اردو میں جدید لسانیات کے مباحث

تحقیقی وتنقیدی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

احسان قادر صدیق

پی ایچ ڈی سکالر

نگرانِ مقالہ

ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد

پروفیسر شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

۲۰۱۷ء

انتساب

اپنی والدہ کے نام

اقرارنامہ

میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ تحقیقی مقالہ بعنوان **''اردو میں جدید لسانیات کے مباحث''** میری ذاتی کاوش ہے اور اس سے پہلے کسی یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی (اُردو) کی ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

احسان قادر صدیق

تصدیق نامہ

اِس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے پی ایچ ڈی اُردو کے طالب **علم** احسان قادر صدیق کے تحقیقی مقالہ بعنوان **"اردو میں جدید لسانیات کے مباحث"** کا مطالعہ دِقتِ نظر سے کیا ہے۔ میں طالب علم کے تحقیقی وتنقیدی کام سے مطمئن ہوں اور اِس اَمر کی سفارش کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ ان کا یہ مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (اُردو) کی ڈگری کی جانچ کے لیے جمع کروا دیا جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد
نگرانِ مقالہ/ داخلی ممتحن

تصدیق نامہ

اِس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے پی ایچ ڈی اُردو کے طالب علم احسان قادر صدیق کے تحقیقی مقالہ بعنوان **"اردو میں جدید لسانیات کے مباحث"** کا مطالعہ دِقتِ نظر سے کیا ہے۔ میں طالب علم کے تحقیقی و تنقیدی کام سے مطمئن ہوں اور اِس اَمر کی سفارش کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ ان کا یہ مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (اُردو) کی ڈگری کی جانچ کے لیے جمع کروا دیا جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد
نگرانِ مقالہ/ داخلی ممتحن

فہرست

مقدمہ

اردو ادب میں جدید لسانیات کے مباحث، کے موضوع پر تحقیق کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بہاء الدین یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے ضروری سمجھا کہ لسانیات کے جدید مباحث سے اردو ادب کے طلبہ کو مستفید کیا جا سکے اور طلبا کی لسانیات کے حوالے سے معلومات کے ذخیرے میں اضافہ کیا جا سکے اور غیر ملکی زبانوں میں لسانیات کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات سے طلبا کو آگاہی فراہم کی جا سکے اور ان کو جدید لسانیاتی مباحث سے روشناس کرایا جا سکے۔ تاکہ وہ لسانیات کے میدان میں مزید بامعنی اور بامقصد تحقیقات کو آگے بڑھا سکیں۔ اس مقالہ میں اردو لسانیات اور دیگر زبانوں کی لسانیات میں موجود مشترک اور مختلف عوامل کی نشاندھی کی گئی ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ اس حوالے سے اہم ہے کہ یہ طلبا کے لیے لسانیات کے میدان میں نئی جہتیں فراہم کرے گا اور نئی سمتوں سے روشناس کرے گا۔ اس کے ساتھ طلبا میں اردو میں ہونے والی لسانی تحقیقات کے علاوہ دیگر زبانوں میں ہونے والی لسانی تحقیقات کا رجحان فروغ پائے گا۔ جس سے اردو لسانیات کو وسعت اور فروغ دینے کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں اضافہ ہوگا۔ اس لیے بہاء الدین یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے پی ایچ ڈی کی سطح پر اس موضوع پر تحقیقی مقالہ تجویز کیا۔

زبان ایک سماجی حقیقت ہے۔ کسی بھی سماج میں رہنے والے زبان کی سماجی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ زبان کی اس اہمیت اور سماجی حیثیت نے لسانیات کے نظریوں کو مختلف طرح سے متاثر کیا۔ اس لیے لسانیات کو علم کی ایسی قسم قرار دیا جاتا ہے۔ جو زبان کی اصلیت اور ماہئیت کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کی پیدائش، فروغ، اور تفریقات جیسے مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ فارسی زبان میں اس علم کو زبان شناسی کا نام دیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں Linguistics اور فلالوجی کہا جاتا ہے۔ جب کہ اردو زبان میں اس کو بولی گیان کہتے ہیں۔ لسانیات کو زبان کا سائنسی مطالعہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ لسانیات دیگر سائنسی علوم کی طرح دوسرے علوم سے

کچھ مخصوص رابطوں اور موضوع کی شعبہ جاتی تقسیم کو بھی اپنے دائرہ میں سمیٹ لیتی ہے۔ لسانیات کو طبعی، سمعی، نفسیاتی، اور بشریاتی علوم سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے علوم کی طرح لسانیات کا ارتقائی سفر آج بھی جاری ہے۔ اپنے ارتقا کے سفر میں لسانیات کے نئے افق ابھر کر سامنے آتے رہے۔ جس کا نتیجہ نظریات کے قیام اور تنسیخ کی صورت میں صدیوں کے سفر میں لسانیات کے ساتھ ساتھ رہا۔

لسانیات کے سائنسی مطالعے کے آغاز سے قبل زبان کی اندرونی ساخت، تالیف اور ترکیب کے قاعدوں یا صوتیات اور فونیمیات کے مبہم تصور کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان کا انسان کے ذہنی ارتقا سے گہرا تعلق ہے۔ انسانی خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے زبان کے وسیلے کو صدیوں سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان اجزائے ترکیبی اور نظاموں کے بارے میں معلوم کریں جو زبان کو باہمی رابطہ کا اہل بناتے ہیں۔ جدید لسانیات کے ماہرین عہد حاضر کی لسانی تحقیقات کی روشنی میں زبان کے معارف اور حقائق کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ جس کی بدولت لسانیات کا علم وسعت اور مقبولیت کی جانب رواں دواں ہے۔

اس مقالے ''اردو ادب میں جدید لسانیات کے مباحث'' میں لسانیات کے جدید مباحث پر تحقیق کی گئی ہے۔ لسانیات کے جدید مباحث نے اردو ادب پر جو اثرات مرتب کیے ان کا جائزہ لیتے ہوئے زبان شناسی اور اردو شناسی کے متعلق بہت سی نئی باتیں نظر آئیں۔ اس مقالہ میں نہ صرف مغربی ماہرین اور مشرقی ماہرین لسانیات کے نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے بلکہ ان کے بارے میں اپنی رائے بھی قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالہ اردو ادب میں لسانیات کے مباحث سے متعلق تحقیقات میں نئے دور کا آغاز کرے گا۔ جس سے زبان کی مختلف سطوحات کو وضع کرنے اور عالمی تاریخی اور تہذیبی منظر نامے میں اردو میں لسانیاتی ارتقا کا جائزہ لینے اور ان کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اردو ادب میں جدید لسانیاتی مباحث کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش اس مقالے میں کی گئی ہے۔ تاکہ ہم اردو زبان میں تحریر کیے جانے والے ادب کو بین الاقوامی تناظر میں پیش کر سکیں۔ اس مقالہ میں اردو زبان کو درپیش لسانی مسائل کو جدید لسانی مباحث کے حوالے سے پرکھنے اور ان مباحث کی روشنی میں ان مسائل کو حل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ نیز لسانیات کے بنیادی اور ثانوی ماخذات کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔ عہد حاضر میں لسانیاتی تحقیقات کو مقالہ میں شامل کیا گیا ہے، خصوصاً مغرب میں ہونے والے مباحث اور ان کے اردو ادب پر

اثرات کے حوالے سے تحقیق کی گئی اور از سر نو حقائق اور معارف کی کھوج کی گئی ہے۔اس مقالہ میں لسانیات کے تبادلی قواعد کے تصورات سے متعلق تحقیق کرتے ہوئے ابتدائی لسانی مطالعے کی قدیم روایت سے آ گاہی فراہم کی گئی ہے۔ساتھ ہی جدید لسانیات میں زبان کا نظام اور اجزائے ترکیبی کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

اردو میں جدید لسانیاتی مباحث کے موضوع پر تحقیقی مقالہ کے لیے استقرائی اور استخراجی کے ساتھ سائنسی، اور تنقیدی انداز کو اپنایا گیا ہے۔ جدید لسانیات کے مباحث کا مطالعہ وسیع موضوع ہے۔ جس میں تاریخ، مذہب، سیاست، ثقافت اور ادب کے علاوہ اور بھی کئی موضوعات شامل ہیں۔چنانچہ ہمہ قسمی علمی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی ماخذات سے استفادہ کیا گیا۔دوران تحقیق تنگ نظری اور ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مختلف دانشوروں، ناقدیدین اور ادیبوں کے خیالات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔اس مقالہ میں ان خیالات کو اردو زبان کے لسانی مسائل کے حل میں معاون ثابت ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے تحقیق کی گئی ہے۔اس مقالہ کے حوالے سے کی گئی تحقیقات کے دوران استدلالی، منطقی، تجرباتی اور دیگر تحقیقی لوازمات کو مدنظر رکھا گیا۔جذباتیت سے گریز کا راستہ اختیار کرتے ہوئے سائنسی طرز تحقیق کو اپنایا گیا ہے۔واضح اور منطقی انداز میں تجزیات کی مدد سے حقائق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تحقیقی لسانی مقالہ لسانیاتی ادب کے فروغ میں ایک ادنیٰ کاوش ہے۔امید ہے چراغ سے چراغ جلنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔اور اردو ادب کے معیار کو بلند کرنے کے لیے مختلف حوالوں سے کام جاری رہے گا۔میرے تحقیقی مقالہ کا دائرہ کار اردو کے جدید لسانی مباحث تک محدود ہے۔جس کو میں نے مکمل دیانتداری کے ساتھ اپنے نگران ڈاکٹر قاضی عابد صاحب کی بھرپور رہنمائی اور اعانت سے مکمل کیا۔اس لیے میں ڈاکٹر قاضی عابد صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری ہر موقع پر رہنمائی کی اور ہر وقت مجھے اپنی علمی قابلیت سے مستفید فرمایا۔ان کی نگرانی میں اس مقالے کی تکمیل میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں، کیوں کہ ڈاکٹر قاضی عابد صاحب اکثر خود مجھ سے رابطہ فرما کر میرے مقالے کے حوالے سے دریافت کرتے اور ہدایات دیتے رہے۔اس مقالے کی تکمیل میں ان کی رہنمائی میرے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ڈاکٹر قاضی عابد صاحب کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور ان کی اعانت ورہنمائی کی بدولت ہی

میں اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں کامیاب ہو سکا۔

اس تحقیق کے دوران میں نے کئی لائبریریوں سے استفادہ کیا جن میں سنٹرل لائبریری بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، لائبریری شعبہ انگریزی، تاریخ، سیاسیات، اسلامیات بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پروفیسر خلیل صدیقی ریسرچ لائبریری شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لائبریری اسلام آباد، پبلک لائبریری لانگے خان باغ ملتان، سنٹرل لائبریری اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، لائبریری گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان، قائداعظم لائبریری لاہور، شامل ہیں۔تراکیب اور اصطلاحات کے معانی اور درست مفہوم تک رسائی کے لیے انٹرنیٹ اور مختلف ڈکشنریوں سے استفادہ حاصل کیا۔انگریزی ادب کے اساتذہ اور سکالرز سے بھی رہنمائی حاصل کی جس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔

اس تحقیقی مقالہ کی تکمیل میں شعبہ اردو بہائالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کا کردار نہایت اہم رہا۔اس ضمن میں ڈاکٹر روبینہ ترین اور ڈاکٹر عقیلہ بشیر کا کردار انتہائی اہم ہے۔جن کی معاونت اور رہنمائی نے مقالہ کے دوران ہر قدم پر میری مدد کی، خواہ وہ کلاس ورک ہو یا سیمینار کا انعقاد، ان کا تعاون ہمیشہ مثالی رہا۔جس کے لیے میں ان دونوں شخصیات کا ممنون ہوں۔

مقالہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔لسانی مطالعہ کی قدیم روایات۔

۲۔جدید لسانیات: ایک تعارف۔

۳۔اردو میں علم الاصوات کا تعارف۔

۴۔اردو میں معنیات کے مباحث اور ان کا اطلاق۔

۵۔اردو میں جدید لسانیات کے مباحث۔

باب اول میں لسانیات کی مذہبی روایات اور فلسفیانہ روایات پر تحقیق کو شامل کیا گیا ہے۔لسانیات کی قدیم روایات پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف ماہرین کی آرا کی روشنی میں درست حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔زمانہ قدیم کی تاریخ اور لسانیات میں پس منظر کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم میں جدید لسانیات کے تعارف کو شامل کیا گیا ہے۔ مغربی ماہرین لسانیات کے زبان کی ماہیت کے مباحث کو اس باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ لسانیات کی مختلف شاخیں جن میں صوتیات، علم الاصوات، صرف، نحو، اور معنیات کے حوالے سے بحث کو شامل کی گیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاق وسباق کے لسانیات میں کردار پر بحث کی گئی ہے۔ سیاق وسباق کی لسانیات کے عمل میں اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تنقیدی اور منطقی لسانی تبدیلیاں اور ان کی پس منظر میں اہمیت کے بارے میں مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ لسانیات کی شاخوں کے حوالے سے مباحث میں اردو کے صوتیاتی نظام کے مطالعہ کو شامل کیا گیا ہے۔ صرف کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایسے اصول وضوابط کا تحقیقی مطالعہ کو شامل کیا گیا ہے جو علم صرف کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ مرکب الفاظ کی بناوٹ اور ساخت کے حوالے سے مباحث میں الفاظ کے مطالعے کو باریک بینی سے دیکھا گیا ہے۔ اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ عام لسانیات اور جدید لسانیات کے مباحث کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم میں اردو میں صوتیات اور علم الاصوات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جن میں فونیمیات کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کو شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ صوتیات اور اردو رسم الخط کے بارے میں قائم قابل تردید مفروضوں کو تحقیق کی روشنی میں رد کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ اردو رسم الخط کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان مسائل کا حل بھی تجویز کیا ہے۔ اردو رسم الخط کی اصلاح کے لیے دی جانے والی تجاویز کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس باب میں اردو صرف ونحو کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مارفیم اور ذیلی مارفیم کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔

باب چہارم میں اردو میں معنیات کے مباحث کے حوالے سے تحقیقی مواد موجود ہے۔ اردو ماہرین لسانیات نے معنیات کو کس طرح اپنایا اور ان کے نقطہ نظر کا مغرب کے ماہرین لسانیات کے ساتھ موازنہ کرانے کی سعی کی گئی ہے۔ معانی کی افادیت، معنوی تبدیلی اور ثقافتی تغیرات، معانی کا درست اظہار، واضح اور مضمراتی اسلوب میں فرق، ماحولیاتی تناظر میں معنی کی شناخت، معنویاتی اسلوب، گفتگو کے تغیراتی پہلو معنی میں تبدیلی کی وجوہات، تنقیدی تغیر، لسانیات کی شناخت اور سماجی تناظر کے موضوعات پر تحقیق کو اس باب میں سمویا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متن کی ساخت اور پیچیدگی کو موضوع پر مغرب میں ہونے والی تحقیقات کو شامل کیا ہے جن میں منطقی تغیرات، طبقاتی تفرقات اور معنی میں اختلاف، معاشرہ اور گفتگو کے معیارات، الفاظ کی اہمیت، زبان اور انسان کی

فطرت، کوشامل تحقیق کوموضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے تین اہم نظریات کوبھی اس حوالے سے تحقیق میں شامل کیا ہے اور ان کی افادیت اور لسانیات کے ارتقا میں ان نظریات کی اہمیت اور افادیت کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب پنجم میں جدید لسانیات کے مباحث کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔اس حوالے سے مغرب میں ہونے والی تحقیقات کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ میخائیل باختن،سوسیور، رولاں بارتھ، مشعل فوکو، دریدا، اور دیگر کئی ماہرین لسانیات کے نظریات پر تحقیق کی گئی ہے۔بیسویں صدی کے لسانی مراحل ومباحث، ساختیات اور لسانیات کے مباحث، سوسیور کے لسانی ماڈل، جمالیات اور لسانیات کے موضوع پر مباحث کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔ تخلیق کار کی اہمیت، متن کی اہمیت، ساختی تنقید اور لسانی شعور، قاری کی اہمیت، تشریح کے مباحث، لسانیات اور ساخت شکنی کے مباحث، کے علاوہ اردو زبان اور مغربی رجحانات کے حوالے سے تحقیق کو اس باب میں شامل رکھا گیا ہے۔ متن کی ساخت کی اہمیت، امتزاجی تنقید، زبان اور تخیلات، کے ساتھ لسانیات اور ذہنی اتصال، انسانی علم اور لسانیاتی مباحث، زبان کے نا قابل استعمال حصے، لسانی وجدان اور ناؤم چومسکی کے نظریاتی مباحث کو اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ژاک لاکاں، سگمنڈ فرائڈ، اور دیگر ماہرین لسانیات کے لسانی نظریات پر تحقیق کو موضوع بنایا گیا ہے۔اردو میں جدیدیت، جدیدیت اور مشرقی شعریات، لسانیات کے عمومی مغربی رجحانات، مغرب کے جدید لسانی مباحث اور ان کے اردو پر اثرات کے بارے میں تحقیق اس باب کا حصہ ہے۔ نیز اس باب میں ساختیاتی لسانیات کی اہم خصوصیات، رومن جیکب سن کا ترسیلی ماڈل، شعریات اور نئی تنقیدی تھیوری، ساختیاتی لسانیات کی اہم خصوصیات، متن اور نو آبادیات، یورپ میں ساختیاتی لسانیات کے معروف دبستان، امریک اور لسانیات مباحث، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے لسانی نظریات کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔اس مقالہ میں کئی تحقیقی کتب اور شخصیات سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ مقالہ میں ضمیمہ جات، حوالہ جات، اور حواشی کا خیال رکھا گیا ہے۔ کتابیات بھی مقالہ کے آخر میں موجود ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر ڈاکٹر قاضی عابد صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی رہنمائی مقالہ کے آغاز سے اختتام تک ہر قدم پر میرے ساتھ رہی جس کی وجہ سے تحقیق کا یہ کٹھن سفر طے کرنا سہل ہو گیا۔

باب اول
لسانی مطالعہ کی روایات

لسانی مطالعہ کی روایات

زبان ایک ایسی صلاحیت ہے جو انسان کو تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ یہ انسان کی پیدائش سے لے کر اُس کے مرنے تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اُردو میں زبان کے علم کو لسانیات کا نام دیا گیا ہے۔ زبان کے منظّم اور مربوط انداز میں سائنسی مطالعہ کو لسانیات کہا جاتا ہے۔ زبان کی تراش خراش اور اس کی ترقی میں لسانیات مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک ماہر لسانیات کا کام پرت در پرت زبان کے اندر اتر کر اس کی ساخت اور بناوٹ کو کھوجنا ہے۔ فیروز اللغات میں زبان کی ابتدا ارتقاء اور اس کی تشکیل کے قانون کا علم زبان کی تاریخ کے علم کو لسانیات قرار دیا گیا ہے۔

لسانیات مختلف زبانوں کی تاریخ، ارتقاء زبانوں کے آپس میں رشتے، معنوی وظاہری ساخت سے بحث کرتی ہے۔ اور زبانوں کا عصری مطالعہ اور تجزیہ بھی کرتی ہے۔ لسانیات نے زبان کی ماہیت کی شعور کو عام کیا اور زبان کی فرضی قصہ کہانیوں کی دنیا سے نکال کر سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے۔ لسانیات کے مطابق زبان ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے معاشرہ میں اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لسانیات کا انسان، انسانی زبان وادب کے ساتھ گہرا تعلق ہے لسانیات کی مدد سے قدیم سے قدیم اور جدید ترین ادب کی توضیح میں آسانی ہوتی ہے۔ لسانیات زبان اور تاریخ کے اُن گوشوں کے بے نقاب کرتی ہے۔ جن کی مدد سے ہم کسی زبان کی قواعد کا با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ لسانیات مختلف زبانوں اور انسانی سماجوں کے درمیان موجود تعلق کی بازیافت کا کام کرتی ہے۔ لسانیات سائنس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں زبان کا

مشاہدہ کیا جاتا ہے۔لسانیات میں نتائج کی تصدیق کا باقاعدہ طریق کار موجود ہے۔لسانیاتی تجربہ گاہ دوطرح کی ہوتی ہے۔ایک تو باقاعدہ تجربہ گاہ (فونیٹک ، یالینگوئج لیب) دوسرے کوئی بھی مخصوص لسانی گروہ جہاں لوگوں کو واقعتاً بولتے ہوئے سنا جائے۔(۲)

لسانیات بھی ایک علم ہے بالکل اس طرح جیسے ہم علم الحیو انات ،علم الارضیات ،طبیعات وغیرہ۔کوعلوم کی تعریف میں رکھتے ہیں۔لسانیات میں زبان کی نوعیت ،تاریخ اوراس کی اصل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔لفظ اوراُس کے معنی میں کیا تعلق ہے۔ہم مختلف مفہوم ادا کرنے کے لیے جوآوازیں یاعلامتیں استعمال کرتے ہیں۔ان کا تعین کب اور کیسے ہوا۔کیا الفاظ کے معنی مستقل ہوتے ہیں یابدلتے رہتے ہیں۔دنیا کی مختلف زبانیں کب اور کس طرح وجود میں آئیں؟ جس زبان کوہم استعمال کرتے ہیں وہ ہم تک کن ارتقائی منازل کو طے کر پہنچی ہے۔یہ تمام مسائل لسانیات کا موضوع ہیں۔(۳)

زبان کے مختلف پہلوؤں کا فنی مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے۔زبان کا یہ مطالعہ (Diochronic) یعنی دو زمانی بھی ہوسکتا ہے۔اور یک زمانی یعنی (Synchronic) بھی ہوسکتا ہے۔دوزمانی مطالعہ کی حیثیت تاریخی ہوتی ہےاور یک زمانی مطالعہ کی حیثیت توضیحی ہوتی ہے۔

لسانیات (Linguistics) کا اُردو ترجمہ ہے۔فلالوجی کی اصطلاح بھی لسانیات کے مترادف کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔فلالوجی نسبتاً وسیع قرار اصطلاح ہے جس میں زبان کے سائنسی مطالعہ کے علاوہ ادبیات کا سائنسی مطالعہ بھی شامل ہے۔کسی بھی علم کوسائنس اُس وقت قرار دیا جاسکتا ہے جب اُس کے مطالعہ کے لیے کچھ قواعد اور ضوابط موجود ہوں۔سائنس ایک منظّم علم کا نام ہے جس میں تمام مراحل کو اصولوں کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔سائنس کی ایک خاصیت (Explicitines) وضاحت ہے۔سائنس کے مطالعہ میں سائنس دان کوواقعیت پسند ہونا چاہیے۔سائنس میں واقعیت پسندی ایک بنیادی طریق کار ہے۔ایک سائنس دان اپنی پسند

اور نا پسند کو دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ یہی انداز ماہر لسانیات کا ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی زبان کو مکمل خیال نہیں کرتا۔ زبان کو واقعیت پسندی سے جانچتا ہے جبکہ زمانہ قدیم میں زبان کا تجزیہ داخلیت پسندی سے کیا جاتا تھا جسکی ایک مثال اہل یونان کی ہے جو اپنی زبان کو دیگر تمام زبان سے بہتر و ممتاز جانتے تھے۔ سائنس کے علم کی بنیاد مشاہدات مفروضات اور تجربات پر ہوتی ہے۔ اسی طرح لسانیات میں بھی زبان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ انسان کیا بولتا ہے۔ لسانیات میں بھی عارضی نتائج کی تصدیق ممکن ہے۔ لسانیات کی تجربہ گاہ دو طرح کی ہوتی ہے ایک باقاعدہ تجربہ گاہ اور دوسرا کوئی بھی مخصوص گروہ جہاں انسانوں کو حقیقت میں گفتگو کرتے سنا جائے۔ سائنس کی خاصیت ہے کہ وہ کسی دوسری سائنس پر انحصار نہیں کرتی۔ لسانیات کو جب سماجی یا نفسیاتی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تو یہ خالص سائنس نہیں رہتی جبکہ خالص لسانیات خالص سائنس کے طور پر پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔

لسانیات کی قدیم روایات

زبان وہ صفت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات کے مرتبہ پر فائز کرتی ہے۔(۴) زبان خیال کے اظہار کا وسیلہ ہے اگر زبان کی اس تعریف پر اکتفا کر لیا جائے تو ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر زبان محض اظہار کا ذریعہ ہے تو یہ آلہ کسی نہ کسی حد تک تمام جانوروں کو بھی نصیب ہے۔ وہ مختلف حرکات وسکنات اور آوازوں کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کر لیتے ہیں۔ اور دوسرے جانور اُسے سمجھ لیتے ہیں مگر ہم اُسے زبان نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ انسان کی زبان اپنی نوعیت اپنے حلقہ عمل اور وسعت کے اعتبار سے ان تمام سے بہت مختلف ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر انسان کی زبان کیا ہے؟ جو آوازیں یا علامات انسان استعمال کرتا ہے ان کا تعین کیسے اور کب ہوا؟ ایک ہی مفہوم کی ادائیگی کے لیے مختلف علاقوں کے لوگ مختلف علامات اور الفاظ کو کیوں استعمال کرتے ہیں؟ الفاظ اور اُس کے معانی میں کیا تعلق ہے؟ دنیا کی مختلف زبانیں کب اور کیسے پیدا

ہوئیں؟

لسانیات کی تاریخ کا ابتدائی دور مفروضات اور قیاس کا دور ہے۔لسانیات دراصل یورپ میں لسانیاتی مسائل کے مطالعہ کی تاریخ ہے۔جس کا آغاز یونان کے علم اور حکمت کے دور سے ہوتا ہے۔افلاطون کے مکالمات میں کسی شے کے نام اوراُس کے قدرتی تعلق پرطویل بحث موجود ہے۔افلاطون کی خواہش تھی کہ ایک ایسی زبان تخلیق ہوسکے جس میں لفظ اوراُس کے معنی کے درمیان قدرتی تعلق موجود ہو۔یہی وہ دور تھا جب یونانی مفکرین خالص تصوراتی مسائل میں الجھے تھے کہ ہندوستان کے ماہرین لسانیات آریائی زبان کے قواعداوراُس کے اصول مرتب کررہے تھے۔

مذہبی روایات

مذہب ہمیشہ سے زبان پراثرات مرتب کرتا رہے ہے۔سنسکرت کا مطالعہ اورتحقیق کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ برہمن اس کوشش میں تھے کہ سنسکرت کے اصل الفاظ اورعبارت میں کوئی تبدیلی نہ ہوسکے۔اسی لیے اس زبان کومقدس قرار دیتے ہوئے غیرآریائی لوگوں پراس کے دروازے بندکردیئے گئے۔اس طرح پراکرتوں کا وجودسامنے آیا۔یورپ میں بھی مذہب ہی تھاجس کی وجہ سےلسانیات کی ضرورت کومحسوس کیا گیا۔اس کی مثال عہد نامہ عتیق کی زبان ہے جواُس وقت یورپ میں بولی جانے والی تمام زبانوں سے الگ تھی یہ عبرانی زبان تھی جس کی ساخت سے اہل یورپ شناسانہ تھے۔اس وجہ سے عام رائے تھی کی عبرانی خدا کی زبان ہے۔کیونکہ فرشتوں نے خدا کا پیغام اس زبان میں نبیوں تک پہنچایااس لیےعبرانی کے معانی اورمفہوم کوکھوجنا شروع کردیا۔(۵) اس طرح ایسے الفاظ جن میں بظاہر ہی کوئی مماثلت نظرآئی۔اُن الفاظ کے درمیان تعلق پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی خواہ دونوں لفظ اورمعانی اورمفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضِد ہی کیوں نہ ہوں۔اگرچہ یہ مطالعے

لسانیات کی تحقیق کے حوالے سے اہم نہ سہی لیکن تاریخ لسانیات میں ایک نئے دور کا آغاز ضرور فراہم کرتے ہیں۔

عیسائیوں کی طرح مسلمان بھی عرصہ دراز تک عربی زبان کو اُم للسان سمجھتے رہے۔جس طرح عیسائی عبرانی زبان کو تمام زبانوں کی بنیاد تصور کرتے تھے۔تحقیق سے ثابت ہوا کہ عربی اور عبرانی دونوں کا قریبی تعلق ہے۔دونوں سامی نسل کی زبانیں ہیں۔اس طرح کافی عرصہ تک مسلمان اور عیسائی اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ عبرانی،عربی ہی وہ زبانیں ہیں جو زبان الٰہی کا درجہ رکھتی ہیں اور عیسائیوں کے نزدیک عبرانی اور مسلمانوں کے نزدیک عربی تمام زبانوں کی موجد قرار پاتی رہیں۔جبکہ لسان کے کئی بڑے خاندان اور بھی موجود ہیں جن کا عربی یا عبرانی سے بلحاظ لغت اور ساخت کو تعلق نہیں بنتا۔ان میں سے ایک خاندان آریائی ہے۔جس کی شاخیں ہندوستان سے یورپ تک پھیلی ہیں جس کا عبرانی اور عربی سے تعلق نہیں ہے۔ ہند آریائی زبانوں سے عموماً آریاؤں کی وہ زبانیں مراد لی جاتی ہیں۔ جو جنوبی ایشیاء میں اُن کے دور میں ارتقا پذیر ہوئیں۔ ہند آریائی کی قدیم ترین دستاویز ''رگ وید'' کی صورت میں منظر عام پر آئی۔رگ وید،بھجنوں،منتروں کی تخلیق وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔رگ وید کے وجود میں آنے کے وقت آریائی فن تحریر کو نہیں جانتے تھے۔جس کے سبب مختلف ادوار میں ''رشی'' یہ تخلیقات کرتے رہے رگ وید کی تخلیق کے قریب سات سو سال بعد ان کو تحریر کو صورت دی گئی۔رگ وید کی پہلی بار تحریری اشاعت کا سہرا رشی مدھو چھندس کے سر ہے۔(٦) ظاہر ہے کہ سات سو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد تحریر کی صورت اختیار کرتے ہوئے زبان میں تغیرات بھی آ چکے ہوں گے اور تحریر میں اُس دور کے مروجہ الفاظ کو ہی فوقیت دی گئی ہو گی۔ چنانچہ اس میں دو رائے نہیں کہ موجودہ رگ وید میں جو زبان ملتی ہے وہ اصل تخلیق کی زبان سے مختلف ہو گی۔

زبان کی ابتدا کے بارے میں عہد نامہ عتیق میں تحریر ہے۔

''اور خداوند نے کل جانوروں اور ہوا کے کل پرندوں اور مٹی سے بنائے آدم کو اپنے پاس بلایا کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے۔اور آدم نے جس چیز کا جو نام رکھا وہ نام ٹھہرا (کتاب پیدائش) اس طرح وہ آدم تھا جس نے تمام

اشیاء کے نام رکھے لیکن اس حقیقت کے برعکس ان تمام الفاظ کو براہ راست خدا سے منسوب کر دیا گیا''۔

افلاطون اپنی کتاب کرسیٹیس میں کچھ یوں تحریر کرتا ہے کہ:۔

''آخر زبان کے اولین الفاظ کس طرح بنائے گئے ہوں گے اور وہ کون سے اصول وضوابط تھے جن کے باعث یہ الفاظ تشکیل ہوئے۔''

افلاطون چونکہ دوسرے ممالک میں بولی جانے والی زبانون کے علم سے ناواقف تھا اس لیے زبان کے آغاز کے محرکات تک اُس کو رسائی حاصل نہ ہو سکی۔

سنسکرت کے قدیم ترین قواعد نویس ''نروکتا'' جو سنسکرت کو بھاشا کا نام دیتے ہیں۔ بھاشا کے معنی بولی جانے والی زبان کے ہیں ''نروکتا'' بھاشا اور ویدوں کی زبان میں فرق کرتا ہے۔ اس طرح ''پانِنی'' (۳۰۳ ق۔م) بھی ادبی سنسکرت اور ویدک سنسکرت میں فرق کو واضح کرتے ہیں پانِنی کی پرورش اور تعلیم و تربیت ایسے علاقوں میں ہوئی جو آریائی تہذیب اور تمدن کے عکاس تھے جہاں پر زبان ویدوں کے قریب نہ تھی پانِنی قواعد یقینی طور پر یورپ کے علاقوں میں معیاری کتاب کی حیثیت رکھتی تھی۔(۷)

زبان کی ابتداء کا مسئلہ انسانی دلچسپی کا مرکز رہا ہے کہیں اسے منروا سے منسوب کیا گیا تو کہیں سرسوتی، ایتھا اور ثوث کو اس کا خالق قرار دیا گیا لیکن جب دینا کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں ''واک'' (لفظ) کے عنوان سے نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُسے موجودہ لسانی نظریات سے کافی حد تک ملتا جلتا پاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مہارشی بہسپتی'' وہ ہستی ہے جس نے سب سے پہلے اپنے دور میں استعمال ہونے والے الفاظ کو سنوارا اور اُن کی تراش خراش کی۔

فلسفیانہ روایات

اٹھارویں صدی میں یہ خیال زور پکڑ رہا تھا کہ زبان کا آغاز کسی مافوق الفطرت ہستی کے سبب ہوا۔ اس

کے بارے میں انقلابی مضمون نویسی ''روسو'' کی تصنیف ''زبانوں کی ابتداء'' میں ایک طرف تو زبان کے مافوق الفطرت ماخذ کی تائید کی گئی ہے اور دوسری جانب زبان کو کچھ قدرتی امور کا نتیجہ بھی قرار دیتے ہیں۔

روسو کے تصورات یہ ہیں کہ جب چند انسانوں نے ایک جگہ مل کر رہنا شروع کیا ہوگا تو باہمی اقرار سے ایک زبان بھی مقرر کی ہوگی۔ روسو کے اس نظریہ میں جو خامیاں نظر آتی ہیں۔ اُن میں اگر آپس کے اس قول واقرار سے قبل کو زبان موجود نہ تھی تو زبان کی ضرورت کب اور کیوں محسوس ہوئی؟۔ اور جب انسان کے پاس اس قول و اقرار سے پہلے اظہار کا کوئی وسیلہ موجود نہیں تھا تو ایک خاص لفظ کو خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کیسے استعمال کیا گیا۔ اس طرح روسو کا نظریہ قابل عمل نہیں لگتا۔ اگر ہم روسو کے بعد دیکھیں تو ہمارے پاس دوسرا مفکر ''کونڈ لیک'' ہے جس کا تصور زبان کے بارے میں کچھ یوں ہے:۔

> ''ابتدائے آفرینش میں شاید اک مرد اور ایک عورت جو زبان سے محروم تھے آہستہ آہستہ اشاروں اور قدرتی زبانوں کی فعل سے کام لینے لگے اس طرح خاص آوازیں خاص مفہوم کے ساتھ منسلک ہوتی چلی گئیں۔ ان میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور آوازوں کا یہ سرمایہ دوسری نسل کو ورثہ میں ملا جس نے اس میں اور اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ ہر نسل کے افراد اسے فروغ دیتے رہے حتیٰ کہ ایک زبان وجود میں آ گئی۔''

کانٹ کے شاگرد اور گوئٹے کے دوست جون گوٹ فریڈ ہرڈر نے ۱۷۷۲ء میں مشہور مقالہ ''زبان کی اصل'' تحریر کیا اور پہلی مرتبہ الہیاتی نظریہ کی تردید کی۔ اور کہا زبان عطیہ الٰہی نہیں ہے۔ انسان نے اپنی ضرورت سے اسے استعمال کیا ہے۔ اگر زبان عطیہ الٰہی ہوتی تو اس میں کوئی نقص یا خامی نہ ہوتی اس کے برعکس ابتدائی زبانیں اظہار کا ناقص اور نامکمل ذریعہ تھیں۔ ''ہرڈر'' کا یہ نظریہ افعال و روابط کے بارے میں بتانے سے قاصر

ہے۔ ہرڈر کی لسانیاتی تحقیق نے ہونے کے برابر ہونے کے باوجود ''ہرڈر'' نے لسانیات کے ماہرین کو مذہبی تعصب کی ضِد سے نکال لیا۔ جس کی وجہ سے لسانیاتی تحقیق کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے رہے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ لسانیات کا باقاعدہ آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔(۸)

الہیاتی نظریہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آدم کو مختلف اشیاء دکھائیں۔ آدم نے ان کو جن ناموں سے پکارا وہ ان کا نام ہو گیا۔ پھر جب انسان نے بلند مینار قائم کر کے آسمان تک پہنچنے کی خواہش کی تو اللہ تعالیٰ کو یہ غرور پسند نہ آیا۔ اور اُس نے ابن آدم کی زبان کو غلط ملط کر دیا۔ جس سے زبانوں کا اختلاف شروع ہو گیا۔ زبانوں کے تاریخی اور تقابلی جائزہ کا آغاز ولیم جونز کے اس فلسفیانہ مقالے سے ہوا جو انہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے منعقدہ اجلاس کلکتہ ۲ ستمبر ۱۷۸۶ء کو پڑھا جس میں ولیم جونز نے سنسکرت یونانی، لاطینی اور جرمن زبانوں کے درمیان لسانی مماثلتوں کی جانب اشارہ کیا۔ ولیم جونز نے کہا:۔

> ''سنسکرت، یونانی سے زیادہ تکمیل یافتہ اور لاطینی سے زیادہ جامع ہے اور سنسکرت ان دونوں سے زیادہ شائستہ ہے۔ مگر یہ ان دونوں سے بہت زیادہ مماثلت بھی رکھتی ہے۔ ان تینوں کا سرچشمہ اگرچہ خود معدوم ہو چکا ہے۔ مگر ایک ہی سرچشمہ ہے۔''(۹)

تقابلی لسانیات کی اصلاح پہلی مرتبہ فریڈرک شیگل (۱۷۷۲ء تا ۱۸۲۹ء) نے وضع کی۔ ۱۸۰۸ء میں ''اہل ہند کی زبان اور حکمت'' کے نام سے شائع کردہ کتاب میں یورپی زبان کا سنسکرت سے موازنہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں فریڈرک نے سنسکرت، یونانی، لاطینی اور رجرمن زبانوں کے درمیان گہرے رشتے اور مطابقت کی نشاندہی کی۔

چینی زبان کے آغاز کے بارے میں مختلف مذہبی روایات ملتی ہیں۔ لیکن سب روایتوں میں یہ بات

مشترک ہے کہ زبان کو وحی یا الہام کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جو روایات چینی زبان کے بارے میں ملتی ہیں اُں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آسمان کے بادشاہ ''لی این ہوانگ'' نے انسانوں کو چینی زبان سے متعارف کرایا۔مگر روایتوں میں کچھوے کو جسے طویل العمری کے باعث عقل منداور اس کے خول پر آسمانی زبان کے حروف منتقل ہونے کے بارے میں بات کی جاتی رہی ان روایات کے مطابق ''لی این ہوانگ'' کا پیغام زمیں پر کچھوالے کر آیا۔ یہ پیغام ''فوہی'' کے پاس پہنچا تھا یہ بھی روایت ہے کہ چڑیوں کے پنجوں کے جو نشان زمین پر بنتے ہیں۔ان کے مطابق تحریری شکلوں کا تعین ہوا۔اس طرح اس روایت کے مطابق چڑیاں بھی آسمانی پیغام رساں ہوئیں اور وہ آسمانی زبان بولتی ہیں۔ چنانچہ کچھوااور چڑیاں روحانی اور علم غیب کے حصول میں مددگار تصور کی جاتی رہیں ہیں:۔

> ''چینی کی طرح دیگر زبانوں کا آغاز بھی پراسرار مذہبی پردوں میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔جس کی بنیادی وجہ یہ کہ ''ہر اچھی چیز آسمانی تحفہ'' قرار پاتی تھی۔اسی لیے ان ادوار میں دیوی اور دیوتاؤں کو فنون کا سرپرست سمجھا جاتا تھا۔ان ادوار میں قابلِ ذکر بات ناخواندگی کا ہونا بھی ہے۔ پجاری ہی واحد شخص ہوتا تھا جو مذہب کی تشریح کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ ''البیرونی'' اپنی کتاب ''الہند'' میں زبان کے اساطیری آغاز پر روشنی ڈالتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا رسم الخط مٹ گیا تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ لوگ ان پڑھ ہو گئے تھے۔اور علم سے اُن کی دوری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ پراشر کے بیٹے بیاس نے الہام الٰہی سے اُن پچاس حروف کو از سرِ نو ایجاد کیا۔حرف کا نام اکشر ہے۔'' (ابوریحان البیرونی،ص۱۸۲)

عہد نامہ عتیق میں قصہ آدم کے بیان میں تحریر ہے

''اور خداوند نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا۔ اور اُس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اُس کے بدلے گوشت بھر دیا۔ اور خداونداس پسلی سے جو اُس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا۔ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ایک ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی اس سبب سے ناری کہلائی۔'' (باب نمبر۔۲)

آدم اور حوا کے لغوی معنی پر غور سے معلوم ہوتا ہے آدم کا لغوی مطلب گندم گوں اور رہنما ہے۔ سُریانی میں آدم کا لفظی مطلب مایوس شخص ہے۔ جہاں تک حواہ کا تذکرہ ہے۔ حوا کا نام آدم نے رکھا حوا کا لغوی مطلب ''جزو'' ہے۔ عبرانی زبان میں ''حوا'' زندگی کے معنی میں ہے اور آدم کے معنی ''مٹی'' ہے۔ قدیم اہل مصر کا عقیدہ تھا کہ فنون دیوتا نے انسان کو کمہار کے چاک پر تشکیل دیا مصر سے نکلتے وقت یہودی یہ عقیدہ اپنے ساتھ لائے۔ (سبطِ حسن، ''ماضی کے مزار''، ص۱۹۹)

سبطِ حسن کے خیال میں انجیل کی داستان میں بہشت کا جو نقشہ ہے اُس کے ماخذ کے بارے میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں دریاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ خود لفظ ''عدن' عکادی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی چراگاہ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح شجر حیات، شعبہ ممنوعہ بھی بابل کی قدیم داستانوں کے پودے ہیں۔

جہاں تک ''حوا'' کی اساطیری اہمیت ہے۔ نن ہواسگ کی سمیری داستان سے حوا کے پسلی سے پیدا ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ ایک دیوی ''نن تی'' یہودی عقیدے میں داخل ہو کر حوا بن گئی اور اس کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے حوا کا تصور سمیری اور عکاسی روایتوں سے لیا ہے۔ (سبطِ حسن ماضی کے مزار، ص۲۰۰)

قصہ آدم کے مذہبی اور اساطیری روایات سے ہٹ کر قرآن مجید اور عہد نامہ عتیق میں آدم کی پیدائش کا جو تصور موجود ہے۔ اُسے زبان کے آغاز کی آسمانی توجیح بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء

کے نام سکھائے فرشتوں کو بتایا کہ میں آدم کو تخلیق کر رہا ہوں جس پر وہ معترض ہوئے کہ یہ فساد برپا کرے گا۔اس پر خدا نے فرشتوں سے ان اشیاء کے نام پوچھے۔مگر فرشتے ناکام رہے۔ جب خدا نے آدم سے نام پوچھے تو آدم نے وہ نام بتا دیئے۔جس پر فرشتے سجدہ ریز ہو گئے۔''عہد نامہ عتیق (باب دوم) کتاب پیدائش'' میں تحریر ہے کہ خداوند نے ہر ایک جانور اور پرندوں کو زمین سے بنا کر آدم کے پاس بھیجا جو آدم نے ہر جانور کو کہا وہی اُس کا نام ٹھہرا۔اس طرح آدم علیہ السلام ابو بشر ہونے کا ساتھ ساتھ ابولسان بھی قرار پاتے ہیں۔

زبانِ آدم کیا تھی؟ کتاب عروض میں ''سیفی'' حضرت آدم کی زبان کو سریانی بتاتے ہیں جس میں آدم کے لفظی معنی مایوس کے ہیں جبکہ اگر ہم مولانا شاہ عبدالعزیز کی گفتگو پر غور کریں تو اُن کے مطابق حضرت آدم بہشت عربی زبان بولتے تھے وہاں سے نکالے گئے تو عربی زبان سلب کر کے اُس کی جگہ سریانی بولی اُن کی زبان پر چڑھا دی گئی جبکہ اس کے برعکس ''مصنف تاریخ خمیس نے معائم التنزیل'' سے اخذ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام زبانوں کی لغت سکھائی۔انہوں نے اپنی اولاد میں ہر شخص سے الگ الگ زبان میں گفتگو کی۔اینڈ ریے کیمپ نے ۱۵۲۶ء میں ایک کتاب میں بہشت کی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خدا نے آدم سے سویڈن زبان میں گفتگو کی۔آدم نے ڈنمارک کی زبان میں بات کی اور سانپ نے ''حوا'' سے فرانسیسی میں بات کی۔''ایرو'' اس بات پر مضمر ہے کہ جنت میں ہسپانوی زبان (بسکانی) بولی جاتی تھی۔مگر ان تمام نظریات کو غلط ثابت کرتے ہوئے گربیپس نے ۱۵۷۰ء میں ایک کتاب میں تحریر کیا کہ بہشت میں ''ڈچ'' زبان کا استعمال ہوا۔ان دعوی جات سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ہر قوم اپنی زبان کی برتری اور فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے اُسے بہشت کی زبان قرار دینے پر مصر ہے۔

حضرت نوح تک زبانوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔اٹھارہ زبانیں اُن کی اولاد میں پیدا ہوئیں۔ اولاد نوح میں لسانی اختلاف اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ ایک ساتھ انیس زبانوں کو بول چال کے لیے استعمال کیا

جانے لگا اس حالت میں یہ لوگ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ علاقوں میں جا بسے۔ ''نمرود'' کے عہد تک ۲۷ زبانوں کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نمرود کے عہد سے عربی زبان کا آغاز ہوا۔ جس شخص نے سب سے پہلے عربی زبان کو اختیار کیا اُس کا نام یعرب ابن قحطان تھا۔ (مقدمہ، ص ۵۰۰) عہد نامہ عتیق کتاب پیدائش باب نمبر ۱۰ میں پسران نوح کے بیان کا خاص تذکرہ موجود ہے۔ پس حام کے بیٹے اپنے خاندانوں اور اپنی زبانوں کے موافق اپنے ملکوں اور گروہوں میں ہیں۔ پس سام کے بیٹے اپنے خاندانوں اور اپنی زبانوں کے موافق اپنے گروہوں میں ہیں۔

لسانی اختلاف کے بارے میں عہد نامہ عتیق کے باب گیارہ کا متن کچھ یوں ہے:۔

''اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور جب وہ یورپ سے نکلے تو انہوں نے کہا آؤ اپنے واسطے ایک شہر بسائیں۔ اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے۔ اور خداوند اسی شہر اور بُرج کو جسے بنی آدم بناتے دیکھنے اُترتا اور خداوند نے کہا دیکھو لوگ ایک ہیں۔ اُن سب کی بولی ایک ہے۔ اب وہ یہ کرنے لگے ہیں۔ آؤ ہم اُتریں اور ان کی بولی میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات کو نہ سمجھ سکیں۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے اس لیے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں زبانوں میں اختلاف ڈالا۔''

زمانہ قدیم کی تاریخ سے معلوم ہوا کہ۔

سمیریائی (۴۰۰۰ ق م)   قدیم مصری (۳۵۰۰ ق، م)   ہند یورپی (۲۰۰۰ ق م)

چینی (۲۰۰۰ تا ۵۰۰ ق م)   دراوڑی (دوسری صدی عیسوی)   جنوبی قافی یا جاربی (پانچویں صدی ق م)

الفائی (آٹھویں صدی ق م) برمی (نویں صدی ق م) یورالی (۱۳اصدی ق م) (۱۰)

اس بحث سے حاصل مقصود یہ ہے کہ زبان عطیہ الٰہی نہیں ہے انسان نے اپنی ضروریات کے مطابق استعمال کیا۔ ابتدائی زبانیں اظہار کا ناقص ذریعہ تھیں اور نامکمل بھی تھیں۔ اس ضمن میں یہ بات کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر زبان عطیہ الٰہی ہوتی تو اس میں نقص یا خامی ہرگز نہ ہوتی۔ الہیاتی نظریہ اشیاء کے نام دینے تک تو مددگار رہے۔ مگر ان کے افعال اور روابط کے بارے میں الہیاتی نظریہ خاموش ہے۔

پروتوغورس (۴۱۱۔۴۸۰ قبل مسیح) کو اس کے ادا اکردہ ایک جملے کے عوض اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور اس کی تمام تصانیف کو جلا دیا گیا۔ مگر اس کے جملے نے ایک بات سب پر واضح کر دی کہ ''سچ'' اگر کسی بھی فریق کو اضافی محسوس ہو تو بھی اس کی سچائی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ پروتوغورس نے کہا تھا۔ ''خداؤں کے متعلق یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ آیا وہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔ یا وہ کیسے ہیں بہت سی چیزیں مجھے لب کشائی سے روکتی ہیں''۔ اسی قسم کی سوچ ہی فلسفہ لسان کو فروغ دینے کا باعث بنی۔ پروتوغورس اور سوفسطائیوں نے On the Correctness of Names پر کتابیں تحریر کیں۔ جس کی وجہ سے درست زبان کی تلاش اور تحقیق کا آغاز ہوا۔

دیما قریطس (۴۱۱۔۴۸۰ قبل از مسیح) کا تصور ایک جیسی اور مختلف اشیا کے ناموں کے بارے میں کچھ یوں تھا کہ کچھ اشیا ایسی ہوتی ہیں جن کے نام ایک سے زائد ہوتے ہیں جبکہ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے نام یکسر معلوم ہی نہیں ہوتے۔ زبان کے بارے میں دیما قریطس کے یہ خیالات زبان کو عطیہ الٰہی قرار دینے کی جانب نشاندھی کرتے ہیں۔ دیم قریطس کے بعد اس سلسلہ کا اہم نام افلاطون (۳۴۷۔۴۲۷) کا ہے۔ جس نے عہد نامہ عتیق سے بہت پہلے فلسفہ لسان کو کتاب پیدائش کے موقف سے آگے بڑھا کر پیش کیا تھا۔ افلاطون اپنے خیالات کو چند سوالات کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں۔

'' زبان کے حقائق کس طرح وجود میں آئے؟۔زبان کے پہلے حروف کس طرح سامنے آئے؟۔حروف سازی کا عمل کیا ہیاوراس کے اصول کیا ہیں؟۔''

افلاطون چیزوں کی ابتدا اور حقائق کی تلاش کا محور بنائے ہوئے تھا۔جبکہ اس کے برعکس ارسطو کی توجہ کا مرکز''الفاظ'' تھے۔لیکن ارسطو کے نظریات میں ابہام کی صورت اس وقت جنم لینے لگی جب اس نے الفاظ کو شئے کا محمول بتانا شروع کیا۔ارسطو نے ایک شئے کومتعدد مرتبہ بحث کا حصہ بنا کر الفاظ اور شئے میں تعلق پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہیاس میں ارسطو الفاظ کی پیچیدگیوں میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

سقراط کے مطابق''اسم اپنے مسمیٰ جیسا نہیں ہوتا''۔اس کے مطابق اسم اصل چیز کی نقل ہے۔رواقیوں نے علامت،آواز،شئے،اور معنی کو زیر بحث لاکر الفاظ اور اشیا کے معروضی معنی پر زور دیا۔اٹھارویں صدی کے پہلے نصف تک رواقیوں کی گرامر کی بالا دستی قائم رہی۔اس دوران ولیم آف آرک بام، جان لوک،لیبنز اور روسو کے خیالات نے لسانیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ Direction of Categories کی بجائے الفاظ کی تقسیم پر زور دیا جاتا رہا۔جبکہ تمام بنیادی حوالے اس میں سراسر نحوی نوعیت کے ہیں۔''اوک بام'' کے مطابق گفتگو تین طرح کی ہوتی ہے۔''تحریری،تصوری،اور تقریری'' جو قدرتی طور پر علامتوں کی طرح کام کرتی ہے۔جن میں مکر کا پہلو موجود رہتا ہے۔سولہویں صدی کے پہلے نصف میں منطق کے حوالے سے کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زمانہ وسطیٰ میں علما کی توجہ کا مرکز علامتوں کا منطقی تجزیہ تھا۔اس دور میں ترقی یافتہ نحوی نظام موجود تھا۔اس لیے منطق کا تعلق الفاظ کی بجائے لسانی فکر سے جوڑا گیا۔

قرون وسطیٰ کے برعکس نشاۃ ثانیہ میں''معانی'' کو اظہار پر فوقیت دی جانے لگی۔تھامس پالس (۱۶۷۹۔۱۵۸۸) نے الفاظ کے معنی کے تعین کا ذمہ دار بادشاہ کو قرار دیا۔''ہوبس'' نے زبان کو ایسے اسما پر مشتمل

قرار دیا جو اشیا کی نشاندھی کرتے ہیں۔ ہوبس نے زبان کی ابتدا کے بارے میں کہا کہ سب سے پہلا انسان جس کو مختلف اشیا کے مختلف نام رکھنے کی ہدایت کی گئی وہ ہدایت کسی اور کی جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے تھی۔ اس طرح ہوبس کے مطابق خدا نے سب سے پہلے زبان کو تخلیق کیا۔ اس لیے ہوبس کہتے ہیں کہ فطرت کا درست معانی فراہم کرنا صداقت ہے۔ آدمی اس وقت تک صادق نہیں ہوسکتا جب تک وہ اشیا کے صحیح نام نہ جانتا ہو۔ اسی لیے زبان کو خدا نے انسان کے لیے تخلیق کیا۔

جان لاک (۱۷۰۰۔۱۶۳۳) اس خیال کا حامی تھا کہ ''انسانی افکار حقیقت کی عکاس ہوتی ہیں''۔ جان لاک کے مطابق پیدائش کے وقت انسانی ذہن صاف تختی کی مانند ہوتا ہے جو سادہ تصورات سے پیچیدہ نظریات کی طرف سفر کرتا ہے۔ یہ سفر خیالات اور تجربات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ جان لاک کے مطابق انسان کی زبان اس کے اندر چھپے تصورات کی عکاس ہوتی ہے جو انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ زبان کی بدولت انسانی ذہن میں مخصوص علامات اور تصورات جنم لیتے ہیں۔ جان لاک کے اس نظریہ نے مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر کو گہری ٹھیس پہنچی۔

جان برکلے (۱۷۵۳۔۱۶۸۵) نے جان لاک کے نظریہ سے اختلاف کیا۔ جان برکلے کے مطابق ''ہر اسم ایک خیال ہے''۔ اس طرح وہ تمام ممکنہ اسماء جو خیالات کے دائرہ کار میں نہیں آتے جو مجرد ہوتے ہیں۔ برکلے، جان لاک کی طرح ذہن کو صاف تختی تسلیم کو تیار نہیں تھا۔ اس کے مطابق ''تصورات خلقی ہوتے ہیں]]۔ جن کو بازیافت کے عمل سے گزار کر شعوری حالت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ برکلے کے بعد روسو کی تصنیف Origin of Language لسانیات کے میدان میں قدیم اور جدید کا خط فاصل قرار پاتی ہے۔ اس کتاب میں روسو نظریاتی سے زیادہ عملی پہلوؤں پر بحث کرتا ہے۔ روسو زبان کے متعلق سماجی گروہوں اور موسمی اثرات کو اہمیت دیتا ہے۔ روسو

زبان کے متعلق انجیل میں بیان کردہ مظریات سے اتفاق کرتا ہے۔ وہ اپنے مضمون کے آخر میں لکھتا ہے کہ زبان پرعوام کا کردار، اخلاق اور مفادات اثر انداز ہوتے ہیں۔

یورپ میں عہد نامہ عتیق کا نظریہ، رواقیوں کی گرامر کے بعد جو شخص سب سے بنیادی تبدیلی لانے کا باعث بناوہ'' جوہان گوٹفر یڈ ہرڈر (۱۸۰۳۔۱۷۴۴) تھا۔اس کا مقالہ (۱۷۷۲) تاریخی نوعیت کا ہے۔ اس مقالے کے بعد لسانیاتی میدان میں ہونے والے مباحث اور تبدیلیوں میں ہرڈر کے اس مقالے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہرڈر کے خیالات پر کانٹ کے ارتقائے فطرت کے نظریہ کے گہرے اثرات تھے۔ ہرڈر، عہد نامہ عتیق میں بیان کردہ نظریہ آفرینش کا مخالف تھا۔ ہرڈر کے بعد لسانیات کے حوالے سے اہم نظریہ ولیم جانس نے پیش کیا۔

لسانیات دور حاضر میں عظیم طاقتوں کی سیاسی حکمت عملی میں اہم کردار کی حامل ہے۔لسانیات کی بنیاد پر لڑاؤ اور حکومت کرو کے فلسفہ کے اصول پر عمل پیرا ہو کر بڑی بڑی طاقتیں اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے سرگرداں ہیں۔ سامراجی دور ہو یا نو آبادیاتی نظام یہ قوتیں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے لسانی جھگڑوں اوران کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گروہی قوتوں کو آلہ کار بنا کر دنیا میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔اپنے اقتدار کے فروغ اور استحکام کے لیے لسانیات کو بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے۔مغرب کا بیشتر فلسفہ، ادب اور لسانی تجزیات کے گرد گھوم رہا ہے۔اردو ادب میں بھی لسانیات کے ذریعہ انسان کو اس کی خوابوں کی دنیا سے باہر نکالنے اور خیال اور فکر سے زیادہ ادائیگی پر توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔موجودہ دور میں لسانیات کی مدد سے بولنے والے کی ثقافت اور معاشرت کے بارے میں معلومات کا حصول دشوار نہیں رہا۔لسانی ڈھانچوں کی مدد سے گفتگو کرنے والے کے بارے میں مکمل معلومات اخذ کی جاسکتی ہیں۔امریک ماہر لسانیات'' پیکارڈ'' کے مطابق،''کسی ملک کی ثقافت ابلاغی انجنیئر نگ کی مدد سے چند برسوں میں تبدیل کی جاسکتی ہے۔ دور جدید میں ٹیکنالوجی کی بدولت کسی

بھی زبان مین بھیجے جانے والے پیغام کو با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہر زبان کی لغت اور اس کے نحوی ڈھانچے کو برقی آلات کی مدد سے قابل فہم بنانا اب دشوار نہیں رہا۔اردو میں اب جذباتی، فعلی اور صفتی عوامل کو ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے۔ان کی جگہ مصدقہ افعال و اعمال کو دی جا رہی ہے۔جس کی وجہ سے اضافیت نے جنم لیا ہے۔جس سے زندگی بذات خود ایک لایعنی شئے اور واہمے کا روپ دھار گئی ہے۔متضاد امتزاج کے مقابل متعین ثقافت کی بات کی جا رہی ہے۔جس کی وجہ سے حرکی اقدار میں فروغ ممکن نہیں رہے گا۔ایلیٹ نے ایک خوبصورت تضاد کے ذریعہ اپنی اصل نیت کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کی غرض سے ''نقطہ سکوت'' کو ادبی اصطلاح کے طور پر پیش کیا ہے۔

ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں دنیا نے ترقی کی منازل کو حیرت انگیز طور پر بہت کم وقت میں طے کیا ہے۔اس ترقی میں زبان نے بھی انسانی تاریخ میں اس کا بھر پور ساتھ دیا ہے۔عہد نامہ عتیق مین زبان کو خدا کا عطیہ قرار دینے سے، آدم علیہ السلام کو اشیا کے نام بتانے، جانوروں اور دیگر مخلوقات پر انسانی برتری کو ثابت کرنے کے لیے انسان کو زبان عطا کی گئی۔۱۸۷۱ء میں ڈارون کے نظریات نے انسان کو جانوروں کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔برنارڈ شاہ جیسے مفکرین نے ڈارون کے اس نظریہ سے عدم اتفاق کیا۔بقول برنارڈ شاہ ''ڈارون نے اپنے نظریات میں انسانی ذہن کو بالکل جلاوطن کر دیا ہے''۔زبان بذات خود انسانی اظہار کا ذریعہ قرار دی جاتی ہے۔یورپ میں اٹھارویں صدی کے پہلے نصف حصہ تک یہ اختلاف موجود رہا کہ ''زبان خدا کا عطیہ ہے یا ذہن میں پنپنے والے تصورات اور عقائد کے اظہار کا موثٔر ذریعہ ہے''۔یہ اختلاف رحمت کی بجائے سزا کے معنی میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔

کانٹ نے اپنی تصنیف ''Critiques of Pure Reason'' میں مادے اور زمان و مکان کی ماہئیت پر بات کی جسے البرٹ رچرڈسن نے حتمی شکل دی ہے۔اس کے مطابق حسی ہیئتوں کو لسانی ڈھانچے تک

رسائی کا ذریعہ تصور کیا گیا۔ جدید لسانیات میں علامتی اظہار کے خلاف ردعمل سامنے آنے کے باعث اظہار کے رائج طریقوں کو غلط ثابت کیا جا رہا ہے۔ اس طرح زبان کو فلسفہ کی شکل دینے کی عملی کاوش کی جا رہی ہے۔ ماضی میں زبان کو کبھی بھی معنی کے اظہار کا ذریعہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کے برعکس اقتصادیات، سماجیات جیسے مسائل کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس کی وجہ سے زبان کو پیداواری رشتوں کا بالائی ڈھانچہ تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ زبان کے بارے میں گفتگو سے قبل ضروری ہے کہ گفتگو کرنے والے کے نظریات سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اگر بات کرنے والا کانٹ کی طرح ''عینیت پسند'' ہے۔ تو مظہری اور بالذات نظریاتی مباحث کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مادیت پردت ہے تو پھر عینیت غائب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم عینیت اور مابعدالطبیعات کے ساتھ نتائج کی عمل داری کے خلاف ہیں تو زبان کے بارے میں ہمارے نظریات مختلف ہوتے جائیں گے۔ ہر فلسفہ زبان کے پس پردہ مخصوص نظریہ حیات کارفرما ہوتا ہے۔ اگر ہم روایت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اجزا کی بجائے نشانیہ کو استعمال کرنا ہوگا۔ زبان خیالات اور احساس کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ اسے چاہے نشانات کا نظام قرار دیا جائے یا اسماء اور افعال کے نحوی رشتوں کی سائنس قرار دیا جائے، زبان ہر حالت میں انسانی رویہ کی جھلک ہے۔ اس کی ادائیگی کا انداز اور اس میں موجود الجھنیں یا پیچیدگیاں انسانی ذہن کی اختراع ہیں۔ ایک بات مسلمہ ہے کہ زبان ''خیال'' کے ابلاغ کا زریعہ ہے اور حقائق کا آئینہ ہے۔ زبان میں تبدیلی کا بڑا سبب زودحس لغت ہوتی ہے۔ جو پیداواری رشتوں اور ثقافت کے پھیلاؤ کے باعث بدلتی رہتی ہے۔ صرف ونحو میں اس کی تبدیلی شاذ و نادر ہوتی ہے۔ کیونکہ صرف ونحو میں تبدیلی نئی زبان کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔

جدید لسانیات نے سب سے اہم مسئلہ ''معنی اور معنویات'' کو گردانا گیا ہے۔ لسان کا علم اسی مسئلے کے گرد گھومتا ہے۔ جس کی وجہ سے ابلاغ کے حوالے سے سائنسی اقدار اور اور سائنسی نظریات کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا

ہے۔جس کی وجہ سے نفس مضمون کی بجائے زیادہ اہمیت ادائیگی کو حاصل ہوگئی ہے۔

لسانیات میں پس منظر کی اہمیت

لسانیات کے سائنسی مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لسانیات کے بارے میں آگاہی کے حصول سے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ ''زبان'' کس طرح کام کرتی ہے۔سماجی طرزِ زندگی کے عوامل میں ماہرین لسانیات ''پس منظر'' کو گفتگو کی بنیاد اور اس کے اسلوب کا سبب مانتے ہیں۔جس کی اہم مثال ۱۹۶۷ء میں گریگوری کی تصنیف "Tenor of Discourse" میں پس منظر کے معیارات کو لسانی اقسام میں تقسیم کا باعث قرار دیا اس نظریہ کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں پس منظر کو عام زبان کے استعمال کا سبب جانا گیا۔(۱۱)

لسانیات کا سائنسی مطالعہ بہت جامع ہوتا ہے یہ نہ صرف زبان کی بناوٹ سے آگاہ کرتا ہے بلکہ اس کے سماجی اور ثقافتی تعلق کی بھی وضاحت کرتا ہے جس کے باعث زبان میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔اور یہاں تک کہ زبان کی مکمل تبدیلی کا باعث بھی یہی سماجی اور ثقافتی پسِ منظر ہی ہوتا ہے۔

وسیع مطالعے اور مشاہدے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ گفتگو لوگوں کی فطرت پر منحصر ہوتی ہے۔اور یہ گفتگو شناسی پس منظر کے زیر اثر ہوتی ہے۔جبکہ زبانی اقرار انفرادی سرگوشی تک محدود ہوتا ہے۔جبکہ معانی کا تبادلہ لازمی طور پر بولنے والے کے ثقافتی اور سماجی پس منظر پر منحصر ہوتا ہے ان معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لسانیات میں پس منظر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔(۱۲)

زبان اور سیاق وسباق میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے کسی بھی لسانی مطالعے کے ضمن میں معانی تک رسائی کے حصول کے لیے اُن حالات سے آگاہی ضروری ہے۔جن حالات میں زبان کو استعمال کیا گیا ہو۔کیونکہ بولنے والے کے حالات اور اردگرد ماحول الفاظ کے معانی تک رسائی میں مددگار ہوسکتا ہے۔ایسی صورت میں جب مخاطب اور سامع ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے ہوتے اس صورت میں الفاظ کا چناؤ ہی معانی کی فراہمی میں ابہام

یا شفافیت کی وجہ بن سکتا ہے۔ جبکہ اگر بات چیت بالشمافہ ہو تو مخاطب کے چہرے کے تاثرات، حرکات وسکنات تمام عوامل معانی کی وضاحت میں مدد کر رہے ہوتے ہیں جس سے پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ جس قدر پس منظر واضح ہوگا اُسی قدر زبان اپنے معانی اور مفہوم کو واضح کر پائے گی۔ (۱۳)

ماحول لسانیات پر بہت اثر انداز ہوتا ہے جس کے باعث ایک ہی لفظ کے معانی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ بعض اشیاء کے معانی لسانیات کے اندر محدود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایک لفظ کے معانی دو مختلف زبانوں میں الگ الگ ہوتے ہیں۔ (Lunkin ۲۰۰۷)۔ یہ ماحول ہی ہوتا ہے جو لغتی گرامر کی تشکیل کے لیے معنویاتی چناؤ کو متحرک کرتا ہے۔ جب مخاطب گفتگو کرتا ہے تو سامع اُس کی بات سے کیا معانی اخذ کرتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں سامع کی لسانی حیثیت کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ مخاطب کو اپنی گفتگو کا معیار اُس طرح رکھنا ہوگا کہ سامع اُس کی بات کو درست انداز میں ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے۔ اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ معنویات درحقیقت ایک ربط ہے جو پس منظر کا تعلق لسانیات سے جوڑتا ہے۔

درحقیقت ہر بولنے والے کے پیچھے ایک مخصوص پس منظر ہوتا ہے جو اُس کی گفتگو کے معیار کو مقرر کرتا ہے۔ اگر ہم کسی شخص کے بارے میں جانتے ہوں کہ وہ غیبت پسند ہے تو سامع اُس کی بات چیت کو اُس انداز میں سُنے گا۔ اگر کوئی شخص کاذب کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے تو سامع اُس کی گفتگو سے متاثر اُس قدر ہوگا۔ اور اگر غور کریں تو زبان ہر انسان کے خیالات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ یہ ایک نشانات کا نظام ہے جس سے انسانی رویہ کی جھلک سامنے آتی ہے۔ اسی لیے زبان کو اور لسانیاتی نظام کو اسماء اور افعال کے ساتھ نحوی رشتہ کو ارتباط بخشنے کی سائنس کہا جاتا ہے۔ (۱۴)

زبان میں ہونے والی تبدیلی کی وجہ پیداواری رشتوں اور ثقافتی پھیلاؤ ہے۔ جبکہ صرف ونحو کی تبدیلی عموماً کم وبیش ہی ہوتی ہیں اگر ایسی تبدیلی واقع ہو جائے تو وہ نئی زبان کو وجود میں لانے کا باعث بن جاتی ہے۔ کلاسیکی

ماہرین لسانیات زبان کی پیدائش ترقی اور پھیلاؤ کے ضمن میں صرفی ونحوی تبدیلیوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ جبکہ جدید ماہرین معانیات اور معنویات کے فلسفہ کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس طرح اب لسانیات میں سائنسی اور تکنیکی نظریات کارفرما نظر آتے ہیں جن کے باعث نفس مضمون سے زیادہ ادائیگی یا اظہار، پس منظر کے تناظر میں اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ لسانیات اور مخاطب دونوں جب معاشرت کی بات کرتے ہیں اُس کی بنیاد سماجی عوامل پر ہوتی ہے۔ منظّم گفتگو مخاطب کے سماجی مقام کا تعین کرتی ہے۔ (۱۵)

بین الاقوامی لسانیات ہمیشہ طاقت ور بولنے والوں کا گروہ ہوتا ہے یہ بہت بڑے سماجی دائرہ کار میں آتے ہیں۔ لسانی ترقی کا عمل پوری دنیا میں یکساں ہوتا ہے۔ مگر ان کا ریاستی فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کیونکہ کچھ معاشرتوں میں لسانیات کم ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ان ریاستوں میں وسائل کی کمی ہوتی ہے۔ مغرب کا پیشتر فلسفیانہ ادب لسانی تجزیہ کے گرد گھوم رہا ہے۔ جس میں خیال اور فکر سے زیادہ ''ادائیگی'' کی طرز کو اہمیت دی جاتی ہے۔ انسان اپنے الفاظ کی نشاندہی پر عامل ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانی افکار حقیقت کے عکاس ہوتے ہیں اور وہ اُن اشیا و اسماء کی حدود سے ماورا ہوتے ہیں جن کو وہ اظہار میں لاتے ہیں۔ (۱۶) ہر اسم ایک خیال ہوتا ہے۔ اس طرح وہ تمام اسماء جو ممکنہ خیالات کے دائرے میں نہیں آتے۔ ''مجرد'' ہوتے ہیں۔ تصورات خلقی ہوتے ہیں جو لاشعوری حالت میں اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب اُن کی بازیافت کے لیے مخصوص تجربات سے گزارا جائے۔ ''لبنز'' مثالی زبان کے حق میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایسی زبان جس میں ہر خیال کو سیاق وسباق کے تناظر میں مخصوص علامات کے ذریعے بیان کیا جاسکے اور باہم امتزاج کے لیے متعین ضوابط وضع کئے جاسکیں۔ مثالی لسانیات قرار دیا جاسکتا ہے۔''

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لسانیاتی عمل میں الفاظ کی خاصی مقدار سیاق وسباق کے حوالے سے استعمال ہوتی ہے یہ مواد مختلف طریقوں سے استعمال ہوتا ہے جن سے ایک سوال جنم لیتا ہے کہ ''کیا معانی کے اندر

مخصوص پن موجود ہوتا ہے جو الفاظ اور معانی کے تعلق کو مختلف حوالوں سے قائم رکھ سکے؟'' اس سوال کا جواب اُس وقت دیا جاسکتا ہے جب لسانیات کا مطالعہ درجہ بندی کے بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر کیا جائے۔

لسانیاتی نظام کا انحصار

لسانیاتی نظام کا انحصار اور اُن کے اخذ کردہ معانی پر ہوتا ہے۔ لہٰذا الفاظ کو سننے والے کی سمجھ کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے۔ ستر کی دہائی میں لسانیات پر کیے جانے والے کام میں ''لغتی گرامر'' پر توجہ دی گئی۔ ایچ۔ اے۔ کے ہالیڈے معنویاتی اور لغتی گرامر کے نظام کو سیاق و سباق کے تین پہلوؤں کے زیر اثر تشکیل دیتے ہیں۔

۱۔ انسانی لسانیات کا عملی طور پر لاگو ہونا چاہیے۔

۲۔ انسانی زبان کے ارتقاء کی وجہ سے ہونے والی تبدیلیوں کو معنویاتی اور معاشرتی تناظر میں پرکھا جائے

۳۔ عملی طور پر لسانیات میں بنیادی تکرار مکمل طور پر سیاق و سباق کے تناظر میں ہوتی ہے۔

ہالیڈے کے اس نظریہ کی روشنی میں ہم جان پاتے ہیں کہ صوتیاتی عمل میں ہونے والی تبدیلیوں اور معانی کا تعلق مکمل طور پر ماحول اور اُس کے تناظر سے ہوتا ہے۔ الفاظ کے معانی اخذ کرنے کے لیے سیاق و سباق کا جاننا از حد ضروری ہوتا ہے۔ اس نظریہ سے مزید جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ زبانی اقرار سماجی تناظر میں زبان کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ لسانیات کی وہ تصویر جو خالص حالت میں ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ گفتگو کے دوران اس تصویر کو قائم نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ جوڑوں کے درمیان ہونے والی گفتگو پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ (۱۷)

لسانیاتی نظریات میں پس منظر اور زبانی اقرار بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کو شامل کیے بغیر جامع سائنسی لسانیاتی اظہار ناممکن ہے۔ لسانیات میں عملیت کے تصور کے ضمن میں پس منظر کی شمولیت تشویشناک ہے۔

لسانیات میں بڑھوتری کا عمل اُس وقت ممکن ہے جب لسانیات زبان کو معاشرے اور نظام کو ضرورت کے ساتھ جوڑنے کا کام سرانجام دے۔ زبان اور معاشرے کا تعلق درحقیقت سماجی لسانیات کی بنیاد ہے۔ لسانیات کے اطلاق کا انحصار نہ ختم ہونے والے معاشرتی لسانیاتی تعلق پر ہے۔(۱۸) جس طرح ہم اس بات کو ناممکن سمجھتے ہیں کہ خلد کی وضاحت کیسے کی جائے جب تک اس کے تعلق کو زمین کے ساتھ قائم نہ کیا جائے اس طرح لسانیات کا کامیاب اطلاق ناممکن رہے گا جب تک ہم زبان کے سماجی تناظر سے آگاہ نہ ہوں۔

فرتھ اور ہالیڈے لسانیات میں تناظراتی نظام پر کام کے دوران مختلف امثال سے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں جن میں وہ گفتگو میں شریک لوگوں کی لفظی حرکات اور غیر لفظی حرکات پر بحث کرتے ہوئے لفظی حرکت کے اثرات کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے تجربہ سے اس بات کی وضاحت سے قاصر ہیں کہ لفظی اور غیر لفظی حرکات میں تعلق کس طرح قائم ہوا۔ کس کے لیے اور کسی نوعیت کا قائم ہوا۔ بعدازاں ۱۹۶۴ء میں ہالیڈے اس نقطہ کی وضاحت کرتے ہیں کہ گفتگو کی سمت اور موضوع کا پس منظر متن پر نہ صرف نقوش مرتب کرتا ہے بلکہ جو بات پس منظر سے تعلق رکھتی ہے وہ متن سے عیاں ہو جاتی ہے۔ مگر ایک بات پُراسرار رہ جاتی ہے کہ سیاق وسباق کا تعلق کن حالات سے تھا۔(۱۹)

میلان وسھکی نے ۱۹۳۵ء میں زبان کے اظہار کے حوالے سے اس بات کو بیان کرتے ہوئے کہا حقیقت اور کہانی کا سیاق وسباق یکساں نہیں ہوسکتا۔ کہانی کے پس منظر میں تخیلاتی عنصر کارفرما ہوتا ہے جبکہ حقیقت کا پس منظر اس کے برعکس حقائق پر مبنی ولغات کا مجموعہ ہوتا ہے۔(۲۰) ''ہالیڈے'' کا زور اس بات پر ہے کہ پس منظر کا تعلق مکمل طور پر اُس ماحول سے ہوتا ہے جس میں بات چیت کی جا رہی ہے۔ زبان کے متن پر ماحول کے اثرات کا مشاہدہ باآسانی ممکن ہے۔ میلان وہسکی تجویز دیتے ہیں کہ پس منظر گفتگو میں دو پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک مادی حالت کی ترتیب اور دوسرا سیاق وسباق میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر رقیہ حسن (۱۹۷۸ء) مادی حالت

کی ترتیب کو خوابیدہ قوت قرار دیتی ہیں جبکہ اس کے برعکس وہ پس منظر کے اثرات کو زیادہ اہم قرار دیتی ہیں۔ اور پس منظر کو معانی کی فراہمی کا سبب قرار دیتی ہیں۔ (۲۱) مگر سیاق وسباق کی اس قدر اہمیت کئی سوالوں کو جنم دیتی ہے۔

۱۔ کیا سیاق وسباق جس کی متن میں عکاسی موجود ہے۔ ہمیشہ گفتگو کرنے والے کے پیش نظر یکساں ماحول ہی موجود رہتا ہے۔؟

۲۔ کیا گفتگو بذاتِ خود اس بات کی عکاس ہوتی ہے کہ وہ ماحول کی نشاندہی کر سکے۔ اور پس منظر کے بارے میں کوئی واضح دلیل موجود ہے یا محض مفروضاتی عمل سے سیاق وسباق کو تلاش کیا جائے؟

۳۔ اگر دو مختلف پس منظر ایک ساتھ کام کر رہے ہوں تو کیا گفتگو مبہم اور غیر معنی تو نہ ہو جائے گی؟ یہ صورت حال اکثر بچوں کی کہانی میں درپیش آتی ہیں۔

ان سوالات کے جواب پر ڈاکٹر رقیہ حسن اور ہالیڈے نے ۱۹۷۲ء میں وضاحت کی کہ اگر سیاق وسباق کے باعث ''معانی'' خطرہ میں ہوں تو اُن حالات پر اکتفا کرنے کی ضرورت ہے جو مادی حالت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ (۲۲) متن زبان پر ماحولیاتی عناصر کے نشانات بھی موجود ہو سکتے ہیں اور نہیں بھی ہو سکتے لہٰذا پس منظر کے ساتھ ساتھ مادی حالت اور زبان کے خدوخال ہی اُس کے معانی اور مفہوم تک رسائی میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ اگر مادی ترتیب کے عناصر کے نشانات متن میں موجود ہوں تو یہ معنویاتی عناصر سیاق وسباق کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح عناصر کی یہ مادی ترتیب سیاق وسباق کے خاص حصہ پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ جس سے حالات کا مناسب ہونا ضروری ہے۔ اس کی بہترین مثال دو دوستوں کے درمیان گفتگو ہے جس میں سے ایک بات سے دوسری بات نکلتی ہے اور اس بے تکلف گفتگو کا پس منظر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایسی گفتگو کو 'منسلکہ حرکاتی گفتگو' کا نام دیتے ہوئے (کلورون ۱۹۹۹ء) اس کے پس منظر کو مادی حالات سے جوڑتے ہیں اور سیاق وسباق کی درجہ بندی

کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سیاق وسباق میں اتنی صلاحیت موجود ہونی چاہیے کہ وہ مادی حالت کو تبدیل کر سکے جیسا کہ اکثر غیر رسمی گفتگو میں ہوتا ہے۔ (۲۳)

لسانیات کو زبان کے فن کے طور پر جب ہم سماجی خدمات کے لیے لیتے ہیں۔ تو پس منظر کی گرفت کے تین پیمانے ''گفتگو کا موضوع''، ''انداز'' اور ''تازگی'' ہیں جن کی مدد سے گفتگو کے مکمل سیاق وسباق تک ہم رسائی حاصل کر کے معانی اور مفہوم کو درست سمت دے سکتے ہیں۔

ہم زبان استعمال کرتے ہوئے بہت سے عوامل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جیسے کہ خریداری کرتے ہوئے، تدریس کے دوران، کسی بچے کو کہانی سناتے ہوئے، کھیلتے ہوئے، مریض کی تیمار دار کرتے ہوئے ہم ان تمام مثالوں میں گفتگو کے مختلف انداز اپناتے ہیں۔ الفاظ کا چناؤ، آواز کا زیر و بم، لہجے کی نرمی و تلخی مختلف ماحول میں یقیناً مختلف ہوتی ہے۔ ماہرین لسانیات کی دل چسپی کا عنصر اُس وقت نمودار ہوتا ہے۔ جب ان تمام عوامل میں زبان استعمال ہو، جس میں مقصدیت کا پہلو عیاں ہو مثلاً جب ایک ماں بچے کو نہلا رہی ہو تو اس دوران جو باتیں وہ بچے سے کر رہی ہوتی ہے اُس کا مقصد بچے کو بہلانا اور لطف اندوز کرنا ہوتا ہے۔ مگر باطنی طور پر اس قسم کی کئی اور سرگرمیوں کے نتیجہ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماجیت بیدار ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح وہی بچہ معاشرہ کے اندر رہنے کے طور طریقے سمجھ لیتا ہے۔ یہ مقصد درحقیقت پوشیدہ مقصد ہوتا ہے۔ کیونکہ ماں ظاہری طور پر تو اُس کو لطف اندوز کرانا چاہ رہی تھی مگر لاشعوری طور پر بچے کی کرداریت کو پختہ کرنے میں اپنا حصہ ڈال رہی تھی۔ اس طرح دونوں مقاصد ایک ساتھ حاصل ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے ہم گفتگو کے ان عوامل پر تجزیہ کرتے جائیں گے ان عوامل کی عمومیت بڑھتی جاتی ہے۔ اور اونچے درجے کی عمومیت تشکیل پاتی ہے۔ مثلاً خریداری، بحث ومباحث، وغیرہ کو عمومی تشکیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ (۲۴)

برنسٹن نے اس کام کو آگے بڑھانے کو کوشش کی اُن کے مطابق روش کا تعلق سماجی رشتوں سے ہے۔ جو

کردار اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ مثلاً ''ماں اور بچہ'' اور'' گاہک اور دکاندار'' اور''ڈاکٹر اور مریض'' کے درمیان گفتگو مخصوص روش کی عکاسی کرتی ہے۔ برنسٹن نے سماجی عدم مطابقت کو بھی اپنی تحقیق کا حصہ بنایا تا کہ مادی گفتگو کے درمیان درجات اور ضابطہ کے تعلق کو بھی واضح کیا جا سکے اس طرح کوشش کی گئی کہ سماجی عوامل میں ہونے والی گفتگو کے دوران جن لوگوں نے حصہ لیا اُن کا سماج میں ایک دوسرے کے مقابل مقام کا تعین کیا جا سکے جس سے یہ بات ظاہر ہو سکے کہ جب دونوں معاشرہ میں گفتگو کے عمل میں شریک ہوتے ہیں تو ان کا اندازِ گفتگو کیسا ہونا چاہیے۔(۲۵)

گفتگو کے عمل میں ''واسطہ'' اور''رابطہ'' کو ڈاکٹر رقیہ حسن نے خاص اہمیت دی ہے واسطہ کی اہمیت یوں کہ بات کس ذریعہ سے کی گئی۔ واسطہ میں دو چیزوں کو خاص اہمیت دی گئی ایک ''زبان'' اور دوسرا ''بصری'' ذرائع کو جن کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کے عمل میں ''زبان کا کیا کردار'' تھا۔ جیسے بولنے میں، لکھنے میں، دوران مکالمہ زبان کا کیا کردار ہے نیز غیر رسمی گفتگو یا کانفرنس کے دوران میں مضمون پڑھنا، مادی اشیاء کی ترتیب کے لیے ہدایات دینا جیسے عوامل میں زبان کی کیا اہمیت ہے۔ان دونوں گفتگو کی اقسام میں ہم جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ زبان کیا کردار ادا کر رہی ہے۔ پہلی قسم جسے ہم غیر رسمی یا بے تکلف گفتگو کا نام دیتے ہیں۔اس کی تشریح ہر شخص اپنے انداز میں کرتا ہے۔(۲۶) جبکہ اس کے برعکس دوسری قسم کی گفتگو میں معیارات کو ملحوظ خاطر رکھ کر جو گفتگو کا انداز اپنایا جاتا ہے اُس میں باقاعدگی کی موجودگی اُس کے مفہوم کو مبہم ہونے سے بچاتی ہے جس کی وجہ سے سامع تک ایک واضح مفہوم ہی گفتگو کی مقصدیت ہوتا ہے۔

ایک مفروضہ ہے کہ منطقی ہونے کے باعث لسانیات کا ماہر یہ جان لیتا ہے کہ گفتگو کرنے والا کس کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اُن گرامری اصطلاحات اور رموز اوقات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے جس زبان میں مقامی لوگ گفتگو کرتے ہیں اس طرح وہ متن سے یہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ متن کو مفہوم کیا ہے۔

اس کے لیے کچھ باتوں کا جاننا ناگزیر ہوتا ہے۔''کون کر رہا تھا''،''کس سے کر رہا تھا''،''کیوں کر رہا تھا''،''کہاں اور کب کر رہا تھا'' یہ تمام عوامل جان کر ہی گفتگو کے درست معانی اور مفہوم تک رسائی ممکن ہے جس کی وجہ سے ایک تخیلاتی متن وجود میں آتا ہے۔ جو تمام گفتگو کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

سیاق وسباق کے حوالے سے تا حال جو بات کی گئی ہے وہ عام طور پر محسوس کیے جانے والے عوامل کے بارے میں ہے۔ اگر ان عوامل کو گرامر کے اصولوں سے جوڑا جائے تو ماہر لسانیات کا کام کیا کہاں اور کیوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ماہرین لسانیات اس قسم کی زبان کو تسلیم نہیں کرتے خاص طور پر اگر اس قسم کی زبان تعلیمی تناظر میں استعمال ہو تو اضطراب پیدا کرنے کا باعث ہو گی۔ اس ضمن میں ضروری ہے کہ ماہرین لسانیات کے بیانات نظام کے تناظر میں ہونے ضروری ہے۔ مثلاً "SFL" میں لغتی گرامر کے نظام کو لسانیاتی گرامری نظام کے طور پر اپنایا جاتا ہے۔(۲۷)

اگرچہ لغت اور گرامر میں واضح فرق ہے۔ لغت یہ سمجھاتی ہے کہ سننے والا کیسے سنے اور سمجھے اور کہنے والا کس طرح بات کرے۔ لغت گرامر تک رسائی کا ایک اہم قدم ہے۔ اس میں ایک چیز کی وضاحت ممکن نہیں وہ پس منظر کا معیار مقرر کرتا ہے۔ ہالیڈے سیاق وسباق کے حوالے سے کہتے کہ دو مختلف طبقات میں ہونے والی گفتگو میں سیاق وسباق کی خصوصیات مختلف ہوتی ہیں۔ (فرتھ، ۱۹۵۷) میں تجویز پیش کرتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں کہ سیاق وسباق کا حالات سے تعلق نہ ہو (مارٹن، ۱۹۸۵) کا کہنا ہے کہ یہ بات سامنے نہیں آسکی کہ معانی سیاق وسباق سے مختلف ہوتے ہیں۔ (۲۸) معانی گرامر کا حصہ ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کی وضاحت سیاق وسباق کے تناظر میں ممکن ہے۔ اس طرح ایک ایسا نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس میں سیاق وسباق ایک خاص محرک کے طور پر ابھرتا ہے اور گفتگو تشکیل دیتا ہے۔ سیاق وسباق مخصوص حالات میں حوالہ جات کے ذریعے جوڑے جاتے ہیں۔ جن سے ایک مادی ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہ بذاتِ خود معنویاتی ساخت ہے۔(۲۹) تناظراتی لسانیات اس حوالے سے منفرد

اوراہم ہے کیونکہ اس میں معانی کو درجہ بندی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔درحقیقت ایک ایسا نظام متعارف کرایا جاتا ہے جو حقیقی معانی کے متعلقہ سیاق وسباق کے خدوخال کو سامنے لاتا ہے۔اور کوشش کرتا ہے کہ الفاظ سے متعلقہ سیاق وسباق کو بذریعہ معانی ظاہر کرے۔ سیاق وسباق الفاظ اور معانی کے درمیان بطور ساجھے دار متحرک ہوتا ہے۔ڈاکٹر رقیہ حسن نے پس منظر کی وضاحت کے لیے تین معیارات مقرر کر دیئے ہیں جو سیاق وسباق کو وضع کرتے ہیں۔

ا۔مخصوص بیانات جو لغتی گرامر کی حدود سے براہ راست معانی فراہم کرتے ہیں۔

۲۔الفاظ کا چناؤ جو متعلقہ سیاق وسباق کی وضاحت کریں۔

۳۔ایسا نظام جس کے ذریعہ حقیقی معانی سیاق وسباق تک رسائی فراہم کریں۔

حوالہ جات اور حواشی

۱۔ فیروزلدین، مولوی (مرتب)، فیروز الغات، فیروزسنز لاہور، ص ۱۱۵۵۔

۲۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۔

۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۲۔

۴۔ عہد نامہ جدید، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۳۹ء۔

۵۔ کتب مقدس کا احوال، مطبوعہ لدھیانہ، ۱۸۴۳ء۔

۶۔ مدھو چھندس رشی، رگ وید۔

۷۔ مسعود حسین خان، تاریخ زبان اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۔

۸۔ عین الحق فرید کوٹی، زبان کی قدیم تاریخ، ص ۲۳

۹۔ ولیم جونز، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۷۸۶ء۔

۱۰۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات، زبان اور رسم الخط، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء۔

11. Greogry M, Relations and functions in and around language, London,2002,p316.

12. G.leach, Semantics, London,1974,p385.

۱۳۔ کسی بھی جامع بیانیہ کا اطلاق کسی نظام پر اسی صورت ممکن ہے جب ہم اس نظام کو ثقافت اور سمیات کے تناظر میں ہونے والی تبدیلی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں زبان اور ثقافتی نظام کی خصوصیات ایک دوسرے میں ضم ہوتی نظر آتی ہیں۔

۱۴۔ رشتوں کے لیے ہمارے پاس مناسب بیانیہ نہ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رقیہ حسن یہاں بیان کرتی ہیں کہ حوالہ کی مخصوصیت کا تعلق عناصر، مواد اور ان کی موجود حالت کے تناظر سے ہے۔ لیکن مادی حالت کو اپنی صلاحیت کی بدولت کسی حوالہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

۱۵۔ رقیہ حسن، ڈاکٹر، ہالیڈے اور حسن، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۔

16. Uzgalis william, Stanford encyclopedia of philosphy,john locks. Halliday,Categories of the theory of grammer, p241.

۱۸۔ کم ترقی یافتہ زبان کے تصورات لسانیات کے بارے میں غیر محتاط خیالات کے عکاس ہیں۔ زمانہ قدیم میں انگریزی زبان کم ترقی یافتہ زبان تھی۔ مگر یہ بات آج کے دور میں نہیں کی جا سکتی کہ اس زبان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ درحقیقت لسانیات کا نظام ذہن میں اپنی جگہ بنا چکا ہوتا ہے۔

19. Firth, Papers in Linguistics,oxford university press london,1957.

20. Halliday, Collected Work vol.2

۲۱۔ میلان وسہکی سے قبل پس منظر کو ثقافتی تناظر میں نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس کو عموماً ماحولیاتی تناظر میں سمجھا جاتا رہا۔

22. Halliday, MAK. and Hassan, Cohesion in English, London,1976.

۲۳۔ ڈاکٹر رقیہ حسن نے ۱۹۸۰ء میں جن خیالات کو پیش کیا ان کی تائید کلورون نے ۱۹۸۲ء میں کی۔

۲۴۔ قواعد کا یہ جدید نظریہ ''جان سنکلر'' نے پیش کیا۔ دیکھیے (Ravelli, 1995)

۲۵۔ حالت میں تبدیلی ایک مسلسل عمل ہے۔ اس کے لیے ''برنسٹن ۲۰۰۷'' سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔
۲۶۔ ۱۹۶۴ء میں پیش کیے گئے ہالیڈے کے بیانیے کا تقابل بعد کے سیاق وسباق کے حوالے سے لسانیاتی بیانیوں سے کریں۔

۲۷۔ سیاق وسباق کے حوالے سے دو مشہور ماڈل'' مارٹن ۱۹۹۲ء اور فوکولٹ ۱۹۹۹ء'' ہالیڈے کے پیش کردہ ماڈل سے مختلف ہیں۔

۲۸۔ مارٹن کی پیش کردہ اصطلاح Genere کو ڈاکٹر رقیہ حسن نے اہم سمجھتے ہوئے ۱۹۹۹ء میں متن کے مطالعہ میں استعمال کیا۔

۲۹۔ ڈاکٹر رقیہ حسن، ہالیڈے کے گرامر اور سمیات کے نظریہ کو اتنا سادہ نہیں سمجھتیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ مادی حرکات بذات خود دلیل فراہم نہیں کرتیں۔ مزید تحقیق Macquire university میں جاری ہے۔

باب دوم

جدید لسانیات: ایک تعارف

جدیدلسانیات:ایک تعارف

نظام لسانیات جومنتخابات کا وسیع نظام ہے۔اس نظام کا نقطہ آغاز متعلقہ سیاق وسباق ہے جس کو بیان کرنا تناظراتی نظام کا مدعا ہوتا ہے۔ یہ متن میں موجود حروف کو حوالے سے بحث کرتے ہوئے اُس کے پس منظر تک متن کے ذریعہ رسائی حاصل کرتا ہے۔اس نظام میں یہ کوشش کی جاتی ہے جانا جا سکے کہ حروف کے ملنے اور جُدا ہونے پیچھے ایسے کون سے عوامل سرگرم ہیں اور جن کی وجہ سے متوازی گفتگو کا آغاز ممکن ہوسکتا ہے۔ مادی عوامل کی اہمیت ماہرین لسانیات کے لیے ثانوی ہوتی ہے لسانیات کے حقیقی عمل میں گفتگو منبع کی صورت میں ہوتی ہے۔اس ضمن میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اگر لفظی حرکات معاوناتی ہوں تو ان عناصر کا مادی حوالہ ضروری قرار پائے گا۔اس میں بولنے والے کے ماحول، متعلقہ واقعات اور حالات کا حوالہ دینا ہوگا۔اس کے برعکس اگر لفظی عمل مقررہ ہیں یہ مادی عمل کو ظاہر بھی کر سکتے ہیں اور مخفی بھی رکھ سکتے ہیں اگر مادی حالت کو الفاظ ظاہر کر رہے ہوں تو ان کے اثرات زبان کے استعمال میں واضح طور پر نظر آئیں گے۔تاہم ان حالات کی طرف کو واضح اشارہ نہیں ملتا۔تناظراتی عمل میں معاوناتی اور مقرر کردہ حرکات ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتی ہیں۔ یہ صورتحال عمومی گفتگو کے دوران ہمارے سامنے آتی ہے۔مثال کے طور پر ایک کمرہ جماعت میں اُستاد کی گفتگو جاری سرگرمی کو ظاہر کرتی ہے جس کے پس منظر میں وہ مخصوص مضمون ہوگا جس کی تدریس اُستاد کرار ہا ہوگا اُس کی گفتگو اُس پس منظر کو واضح طور پر سامنے لائے گی کیونکہ وہ غیر مبہم نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق کچھ سرگرمیوں میں نظاموں کے تضادات تفریق پیدا کرتے ہیں جیسے کھانا پکانا،

بستر لگانا، خریداری کرنا، وغیرہ یہ تمام سرگرمیاں روزمرہ کی سرگرمیاں کہلاتی ہیں ایسی سرگرمیوں کی بدولت جو زبان فروغ پاتی ہے وہ ثقافت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو معمول کی کاردائی قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی سرگرمیوں میں زبان کی مہارت کی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔(۱) اس قسم کی ذاتی سرگرمیوں میں عموماً زبان کا ڈھیلا پن پایا جاتا ہے۔ ان سرگرمیوں میں زبان پر عمل کے ساتھ اپنی حالت کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ ایک ایسی سرگرمی جس میں بچے کو نہلانا، پھل خریدنا، وغیرہ شامل ہوں اس عمل کے دوران جو زبان استعمال ہوتی وہ یقیناً اُس وقت تبدیل ہو جائے گی جب ہم کار کی خریداری یا گھر کی خریداری کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ مختلف سرگرمیوں کے دوران گفتگو کے معیارات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ سرگرمیاں مختلف ماحول میں اور مختلف مقامات پر ہوتی ہیں۔ اس طرح کمرہ جماعت ہونے والی گفتگو، بازار میں پھل خریداری کے دوران گفتگو، پراپرٹی ڈیلر یا کار کی خریداری کے عمل میں ہونے والی گفتگو سے متعلق ہماری پہلے سے موجود معلومات ہمارے تخیل کو وہاں ہونے والی تمام صورتحال سے آگاہ کر دیتی ہیں کہ کون کون سے تعلقات کو سماجی عوامل میں معاشرتی گروہ کس طرح استعمال کرسکتا ہے۔ (ڈاکٹر رقیہ حسن ۱۹۷۸ء)

ایم۔ اے۔ کے۔ ہالیڈے (۱۹۷۷ء) سیاق وسباق کی ترتیب اور متن کے تجزیہ کو معانی کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ معانی کی شناخت کا انحصار متن کی ساختی ڈھانچہ پر ہوتا ہے۔ ہر متن ایک حقیقی ساخت پر مبنی ہوتا ہے۔(۲) اور اس متن کے مخصوص عوامل مشترکہ ہوتے ہیں۔ ہر متن میں ایسے ضروری عناصر موجود ہوتے ہیں۔ جو پس منظر کے خدوخال کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایسے عناصر مرکزی حیثیت کے حامل نہیں ہوتے۔ یہ عناصر جامد بھی ہو سکتے ہیں۔ اور متحرک بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس حرکت کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔

بہت سے ماہرین لسانیات اس بات سے متفق ہیں کہ دو متون جن کا تعلق ایک ہی جیسے پس منظر سے ہو وہ

مکمل طور پر ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر بولنے والا ایک سٹور سے ناشتے کا سامان خریدتا ہے۔ اور دوسرے سٹور سے وہ سبزی خریدتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ برانڈ کا نام اور پیکٹ کا سائز بتا کر خریداری کرے گا جب کہ سبزی کی خریداری میں وہ وزن کلو میں بتائے گا۔ اس طرح پس منظر کی نظامیاتی بحث معنویاتی درجات کے خدوخال کی تلاش سے شعوری طور پر آگاہ کرتی ہے۔ معانی کے یہ عناصر سیاق وسباق کے ذریعہ تخلیق ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ''مظہر'' خود اپنے آپ کو واضح نہیں کرتا بلکہ اُس کا پس منظر جس نے اُس کو گھیر رکھا ہوتا ہے وہ اُس کی وضاحت کرتا ہے۔

معانی کی اہمیت وضرورت

علامتی نظام کے اظہار کے لیے معانی ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ اقسام معانی، مادی حیثیت میں موجود ہوتی ہیں۔ جبکہ معانی کی حیثیت مادی نہیں رہتی جس کی واضح مثال انسانی عقائد کی صورت میں موجود ہے۔ معانی ایسی قوت ہے جو علامت اور بیان کے درمیان تعلق قائم کرتی ہے۔ ڈاکٹر رقیہ حسن معانی کو بات کرنے کے انداز کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ ''بات کرنے کے مختلف انداز مختلف معانی کو ظاہر کرتے ہیں یہ معانی مکمل طور پر ثقافت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور ایک مربوط اسلوب کو تشکیل دیتے ہیں۔'' یہ دعویٰ کہ ایک مخصوص ثقافت کا مخصوص اسلوب ہوتا ہے نہ تو مکمل درست ہے اور نہ غلط کہا جا سکتا ہے۔ اگر چہ یہ دعویٰ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ معاشرے میں کرداری حوالوں سے انسانی رویوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک مخصوص مذہبی اور معاشرتی ثقافت کا حامل معاشرہ دنیا کے بارے میں الگ نظریات قائم کرتا ہے۔ جو معانی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس بات سے تو تمام مفکرین اتفاق کرتے ہیں کہ یہ دنیا جیسی آج ہے ایسے عطا نہیں کی گئی تھی۔ یقیناً اس کے ایک حصے کو انسان نے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس طرح قدرت کے ساتھ

ساتھ انسان بھی اس کی تخلیق نو میں حصہ دار ہے۔ کائنات میں انسانی تصورات کی وجہ سے بے رحم پن اور پختہ حقائق بھی موجود ہیں۔ اور از سرِ نو ملاپ اور محبت کے تصورات بھی انسان نے ہی اس کائنات کو عطاء کیے ہیں۔ جس کی بنیاد باہمی بقاء کی ضامن ہے ان تمام ضروریات کے مدِنظر انسان نے زندگی گزارنے کے لیے موزوں اسلوب کو تشکیل دیا۔ ایک مخصوص ثقافت میں اس موزونیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد تک رسائی حاصل کی جائے جس کے لیے اُس سماج کو سمجھنا بے حد ضروری ہے خواہ وہ کتنا ہی ثانوی حیثیت کا حامل ہو۔

منطقی لسانی تبدیلیاں

منطقی طور پر اسلوب کی اصطلاح کا تعلق معنویاتی اسلوب پر ہوتا ہے معنویاتی اسلوب الفاظ کے معانی سے روشناس کراتے ہے۔ ایک مخصوص معنویاتی اسلوب جو ایک مخصوص ثقافت میں مستعمل ہوتا ہے منطقی طور پر وہ اُس ثقافت میں مستعمل نشانیاتی اسلوب کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ ثقافتی حدوں کو قائم کرنا ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ثقافت کسی دوسری ثقافت کی ہم جنس نہیں ہوتی۔ اس لیے تصورات کو جمع کر کے کسی ثقافت پر لاگو کر دینا غلط ہو سکتا ہے۔ طور طریقوں اور اظہار کے اعتبار سے ثقافتی حدود متغیر ہوتی ہیں ثقافتی تضاد سے مراد ثقافتوں کے درمیان مکمل انحراف نہیں ہے۔ بلکہ وہ لسانی رشتہ ہے جو اشیاء کو دو ثقافتوں کے درمیان مماثلت اور امتیاز کا اظہار ہے۔ یقیناً معنویاتی اسلوب کا قیاس اس معاملہ میں اہمیت سے خالی نہیں۔ اپنی حدود کے اندر لسانیات معانی کے اظہار کے بے شمار ذرائع کی حامل ہوتی ہے۔ دو مختلف زبانوں کا تقابل کرتے ہوئے جو سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں کہ دونوں زبانوں کے نظام کس طرح سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جو ان نظاموں میں بولنے والوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ امکان موجود رہتا ہے کہ دونوں زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان معنویاتی اسلوب یکساں نہیں بلکہ اپنی اپنی ثقافت اور پس

منظر کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خیالات کے چناؤ پر ثقافت کے اثرات موجود ہوتے ہیں جس طرح دو ثقافتیں اپنے کرداری اور علامتی طرز عمل کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اس طرح ان ثقافتوں میں لسانیات بھی اپنے معنویاتی اسلوب کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں۔

ونگسٹن کے مطابق ایک ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگ دوسری ثقافت کے لوگوں سے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے الفاظ سے واقف نہیں ہوتے بلکہ اس کی وجہ اُن الفاظ کے معانی ہوتے ہیں جو پہچانے نہیں جا سکتے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کائنات کی تشکیل کی ہے جو خود تو بامعانی ہے لیکن اس کے باوجود مقصد تخلیق کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

معنویاتی فاصلے زبانوں میں معانی کی تشکیل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کونسی شے ہے جو دو زبانوں کے مابین فاصلے کا تعین کرتی ہے؟ اس سوال پر (Whorf) نے کام کیا اور اُس نے معنویاتی تنظیم کے بنیادی مطالعہ پر زور دیا ہے۔ Whorf نے تجویز کیا کہ وہ اصول جو معانی بناتے اور چلاتے ہیں اُن معنوی فاصلوں کی وضاحت کرتے ہیں جو دو زبانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک انگریزی بولنے والے کی بات کریں جو کسی رنگ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہے اس کے مقابل دوسری زبان بولنے والا شخص اس رنگ کے بارے میں مختلف انداز میں اپنی بات کہے گا۔ یقیناً یہ اظہار دو ثقافتوں کے درمیان پائے جانے والا اختلاف کو ظاہر کرے گا اور معنویاتی فاصلے جنم لیں گے۔

Whorf پہلا شخص تھا جس نے ایک ہی شے سے مختلف معانی لیے جانے کی وجوہات پر کام کیا۔ (۳) اس ضمن میں وہ مثال دیتا ہے کہ ''پتھر'' کا پتھریلا پن اور ''بادل'' کا ہلکا پن دونوں حقیقت ہیں اور مادی حیثیت کے حامل ہیں اور انسان ان کی طبعی حالتوں اور خاصیتوں سے واقف ہوتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسی پتھر کو دیوتا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اور Hopi ان بادلوں کے بارے میں ایسا تصور کیوں رکھتے ہیں کہ وہ

روح پھونکنے کا ذریعہ ہیں۔ Whorf کے نزدیک پتھر بیک وقت ایک ایسی بھاری شے جو پاؤں کو زخمی کر سکتی ہے۔ اور دیوتا کی خصوصیات بھی رکھتی ہے جو اپنے ماننے والوں کی خواہشات کو پورا کر سکتا ہے۔ ایک ہی شے کے بارے میں دو واضح مختلف نظریات اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ''پتھر'' کی معانوی حیثیت دو مختلف ثقافتوں میں مختلف لی جاتی ہے۔ Whorf اس ضمن میں اس کو علامتی پن سے جوڑتا ہے کہ علامتیں معانی اور مفہوم کو بدل دیتی ہیں۔ اور اس کے در پردہ ثقافتیں کام کر رہی ہوتی ہیں جو معنویاتی فاصلوں کو جنم دیتی ہیں۔

ڈاکٹر حسن، Whorf کے تجزیہ کو محض امکانی ابتدا سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اُن کے مطابق ''دنیا کا نظریہ'' طبعی بصارت کو جانچنے کا ٹھوس ذریعہ ہے۔ اس کا ثبوت پتھر کا ٹھوس پن ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وزنی شے ہے۔ جبکہ دیوتا کے طور پر اس کی شان وشوکت علامتی ہے۔ خاص قسم کا مکمل اسلوب سماجی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ اُن کے رویوں پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی مطابقت پیدا کرتا ہے۔ جو ایک مخصوص علاقہ پر محیط ہو جاتی ہے۔ اور یہ معنویاتی فاصلے ہی ہوتے ہیں جو اُس ثقافتی فرق کو واضح کرتے ہیں جو دو معاشرتوں کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

منطقی تبدیلی کو سمجھنے کے ضروری ہے کہ گفتگو کے دوران ہونے والی تبدیلی اور پس منظر کو جانا جا سکے کیونکہ یہ سماجی تبدیلی کے عکاس ہوتے ہیں۔ (۴) فیئر لاف ثقافت کے توازن پر زور دیتے ہیں۔ تکرار یا ہم معانی الفاظ سے شناسا کے لیے حیرانی کا باعث نہیں ہوتے جبکہ ایک ایسا شخص جو ان الفاظ سے شناسا نہیں۔ اس کو یہ الفاظ پریشان کر سکتے ہیں اور صورت حال کو پیچیدہ بنا سکتے ہیں۔ پچھلے چند عشروں سے گفتگو کے مباحث میں خاصی شدت آ چکی ہے۔ (ایجن اور سلیڈن، ۱۹۹۷ء) کے مطابق گفتگو کی تمام اقسام میں عمومی گفتگو سب سے زیادہ شناسا ہے۔ اور جو زبان عمومی گفتگو کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ وہ سماجی حالت کی عکاس ہوتی ہے۔ سماجی زبانیات میں تغیر ایک عام اصطلاح ہے۔ تغیر ہم آہنگی سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس طرح ہم آہنگی اور عمومیت کے معانی ہمیں تغیر

کے معانی تک رسائی فراہم کرتے ہیں۔تغیر اصل میں ہم آہنگی کی ہی ایک قسم ہے۔ جو مختلف سماجی گروہوں کے درمیان موجود اختلاف کو ظاہر کرتا ہے جو ایک شے کے بارے میں دو مختلف ثقافتوں میں موجود ہوتا ہے۔

سماجی لسانیات میں اگر تغیر کی الجھن کو شامل کر لیا جائے تو سماجی لسانیات کی مضبوط روایات کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ غالب سماجی گروہ رویے اور اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ ان رویوں میں تبدیلی کے نفوذ کو برداشت نہیں کر پاتے۔ ''ہالیڈے'' کے مطابق لسانی تبدیلیوں کی کئی اقسام ہیں جن میں زبان ایک عمل کے طور پر تبدیل ہوتی ہے۔ایک زبان کو استعمال کرتے ہوئے جب دوسری زبان کے حوالہ جات شامل کر لیے جائیں تو اختلاف جنم لیتے ہیں۔اس طرح ہالیڈے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زبان کو استعمال کرنے والے ہی زبانی تغیر کا باعث بنتے ہیں۔ زبان کو استعمال کرنے والے مختلف لوگ جو ایک ہی معاشرے طبقات اور گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ زبان میں تغیر کا باعث ہوتے ہیں ایسی تبدیلی کو منطقی تبدیلی قرار دیا جاتا ہے۔مختلف محرکات بھی وقت کے ساتھ ساتھ زبان میں تغیر کا باعث بن جاتے ہیں۔

تنقیدی لسانی تبدیلیاں

اس قسم کی لسانی تبدیلیوں میں پس منظر کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ قابل شناخت سیاق وسباق کی عدم موجودگی لسانیاتی عمل کو گمراہ کن بنا سکتی ہے۔ سیاق وسباق کی روشنی میں اقتباس کو سمجھا جا سکتا ہے۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زبان کے نظام کا ثقافت کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔اسی لیے گفتگو زیادہ تر سماجی حالات پر انحصار کرتی ہے۔ حالات کے پس منظر خود بخود اقتباس کو جنم دیتے چلے جاتے ہیں۔ضروری ہے کہ منظّم تبدیلی کے لیے ردعمل موجود ہو اور یہ ردعمل کسی خاص وجہ سے ہمارے سامنے آسکتا ہے۔ اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان کی ادائیگی براہ راست حالات سے مشروط ہے۔اور الفاظ کے معانی حالات

کے پیش نظر ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ زبان کو سماجی تعلق کی بدولت معاشرے کی علامت سمجھا جاتا ہے جو بات چیت کرنے والوں کے درمیان سماجی تعلق کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ جس کی بدولت معاشرے کے رکن ایک دوسرے کا مدعا سمجھ سکتے ہیں۔ متن کی زبان علامت کے طور پر بولنے اور سننے والوں کے درمیان موجود رہتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سننے والا اور بولنے والا دونوں موجود ہیں یا مخاطب موجود اور سامع غائب ہے۔ گفتگو کا عبور ثقافتی نظریاتی سرگرمیوں پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار یاددہانی پر ہے۔

موضوع، ثقافتی نظام کا حصہ ہونے کے باوجود اس کی لسانی تاویل نہیں ہوتا۔ موضوع کے تین بنیادی اجزاء گفتگو کرنے والے کی گفتگو کے درمیان تبدیلیوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہ تین اجزاء موضوع کا میدان، موضوع کی تازگی، اور موضوع بیان کرنے کا طریقہ کار ہیں۔ ان میں سے ہر جزو اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ فنی طور پر یہ اجزاء حالات کی سمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ بالالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ بیان کا مفہوم بیان کی صلاحیت سے زیادہ حالات کے تناظر میں مضمر ہوتا ہے۔ زبان کے تین سطحی نظام زبان کی خارجی سطح پر بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان مکمل کرنے کے لیے ٹھہراؤ موجود ہو۔ ڈاکٹر حسن زبان کے نظام کو چار درجات پر مشتمل قرار دیتی ہیں۔ (۴) یہ درجات زبان کے نظام کی وضاحت میں اہم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن تمام اُن سماجی عوامل کو بھی زبان کے نظام کا حصہ قرار دیتی ہیں جن میں سے لسانیات کے عمل کو گزرنا پڑتا ہے۔ یہ عوامل متن اخذ کرنے کے عمل سے منسلک نہیں ہوتے اور کوئی بھی سماجی عمل ایسا نہ ہے جس کو واضح نہ کیا جاسکے۔ ڈاکٹر حسن کا یہ دعویٰ منطقی حیثیت کا حامل نہیں ہے یہ درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر ہالیڈے ۱۹۸۸ء کے مطابق ہر قابل فہم متن کے اندر دو صفات، متنی ڈھانچے اور مواد کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً روزمرہ اشیاء کی خریداری کرتے ہوئے جو گفتگو کی جاتی ہے اُس کا انداز عموماً یکساں ہوتا ہے۔ مگر بلاشبہ اُس کا متن جُدا جُدا ہوتا ہے کیونکہ ہر متنی مواد الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ متن کا ڈھانچہ ظاہری محل وقوع پر

انحصار کرتا ہے اور محل وقوع کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی کا عمل بنیادی اور ثانوی عناصر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان عناصر کی نشاندہی مخصوص یا متحرک نظریہ کرتا ہے۔ جو ایک خاص تسلسل اور ترتیب کو مخصوص محل وقوع کی موجودگی میں اظہار کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ قدرتی طور پر اظہار کی یہ خاصیت پہچان کا معیار مقرر کرتی ہے۔(۵)

متن کی بنیاد میں اتصال کا تسلسل موجود ہوتا ہے۔ جو ساختی طرز تسلسل کا اظہار ہوتا ہے۔ تغیراتی تبدیلی کا یہ تجزیہ اس بات کی غماز کرتا ہے کہ ایک مخصوص تبدیلی کے ساتھ ساتھ عمومی تبدیلی کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسے معانی چنے جائیں جو لازمی عناصر کے طور پر تسلیم کیے جا سکیں۔ اور یہ معانی تبدیلی کے ساتھ تعلق بھی رکھتے ہوں۔ کسی بھی تنقیدی تبدیلی میں متن کا تسلسل اُس وقت ممکن ہوگا جب اُس متن کے معانی تسلیم کر لیے جائیں۔ کسی بھی متن میں اچانک تبدیلی آ سکتی ہے۔ جب کہ عناصر کسی بھی متن میں ہونے والی ان اچانک تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس طرح لسانیاتی نظام میں ایک خاص فطری طریق گفتگو کو ممکن بناتے ہیں۔ جس سے متن کی اصل روح واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔(۶)

منطقی یا استدلالی نظام لسانیات کے مطابق ترقی پسندانہ حرکات کے ساتھ ساتھ حالات کی نزاکت کا اظہار بھی شامل ہوتا ہے کم نازک اظہار خیال بنیادی لسانی نظام فراہم کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے پس منظر کے اجزا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مخصوص خیالات کا اظہار ممکن ہو پاتا ہے۔ عام طور پر متنی طریقہ کار کو ساختیاتی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے مخصوص پہلوؤں کا مطالعہ انفرادی گفتگو کی سطح پر جب کیا جاتا ہے اس دوران اظہار بھی متنی اقتباس کی اہمیت وحیثیت رکھتا ہے۔ خریداری کے عمل میں ہونے والی گفتگو کے دوران تمام اشیاء خواہ وہ سبزیاں، پھل، یا گوشت ہوں سب گفتگو کا حصہ ہوتے ہیں۔

پس منظر کو مدِ نظر رکھ کر لسانی نظام میں متن کی ساخت کی تکمیل ممکن ہوتی ہے۔ ساختیاتی متن سیاق وسباق

کے ضمن میں جبکہ گرامر کو ساختی لسانیات کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اس دعویٰ کی خاص بات یہ کہ اس میں اغلاط سے پاک متن بیان کیا جاتا ہے۔ اور اس کی انفرادیت کا تعلق مکمل طور پر سیاق وسباق اور صورت حال کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ سب عوامل جمع ہو کر متن کے ساختیاتی نظام کو متحرک کرتے ہیں۔ (۷)

گفتگو لسانیات کا ایسا اظہار ہے جو اس کی شناخت سماجی تناظر میں کراتا ہے۔ پیچیدہ گفتگو کے مفہوم تک رسائی کے لیے اُن عوامل تک رسائی ضروری ہوتی ہے جو محرک کے طور پر در پردہ موجود ہوتے ہیں اور گفتگو کے دوران لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال کے پیچھے موجود سیاق وسباق تنقیدی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔ اور اس طرح گفتگو میں ذیلی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور بعد ازاں یہ تنقیدی تبدیلی کی بنیاد بن کر ابھرتا ہے۔ تفریحی مشاغل میں گفتگو کے دوران لسانی بنیادی نظام پر بہت کم انحصار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی بے ربط گفتگو ایسا عمل ہے جو کسی قابل شناخت سماجی پس منظر میں ہوتا ہے۔

عام طور پر مکالمہ کرنے والوں کی بات چیت سادہ مسائل کو حل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اکثر بنیادی نوعیت کی معلومات بھی اس میں شامل ہوتی ہیں۔ (ڈاکٹر حسن، ۱۹۷۸ء) کے مطابق اچھے تعلقات کے لیے ضروری ہے کہ درج ذیل عوامل کو مدِ نظر رکھا جائے۔

۱۔ سرگرمی کے ضمن میں مخاطب اور سامع کا کیا تعلق ہے۔

۲۔ دونوں کا معاشرہ میں مقام اور کردار کیا ہے۔

۳۔ دونوں کے درمیان معاشرتی اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔

۴۔ ان کے آپس میں سابقہ تعلقات کی تاریخ کیا ہے۔

(کارلارن، ۱۹۸۲ء) نے بہت سے لوگوں کے وراثتی رشتوں، مقام اور معاشرتی تعلقات کو زبان کے استعمال میں اہم قرار دیا ہے۔ بلاشبہ گفتگو کی خصوصیات گفتگو کرنے والوں کے تعلقات کی وضاحت کرتیں ہیں۔

کلام کرنے والوں کا لہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں کا تعلق کسی ایک سماجی گروہ سے ہے یا کوئی ایک دوسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا سادہ مطلب ہے کہ تنقیدی تبدیلیوں کو تبدیلی کا راستہ عبور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ زبان استعمال کرنے والا خود تبدیلی کو گفتگو کا حصہ بنا رہا ہوتا ہے مطلب یہ کہ منطقی تبدیلی تیز کرنے والا کوئی اور نہیں خود بولنے والا ہوتا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کس طرح کے سماجی گروہ کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ جس کے باعث مخصوص حالات میں بولنے والے مخصوص پہچان کو ظاہر کرتے ہیں۔ گفتگو کی یہ صورتحال پس منظر کے باعث تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بولنے والا اپنے علاقہ کی زبان کو اور حالات کو اچھی طرح سمجھتا ہے مگر وہ سامع کے لہجے اور زبان کے ساتھ اپنی گفتگو اور لہجے کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اس کی بات سے درست مفہوم لیا جا سکے۔ ماہرین لسانیات نے مختلف زبانوں اور اُن کے لہجوں کو اس کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ کہ کب، کہاں اور کیسے ہم معاشرتی اور معاشی حالات کے باعث لسانی تبدیلیوں کو اپنا لیتے ہیں۔

ایک ہی لہجے والے لوگ عموماً ایک ہی مقام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ثقافتی اقدار بھی عموماً مشترک رکھتے ہیں۔ پچھلے چند عشروں میں زبان دان لوگوں کے مختلف گروہوں کو اُن کی ذات جنس، مذہب اور قومیت کے حوالے سے پرکھ چکے ہیں۔ اور یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے یہ گروہ کتنی قوت اور طاقت کے ساتھ لسانیات کو استعمال کر رہے ہیں۔ اگر ہم زبان کی معانی کی صلاحیت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ کے اپنے معانی ہیں جن کو ہم حقیقت کہتے ہیں۔ مختلف الفاظ ایک دوسرے سے مختلف معانی رکھتے ہیں۔ انسانی زبان ایک ہی صورت حال کے لیے مختلف الفاظ کا چناؤ رکھتی ہے۔ اس طرح لفظوں کی ادائیگی کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔

ایم اے کے ہالیڈے کے مطابق تین دہائیاں قبل تک ثقافت کے ذیلی اختلافات کو معانی کی سطح پر کم نہیں

کیا جا سکتا۔ زبان سماج میں ہونے والے بہت سے عوامل کے اظہار کا ذریعہ ہے جسے بولنے والا استعمال کرتا ہے۔ شعوری طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ مخاطب کی حالت میں سماجی حالت کا تعلق کسی نہ کسی حد تک موجود رہتا ہے۔ جو معانی میں تبدیلی کا باعث بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسن، کارلون، ولیم کی تحقیقات ہالیڈے کی اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہیں۔(۸)

ذیلی ثقافت سماجی حالات کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ کسی ثقافت کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک ہی ثقافت کے زیر اثر کئی ذیلی ثقافتیں موجود ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق ثقافت میں ہونے والی سماجی تبدیلی سے ہوتا ہے۔ ذیلی ثقافت میں علم المعانی کے نظام کے قابل شناخت رہنے کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ لوگوں اور معاشرہ کے طبقاتی فرق کی وجہ سے الفاظ اور معانی کے تعلق میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ثقافت کے زیر اثر بولنے والا اپنے نظریاتی انداز اور لہجہ کی بدولت معانی میں اختلاف کا باعث بن جاتا ہے۔ (برنسٹن، ۱۹۹۰ء) کے مطابق سماج کے زیر اثر معانی کی تخلیق کے لیے منطقی تبدیلی کو ایک ہی شے کو بیان کرنے کے مختلف انداز تک محدود نہیں رکھ سکتے اور محض الفاظ کی ادائیگی میں اُتار چڑھاؤ تک بھی اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ منطقی تبدیلی تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ بولنے والے کی نظریاتی حالت، رویے اور سماجی حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔ پس ان تمام عوامل کا تعلق گفتگو کے درمیان معانی کے تعین سے ہوگا۔

قطعیاتی صوتیات کا معانی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ (حسن، ۱۹۹۹ء) الفاظ اور معانی کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف صوتیات کی ایک خاص سطح پر نشاندہی کے نظام کی حیثیت رکھتے ہیں۔(۹) علم صوتیات میں عام طور پر لغتی قواعد کا اظہار موجود ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے لہجے کی ادائیگی میں سماج کا اہم کردار ہے۔ جس میں ایک ہی بات کو کہنے کے مختلف طریقے معانی میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوتے ہیں۔ لہجے کے تناسب سے بولنے والے کی پہچان کے ساتھ ساتھ اُسکے تجربات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز وہ صورتحال

جس میں گفتگو کی جارہی ہے وہ بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔اس طرح الفاظ اور معانی کے تعلق کی بنیاد پر صوتی توازن کی بدولت بے معنی الفاظ بھی صوتیات کے احاطہ میں آجاتے ہیں۔

لہجے کی تبدیلی، زبان کو استعمال کرنے والے کے ذہن میں موجود خیالات کی جانب اشارہ ہے۔ Contralabov کے مطابق نظریات اور لہجہ کا تناسب بہت اہم ہے۔ جو کسی بھی بات کی اہمیت اور غیر اہم ہونے کی دلیل ہوتا ہے۔نظریاتی طور پر لہجے میں ہونے والی تبدیلی منطقی ہوتی ہے۔ جو کسی زبان میں پہلے سے بیان کردہ مظاہر کی وضاحت کرتی ہے۔ سیاق وسباق عملی طور پر متن سے متعلق ہوتا ہے۔اس طرح منطقی تبدیلی کا براہ راست تعلق سیاق وسباق سے ہوتا ہے۔(۱۰)

تنقیدی اور منطقی تبدیلیاں سماجی شناخت کے زیر اثر ہونے والی گفتگو میں ایک ساتھ نمودار ہوتی ہیں۔ بولنے والے کی شعوری کیفیت میں تبدیلی اس کی بڑی وجہ ہے۔جس کی نشاندہی برنسٹن اور بہت سے دوسرے ماہرین لسانیات نے کی ہے۔

معاشرے میں ہونے والی بات چیت معاشرتی حالت کا اظہار ہوتی ہے۔ اور اس گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان سماجی تشخیص بن جاتی ہے۔جس سے عمومی خیالات کے معانی تجربات کی روشنی میں اخذ کیے جاتے ہیں۔اس گفتگو کے در پردہ علم المعانی کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ معانی بولنے والے کے طریقہ گفتار سے عیاں ہوتا ہے۔ گفتگو دو قسم کے معاشرتی گروہوں کی عکاسی کرتی ہے ایک گروہ غالب اور دوسرا مغلوب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی گفتگو میں گفتار حکمانہ ہو تو یقیناً غالب گروہ کیجانب نشاندھی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مخاطب یا سامع گروہ مغلوب ہوتا ہے۔اس کی مثال ماں اور بچے کے درمیان گفتگو ہے جس میں ماں غالب گروہ کی نمائندگی جبکہ بچہ مغلوب گروپ کی نمائندہ ہوتا ہے۔ مائیں حکم دیتی ہیں جبکہ بچے اُن کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ دونوں کے لہجے اور الفاظ اُن کے گروہوں کی واضح عکاسی کرتی ہیں۔اس طرح ان دونوں گروہوں میں واضح لسانی اختلاف موجود ہوتا

ہے۔

دو سماجی گروہوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا اقتباس اور لہجہ میں واضح فرق ہوتا ہے اور یہ فرق معاشرے اور لسانیات کے تاریخی ارتقاء کے باعث ہوتا ہے۔ معاشرہ اور زبان ایک دوسرے کے لیے کام کرتے ہیں۔ پس معاشرتی تبدیلی کی وجہ سے لسانی تبدیلی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس طرح معاشرتی تنظیم کی جڑیں بھی غالب لسانی گروہ سے منسلک ہوتی ہیں یہ دعویٰ ایک ثقافتی ریاست کی خاص حدود پر دلالت کرتا ہے۔ لسانیات کا وہ نمونہ جو زبان کو بامعانی بناتا ہے۔ وہ معاشرہ اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں پر انحصار کرتا ہے۔ گفتگو سماجی تبدیلی میں جو کردار ادا کرتی ہے اُس سے تنقیدی تبدیلیاں پرورش پاتی ہیں۔ منطقی تبدیلیوں کے عمل میں علم المعانیاتی سمتیں ایسی فہم فراہم کرتی ہیں جو طاقت کی تقسیم کے عدم توازن اور سماجی گروہوں کے درمیان حاکمیت کے اصولوں جیسے حساس موضوعات کو ابھارتی ہیں۔ معانی الفاظ کی وہ صورت ہے جو حالات کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے زبان اور تقریر کے مابین سماجی ساخت موجود رہتی ہے۔(۱۱) جس کا وساطتی عنصر انسان کا دماغ ہوتا ہے۔ جس میں اُن نظریات کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔ جو مزاج کی تشکیل کرتے ہیں۔ سماجی تنظیم ان تمام تبدیلیوں کو پیدا کرنے کے لیے محرک کے طور پر کام کرتی ہے۔ جس کے باعث شعوری حالتیں تشکیل پاتی ہیں۔

مفروضہ ہے کہ جب بھی لسانیاتی حوالہ جات کی بات کی جاتی ہے تو منظّم اصولوں اور قواعد پر سختی سے عملدرآمد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم نظام کی بات کرتے ہیں تو ایسی صورت میں انفرادیت کو کم اہمیت دے رہے ہوتے ہیں اگر ہم نظام کی تشکیل پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غالبیت کا عمل وقوع پذیر ہونے کی کیا وجوہات ہیں۔ یقیناً یہ سماجی تبدیلیوں اور اُن کی وجوہات جاننے میں مددگار ہوگا۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظام نہ تو بذاتِ خود ساکن ہے۔ اور نہ اس کی ساخت ساکن ہے بلکہ ساکن ہمارے وہ نظریات اور تصورات ہیں جن کی مدد سے ہم دیکھتے ہیں۔ اور اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

لسانیات کی شاخیں

آوازوں سے بنائے ہوئے نمونے زبان کو سمجھنے کے عمل میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ انسان روزمرہ کے دوران ایسی سینکڑوں آوازیں سنتا اور اُن کے درمیان افتراق کو محسوس کر سکتا ہے۔ ہر زبان آواز کے ان نمونوں میں سے صرف چند کو اپنے لیے منتخب کر لیتی ہے پھر ان سے الفاظ ترتیب پاتے ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ ساتھ بولنے والا اپنی جسمانی حرکات کی مدد سے بھی آواز کے اتار چڑھاؤ کی مدد سے بھی اپنے مدعا کا اظہار کرتا ہے۔ ہر زبان آوازوں کے وسیلے سے وجود میں آتی ہے۔ منفرد آوازیں جن کو اصوات کہتے ہیں۔ لسانیاتی اصولوں سے ترتیب پائے ہوئے الفاظوں کے سانچوں میں ڈھل کر مرکبات اور جملوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ہر انسان اپنی مادری زبان کے ان عناصر کو لاشعوری طور پر سیکھ لیتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنی زبان سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن اجنبی شخص کو یہ سب شعوری طور پر سیکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اُس کے لیے ابلاغ کے مسائل پیدا ہوں گے۔ بعض اوقات یہ مسائل سنگین غلط فہمیوں میں بدل جاتے ہیں۔ لسانیات میں اس قسم کے حالات کا مختلف سطحوں پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جب ہم زبان کا خالص لسانی نقطہ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ایسے عمل کو خالص لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔

خالص لسانیات کو یک زمانی لسانیات بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی مخصوص زمانے کی لسانی سطحوں کا مطالعہ خالص لسانیات قرار پاتا ہے۔ اگر زبان کا عصری مطالعہ حال کے نقطہ نظر سے کیا جائے ایسی صورت میں زبان کی ساخت کا ہی تجزیہ ممکن ہوتا ہے اس لسانیات کو توضیحی لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم لفظ توضیح کے معانی پر غور کریں تو لسانیات کی اس شاخ توضیحی کی بجائے ساختی یا تجزیاتی کہا جائے تو زیادہ بہتر اصطلاح ہو سکتی ہے۔

اُردو کا صوتیاتی نظام

اُردو زبانوں کے قدیم خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ برصغیر میں اس زبان کا ماحول آریاؤں کی آمد کے ساتھ تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل ہوا۔ اس زبان کا صوتی مطالعہ آج سے تین ہزار سال قبل شروع ہوا۔ ٹیکسلا کی معانی کے ماہر لسانیات پانِنی سے کون واقف نہیں۔ پانِنی سے قبل بھی صوتیات کا علمی تجزیہ کرنے والے چھبیس لوگوں کا تذکرہ موجود ہے جن کو پانِنی کے پیش رو سمجھا جاتا ہے۔ پانِنی کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے اُن تمام پیشرووَں کے منتشر خیالات کو یکجا کیا۔ اور اُن کی صوتی اور لسانی تبدیلیوں کا جائزہ لیا۔ جدید لسانیات کی توضیح اور تشریح کے لیے جن بنیادی اصولوں کو استعمال کیا جاتا ہے وہ پانِنی کے مرہون منت ہیں۔ برصغیر میں لسانی بالخصوص صوتی مطالعے کی تاریخ میں انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت اُردو کے لسانی مطالعے کی اہم کتاب ہے اس سے اُردو کے جدید لسانی مطالعہ کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ، موسیو گارساں دتاسی کا نام اُن مستشرقین کی فہرست میں بلند درجہ رکھتا ہے۔ جنہوں نے اردو، ہندی کے لسانی مطالعہ خصوصاً صوتی مطالعہ پر توجہ دی۔ (۱۲)

علم الاصوات

صوتیاتی مطالعے کا موضوع انسان کا باہمی کلام ہے۔ جانداروں کے آلاتِ صوت سے جنم لینے والے مختلف آوازیں بہت سے مشترک خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ صوتیات کا ایک پہلو جسے طبقات کی ایک شاخ صدائیت کا موضوع قرار دیا گیا ہے۔ جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ جب کوئی آواز ہوا کے واسطہ سے متکلم سے سامع تک پہنچتی ہے تو ہوا میں جو چیز حرکت کرتی ہے۔ اُس حرکت کے نتیجہ میں جو شور پیدا ہوتا ہے۔ وہ سامع کے

کانوں سے ٹکراتا ہے۔ ہوا کے ذرات اپنی جگہ پر موجود رہتے ہیں اُن کی معمولی سی حرکت ہوتی ہے جو آگے اور پیچھے کی جانب ہوتی ہے۔ پردہ سماعت سے ہوا کے ذرات نہیں ٹکراتے بلکہ وہ شور جو متکلم کی آواز سے پیدا ہوتا ہے وہ ان ذروں کو محض حرکت دیتا ہے اور ہوا کو واسطے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ہوا میں موجود ذرات عام حالت میں ایک دوسرے سے فاصلے پر موجود ہوتے ہیں جب کہ تھرتھراہٹ ان ذرات کو ایک سمت میں دھکیلتی ہے تو یہ ذرات آپس میں مل جاتے ہیں۔ جس کے باعث ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس عمل کو Condensation کہا جاتا ہے۔ (۱۳) جب تھرتھراہٹ ختم ہو جاتی ہے تو یہ ذرات واپس اپنی جگہ پر چلے جاتے ہیں۔ اور پھر سے خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہوا میں صوتی لہریں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتی ہیں۔ اور سامع کے کان کے پردوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حالت صفر سے اس پورے چکر کو Cycle کہتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ آواز کی رفتار لہروں کی صورت میں گیارہ سو فٹ فی ثانیہ ہے آہستہ آہستہ آواز کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ بہترین مناسب حالات میں انسانی کان بیس ہزار ادوار فی ثانیہ تک آواز کی موجودگی کو پہچان سکتا ہے۔ اسے آواز کی بلندی کہا جا سکتا ہے۔ جو صوتی لہروں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہوائی دباؤ کے لیے ایک پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے جسے Dyne کہتے ہیں۔ اُس قوت کو شمار کرتا ہے جو ایک دیئے ہوئے رقبے پر عمل کرتی ہے۔ مناسب حالات میں انسانی کان جو ہلکی سے ہلکی آواز سن سکتا ہے اُس کا ارتفاع $1/cm^2$ ہوتا ہے۔ صوتی لہر کی قوت کا تناسب جاننے کے لیے Decible کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے ہلکی سے ہلکی آواز کی پیمائش ممکن ہے۔ انسانی سماعت کی حدود پانچ ڈیسی بل سے ایک سو چالیس ڈیسی بل تک ہے۔ مطلب یہ کہ پانچ سے کم اور ایک سو چالیس ڈیسی مل سے زائد قوت کی حامل آواز انسانی سماعت کے دائرہ میں نہیں آتی۔ اگر انسان پانچ ڈیسی مل سے کم قوت کی آوازیں سننے کے قابل ہو جائے تو شاید ہوا کا معمولی تموج بھی اُس کو سنائی دیتا۔ اور اگر آواز کی قوت ایک سو چالیس ڈیسی بل سے زیادہ ہو تو بھی انسانی کان اتنی طاقتور آواز کی تاب نہیں لاسکتا۔ پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قدرت نے انسانی قوت

سماعت کی حدود کو متعین کر دیا ہے۔ جن میں کم تر اور شدت دونوں حدود شامل ہیں۔

ان حدود کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا خاکہ وجود میں آ سکتا ہے جو کم سے کم قوت اور انتہائی طاقتور آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لسانی تجزیہ کے لیے دو عوامل قابلِ توجہ ہیں۔ ایک کو Segmentation اور دوسرا Classification کہلاتا ہے۔ Segmentation جسے عمل تقطیع بھی کہا جاتا ہے سے مراد گفتگو کے اجزاء کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ جبکہ دوسرا عامل Classification میں ان ٹکڑوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ اُردو کے حوالے سے اگر ہم پہلے عامل یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے حوالے سے بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف الفاظ ٹکڑوں کی صورت میں باہم یکجا ہو کر بامعانی کلمہ تشکیل دیتے ہیں۔ ہر کلمہ ایک سے زیادہ مکمل مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔ اگر کلمہ مرکب حالت میں ہو تو معانوی سطح پر اس کی مزید تقسیم ممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک کلمہ ''بچی'' اور دوسرا کلمہ ''بچہ'' ہے۔ ان دونوں کلمات میں تین عناصر ایسے ہیں جو مشترک ہیں اور ایک عنصر ایسا ہے جو مختلف ہے۔ تذکیر و تانیث کے حوالے سے دونوں کلمات ایک دوسرے کی ضد یعنی ایک مذکر اور دوسرا مونث ہے۔ اقل تر معنوی عنصر جسے انگریزی میں Morpheme اور اُردو میں معانیہ کہتے ہیں۔ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مکمل اور دوسرے ملحقہ۔ مکمل کلمہ معنیہ کی بجائے خود مستقل حیثیت رکھنے کی وجہ سے کسی دوسرے معنیہ کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ اپنی تکمیل اور معنویت خود فراہم کرتا ہے۔ مثلاً احمد، قلم، کتاب وغیرہ۔ اس کے تضاد میں آئی، آئے، آئیں کو دیکھیں ان میں ''آ'' مشترک جبکہ ئی، ئے، ئیں، مختلف عناصر کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں پہلے لفظ میں ہمیں واحد مونث، دوسرے میں جمع مذکر اور تیسرے میں جمع مونث معنیے موجود ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا کہ ایک مکمل کلمہ اپنی معانی کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا جب کہ مرکبات کی صورت میں موجود کلمات اپنی توضیح کے لیے دوسرے عوامل پر انحصار کرتے ہیں۔ اقل ترین معنوی ٹکڑوں کا مزید تجزیہ معنوی سطح پر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہر قطع یا ٹکڑا اپنے طور پر چند آوازوں کا مرکب ہوتا ہے۔ اگر ہم ''قلم'' کی مثال لیتے ہیں اُردو میں

''ق''، ''ل'' اور ''م'' کے کوئی معانی نہیں ہیں۔ البتہ ان میں صوتی عناصر موجود ہیں۔ لفظ کی طرح حرف بھی صرف تحریر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کا کلامی پہلو صوت ہے۔ اس میں جو فرق کلمہ اور لفظ میں ہے وہی فرق صرف اور صوت میں ہے۔ (۱۴)

صوتیے دو قسم کے ہوتے ہیں کسی زبان میں کسی صوتیہ کا تعین تضاد یا تقابل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ تضاد یا تقابل کی عدم موجودگی صوتیہ کے وجود کو مشکوک کر دیتی ہے۔ بعض آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک زبان میں تو صوتیہ کی حیثیت رکھتی ہیں مگر دوسری زبان میں ان کی یہ حیثیت نہیں ہوتی۔ اگر ہم اُردو کے دو الفاظ پر غور کریں اور ان کا تقابل کریں جیسے کہ ''پل'' اور ''پھل'' ان میں جو اہم ترین فرق موجود ہے وہ ''پ'' اور ''پھ'' کا ہے لہٰذا اُردو میں پ، اور پھ، کے لیے الگ صوت موجود ہیں۔ اس کے مقابل انگریزی Paul اور Lop میں جو P کی آوازیں ہیں ان میں یکسانیت موجود نہیں ہے۔ مزید یہ کہ انگریزی کی زبان میں P کی آواز میں فرق یا تضاد بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے ان کو الگ صوتیہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کو ہم صوتیہ یا Allophone کہتے ہیں جس میں فرق ہم محل وقوع کی بنیاد پر ہی کر سکتے ہیں۔ اس طرح صوتی فرق مختلف زبانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کا عنصر ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اُردو بولنے والا شخص اپنی آوازوں کی غیر محدود اور تعداد میں سے چند صوتیوں کو استعمال کرتا ہے۔ یہی صوتیے اُردو کے صوتی عناصر کہلاتے ہیں۔ تضاد یا تقابل کے ذریعہ سے متقابل جوڑوں کو تلاش کر کے تحریری صورت میں لایا جاتا ہے۔ جو اقلی جوڑے کہلاتے ہیں۔ مثلاً ایک فہرست ہم دیکھتے ہیں جس میں یہ جوڑے موجود ہیں اور پھر ان پر تجزیہ کے ذریعے ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مختلف اجسام سے پیدا ہونے والی آوازوں میں مختلف خصوصیات کی بدولت فرق کیا جا سکتا ہے۔ آواز کی وہ خاصیت جس کی وجہ سے ہم بلند اور مدہم آواز میں فرق کر سکتے ہیں مثلاً جب ہم کسی درست سے بات کرتے ہیں

تو ہماری آواز مدہم ہوتی ہے اوراس کے برعکس اگر ہم کسی اجتماع سے خطاب کررہے ہوں تو ہم بلند آواز میں بات کرتے ہیں۔ آواز کی شدت کے انحصار بہت سے عوامل پر ہوتا ہے۔ مثلاً ہم ستار کی ڈوری کو جتنی شدت کے ساتھ کھینچیں گے اتنا بلند آواز پیدا ہوگی۔ اس طرح اگر کسی ڈرم کو زور زور سے بجایا جائے تو اُس کی شدت میں اضافہ کی وجہ سے بلند آواز پیدا ہوگی۔ آواز کی شدت کا انحصار جسم کی تھرتھراہٹ پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بڑے ڈھول سے پیدا ہونے والی آواز چھوٹے ڈھول سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس کی تھرتھراہٹ بڑے ڈھول کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے۔ لہٰذا جسم کی تھرتھراہٹ کا رقبہ جتنا زیادہ ہوگا۔ آواز کی بلندی اتنی بڑھ جائے گی۔

آواز کی شدت سننے والے کے فاصلے پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ اس طرح آواز کی شدت کا تعلق سننے والے کے کان سے بھی ہوتا ہے۔ ایک اچھی سماعت رکھنے والے شخص کو جو آواز اونچی سنائی دیتی ہے وہی آواز کسی خراب سماعت رکھنے والے شخص کو مدہم سنائی دیتی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ کتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے آواز سیٹی جس کی شدت 20,000HZ سے، 25,000HZ تک ہوتی ہے استعمال کرتے ہیں۔ یہ سیٹی انسان کے لیے بے آواز ہوتی ہے۔ مگر کتوں کے لیے نہیں کیونکہ کتوں کی قابل سماعت فریکونسی انسان کے مقابل بہت زیادہ ہوتی ہے۔

آواز کی وہ خصوصیت جس کی وجہ سے ایک ہی بلندی اور پیچ کی دو آوازوں میں فرق محسوس کرسکیں اُس کو کوالٹی کہتے ہیں۔ مثلاً کمرے کے باہر سے ہم کمرے میں بجنے والے پیانو اور بانسری کی آواز میں فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق کی وجہ کوالٹی ہے۔ ان دونوں کی آوازوں کی شدت اور پیچ ایک جیسی ہونے کے باوجود ان کی آواز کے درمیان فرق کیا جا سکتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق انسان کان $10^{-2}wm^{-2}$ کی شدت سے لے کر $1.0Wm^{-2}$ تک کی آوازیں سُن سکتا ہے جبکہ $1.0Wm^{-2}$ شدت کی آواز کان کے لیے تکلیف دہ ہوسکتی ہے۔ الیگزینڈر گراہم بل کے نام سے منسوب سب سے مدہم آواز جو قابل سماعت ہوتی ہے۔ زیرو بل

کہلاتی ہے۔ تجربات سے ثابت ہوا کہ آواز کی شدت کا انحصار محض آواز پر ہی نہیں بلکہ انسانی کان کی صحت پر بھی اس کا انحصار ہوتا ہے۔

جب ہم کسی اونچی عمارت یا پہاڑ پر تالی بجاتے ہیں یا اونچی آواز میں کسی دوست کو پکارتے ہیں تو تھوڑی دیر بعد ہی وہی آوازیں ہم کو دوبارہ سنائی دیتی ہے۔ اسے گونج کہتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں آواز کا احساس 0.1 سیکنڈ تک رہتا ہے۔ اس لیے گونج کی صاف آواز سننے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری آواز اور گونج کی آواز میں 0.1 سیکنڈ کا وقفہ ہو۔ گونج پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رکاوٹ کا آواز کے منبع سے فاصلہ 1700 میٹر ہو۔ آواز کی لہریں صرف اُس واسطہ سے گزر سکتی ہیں جس کے ذرات تھرتھراہٹ کر سکتے ہوں۔ آواز خلاء میں سے نہیں گزر سکتی تاہم آواز کا انحصار واسطے کی نوعیت پر ہوتا ہے عام طور پر ثابت ہوا ہے کہ مائع میں آواز کی رفتار گیس میں آواز کی رفتار سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ جبکہ ٹھوس اجسام میں آواز کی رفتار گیس کی رفتار سے پندرہ گنا زیادہ ہے ہوا میں آواز کی رفتار کا انحصار مختلف ماحولیاتی عوامل مثلاً درجہ حرارت، دباؤ اور ہوا میں نمی کے تناسب پر ہوتا ہے۔ ہوا میں آواز کی رفتار $21^{\cdot}C$ پر $343m3^{-1}w$ ہوتی ہے۔

آوازیں ہمارے کانوں کو بھلی بھی اور بُری بھی لگتی ہیں مثلاً موسیقی کی آوازیں جن میں بانسری، ہارمونیم وغیرہ کی آوازیں شامل ہیں۔ یہ آوازیں کانوں کو بھلی لگتی ہیں ایسی آوازوں کو موسیقاتی آوازیں کہا جاتا ہے۔ جبکہ کچھ آوازیں ہمارے کانوں پر اچھا اثر نہیں چھوڑتیں اور کانوں کو ناخوشگوار محسوس ہوتی ہیں ایسی آوازیں شور کہلاتی ہیں۔ شور کی وجہ کچھ آوازوں کی اچانک اور نامناسب تھرتھراہٹ ہے۔ شور ایک ناخوشگوار آواز ہونے کی وجہ سے انسان اور دوسرے جانداروں کی صحت کے لیے مضر ہے۔ بلند ہارن، بڑی مشینوں کا شور، وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ شور چونکہ ناخوشگوار حالات کا باعث بن جاتا ہے جس کی وجہ سے سماعت کا متاثر ہونا، نیند کا نہ آنا، غصہ، فشار خون وغیرہ شور کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ شور بنیادی طور پر دو عوامل پر مشتمل ہوتا ہے ایک شور کا حجم دوسرا شور سے متاثر ہونے کا

دورانیہ ہے۔شور کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی کو قابل سماعت حد میں لایا جا سکتا ہے۔جس کے لیے ساز گار مشینری اور ساؤنڈ بیئریرز کا استعمال معاون ثابت ہوتا ہے۔

ناخوشگوار آوازوں کو نرم کرنے والی ترکیب کو صوتی نگہبانی کہتے ہیں۔(۱۵) ٹھوس یا ہموار سطح پر آواز لچکدار یا ناہموار سطح کے مقابل اونچی ہوتی ہے۔ لچکدار اشیاء جیسے کہ قالین آواز کی قوت کو جذب کر کے اس کی گونج کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خالی کمرہ میں آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔جبکہ ساز وسامان والے کمرے میں آواز کی گونج کو محسوس نہیں کر سکتے۔بعض اوقات جب آواز کمرے کی دیواروں چھت اور فرش کی سطح سے ٹکرا کر لوٹتی ہے تو اس میں بہت زیادہ بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔اس آواز کو جو پیدا ہوتی ہے بازگشت کہتے ہیں۔عام طور پر لیکچر ہال، کانفرنس ہال اور تھیٹر کی چھتوں کو خمیدہ کر کے بنایا جاتا ہے۔جس میں آواز ٹکرانے کے بعد ہال کے تمام کونوں تک پہنچ جاتی ہے اور ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

الٹرا آوازوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے کئی شعبوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔طب کے شعبہ میں مختلف بیماریوں کی تشخیص و تحقیق کے لیے ان آوازوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔یہ 20000HZ سے زیادہ فریکونسی کی حامل آوازیں ہوتی ہیں۔ان کو سمندر کی گہرائی ماپنے کے ساتھ ساتھ سمندر کی تہہ میں موجود اشیاء کے متعلق جاننے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

صوتیات

کسی زبان کی آوازوں کے مخارج کا لسانیاتی مطالعہ جس میں انسانی جسم کے ان حصوں کا مطالعہ بھی شامل ہے جو بولنے کے عمل میں مدد دیتے ہیں۔صوتیات کہلاتا ہے۔صوتیات آوازوں کا ہر سطح پر مطالعہ کرتی ہے۔زبان کی دنیا میں ایک صوت دوسرے صوت سے سو فیصد مطابقت نہیں رکھتی۔ ماہر لسانیات مختلف اصوات کے باہمی ربط کا پتہ چلانے کے لیے کوشاں ہیں۔اس باہمی ربط کو درجہ بندی کے ذریعے بنیادی صوتی اکائیوں میں بند کرے کے

اس طرح پیش کیا جائے کہ زبان کے صوتیاتی نظام کی پوری تصویر فونیم کی کم سے کم تعداد کی صورت میں سامنے آجائے۔

زبان میں آوازیں ایک نظام کے تحت کام کرتی ہیں۔صوتیات مستقل بالذات نہیں ہوتے زبان کے تہہ دار ڈھانچے میں ان کی حیثیت سطحی ہوتی ہے۔زبان کی پیچیدگیوں کا حل محض صوتیات میں نہیں بلکہ اس کے لیے زبان کی دوسری سطحوں یعنی نحو،لفظیات، وغیرہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔زبان کا ہر بولنے والا اپنی زبان کے صوتیاتی نظام کا وجدانی احساس رکھتا ہے۔جس کی بدولت وہ زبان استعمال کرنے پر قادر ہوتا ہے۔صوتیاتی تجربہ کے نتائج جتنے زیادہ سادہ اور مختصر قوانین کی مدد سے سامنے لائے جائیں اُس قدر بہتر ہوتا ہے۔

زبان جملوں سے مل کر بنتی ہے۔جملے لفظوں سے اور لفظ صرفیوں سے بنتے ہیں۔اور صرفیہ آوازوں سے مل کر بنتے ہیں۔وہ آوازیں جو معانی کی تفریق اور امتیاز میں مدد دیتی ہیں فونیم کہلاتی ہیں۔سابقہ دو دہائیوں میں عمل تکلم سے متعلق تحقیق اس بات سے روشناس کرتی ہے کہ زبان کا ایک رمزیاتی ضابطہ ہوتا ہے   جس کی بنیادی اکائیاں اس زبان کے استعمال کرنے والوں کے لسانی شعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔رومن کوب سن ۱۹۶۴ء کے مطابق جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو آواز کی صوتی لہریں ایک غیر منقطع تسلسل سے سامع تک پہنچ کر اس کی سماعت کو متاثر کرتی ہیں۔سماعت کے تاثرات ذہن تک پہنچتے ہیں اور ذہن اس گفتگو کے ادراک میں مدد کرتا ہے۔اس طرح پیغام کا ادراک ہوتا ہے۔جس سے ثابت ہوا کہ صوتی لہروں میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو زبان کے ادراک میں کلیدی اہمیت رکھتی ہیں۔

صوتیاتی مباحث کو پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں تروبتز کولی اور فان وائک نے سائنسی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کی۔مگر باضابطہ صوتیاتی نظریہ میسو چوٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے پروفیسر مورس ہالے اور رائل انسٹی ٹیوٹ سٹاک ہوم کے پروفیسر گنز فائٹ نے ساتھ ملکر ۱۹۵۲ء میں پہلی بار صوتی تجزیہ کی مبادیات منظر عام پر

لائے۔(۱۶) ان کے اس نظریہ کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ صوتی لہر جب سامع تک پہنچتی ہے تو سامع کو دو رُخ انتخاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی اسے دو بالکل متضاد معنوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ زبان کے صوتیاتی نظام میں کسی ایسے انتہائی سادہ رمزیاتی ضابطے کی موجودگی کے باعث فوری ادراک کا عمل ممکن ہو جاتا ہے۔

ماہرین عصبیات بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ زبان کی تفہیم کا راز انتہائی سادہ عمل ہی میں پوشیدہ ہے۔ ''کوب سن'' کے نظریہ میں ایسی کوئی تفریق نہیں جس کے ذریعہ مصمتوں اور مصوتوں کا الگ ڈھانچہ زیر بحث ہو۔ دونوں قسم کی آوازوں کا تجزیہ ایک ہی ڈھانچے کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں نتائج اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ جانچنے کا عمل بھی کارفرما رہتا ہے۔ اور نتائج کی صحت کی تصدیق خود نتائج کی مدد سے ہو جاتی ہے۔

کسی زبان کی آوازوں کا مطالعہ تین طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ ''سمیعاتی'' سماعی، اور تلفظی صوتیات آدمی کے منہ سے آواز نکلنے پر ہوا میں جو لہریں بنتی ہیں۔ اُن کو مختلف طریقوں سے کاغذ پر ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ اس طرح تجزیہ کر کے آوازوں کی خصوصیات کا تعین کیا جاتا ہے۔ سماعی صوتیات میں کان پر آوازوں کے اثرات کو ریکارڈ کر کے اُن کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ تلفظی صوتیات میں اعضاء کی اُن حرکات پر غور کیا جاتا ہے جن سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ماہرین صوتیات نے صوتیات کے مختلف طریقوں کو اپنایا ہے جن اعضاء سے زبان کی مختلف اصوات جنم لیتی ہیں اعضاء تکلم کہلاتی ہیں۔ ان اعضاء کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایسے اعضاء جو حرکت کر سکتے ہیں اور دوسرے اعضاء جو جامد رہتے ہیں۔ سانس لینے سے جو ہوا پھیپھڑوں سے خارج ہوتی ہے تکلم کے اعضاء اس کو آواز میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جسے زبان یا بولی کہتے ہیں۔

پھیپھڑوں سے اوپر کی جانب تانت بکس کی ساخت والے حصے موجود ہوتے ہیں۔ جن کو کنٹھ کہتے ہیں۔ صوتی تانت حرکت کرنے والے دو پردے ہوتے ہیں جو سانس لینے کے عمل میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ ایسی

صوت میں تانت کی حرکت کی وجہ سے آوازیں پیدا ہوتی ہیں جن کو Lyranical کہتے ہیں۔ جب صوت مکمل بند ہو جاتے ہیں تو جو آوازیں نکلتی ہیں اُن کو Glottel یا حلقی بند آوازیں کیا جاتا ہے۔ جب صوت کی تھرتھراہٹ سے آواز پیدا ہوتی ہے اُسے مسموع آوازیں کہتے ہیں اور جب تانت مکمل طور پر کھلتے ہوں تو ایسی آوازیں غیر مسموع آوازیں کہلاتی ہیں۔ دونوں تانت کے درمیان موجود جگہ ''حلق'' کہلاتی ہے۔ سانس لینے کے عمل میں ہوا حلق سے ہوتی ہوئی ناک اور منہ کے راستہ سے باہر نکلتی ہے۔ ایسی آوازیں جو حلق سے نکلتی ہیں حلقومی یا (Pharynceal) کہلاتی ہیں۔ ایسی آوازیں عربی میں موجود ہیں۔ (۱۷) حلق کے اوپر تالو سے جڑا حرکت کرنے والا عضو موجود ہوتا ہے جس ''کوا'' کہتے ہیں۔ اس عضو کی مدد سے جو آوازیں بنتی ہیں اُن کو غشائی آوازیں کہتے ہیں۔ جب نرم تالو نیچے کی طرف آتا ہے تو سانس کی ہوا ناک کے راستے باہر آتی ہے۔ اور جو آواز میں پیدا ہوتی ہیں انفی آوازیں کہلاتی ہیں۔ جب سانس بیک وقت منہ اور ناک کے راستے خارج ہوتا ہے ایسی صورت میں جو آوازیں نکلتی ہیں اَنفیاتی آوازیں کہلاتی ہیں۔ اُردو میں ''م'' اور ''ن'' کی آوازیں انفی آوازوں کی مثالیں ہیں۔ اس طرح ''ں'' کی آواز انفیاتی آواز ہے۔ سانس نکلنے کے دوران ہوا کے راستے میں جو رکاوٹیں آتی ہیں۔ اُن کی مدد سے آواز میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اس حوالے سے زبان کی اوپری سطح کے چار حصے خاص طور سے کیے جاتے ہیں۔ پہلا حصہ غشا (Dorsum) سامنے کا نوک دار حصہ (Apex) کہلاتا ہے۔ اُردو میں ''ٹ، ڈ، ڑ، س، ش'' کی آوازوں کو بنانے کے لیے زبان کو اوپر کی طرف موڑا جاتا ہے۔ ان کو معکوس آوازیں کہتے ہیں۔ ''ل'' ایسا حرف ہے جس کی ادائیگی کے لیے زبان کا مرکزی حصہ منہ کے اوپر والے حصے کی طرف بڑھتا ہے۔ ہوا زبان کے دونوں طرف سے گزرتی ہے ایسی آواز کو پہلوئی آواز کہتے ہیں۔ جب کسی آواز کو ادا کرنے کے لیے زبان کو اوپر کی طرف اٹھایا جاتا ہے اُسے اونچی آواز اور جب زبان نیچی رہے تو آواز بھی نیچی رہتی ہے اس طرح جب الفاظ کے اظہار کے لیے زبان کے سامنے کے حصے کی طرف بڑھے اُسے سامنے کی آواز اور جب زبان کسی لفظ کو ادا کرتے ہوئے

پیچھے کی طرف حرکت کرے اُسے پچھلی آواز کہتے ہیں۔

صوتیاتی مطالعہ کا بنیادی موضوع انسانی باہمی گفتگو ہے۔ جو یقیناً انسان کے آلات صوت سے پیدا ہوتی ہے ان کے طبعی عناصر میں کئی اجزا مشترک پائے جاتے ہیں۔جن کی بدولت با معانی کلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ صوتیات میں ایک پہلو جس کا تعلق طبعی ہے یہ پہلو صدائی صوتیات کا ہے۔ جب کوئی تکلمی آواز ہوا کے ذریعہ متکلم سے سامع تک پہنچتی ہے۔تو ہوا میں جو شے حرکت کرتی ہے وہ سامع کے پردہ سماعت سے ٹکراتی ہے۔ ہوائی ذرات اپنی جگہ پر آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں اور پھر اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہیں۔ اس طرح ہوا میں ذرات کی دو مختلف کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ جب کوئی مہیج جسم ان ذرات کو ایک سمت میں دھکیلتا ہے تو یہ ذرات آپس میں مل جاتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔اس عمل کو تکثیف کہتے ہیں جب کہ تہیج پیچھے کی طرف ہٹتا ہے تو ذرات ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔اور ایک طرح کا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔اس عمل کو عملِ تکسیر کہتے ہیں۔ تکثیف اور تکسیر کا عمل ایک مسلسل زنجیرہ ہے۔اور اس عمل کی بدولت ہوا میں صوتی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔اور سامع کے کان کے پردے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس طرح کی پیدا ہونے والی لہروں کو شکل کے اعتبار سے علامتی لہریں (Sign Waves) کہتے ہیں۔

لسانیات نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا ہے مغرب میں زبان کی تدریس میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ان میں سے زیادہ تر تبدیلیوں کی وجہ سے لسانیات نے زبان کو فسانہ اور فسوں کی دنیا سے نکال کر سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے جس کے مطابق زبان کو آوازوں کا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ زبان بنیادی طور پر بول چال ہے، تحریر زبان کا ثانوی روپ ہے۔ زبان تغیر پذیر ہے اور اس کا اپنا نظام ہوتا ہے۔نوم چوسکی کے مطابق صوت حرف پر مقدم ہے۔ جبکہ اُردو میں عام روایت اس کے برعکس ہے یعنی یہاں حرف کو صوت پر مقدم تصور کیا جاتا ہے۔حرف کا تصور بری طرح ذہنوں پر قائم ہے۔ زبان کی کوئی بھی بحث ہو مشرق میں ''حرف'' سے ہٹ کر کی

ہی نہیں جاتی۔ اُردو میں حرف اور صوت کے رشتے کو درست انداز میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اُردو میں بنیادی مصوتوں کی تعداد دس ہے۔ اوران کے لیے محض تین علامتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ''ا، و، ی''، ''ی'' کے دوروپ ہیں۔ ''ی اور ے'' ان میں واؤ اور یائے دوہری علامتیں ہیں۔ مصوتوں کے علاوہ یہ نیم مصوتوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ''الف'' خالص مصوتوں کے لیے وقف ہے جبکہ وہاں، یہاں، وہ، یہ، وغیرہ۔ نیم مصوتوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اُردو میں تین اعراب خاص ہیں۔ زیر، زبر، پیش۔ جن کا استعمال ابتدائی تدریس کے قاعدوں تک محدود ہے۔ اتنی کم علامتوں کی مدد سے اُردو میں دس بنیادی آوازوں کا کام لیا جاتا ہے۔ زبان کے مطالعہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ آوازوں سے مکمل واقفیت وآ گہی حاصل کی جائے۔ پھر کہیں جا کر معلوم ہوگا کہ ہم موقع محل کے اعتبار سے ''پیر، کوپَیر''، ''تَو کو بھی تُو اور کبھی تو اور مَیل کو مِیل'' پڑھتے ہیں تو کیا یہ سب بلا وجہ پڑھتے ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ اس سب کے در پردہ آوازوں کا مکمل نظام کام کر رہا ہوتا ہے۔ جسے تھوڑی سی جدوجہد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مصوتوں کے حوالے سے اُردو میں آوزیں زیادہ ہیں اور علامتیں کم ہیں۔ لیکن مصمتوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بعض آوزیں ایسی ہیں جن میں دو یا اس سے زائد علامتیں موجود ہیں یہ علامتیں اُردو کے لیے ضروری تو ہیں۔ مگر بعض اوقات حرف کی غلامی اندھادھند قبول کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اُردو میں ذ، ز، ظ، ض'' کی الگ الگ آوازیں ہیں۔ تو ایسا سمجھنے سے مراد دن کو رات کہنے پر اصرار کرنا ہے۔ اسی طرح اگر ''ثواب'' اور ''صواب''، ''یا''، ''تابع'' اور ''طابع'' کو دیکھیں تو معلوم ہوتا کہ ایک کے معانی دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس طرح ''ث''، ''ص''، ''ت''، ''ط'' صوت میں تبدیلی کا باعث نہیں بنتے بلکہ اس سے معانی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اُردو میں یہ الفاظ مستعار لیے گئے ہیں۔ ان کی اصل زبان میں ''ث'' اور ''ص''، ''ت''، ''ط'' کی آوازیں معانی میں فرق پیدا کر دیتی ہیں۔ درحقیقت یہ فرق اُردو زبان میں بھی اصل زبان سے چلا آرہا ہے۔

یہ بات صوت کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد کہنا بے جا ہوگا کہ ''حرف'' کی سطح پر کچھ قبول کرنا اور بات ہے جب کہ صوت کی سطح پر معانی تسلیم کرنا الگ اہمیت کا حامل ہے۔ لسانیات کے پاس نے تو عقیدہ کیا آنکھ ہوتی ہے اور نہ اس میں جذبات کی دھڑکنیں موجود ہوتی ہیں۔ لسانیات چونکہ سائنسی طریق کار کو مدِ نظر رکھتی ہے۔ اور خود بھی سائنس کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کا بنیادی کام حقائق سے بحث کرنا ہے۔ لسانیات اقدار سے نہیں حقائق سے بحث کرتی ہے۔ روایات کی پاسداری اگرچہ اچھی بات ہے مگر روایات کی اندھا دھند تقلید کی گنجائش لسانیات میں ہر گز نہیں۔ کیونکہ معاضی کا شعور اگر پاؤں کی زنجیریں جائے تو علم کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اُردو میں علامتوں کی مدد سے زبان سمجھنے کی اہم مثال ''ہمزہ'' ہے۔ صدیوں سے اُردو میں اٹھئے، چاہئے، لئے، دیئے، وغیرہ جیسے الفاظ مستعمل رہے ہیں جن میں ہمزہ ان الفاظ میں نمایاں موجود رہا ہے۔ ہمزہ آخر کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور صوتیاتی نظام میں وہ کون سی آواز ہے جس کے لیے ہم ہمزہ کو استعمال کرتے ہیں۔ عربی میں ہمزہ کی حیثیت ایک مصمتے کی ہے جب کہ اُردو میں یہ بذاتِ خود مصمتہ نہیں بلکہ دو مصمتوں کو جوڑنے کا کام سر انجام دیتا ہے۔ مثلاً کوئی، کئی، جاؤں، آؤں میں "a" ,"i" کا جوڑ بنتا ہے۔ دوسری جانب کیے، لیے وغیرہ کو دیکھیں تو ان میں بھی اکثر اوقات ہمزہ کے ساتھ نیچے دو ''ی'' کے نقطوں کا اضافہ بھی اردو میں نظر آتا ہے۔ یہ رواج اب غلط العام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ حرف اور صوت کے باہمی رشتہ سے بے توجہی کی مثالیں اُردو میں عام موجود ہیں۔ لسانیات، زبان کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو نئی نظر اور نظریات سے آگاہی بخشتی ہے جس کی وجہ سے رسم و رواج اور روایات کے بت پاش پائیں کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا اب ہم کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ زبان آوازوں کے مجموعہ کا نام ہے جس میں صوت صَرف سے مقدم ہے۔ زبان کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ اور یہ نظام ہر سطح پر کام کرتا ہے۔

زبان کا تجزیہ نوام چومسکی کے تشکیلی نظریے کی مدد سے منطقی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ جس میں بعض ابتدائی

تشکیلی قوانین کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ اصول نہایت سادہ ہیں اوران میں نئے دور کے ساتھ چلنے کی صلاحیت بھی موجود ہیں۔ اس نظریے کے مطابق گرامر کی تشکیل کے تین مدارج بیان کیے گئے ہین۔ پہلا ترکیبی قوانین (P.S Rules) کے لیے دوسرا جس میں تمام تشکیلی قوانین موجود ہوں گے اور تیسرے میں صوتیات اور لفظیات سے متعلق قوانین کو شامل کیا جائے گا۔(۱۸) بلوم فیلڈ تھیوری میں لسانیاتی گرامر کی بحث آواز سے شروع کی جاتی تھی اور جملے پر ختم ہو جاتی جبکہ چومسکی کے ہاں بات بالکل اس کے تضاد میں چلی جاتی ہے۔ یعنی آواز کی بحث جملے سے شروع ہو کر آوازوں پر ختم ہو جاتی ہے۔

نوام چومسکی کے نظریہ تشکیلی گرامر نے ماہرین لسانیات کے لیے نئے باب کا آغاز کر دیا۔ آج کے سائنسی دور میں لسانیاتی تجزیہ صرف ماہرین لسانیات تک محدود نہیں رہا بلکہ سمعیات،طبیعات، ریاضی اور منطق کے ماہرین بھی تشکیلی گرامر کے نظریے میں خاصی دل چسپی لے رہے ہیں۔ اور اس نظریے کی روشنی میں یہ اُمید اُجاگر ہو گئی ہے کہ مستقبل میں اس کی بدولت زبان کے پیچیدہ نظام کو آسانی سے سمجھا جا سکے گا۔ اس کی بدولت نئے سائنسی قوانین کے مدد سے علامتیں آوازوں میں ڈھل جائیں گی اور الفاظ خود بخود آواز کا روپ دھار لیں گے۔ لسانیات میں روز بروز نئے اُفق سامنے آ رہے ہیں۔ لسانیات کی دنیا تجربے کی دنیا ہے۔ اگر اُردو جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتی ہے تو اس کو لسانیات سے استعفادہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ لسانیات کی مدد سے زبان کے مطالعے میں مدد ملتی ہے۔ اور جیسے جیسے وقت گزرے گا لسانیات کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

صَرف

ایسے اصول وضوابط جن کے ذریعہ ایک کلمہ سے دوسرا کلمہ بنانے اور اس میں تبدیلی لانے کا طریقہ معلوم ہو ”صرف“ کہلاتے ہیں۔ علم صرف کا موضوع صیغہ کے اعتبار سے کلمہ ہے۔ صرف کی غرض وغایت یوں ہے کہ

جب ہم صیغوں کو بناتے یا اُن کو تبدیل کرتے ہیں تو ذہن میں کوئی ابہام پیدا نہ ہو۔علم صَرف کو صَرف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صَرف کے لغوی معنی پھیرنا کے ہیں۔ کیوں کہ علم صَرف میں ایک کلمہ کو پھیر کر اُس کی مختلف صورتیں بنانے کے طریقے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس لیے اس علم کو ''صَرف' کہتے ہیں۔صَرف قواعد کا وہ حصہ ہے جس میں جملوں کی بجائے محض الفاظ سے بحث کی جاتی ہے۔ الفاظ کی ساخت، بناوٹ اور معانی کی بحث علم صَرف میں کی جاتی ہے۔کلمہ کی بحث صَرف میں آتی ہے۔(۱۹)

کلمہ وہ اکیلا لفظ جس کے کچھ نہ کچھ معانی ہوں کلمہ کہلاتا ہے۔ مثلاً گھر، مسجد، کیا، گیا وغیرہ۔ اسم وہ کلمہ ہے جو کسی شخص چیز یا جگہ کا نام کو ظاہر کرے۔ اسی طرح فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کے کرنے یا ہونے یا سہنا موجود ہو۔حرف وہ کلمہ ہے جو اکیلے تو معانی نہیں دیتا مگر افعال اور اسماء کے ساتھ مل کر پورے معانی ظاہر کرے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق زندہ زبان کو گرامر کی ضرورت نہیں ہوتی۔(۲۰) اکثر صَرف ونحو اُس وقت لکھی گئی جب کسی غیر قوم کو زبان کی تحقیق یا سیکھنے کی ضرورت ہو۔ کیونکہ اہل زبان اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اُردو میں صَرف کی طرف اول اول یورپ کے لوگ نے توجہ کی۔ اُس کے بعد جب یہاں کے لوگوں نے انگریز کی اُردو میں دل چسپی کو دیکھا تو اُس کی دیکھا دیکھی یا حصول دولت کے لیے کتابیں تحریر کرنا شروع کر دیں۔ پھر جب اُردو کو مدارس میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا گیا تو طلبہ کے لیے کتابیں تحریر کی گئیں۔ چنانچہ صَرف ونحو کے موضوع پر لکھی گئی۔ آج تک کی کتابوں کی غرض وغایت تقریباً یہی رہی۔ مگر آج چونکہ اُردو زبان ملک کی اہم ترین زبان قرار پا چکی ہے اور ملک کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس زبان کے قواعد مرتب کیے جائیں اور مستند کتابیں لغت کے حوالے سے تحریر کی جائیں تا کہ زبان بگڑنے سے محفوظ رہے۔

ہمارے ہاں قواعد کے متعلق جو کتب تا حال رائج ہیں اُن میں عربی صَرف ونحو کی بات کی گئی ہے۔ جبکہ اُردو زبان کی صَرف ونحو میں عربی زبان کی تتبع کسی طرح درست نہیں کیونکہ اُردو زبان آریائی نسل جبکہ عربی سامی

النسل ہے۔ دونوں زبانون کی خصوصیات بالکل الگ ہیں۔ افعال، ضمائر دونوں زبانوں میں مختلف ہیں جبکہ اسماء عربی سے داخل ہیں۔ اس طرح اُردو کی صرف ونحو سنسکرت زبان کی قواعد سے بھی اتنی ہی دوری پر ہے جتنی عربی زبان کی قواعد سے دور ہے۔ کسی زبان کی قواعد لکھتے ہوئے اُس زبان کی خصوصیات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔(۲۱) حروف کے مجموعے کو ابجد کہتے ہیں۔ چونکہ اُردو زبان سنسکرت، فارسی اور عربی زبان سے مل کر بنی ہے۔ لہٰذا اس میں تمام زبانوں کے حروف موجود ہیں۔ خالص عربی کے حروف ''ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق'' ہندی کے حروف ''ٹ، ڈ، ڑ''، فارسی کے حروف ''پ، چ، ژ، گ''، یہ حرف ہندی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کو ہندی اور فارسی میں مشترک مانا جاتا ہے۔ ''خ'' فارسی جبکہ ''غ'' عربی اور فارسی میں مشترک ہیں۔ ہندی سے ''بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، کھ، گھ'' حروف شامل ہیں۔ یہ مفرد حروف اور آواز کی صورت میں نہیں بلکہ دو حروف کی ملنے سے وجود میں آئے حروف ہیں۔ ان حروف سے کوئی سادہ آواز پیدا نہیں ہوتی۔ کرنل ہالرائیڈ کے دور میں پنجاب میں املا پر توجہ دی گئی اور دوچشمی (ھ) کا استعمال عام ہوا۔

صَرف کو ہندی میں ''گیان وروپ'' کہا گیا ہے۔ اس طرح اُردو میں اس کو تشکیلیہ اور مارفالوجی کی تشکیلیات قرار دیا گیا ہے۔ انگریزی میں اسے مارفیم کہا جاتا ہے۔ نیا نقطہ ایجاد کرنے کی بجائے مارفیم کا استعمال ابلاغیات میں سہولت فراہم کرتا ہے۔ صَرف وہ چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے جس میں موضوع اور ہیئت کے درمیان رشتہ موجود ہو۔ بعض اوقات صَرف کی ذیلی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ بلوم فیلڈ ان کو Alternate کا نام دیتے ہیں۔(۲۲) جس طرح صوت میں کئی ہم صوت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مارفیم میں بھی کئی ایلو مارف ہو سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ بالکل واضح ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات مبہم ہوتے ہیں۔ ان مشکوک اور پیچیدہ صورتوں کی وضاحت ماہر صَرف ''نائڈا'' نے چند اصولوں کی مدد سے کی ہے۔

الفاظ کی ایسی حالت جس میں وہ صوتی اعتبار سے یکساں ہوں۔ جن کا مفہوم ایک جیسا ہو۔ مثلاً بچپن،

لڑکپن، پاگل پن، میں ''پن'' کی صوت تینوں میں یکساں ہے اور بے معنی ہے۔ یعنی یہ لفظ کے معنی بدلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

نائڈا کے دوسرے اصول میں معانوی اعتبار سے ایسے الفاظ جن کے صوت میں فرق ہو اس فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ابوالکلام، محی الدین، ایک مارفیم کے ایلو مارف ہیں۔ صوتیاتی وجوہات ان میں فرق پیدا کررہی ہیں۔ کیونکہ قمری حروف میں حرف سے پہلے ''ال'' آتا ہے جبکہ شمسی حروف تہجی میں ''ل'' شمسی مصمتے میں بدل جاتا ہے۔

اگر الفاظ صوتی اعتبار سے قدرے مماثل اور بیک وقت قدرے مختلف ہوں اُن کے مماثلت اور اختلاف کی صوتی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ مثال کے طور پر کیا، گیا، ان میں سے ماضی مطلق واحد مذکر مارفیم کے لحاظ سے یکساں ہے۔ لیکن صوتی اعتبار سے آخری ''آ'' کے باوجود پہلے کے فونیم میں اختلاف موجود ہے۔ اس طرح ''لڑکا اور لوہا'' کے الفاظ میں ''آ'' اس بات کا عکاس ہے کہ ''کیا، گیا'' کے آخری جز و ماضی مطلق کے جو معانی فراہم کرتا ہے۔ ''لڑکا، لوہا'' میں ''آ'' وہ معانی فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر مماثل ساخت کے حامل الفاظ میں صوتی فرق موجود ہو تو یہ صوتی فرق ''صرفی'' حیثیت کا حامل ہوگا۔ اگر اس طرح کے الفاظ میں افتراق تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ مفہوم کی سطح پر معلوم ہوگا۔ اگر دو الفاظ صورت کے اعتبار سے یکساں ہوں اور اُن کے معانی ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو وہ ''صرف'' ہیں۔ مثلاً ''ہار'' بامعنی شکست اور ''ہار'' بامعانی گلے کا زیور مختلف صَر فی خصوصیات کا حامل لفظ ہے۔ اگر معانی کا خفیف فرق قواعدی صیغوں کی وجہ سے پیدا ہو یا محل وقوع کی وجہ سے یہ دونوں صورتیں ایک مارفیم کے ایلو مارف کہلائیں گے۔ مثلاً ''آب'' یا ''پانی'' معنی کے اعتبار سے ایک ہی حیثیت کے حامل ہیں۔ صرف محل وقوع کی وجہ سے ایک ہی معانی رکھنے والی شے کے الفاظ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بعض اوقات مختلف ہیئیت کے الفاظ کے معانی جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ الفاظ جگہ یا شکل بدلنے سے مختلف صورت

حال اختیار کر لیتے ہیں۔ اوران کی صرفی خصوصیات بھی تبدیلی کو ظاہر کرتی ہیں۔صرفی خصوصیات دوقسم کی ہوتی ہیں۔ایک آزاداوردوسری پابندخصوصیات کہلاتی ہیں۔

اضافائی صَر ف کسی آزادصَر ف کے ساتھ آتے ہیں ان کی تین اقسام سابقے لاحقے اور وسطیہ ہیں۔ سابقے کسی مارفیم کے شروع میں آتے ہیں۔مثلاً ایمان دار، بے کار میں ''ایمان اور بے'' سابقے کی صورت میں موجود ہیں۔جبکہ لاحقے مارفیم کے بعد آتے ہیں۔اوران ہی دوالفاظ میں ''دار''، ''کار''لاحقوں کی نمائندگی کرر ہے ہیں۔جبکہ وسطیہ مارفیم کے درمیان میں آتا ہے۔کچھ زبانوں میں ''صرف''ایسی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ جن کومکمل یا جزوی طور پر دہرایا جاسکتا ہے۔اوراس طرح ایک نیا مارفیم جنم لیتا ہے۔خاص طور پر فلپائن میں بولی جانے ولای زبان ''ٹیگا'' میں تکراری صرف کی کثیر تعداد موجود ہے۔انگریز اوراُردو میں تکراری صرف کے حامل الفاظ موجود نہیں ہیں۔ انگریزی میں کبھی کبھار ایسے الفاظ سے واسطہ پڑ جاتا ے۔مثلاً " Chit, Chat, Criss, Cross" وغیرہ۔

مبدل اورغیر مسلسل صرفے دوالگ حیثیت کے حامل صرفے ہوتے ہیں۔انگریزی کے کئی الفاظ میں یہ موجود ہوتے ہیں۔مگراُردو میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔مثلاً فعل، فاعل اورشعر،شاعر، یہ الفاظ آپس میں تعلق کو ظاہرکرتے ہیں۔اُردو میں لبی آواز میں ''ب'' سے ''ن'' کا وصل ہونے کی بجائے ''م'' کا وصل ممکن ہے۔کیونکہ یہ دونوں لبی آوازیں ہیں۔اُردوتحاریر میں اکثر یہ مغالطہ اپنایا جارہا ہے کہ ''ب'' سے پہلے ''ن'' استعمال کیا جارہا ہے۔مثلاً جنبش، انبساط،گنبد، وغیرہ۔کولکھا ''ن'' جاتا ہے۔جبکہ اس کو بولتے ہوئے ''م'' کی آواز استعمال ہوتی ہے۔ یہ مغالطہ ''کربل کتھا'' کے زمانے سے چلا آرہا ہے جہاں لفظ ''تھام'' کو ''تھانب'' لکھا جاتا رہا۔ بعد میں ''ب'' کوختم کر کےصوتی اعتبار سے لفظ سے،ن کونکال کر ''م'' کولگا دیا گیا۔اس حالت کووصلی غناوی مصمت یا صاحتہ کہتے ہیں جو بولنے میں بہتر اورزیادہ آسان ہوتا ہے۔اس طرح ''ن'' ساکن کے بعد ''ب'' اگر لفظ میں

آئے تو ''ن''، ''م'' کی آواز اختیار کر لیتا ہے۔ یہ حالت محض اُردو یا دیگر ہندی زبانوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ فارسی اور عربی میں بھی ان دونوں آوازوں کے ملنے سے ''م'' کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ فارسی میں تنبول، انبار، دنبہ ایسے الفاظ ہیں جو اس طرف اشارہ کرتے ہیں ۔جبکہ عربی میں عنبر ، انبیا، قنبر جیسے الفاظ رائج ہیں۔محمود شیرانی مصدر ''نا'' کو پنجابی سے ماخوذ تعبیر کرتے ہیں۔لیکن اس کے برعکس مشرقی پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی میں یہ مصدری لاحقہ مشترک طور پر موجود ہے۔ایسے الفاظ جو حرف صحیح پر ختم ہوتے ہیں ان میں ''نا''ہی اضافے کا سبب بنتا ہے۔لیکن جن مادوں کے آخر میں حرف علت موجود ہواُن میں ''نا'' کی بجائے ''ونا'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔مثلاً کھاونا، جاونا، اٹھاونا، بٹھاونا، وغیرہ۔ ''ونا'' کا تعلق لہندا سے ہے۔ان دونوں میں فرق محض ''و'' کا ہے۔کربل کتھا میں واؤ افعال کا اہم عنصر ہے۔ جو مضارع اور دوسرے مشتقات افعال میں بھی برقرار رہتا ہے۔''ہونا'' مصدر کے مشتقات میں ''ہو'' کی بجائے ''ہوے'' کے علاوہ کہیں کہیں ''ہوئیں'' یا ''ہووں'' کو بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔(۲۳)

اُردو میں مصدر کی علامت کو حذف کر دیا جائے تو باقی امر رہ جاتا ہے۔ امر مخاطب کو بلحاظ ادب جمع بھی بولتے ہیں۔ مثلاً بیٹھ سے بیٹھو، سُن سے سنو، امر کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں ''امر دعائیہ اور حترامی'' ان کی کی تخصیص کے لیے ''ے'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے ''بیٹھو سے بیٹھیے''۔ کربل کتھا میں امر کی تینوں صورتیں موجود ہیں اس طرح اُردو میں حال مطلق امدادی فعل ''ہے'' کی مختلف صورتوں سے پہلے ''تا'' کے اضافے سے بنتا ہے۔مثلاً جاتا ہے، کرتا ہے، سوتا ہے وغیرہ۔ یعنی صیغہ واحد سے پہلے فعل کے آخر میں ''ے'' بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسے کرے ہے، جائے ہے، فعل حال مطلق جائے ہے، کرے ہے وغیرہ کا استعمال ہمیں راجھتانی اور ہریانی میں بھی ملتا ہے جس کی مثال آج بھی دہلی، مراد آباد اور بجنور کے علاقوں میں بولی جانے والی زبان ہے۔ جبکہ دور جدید کی اُردو نثر میں یہ انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ جدید اُردو میں ''کر'' اور ''کے'' کو بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔

مرکب الفاظ

کسی ترکیب کو زبان کے مزاج کے مطابق مارفیم کے ساتھ جوڑا جائے اگر لفظ محض ایک مارفیم نہ ہو تو اس کے کئی اجزا ہوتے ہیں۔ فطری طور پر الفاظ دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں ان اجزا کو مزید تقسیم کرنے کے عمل کو اتنا دہرایا جائے کہ واحد مارفیم تک رسائی ہو جائے۔ مرکب الفاظ صرف اور نحو کے درمیان سرحد کو قائم کرتے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی قواعدوں میں مرکب کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں۔لیکن جدید لسانیات ان تمام باتوں کو درخواعتنا نہیں سمجھتی۔ کیونکہ الفاظ کی یہ تقسیم ہیئت اور ساخت کی بنیاد پر نہیں کی جاتی۔ مرکب ایک قسم صحیح مرکب کے آخری جزو میں تصریف کا عمل موجود مثلاً زبان درازی، تارگھر وغیرہ۔ جبکہ غیر مرکب میں دو اجزا ایسے ہوتے ہیں جن پر تصریف کا عمل موجود ہوتا ہے۔ مثلاً دوڑ دھوپ، سے دوڑتا دھو پتا، صحیح مرکب تاریخی لحاظ سے زیادہ پرانے ہوتے ہیں اور غیر صحیح مرکب اس کی نقل یا بگاڑ کے طور پر بعد میں جنم لیتے ہیں۔ اکثر غیر صحیح مرکب کے اجز آپس میں تال میل نہیں رکھتے اور زیادہ تر یہ بے معنی ہوتے ہیں۔ لفظ کو صرف کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اکثر الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو ایک صرف پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ صرف آزاد روپ اور مادہ کا حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کان، کرسی، مندر، وغیرہ۔ دوسرے وہ الفاظ ہوتے ہیں جن میں ایک سے زائد صرفے پائے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ مفرد و مرکب دونوں صورتوں میں موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کو دیکھیں جس میں لڑ، کی دو صَرف کی صورت میں موجود ہیں۔ اس طرح دربان، سمجھ دار، خردمند میں ایک مارفیم آزاد صورت میں جبکہ دوسرا پابند صورت میں موجود ہیں۔

مرکب لفظ ایک یا ایک سے زائد شکلوں میں موجود ہوتا ہے۔ مرکب، لفظ اور فقرے کی سرحد پر موجود ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ان کا باہمی فرق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور کبھی ان کے درمیان فرق معلوم کرنا انتہائی سادہ

عمل ہوتا ہے۔ مرکب الفاظ فقرے میں موجودگی کی حالت میں زیادہ تر فقرے کی مناسبت سے نہیں بلکہ اپنے معانی کے حل میں خود ہی پیش پیش ہوتے ہیں۔ مثلاً نواب زادہ، شاہ زادہ، وغیرہ خواہ جملوں میں آئیں یا تنہا یہ اپنی حالت اور اپنے معانی کے اعتبار سے ہمیشہ یکسانیت کا شکار رہتے ہیں۔ مگر جب دو ارکان کے مابین ہم ''صرفی'' تبدیلی کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقرہ کے اندر مرکب الفاظ اپنی ساخت کو برقرار رکھتے ہیں۔ مگر بعض اوقات اس کا ایک جز و بے معانی ہوتا ہے۔ مثلاً (پت جھڑ پتہ + جھڑ)، (پھل جڑی، پھول + جھڑی) ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکب الفاظ اپنی حالت کو برقرار رکھنے کے لیے لفظ کی ہئیت میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ معانی کو مکمل طور پر بدلنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور یہ اہلیت مارفیم کی وجہ سے ہے۔

اس بحث کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ مرکب کے اجزا فقرے کے ارکان کی نسبت آپس میں اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ ان کو باہم تبدیل یا ان کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور معانی میں یہ ایک لفظ کی صورت میں پیش ہوتے ہیں۔ مرکب کے اجزا صنعت، موصوف، مفعول فاعل، فعل موجود ہوتا ہے۔ مثلاً سیاہ پگڑی مرکب کے اجزاء میں نحوی تعلق موجود ہے۔ لسانیاتی مرکب اُردو مرکب سے مختلف ہوتا ہے۔ لسانیات میں مرکب الفاظ کے تمام اجزاء آزاد حالت میں موجود ہوتے ہیں جن کو پابند حالت میں بدلنے سے ثانوی مرکب مشتق وجود میں آجاتا ہے۔

الفاظ کی کثیر تعداد ایسی ہے جو قواعد کی تبدیلی کے ساتھ خود کو نہیں بدلتے بلکہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان الفاظ میں جمع کا مارفیم صفر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ آدمی کو لیں تو واحد اور جمع دونوں حالتوں میں ''آدمی'' اپنی حیثیت کو برقرار رکھتا ہے۔ وہاں ایک آدمی ہے، یا وہاں چار آدمی ہیں۔ یعنی آدمی کی تعداد خواہ ایک ہو یا زیادہ آدمی اپنی صورت اور ہیئت کو برقرار رکھتا ہے۔ اردو زبان میں {ya} ''یا'' کا مارفی ماضی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کھایا۔ لایا۔ آیا وغیرہ ایسے صرفے ہیں جو ماضی کے صرفوں کی جگہ لیتے ہیں عضی صرفے کہلاتے

ہیں۔ مثلاً جا، کو ماضی میں جایا کے طور لکھا اور بولا جاتا تھا۔ مگر اب یہ جایا، گیا، میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس طرح جا، بدل کر ''گیا'' میں تبدیل ہو گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں ''گ'' نے ''جا'' کی جگہ لے لی ہے اس طرح ''گ'' ایک غضبی مارفیم کے طور پر سامنے آتا ہے جس نے ''جا'' کو غصب کر لیا۔

ایسے صرف جن کے معانی ایک لفظ کی جگہ دو لفظوں میں ادا ہوں دو پٹہ صرفے کہلاتے ہیں۔ اس کی مثال اُردو کا لفظ چنانچہ ہے۔ جس کے معانی ''اس لیے'' ہوتے ہیں۔ یعنی معانی دو الفاظ کا مجموعہ ہیں اس لیے صرف دو پٹہ صرف کہلاتے ہیں۔ انگریزی میں بھی ایسی صورت حال موجود ہے۔ بعض حالات میں صرف موقع اور محل کے ساتھ مختلف اشکال تبدیل کرتے ہیں۔ اگر ہم اُردو زبان میں جمع کے صرف کی بات کریں تو اس کی صورت ہم کو عموماً ایسے نظر آتی ہے۔ کیلئے، رکے، گئے، مگر اس کے ساتھ اگر ہم جمع مونث کا بغور جائزہ لیں تو وہاں صرف /e/ اور /a/ کی آواز میں موجود ہیں۔ مثلاً رکیں، گئیں، یہ تمام صورتیں جمع صرف کی ذیلی صورتیں ہیں جن کو ذیلی صورت کے زمرے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ذیلی صرف کا استعمال مشروط حالت میں ممکن ہوتا ہے۔ جن کو ''اصوتی طور پر مشروط'' قواعد کے لحاظ سے مشروط نحوی طور پر مشروط اور لغتی طور پر مشروط ذیلی صرف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ (۲۴)

بعض ''صرف'' ایسے ہوتے ہیں جو ادائیگی کے لحاظ سے کسی دوسرے صرف کے مانند ہوتے ہیں۔ مگر مختلف معانی ہونے کی وجہ سے ان کو الگ صرف قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً آم، عام، ہار، ہار، اس طرح صوتیاتی اعتبار سے ایک ہی صرف مختلف معانی ادا کرتا ہے۔ ''صرف'' ایک آواز کا بھی ہو سکتا ہے۔ ہر صرف کی مخصوص تقسیم اور استعمال ہوتا ہے۔ جس ماحول میں اُس کو ادا کیا جائے گا وہاں اُس کا استعمال دوسرے ماحول کے استعمال سے مختلف ہوگا۔ مثلاً لفظ کو سے پہلے میں اور بعد میں ''جا'' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر لفظ میں ''صرف'' ایک خاص ترتیب میں آتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ''چارہ'' کو لیتے ہیں اور اس کو مختلف

الفاظ میں استعمال کرتے ہیں جیسے ''بے چارہ''، ''لاچار'' اس طرح ''قاعدہ'' کو ''بے قاعدہ'' اور ''باقاعدہ'' میں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح اب لفظ ''چارہ'' اور ''قاعدہ'' ایک صرف کے طور پر مختلف اور متضاد معانی کے اظہار کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔

صحیح مرکب کے اجزا میں آخری جز و کی تصریف ہوتی ہے جبکہ غیر صحیح مرکبات میں تصریف کا عمل دو اجزا پر ہوتا۔ مثلاً دوڑ دھوپ سے دوڑتا دھوپتا وغیرہ۔ لفظ کو ایک صرف سے یا ایک سے زائد صرفے سادہ سے پیچیدہ لفظ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ سادہ لفظ محض ایک صرف پر مشتمل ہوتے ہوئے اپنے مکمل معانی کا اظہار کر سکتا ہے۔ مثلاً گھر، میز، وغیرہ۔ جبکہ پیچیدہ الفاظ میں صرفے ایک سے زیادہ ہوتے ہیں یہ آزاد حالت میں نہیں بلکہ پابند صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دونوں پابند اجزا کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کی صورت میں اپنی شناخت کھو دیتے ہیں اور بے معانی ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال لفظ ''کھڑا'' ہے جس میں دو اجزا یعنی ''کھڑ'' اور ''آ'' ہیں اگر تو یہ ایک دوسرے کے ساتھ پابند اور مرکب حالت میں ہوں تو یہ ایک مکمل معانی دینے والے لفظ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ جبکہ الگ حالت میں یہ اجزاء اپنی معانوی حیثیت کھو دیتے ہیں۔

''ثانوی مشتق'' ایک یا زائد آزاد صورتوں میں موجود الفاظ جن کے ساتھ ایک پابند صورت بھی موجود رہے جس کی وجہ سے اس کی حیثیت لسانی مفرد لفظ کی ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس کا آزاد حصہ اس کی بنیاد ہوتا ہے۔ اور یہ حصہ معانویاتی اظہار کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً خردمند، میں ''خرد'' آزاد روپ میں اپنے معانی کا اظہار کر رہا ہے جبکہ دوسرے حصہ یعنی ''مند'' محض خردمند کی موجودگی میں بامعانی بنتا ہے ورنہ آزاد حالت میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہے یہی صورت حال ہمیں ''دربان'' ''سمجھدار، وغیرہ جیسے الفاظ میں بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

''ثانوی مرکب مشتق'' ایسے مرکب اور پابند الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جس کے تمام اجزاء جو مرکب کی

حالت میں ہوں وہ با معانی اور آزاد حالت میں بھی اپنا تشخص برقرار رکھ سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں جب ہم اس مرکب کے ساتھ پابند حالت کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں تو ایسی حالت میں مرکب الفاظ اپنی حیثیت کھو کر ایک مفرد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح مرکب کا مرکب پن زائل ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں ایسے الفاظ کو DeCompound کہا جاتا ہے۔(۲۵)اس کی مثال کم فہمی، خانہ داری، مال گودام وغیرہ ہیں۔ ''فقری مشتق''، میں فقرہ بنیادی روپ میں موجود ہوتا ہے۔ جب اس پر پابند حالت کا نفاذ کیا جاتا ہے تو اس کا فقرہ پن ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے پوری ساخت مفرد لسانیاتی لفظ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً تیس مار خان، کو اگر فقرہ کی صورت میں شامل کر دیا جائے تو اس کی صورت کچھ ایسی ہوگی۔ ''وہ بڑا تیس مار خان بنا پھرتا ہے'' اس طرح فقرہ بنیادی حالت میں موجود ہونے کے باوجود فقرہ پن سے محروم ہو گیا۔

مرکب ایک سے زائد آزاد حالتوں کا مجموعہ ہوتے ہیں مرکب الفاظ ''صرف'' اور ''نحو'' کی سرحدی حالتیں ہیں۔ اکثر ان کی شناخت میں مشکل پیدا ہوتی ہے مرکب الفاظ اکثر فقرے سے زیادہ معانی کی وضاحت کرتے ہیں۔ اگر دو الفاظ کے درمیان صوتی تبدیلی موجود ہو تو یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ ساخت مرکب تو ہو سکتی ہے مگر مکمل فقرہ نہیں۔ مثلاً ادھورا، پت جھڑ وغیرہ۔ مرکب الفاظ میں ترتیب معین رہتی ہے اس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً دم خم، خم دم، میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح نثر کی فطری ترتیب کو مرکب حالتوں میں نہیں بدلا جا سکتا۔ اس طرح آنکھ، اوجھل، پہاڑ اوجھل، کی ترکیب بھی ایسے ہی ہے اس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرکب کے اجزاء ناقابلِ تقسیم حد تک ایک دوسرے سے جُڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً یتیم خانہ، کو یتیم بچوں کا خانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس قسم کے الفاظ میں کوئی تجدید نہیں کی جا سکتی۔

زبان کے مطالعہ نے جب سے سائنس کی حیثیت اختیار کی ہے۔ تب سے ماہرین نے دنیا میں بولی جانے والی زبانوں پر خاصا کام کیا ہے۔ زبان کے ارتقاء کا سلسلہ انسانی ارتقاء سے جڑا ہوا ہے۔ اس لئے جتنی

انسانی تاریخ قدیم ہے اتنی ہی زبان بھی پرانی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ابتدا سے لے کر آج تک جو زبانیں اظہار کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے اکثر معدوم ہو گئیں یا ان میں اس قدر تبدیلی ہوگئی کہ یہ اپنی اصل سے بہت دور نکل گئیں۔ اس طرح نئی زبانیں بھی وجود میں آ رہی ہیں۔ اس لیے تا حال یہ دعویٰ ممکن نہیں کہ لسانیات کے علم نے دنیا بھر میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ کیونکہ زبان خواہ قدیم ہو یا جدید مسلسل لسانی تغیر کا شکار رہتی ہے۔ دنیا کے مختلف طبعی حالات، جغرافیہ اور انسانی قبائل کا رہن سہن، موسمی تغیرات زبان کو متاثر کرنے والے عوامل کے طور پر کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبانوں میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔

ماہرین کے مطابق بارہ کوس پر لہجے میں تبدیلی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جو آخر کار ایک نئی زبان میں ڈھل کر الگ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ زبانوں کے اس اختلاف کو پاکستان میں با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی پنجاب میں بولی جانے والی زبان جو دریائے ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقے ماجھا میں بولی جاتی ہے کو مرکزی پنجابی کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر یہی زبان جنوبی پنجاب میں لہجے اور بعض الفاظ کی تبدیل شدہ صورت میں ڈھل کر سرائیکی کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اسی طرح سرائیکی بھی اپنے لہجوں کے اعتبار سے جھنگوی، بہاولپوری اور ڈیروی زبانوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ آخر کار سرئیکی سندھی لہجہ اپناتے ہوئے ایک الگ تہذیب کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کس زبان نے کس زبان پر کم یا زیادہ اثرات مرتب کیے ہیں یا کون سی زبان کب جنم لیتی ہے؟ یا کس زبان کی تاریخ کیا ہے؟ ان تمام سوالات کا مقصد محض اس امر کی نشاندھی کرنا ہے کہ زبان علاقائی اثرات اور تہذیب کے زیر اثر خود کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چند زبانیں ترقی یافتہ حیثیت کی حامل ہیں جنہوں نے علم وادب کے میدان میں سائنس کو استعمال کیا اور خوب ترقی کی جبکہ بعض اس کے برعکس محض بول چال تک محدود رہیں۔ زبانوں کی باہمی مماثلت، اختلاف اور ربط کی بناد پر ان کی لسانی تقسیم کی جاتی ہے۔ کبھی زبانوں کو ان کے خاندانوں کے حوالے سے کبھی قواعد کی وجوہ پر تو کبھی زمانے کی بنیاد پر، کبھی تاریخی حوالوں سے، کبھی صرف ونحو کی بنیاد پر، تو کبھی شمولی، تصریفی، اور امتزاجی حوالوں سے تقسیم کیا جاتا رہا ہے۔

انسان کے خیالات اور زبان ہمیشہ اس کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ خواہ وہ خود کو کتنا ہی تنہا کیوں نہ کر لے۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ انسان کی سوچ کے پیچھے جو محرک کام کر رہا ہوتا ہے اسے یقینی طور پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً یہ محرک زبان ہوتی ہے۔ زبان انسان کے فکریاتی تخیلات کو عملی جوہر کے ساتھ جورتی ہے۔ اور تخیل کے ترجمان کے طور پر کام کرتی ہے۔ زبان انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا اہم جزو ہے۔ فکری، تہذیبی اور ثقافتی تمدن میں انسان کی خواہشا تاس کی آسودگی اور نا آسودگی تمام خیالات کا اظہار زبان کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح اخلاقی اور روحانی ورثے کی منتقلی بھی زبان کی مرہون منت ہے۔ انسانی معاشروں میں زبان کا کردار مسلم ہے۔ بقول خلیل صدیقی

" زبان سے انسانی وابستگی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اس کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا"۔(۲۶)

زبان انسان کے احساسات اور خیالات سے جنم لیتی ہے۔ اس کے استعمال میں عضوی حرکات، جسمانی حرکات اور اشارے اس کے اظہار میں شامل رہتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قوت گویائی ہے۔ جس کی بدولت ایک انسان دوسرے کی بات کو سمجھ اور سن سکتا ہے۔ مزید اس کو سن کر دہرا بھی سکتا ہے۔

اصطلاحی حوالے سے زبان ایسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے انسان اپنے ماحول کے مطابق بامعانی ابلاغ کر سکتا ہے۔ باالفاظ دیگر زبان علامتوں کا ایسا مجموعہ ہے جس کی مدد سے انسان ماحول کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بذریعہ خطاب یا تقریر اپنے مافی الضمیر کو بیان کرسکتا ہے۔ اورقوت سماعت کی مدد سے دوسرے لوگوں سے معلومات بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اس لئے زبان کو اظہار خودی کے استعمال کا موثر آلہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تمام حروف والفاظ جو بولنے کے عمل میں استعمال ہوتے ہیں اور تحریر کے درمیان مستعمل ہیں زبان کے عناصر کہلاتے ہیں۔

زبان کی عدم موجودگی کی صورت میں انسان اپنا مدعا بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ زبان ہی ذہن میں جنم لینے والے اور مجتمع سوالوں کے جواب دیتی ہے۔ زبان الفاظ، تراکیب اور جملوں کی ساخت بان کرتی ہے۔ لہذا انسان کے پاس جس قدر وسیع ذخیرہ الفاظ ہوگا وہ اسی قدر دوسروں تک اپنی بات کو واضح اور جامع انداز میں پیش کر سکے گا۔ اس طرح زبان کی فصاحت اور بلاغت خیالات اور جذبات کی ترسیل میں الفاظ اور تراکیب کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے۔

''لفظ کے لغوی معنی کس چیز کے پھینک دینے کے ہیں یا منہ سے نکال دینے کے ہیں۔ اصطلاح میں بھی لفظ بامعانی ملفوظ موجود ہے۔'' (۲۷)

ایسے اصول وضوابط جن کے ذریعہ ایک کلمہ سے دوسرے کلمہ کی تشکیل دینے اور اسے تبدیل کرنے کا علم ''صرف'' کہلاتا ہے۔ علم صرف کا موضوع صیغہ کے اعتبار سے کلمہ ہے۔ صیغہ کلمہ کی ایسی شکل ہے جو حروف کی مخصوص ترتیب کی بدولت بنتی ہے۔ علم صرف، کو صرف کہنے کی وجہ اس کے لغوی معنوں پر انحصار ہے۔ صرف کے لغوی معانی ''پھیرنا'' کے ہیں۔ اس علم میں کلمہ کو پھیر کر اس کی مختلف صورتیں تشکیل دی جاتی ہیں۔ اس لیے اس علم

صرف کہتے ہیں۔

علم نحو وجہ تسمیہ۔

نحو کے لغوی معنی راستہ، ارادہ یا کنارہ کے ہیں۔ اصطلاحاً نحو سے مراد وہ علم ہے جس کی مدد سے ایسے قواعد کا بیان ہو جن میں اسم فعل اور حرف کے آخر میں تبدیلی وقوع پذیر ہونے یا نہ ہونے یا تبدیلی کو جاننے کا مدعا حاصل ہو سکے۔ اس علم کی مدد سے کلمات کے آپس میں ملاپ کا طریقہ بھی بیان ہو۔ نحو کے علم کا مقصد لکھنے اور بولنے میں تراکیبی اغلاط سے بچنا ہے۔ اس علم کا موضوع کلام اور کلمہ ہے۔ نحو کے ایک معانی طریقہ کے ہیں۔ چونکہ گفتگو کرنے والا اس علم کی مدد سے ایک خاص پیغام کو خاص انداز میں دوسرے تک پہنچانا چاہتا ہے۔ علم نحو کے ایک معانی کنارہ کے ہیں۔ کیونکہ اس علم میں کنارہ پر موجود آخری حرف سے بحث کی جاتی ہے۔ اس لیے اس علم کو علم نحو کہا جاتا ہے۔ نحو کے ایک معانی مثل کے بھی ہیں۔ اس لیے جو شخص یہ علم حاصل کرتا ہے عربوں کے مثل گفتگو کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اس لیے بھی اسے علم نحو کہا جاتا ہے۔

ہر زبان کے کچھ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں۔ جو اس زبان کے استعمال اور سیکھنے کے عمل میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ زبان کے درست استعمال اور اس کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ قوانین ہوتے ہیں جن پر عمل درامد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے قوانین یا قواعد گرائمر کہلاتے ہیں ان قواعد کا مطالعہ کسی بھی زبان کے سمجھنے یا استعمال کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اردو قواعد کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۲۸)

۱۔ صرف ۲۔ نحو

وہ علم جس میں اسم، فعل اور حرف کو جوڑ کر جملہ بنانے کی ترکیب اور ہر کلمہ کی آخری حالت معلوم ہو علم نحو کہلاتا ہے۔ اس علم کی بدولت انسان زبان کے استعمال کے دوران خواہ وہ بولنے یا لکھنے کے عمل میں استعمال ہو

رہی ہوا سے اغلاط سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو بات آدمی کی زبان سے نکلتی ہے اسے لفظ کہتے ہیں۔قواعد کا وہ حصہ جس میں جملوں اور مرکبات کی بجائے فقط لفظ سے بحث کی جاتی ہے۔لفظ کی ساخت، بناوٹ اور معانی کے مباحث علم صرف کا موضوع قرار پاتے ہیں۔انسان اپنے منہ سے جو کچھ ادا کرتا ہے اس کی بنیادی اکائی لفظ ہوتا ہے۔جس لفظ کے کچھ نہ کچھ معنی ہوں ایسا لفظ موضوع قرار پاتا ہے۔اس کی دو مزید اقسام ہوتی ہیں۔

ا۔کلمہ (مفرد) ۲۔کلام (مرکب)

کلمہ کی بحث علم صرف جبکہ کلام کی بحث علم نحو کے لیے مخصوص ہے۔ وہ اکیلا لفظ جو بامعنی ہو کلمہ کہلاتا ہے۔مثلاً مسجد، بازار وغیرہ۔اسم وہ کلمہ ہے جو کسی شخص، چیز یا جگہ کے نام کو ظاہر کریا ور یہ کسی خاص کیفیت کو ظاہر کرے مثلاً ''شیر جنگل کا بادشاہ ہے''۔اس جملے میں شیر، جنگل، اور بادشاہ اسماء ہیں۔کلمہ کو مزید تین اقسام اسم فعل اور حرف میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایسا کلمہ جس کے معنی بغیر کسی دوسرے لفظ کو ملائیا ور اس میں زمانے کی تینوں حالتوں (ماضی، حال اور مستقبل) میں سے کوئی حالت نہ پائی جائے۔اسم کی مزید تین اقسام ہین جو اسم جامد، اسم مشتق اور اسم مصدر کہلاتی ہیں۔جامد سے مراد اسم کی وہ حالت ہے جو نہ آپ کسی لفظ سے بنا ہو اور نہ اس سے مزید الفاظ بنائے جاسکیں۔مصدر ایسا اسم ہے جو خود تو کسی لفظ سے نہیں بنتا لیکن اس سے بہت سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔جبکہ مشتق ایسا اسم ہے جو مصدر سے بنتا ہے۔

مرکب الفاظ۔

مرکب وہ لفظ ہے جو دو یا دو سے زیادہ کلموں سے جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔اس کی مزید دو اقسام ہیں

ا۔مرکب مفید ۲۔مرکب غیر مفید

مرکب مفید ایسا مرکب کہلاتا ہے جس کو کہنے والا اپنی مکمل بات کہے اور سامع اسے سن کر گزشتہ واقعے کی طلب کو

محسوس کرے۔ یعنی اس کو سن کر سامع میں پورے واقعے کو سننے کی طلب بیدار ہو۔ مرکب مفید کو جملہ اور کلام کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ جملہ دو طرح کا ہتا ہے۔ ایک جملہ خبریہ اور دوسرا جملہ انشائیہ کہلاتا ہے۔ ایسا جملہ جسے ادا کرنے والے کو سچا یا جھوٹا قرار دی جا سکے جملہ خبریہ کہلاتا ہے۔ جبکہ جملہ انشائیہ وہ ہے جس کے ادا کرنے والے کو سچا یا جھوٹا قرار نہ دیا جا سکے۔ کیوں کہ انشاء کے معنی چیز کو پیدا کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسا جملہ کام کے پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے سچ یا جھوٹ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مرکب غیر مفید ایسے مرکب کو کہتے ہیں جس میں بات کرنے والا کہہ چکے اور سامع اس کی بات میں دلچسپی نہ لے۔ ایسی گفتگو جس سے کسی فائدے یا طلب کا حصول نہ ہو۔ مرکب غیر مفید کی مزید تین اقسام ہیں۔

ا۔ مرکب اضافی

مرکب اضافی وہ مرکب ہے جس میں ایک اسم اضافت کی نسبت دوسرے اسم کی طرف ہو۔ پہلے اسم کو مضاف جبکہ دوسرے اسم کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔

۲۔ مرکب بنائی

مرکب بنائی وہ ہے جس میں دو اسموں کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔ اور ان دونوں میں کوئی نسبت اضافی یا اسنادی نہ ہو۔ اس قسم کے مرکب میں واؤ کو حذف کر کے دونوں اسموں کو ایک کر لیا جاتا ہے۔

۳۔ مرکب منع صرف

مرکب منع صرف کا پہلا حصہ مفتوح ہوتا ہے اور بار بار بدلتا رہتا ہے۔ مرکب غیر مفید ہمیشہ جملے کا محض ایک حصہ ہوتا ہے پورا جملہ نہیں ہوتا۔

حروف تہجی۔

ہر زبان کے ایسے بنیادی حروف جو ہر زبان کو تحریری شکل دیتے ہیں حروف تہجی کہلاتے ہیں۔اردو میں ابتدائی حروف ''الف تاے'' حروف تہجی کہلاتے ہیں۔اردو میں عربی کے ایسے الفاظ جن کے شروع می ''الف اورل'' آتے ہیں۔قمری حروف کہلاتے ہیں۔مثلاً الخالق، المومنین، العلوم اورالکریم وغیرہ۔اردوزبان میں شامل ''ا،ب،ج،ح،خ،ع،غ،ف،ق،ک،م،و،ہ،ی قمری حروف ہیں۔کچھ حروف جن کے ساتھ ''ال'' آتا ہے لیکن پڑھانہیں جاتا۔ایسے حروف شمعی حروف کہلاتے ہیں۔مثلاً عبدالستار، علم الدین،اورفخرالدین وغیرہ۔اردو میں ت،ث،د،ذ،ر،ز،س،ش،ص،ض،ط،ظ،ل،ن، شمسی حروف ہیں۔

عربی کی طرح اردو میں بھی تلفظ کی درست ادائیگی کے لئے اعراب کا سہارا لیا جاتا ہے۔اعراب سے الفاظ اورتحریرکوسمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔اعراب کے طور پر چندعلامات کواستعمال کیا جاتا ہے۔جن میں زیر، زبر، پیش، جزم،تشدید،تنوین،ھمزہ،الف ممدودہ، واؤ معدولہ، یائے معروف، یائے مجہول شامل ہیں۔حروف کوخاص ترتیب سے لکھنے سے لفظ بن جاتا ہے۔مثال کے طور پر''اللہ ایک ہے۔'' اس فقرہ میں تین مکمل الفاظ''اللہ''، ''ایک''،اور''ہے'' کا مجموعہ ہے۔الفاظ کا ایسا ترتیب شدہ مجموعہ جس سے پورا مطلب حاصل ہو جملہ یا فقرہ کہلاتا ہے۔

لفظ کی دوقسمیں ہیں۔کلمہ اورمہمل۔وہ الفاظ جو بامعنی ہوں کلمہ کہلاتے ہیں۔اورایسے الفاظ جن کے معنی واضح نہ ہوں بلکہ مبہم ہوں مہمل کہلاتے ہیں۔مثلاً جھوٹ موٹ، ٹال مٹول میں جھوٹ اورٹال کلمہ جبکہ موٹ اور مٹول مہمل ہیں۔

کلمہ کی اقسام۔

کلمہ کی تین اقسام ہیں اسم،فعل،حرف۔اسم وہ کلمہ ہے جوانسان جانوروں اورجگہ یا چیز وغیرہ کے لیے

استعمال ہو۔لیکن اس میں وقت کا اظہار نہیں ہوتا۔مثلاً امجد، خالد، میز، پہاڑ، قلم، ملتان، وغیرہ۔فعل وہ کلمہ ہے جس میں کام کا کرنا یا ہونا ظاہر ہو۔ایسں زمانے کی حالتوں حال، ماضی یا مستقبل کا اظہار بھی موجود ہوتا ہے۔مثلاً آئی، آتی ہے، آئے گی، آئی تھی، وغیرہ۔ان میں کام اورزمانہ دونوں موجود ہیں۔لہذا افعال ہیں۔حرف وہ کلمہ ہے جو نہ اسم پر ہو نہ فعل پر بلکہ یہ اسم اور فعل دونوں کو ملانے کے لیے کام کرے۔مثلاً کتاب میز پر ہے۔احمد گھر میں ہے۔ان دونوں جملوں میں پر اور میں حروف کے طور پر استعمال ہورہے ہیں۔ان کے علاوہ کا، کی، کے، پر، سے، تک، کو، آگے، پیچھے، نے، واہ، اف، جی، وغیرہ بھی روف کے ذمرے میں شامل ہیں۔

بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی اقسام۔

اسم مصدر۔

وہ اسم ہے جو خود تو کسی کلمہ سے نہ بنا ہو مگر اس سے کئی الفاظ بنائے جاسکتے ہوں۔مصدر کہلاتا ہے۔اردو میں ''نا'' کی علامت مصدر کے لیے مخصوص ہے۔مثلاً کھیلنا، کودنا، رونا، ہنسنا وغیرہ۔بعض اسم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے آخر میں نہ تو ہوتا ہے مگر وہ مصدر نہں ہوتے۔جیسے گانا، نانا، اپنا، پرانا وغیرہ۔اسم مصدر زمانے کے تعلق کے بغیر ہوتے ہیں۔ان میں صرف فعل کے معنی پائے جاتے ہیں۔اوران کی نشانی آخر میں ''نا'' کا آنا ہے۔

اسم مشتق۔

ایسا اسم جسے خاص اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مصدر سے بنایا جائے مشتق کہلاتا ہے۔مثلاً دوڑنا سے دوڑا، بھاگنا سے بھاگا، لڑنا سے لڑا وغیرہ۔

اسم جامد۔

وہ اسم ہے جو نہ تو خود کسی کلمہ سے بنا ہو اور نہ اس سے کوئی اور کلمہ بن سکے۔ مثلاً دریا، پہاڑ، کرسی، میز

وغیرہ۔

اسم معرفہ

وہ اسم ہے جو خاص نام، خاص چیز یا خاص جگہ کے نام کو ظاہر کرے مثلاً اقبال، کوہ سلیمان، ملتان وغیرہ۔ گویا تمام مخصوص ناموں سے منصوب انسان، اشیاء، اور مقامات معرفہ کے ذمرے میں آتے ہیں۔

اسم نکرہ۔

وہ اسم ہے جو عام فرد، جانور، جگہ یا چیز کے نام کو ظاہر کرے۔ ایسے اسم کو نکرہ کہتے ہیں۔ اسے اسم عام بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً لڑکا، شہر، پہاڑ وغیرہ۔

اسم معرفہ کی اقسام۔

(اسم علم، اسم ضمیر، اسم اشارہ، اسم موصول)

اسم علم۔

ایسا اسم ہے جو کسی خاص فرد کا خاص نام ہو۔ جو اس کی شناخت اور پہچان کے لیے استعمال ہو۔ مثلاً ابن مریم، غالب، شاعر مشرق، قائداعظم وغیرہ۔ اسم علم کو مزید اقسام میں تقسیمکیا جاتا ہے۔ جو (تخلص، خطاب، لقب، عرف، اور کنیت ہیں۔)

تخلص۔

وہ مختصر نام جو شاعر اور ادیب اصل نام کی جگہ استعمال کرتے ہیں تخلص کہلاتا ہے۔ مثلاً اسد اللہ غالب، محمد حسین آزاد، میں غالب اور آزاد تخلص ہیں۔

خطاب۔

وہ اعزازی نام جو کسی فرد کو حکومت یا قوم کی طرف سے کارکردگی یا خدما کے صلے میں عطا کیا جائے خطاب کہلاتا ہے۔ مثلاً مادر ملت، شمس العلماء وغیرہ۔ اس طرح اعزازات بھی خطاب کے ذمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً نشان حیدر، تمغہ جرات وغیرہ۔

لقب۔

وہ نام جو کسی خاص خوبی یا وصف کی بدولت مشہور ہو جائے۔ مثلاً حضرت موسیٰ کے لیے کلیم اللہ، حضرت ابراہیم کے لیے خلیل اللہ، وغیرہ القاب کہلاتے ہیں۔

عرف۔

وہ نام جو حقارت یا محبت کی وجہ سے اصل نام کی بجائے مشہور ہو جائے عرف کہلاتا ہے۔ مثلاً غلام محمد سے گاما، معراج دین سے ماجا، اس کے علاوہ والدین پیار سے اپنے بچوں کو اصل نام کی بجائے جن ناموں سے پکارتے ہیں اور وہ نام اصل نام سے زیادہ مشہور ہو جائے تو عرف بن جاتا ہے۔ مثلاً گڈو، منا، ننھا وغیرہ۔

کنیت۔

ایسا نام جو ماں، بیٹے، یا بیٹی کی نسبت سے بولا جائے۔ کنیت کہلاتا ہے۔ مثلاً ابوعبداللہ، ابن مریم، ام حبیبہ، بنت حر وغیرہ۔

اسم ضمیر۔

ایسا لفظ جو کسی اسم کی جگہ استعمال ہو اسم ضمیر کہلاتا ہے۔ جس اسم کی جگہ ضمیر آتے ہیں وہ ''مرجع'' کہلاتے ہیں۔ مثلاً ''احمد کل آیا تھا۔'' کی جگہ جب ہم اس جملے کو اس طرح لکھیں ''وہ کل آیا تھا۔'' ان دونوں فقرات

میں ''احمد'' مرجع اور ''وہ'' اسم ضمیر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

اسم ضمیر کی اقسام۔

ا۔ضمیر متکلم ۲۔ضمیر حاضر ۳۔ضمیر غائب

ضمیر متکلم۔

ضمیر متکلم کو گفتگو کرنے والا شخص اپنے لیے استعمال کرتا ہے مثلاّ میں، ہم، ہمارا وغیرہ۔

ضمیر حاضر۔

اس شخص کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے جس کی بات کی جا رہی ہو اور وہ موجود بھی ہو۔ مثلاّ آپ، آپ کا، تو، تم وغیرہ۔

ضمیر غائب۔

اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جو گفتگو کے دوران سامنے موجود نہ ہو۔ مثلاّ وہ، ان، اس، ان کا، وغیرہ۔

اسم ضمیر کی چار حالتیں ہیں۔ (فاعلی، مفعولی، اضافی، مجروری)

فاعلی حالت، فاعل یعنی کام کرنے والے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاّ اس نے کتاب پڑھی۔ میں نے آم خریدا۔ وہ بازار گیا۔ ان زمثال میں ''میں نے، اس نے، اور وہ'' ضمیر کی فاعلی حالتیں ہیں۔ حالت مفعول میں ضمیر مفعول کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً یہ قلم مجھے دے دو، احمد نے مجھے خط لکھا۔ وغیرہ۔ ''مجھے'' ضمیر کی مفعولی حالت ہے۔ اس کے علاوہ تم کو، ہم کو، ہمیں، تجھے، تمہیں وغیرہ بھی ضمیر کی مفعولی حالتیں ہیں۔ جب ضمیر کس فرد یا چیز سے اپنے مرجع سے تعلق کو ظاہر کرے مثلاً وہ میرا بھائی ہے، تمہاری کتاب میز پر ہے، ان فقرات میں میرا اور

تمہارا ضمیر کی اضافی حالتیں ہیں۔حالت مجروری میں ضمیر مجرور پر قائم مقام ہوتا ہے۔مثلاً مجھ پر روزہ فرض ہے، تم پر نماز فرض ہے۔وغیرہ ان مثالوں میں ''تم پر، مجھ پر''ضمیر کی مجروری حالتیں ہیں۔

اسم ضمیر کی حالتیں

حالت	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
فاعلی	وہ، اُس	وہ، انہوں	تو، تم نے	تم نے، آپ نے	میں، میں نے	ہم، ہم نے
مفعولی	اُسے، اُس کو	اُن کو، انہیں	تجھ کو، تجھے	تم کو، آپ کو، تمہیں	مجھ کو، مجھے	ہم کو، ہمیں
اضافی	اس کے، اس کی	اُن کے، اِن کی	تیری، تمہاری	تمہاری، آپ کی، تم پر	میری	ہماری
مجروری	اُس پر، اِس پر	اُن کی، اِن کی	تیری، تجھ پر	تم پر، آپ پر	مجھے، مجھ پر	ہمیں، ہم پر

اسم اشارہ

ایسا اسم جو کسی شے یا فرد کی جانب اشارہ کے لیے استعمال ہو مثلاً وہ کتاب، یہ قلم، وغیرہ ان امثال میں وہ اور یہ اشارہ ہیں۔ان کی بدولت کسی شخص یا شے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔اس طرح وہ شخص یا شے جس کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے مشارالیہ کہلاتے ہیں۔ان امثال میں قلم، کتاب، اور کرسی مشارالیہ ہیں۔اشارہ اور مشارالیہ مل کر مرکب اشاری بناتے ہیں۔اسم اشارہ کی کی اقسام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب کی اشیاء، فرد یا جگہ کے لیے ''یہ''، اور دور کی اشیا فرد یا جگہ کے لیے ''وہ'' بطور اشارہ استعمال ہوتے ہیں۔اس طرح اسم اشارہ دو اقسام

میں تقسیم ہو جاتا ہے جو اسم اشارہ قریب اور اسم اشارہ بعید کہلاتے ہیں۔(۲۹)

اسم اشارہ اور اسم ضمیر میں فرق یہ ہے کہ اسم ضمیر میں کسی شخص، چیز، یا جگہ کی طرف دل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ اسم اشارہ میں جسم کے دیگر عضو یعنی آنکھ، ہاتھ وغیرہ کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اسم موصول

اسم موصول سے مراد ایسا اسم ہےجس کے بعد جب تک کوئی جملہ نہ لگایا جائے۔ اس وقت تک وہ اپنے معنی سمجھانے سے قاصر ہے۔ مثلاً جو محنت کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ اس مثال میں ''جو'' اسم موصول ہے۔ جبکہ ''کامیاب ہوتا ہے'' صلہ ہے۔

اسم نکرہ کی اقسام۔

۱۔اسم ذات	۲۔اسم استفہام	۳۔اسم مصدر	۴۔اسم حاصل مصدر
۵۔اسم صفت	۶۔اسم فاعل	۷۔اسم مفعول	۸۔اسم حالیہ
۹۔اسم معاوضہ	۱۰۔اسم صوت۔		

اسم ذات

ایسا اسم جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے دوسروں سے اپنی اپنی الگ حیثیت کو برقرار رکھتا ہے۔ مگر اس سے کوئی وصف مراد نہیں ہو۔ اسم ذ ذات کہلاتا ہے۔ مثلاً اونٹ، گائے، بکری، پتھر، آگ، انسان، میدان وغیرہ۔ اسم ذات کی اقسام میں اسم مکبر، اسم تصغیر، اسم ظرف، اسم آلہ، اسم جمع شامل ہیں۔ اسم مکبر شے کے اصل نام کی بجائے اس کے بڑے پن کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً تھالی سے تھال، راجہ سے مہاراجہ، پگڑی سے پگڑ، وغیرہ۔ اس کے مقابل اسم تصغر، میں شے کی اصل کی نسبت اس کی چھوٹی ظاہر کی جاتی ہے۔ مثلاً پہڑ سے پہاڑی،

ڈبہ سے ڈبیا، نالا سے نالی، وغیرہ۔اسم ظرف جگہ یا وقت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔مثلاً سکول، گھر، بازار، صبح، دوپہر، شام، وغیرہ۔اس لیے اس اسم کو ظرف زماں اور ظرف مکاں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ظرف زماں وقت یا زمانے کے معنی دیتا ہے۔مثلاً صبح، دوپہر، کل، شام منٹ، صدی وغیرہ۔جبکہ ظرف مکاں، جگہ، یا مقام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔مثلاً مدرسہ، چراگاہ، مقبرہ، میدان، کالج وغیرہ۔اسم آلہ وہ اسم ہے جس میں ہتھیار یا اوزار کے معنی موجود ہوں۔مثلاً چاقو، چھری، قینچی، توپ، بندوق، قلم تراش وغیرہ۔اسم جمع ایسے الفاظ کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں واحد اور معنی کے اعتبار سے جمع ہوں مثلاً فوج، قوم، ہجوم وغیرہ۔

اسم استفہام

وہ اسم جو سوال کرنے کے موقع پر استعمال ہو اُسے اسم استفہام کہا جاتا ہے۔مثلاً کیا، کیوں، کون، کب وغیرہ۔اسم استفہام کے آخر میں سوالیہ نشان آتا ہے۔اسم صفت کسی شے کی اچھائی یا برائی کی خاصیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔اس کو اسم موصوف بھی کہتے ہیں۔مثلاً بڑا، چھوٹا، موٹا، لمبا، گورا، کالا وغیرہ۔صفت اور موصوف کا مجموعہ مرکب توصیفی کہلاتا ہے۔مثلاً بڑا لڑکا، لمبی لڑکی وغیرہ میں ''بڑا''، ''لمبی''، صفت جبکہ لڑکا اور لڑکی موصوف کے طور پر سامنے آرہے ہیں۔اسم صفت کے تین درجے ہیں۔

۱۔تفصیل نفسی ۲۔تفصیل بعض ۳۔تفصیل کُل

تفصیل نفسی

ایسا اسم جس میں کسی کی صرف ذاتی صفت بیان کی جائے۔مثلاً احمد اچھا لڑکا ہے۔میں اچھا صفت کا پہلا درجہ ہے۔

تفصیل بعض

جب وصف کا دو اسموں کے درمیان موازنہ کر کے ایک کو دوسرے سے برتر یا کمتر کے طور پیش کیا جائے کو تفصیل بعض کہتے ہیں۔ مثلاً زیادہ اچھا، دو کے مقابلے کو ظاہر کر رہا ہے۔

تفصّل کُل

جب اسم کو وصف میں اس جیسی تمام چیزیں یا ناموں میں سے کم یا زیادہ ظاہر کیا جائے۔ یہ صفت کا تیسرا درجہ ہے۔ مثلاً اکرم سبسے اچھا لڑکا ہے۔ اس مثال میں ''سب سے اچھا تفصیل کُل ہے۔

تفصیل نفسی	تفصیل بعض	تفصیل کُل
اچھا	بہت اچھا	سب سے اچھا
بڑا	بہت بڑا	سب سے بڑا
گرم	بہت گرم	سب سے گرم
کڑوا	بہت کڑوا	سب سے کڑوا
نزدیک	نزدیک تر	نزدیک ترین

اسم مصدر

وہ اسم جس میں کسی کام کا کرنا، ہون یا سہنا پایا جائے۔ اس کا تعلق کسی زمانے سے نہیں ہوتا۔ جیسے کھانا، پینا، سونا وغیرہ۔ اسم مصدر کی دو مزید اقسام ہیں۔

۱۔ مصدر لازم ۲۔ مصدر متعدی

مصدرلازم

وہ افعال جن میں فاعل کے ساتھ بات واضح کی جائے مثلاً بچہ گیا،کھلاڑی دوڑا، پھول کھلا وغیرہ۔

مصدرمتعدی

وہ فعل جن میں فاعل کے ساتھ مفعول لگانے سے بات واضح ہو جائے مثلاً میں نے کھانا کھایا، میں نے خط لکھا وغیرہ۔مصدرلازم سے مصدر متعدی میں لفظ کو تبدیل کرنے کے لیے''نا'' سے پہلے الف لگایا جاتا ہے۔مثلاً پڑھنا سے پڑھانا، ڈرنا سے ڈرانا،کھیلنا سے کھلانا۔سننا سے سنانا وغیرہ۔

اسم حاصل مصدر

وہ اسم جس میں مصدر کے معنی پائے جائیں حاصل مصدر کہلاتا ہے۔مثلاً لڑائی اچھی نہیں، مجھے تھکاوٹ محسوس ہورہی ہے،ان دونوں جملوں میں لڑائی ،لڑنا سے اورتھکاوٹ ،تھکنا سے بنتے ہیں۔

مصدر	حاصل مصدر	مصدر	حاصل مصدر	مصدر	حاصل مصدر
چلنا	چلنا	گرجنا	گرج	کمانا	کمائی
گھبرانا	گھبراہٹ	جلنا	جلن	مسکرانا	مسکراہٹ
جھگڑنا	جھگڑا	لڑنا	لڑائی	بنانا	بناوٹ

اسم فاعل

فاعل کے وزن پرآنے والے اسم کواسم فاعل کہتے ہیں۔یعنی ایسا اسم جس کوکسی کام کرنے والے کے لیے استعمال کیا جائے اسم فاعل کہلاتا ہے۔یہ کام کرنے والے کا اصل نام نہیں بلکہ اس کی نوعیت سے کام کی جگہ استعمال

کیا جاتا ہے۔ مثلاً باورچی، لوہار، کھلاڑی، ڈاکیا، تاجر وغیرہ۔ اسم فاعل بنانے کے لیے مصدر کے آخر میں آنے والے حرف ''الف'' کو یائے مجہول میں بدل کر اس کے آگے والا یا والی لگا دیتے ہیں مثلاً لکھنا سے لکھنے والا، پڑھنا سے پڑھنے والا وغیرہ۔ ان کے علاوہ شاعر، گویا، دھوبی، سنار، کمہار، عادل، قاتل، درزی، بھنگی وغیرہ بھی اسم فاعل ہیں۔

اسم مفعول

ایسا اسم جو اس شخص یا شے کو ظاہر کرے جس پر کوئی کام 'فعل' ہوا ہو مثلاً پڑھا ہوا، لکھا ہوا، جلا ہوا وغیرہ۔ اردو میں اسم مفعول بنانے کے لیے مصدر کی علامت ''نا'' دور کر کے ''ا'' یا ''ی'' لگا دیتے ہیں۔ اور ''ہو'' یا ''ہوئی'' کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے مارنا سے مارا ہوا۔ کھانا سے کھایا ہوا وغیرہ۔ اسم مفعول ہمیشہ مفعول کو ظاہر کرتا ہے۔ اور مشتق ہوتا ہے۔ اسم مفعل کسی مصدر سے ہی مشتق ہوتا ہے۔

اسم حالیہ

ایسا اسم جو فاعل، مفعول یا کسی فرد کی حالت کو ظاہر کرے اسم حالیہ کہلاتا ہے۔ مثلاً خالد ہنستا ہوا آیا، اس میں خالد کی حالت کو ہنستا ہوا ظاہر کر رہا ہے۔ اس کو اسم حالیہ کہتے ہین۔ اردو میں مصدر کی علامت ''نا'' کو دور کرتے ہوئے ''تے ہوئے یا تی ہوئی'' لگاتے ہیں۔ جس سے اسم حالیہ بن جاتا ہے۔ مثلاً پڑھنا سے پڑھتا ہوا، رونا سے روتا ہوا وغیر۔

اسم معاوضہ

معاوضہ یا اجرت کے معنوں میں استعمال ہونے والے اسم کو اسم معاوضہ کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً سلائی، دھلائی، پسوائی وغیرہ۔

اسم صوت

ایسا اسم جو کسی جاندار یا بے جان کی آواز کو ظاہر کرے اسم صوت کہلاتا ہے۔ مثلاً کوے کی آواز، ''کائیں، کائیں''، کھٹ، کھٹ وغیرہ۔

علم نحو

علم نحو میں جملے کے اندر موجود الفاظ کی ترتیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لفظ سے جملہ ترتیب دینا مختلف مدارج کا متقاضی ہوتا ہے۔ مارفولوجی میں زبان کا مطالعہ لفظ کی سطح تک ہوتا ہے۔ جبکہ جملہ کی ترتیب میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ تا کہ وہ اپنے معانی کی درست عکاسی کر سکے۔ جملے میں موجود الفاظ ان کی ترتیب اور ترکیب سب علم نحو کے مطالعے کا حصہ ہیں۔ کسی بھی جملے میں جو قدرتی اجزا موجود ہوتے ہیں ان کو ترتیب یا ساختی تعمیر کہا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی جملے میں موجود مختلف الفاظ آپس میں یکساں تعلق کے حامل ہوں۔ جبکہ بعض الفاظ کا ایک دوسرے سے تعلق دوسروں کی نسبت کم یا گہرا بھی ہوسکتا ہے۔ ایک نحوی ترکیب میں کم سے کم دو آزاد روپ ہوں گے جبکہ زیادہ سے زیادہ ایک جملہ مکمل نحوی ترکیب سمجھا جائے گا۔ نحو میں جز و لفظ ہوتا ہے جو کسی دوسرے جز و کی تعمیر میں کردار ادا کرتا ہے۔ اس طرح دو اجزا مل کر ایک خاص ترکیب میں بامعنی جملہ ترتیب دینے میں ابتدائی کردار ادا کرتے ہیں۔ مزید الفاظ کی شمولیت جملے کی ساخت کا واضح کرنے اور جملے کے معنی میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان تمام تراکیب جن میں تصریفی، اشتقاقی تراکیب بھی شامل ہیں ۔ جملے کی ساخت اور الفاظ کی تراکیب اور ترتیب کا بامعنی مطالعہ علم نحو کہلاتا ہے۔ (۳۰)

علم نحو اور اجزائی اتصال

علم نحو میں جملے کو اجزا میں تقسیم کر کے ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو جز و قرار دیتے

ہوئے اگر ایک ترکیب کو دو حصوں میں بانٹا جا سکے تو یہ حصے اس ترکیب کے جز و متصل قرار پاتے ہیں۔ جز و متصل کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ علم نحو میں ہم ایسی تراکیب کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے جز و متصل استعمال کی آزادی رکھتے ہوں۔ کسی بھی جملے کے دو اجزائے متصل بنائے جا سکتے ہین۔ اگر کوئی جز و بھی ایک سے زائد روپ میں ہو تو وہ مزید اجزائے متصل ترتیب دے سکتا ہے۔ اس طرح ایک جملے کو کئی اجزائے متصل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو بامعنی طور پر اظہار کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ دو یا دو سے زائد ایسی تراکیب جن کے آخری اجزا ایک جیسے ہوں یا باہم مماثلت رکھتے ہوں مگر جز و متصل کے اختلاف کی بنا پر معانی تبدیل ہو جائیں ایسے عمل کو تعمیری تجنیس کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک ترکیب لیتے ہیں۔ ''قیمتی زیور اور کپڑے'' اس ترکیب کو ہم دو اجزا میں تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی ''قیمی زیور'' اور ''کپڑے'' تو معلوم ہوتا ہے کہ زیور اور کپڑے میں سے قیمتی ایک شے ہے۔ اور وہ ''زیور'' ہے۔ جبکہ کپڑے قیمتی نہ ہیں۔ جب اس عبارت کو مکمل ملا کر پڑھا جاتا ہے تو ہمارے سامنے ایک اور تصویر آ جاتی ہے۔ جو زیور اور کپڑے دونوں کو قیمتی ظاہر کرتی ہے۔ یہ تراکیب تجنیس تعمیری کی مثالیں ہیں۔ اسے ابہام کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی بھی ترکیب کے جز و متصل اگر دو سے زیادہ ہوں تو یہ اجزائے کثیر کہلائیں گے۔ ان کی تعداد تین بھی ہو سکتی ہے اور چار بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً پاکستان میں میٹر، گرام اور سیکنڈ کا نظام رائج ہے۔ اس جملے میں ''میٹر، گرام، سیکنڈ'' ترکیب کے جز و متصل ہیں مگر ان الفاظ کو الگ الگ معنی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگر ان کی ترتیب کو آگے پیچھے بھی کر دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی میٹر کی جگہ سیکنڈ یا گرام کو رکھا جا سکتا ہے۔ ایسے اجزا متصل کثیر اجزا کہلاتے ہیں۔ بعض تراکیب کے جز و متصل غی مسلسل بھی ہو سکتے ہیں ایک جز و میں میں ایسے الفاظ شامل کیے جاتے ہیں جو معانی اور نحو کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہون۔ مثلاً ''انسان کتنا بے بس ہے۔'' اس جملے میں ''انسان بے بس ہے'' ایک جز و ہے اور ''کتنا'' دوسرا جز و ہے۔ اس جملے میں کتنا کے بغیر بھی معنی مکمل

صورت میں ہیں۔ لہذا اکتنا اس قدر قدرتی اور بامعنی نہیں ہے۔ ایسے اجزا کو غیر مسلسل اجزا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

نحوی تجزیے کی تراکیب اور ساخت

مختلف ترکیب کی نوعیت اور ساخت یکسر مختلف ہوسکتی ہے۔ بعض تراکیب عام نوعیت کی اور بعض تراکیب خاص اور نایاب نوعیت کی ہوسکتی ہیں۔ کسی زبان کے نحوی تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ اس زبان کی ساخت اور ترتیب کے لحاظ سے درجہ بندی کی جائے۔ تاکہ زبان کی نحوی پیچیدگیوں کو سمجھا جا سکے۔ نحوی ساخت کو سمجھنے کے لیے تراکیب کو دو گروہوں (درون مرکز ساخت اور بیرون مرکز ساخت) میں تقسیم کرتے ہیں۔ درون مرکز تراکیب ایسی تراکیب ہوتی ہیں جن کے جزو متصل میں کم از کم ایک گروہ ایسا ہوتا ہے جو کُل کے معنی ادا کرتا ہے۔ اس طرح جملے کے ایک جزو کا اور مکمل جملے کا نحوی استعمال ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال ''اچھی لڑکی'' ہے۔ اس میں جزع متصل یعنی ''لڑکی'' کے استعمال کی وہی نوعیت ہے جو کُل ترکیب اچھی ''لڑکی'' کی ہے۔ ایک اور جملہ لیتے ہیں۔ ''اچھی لڑکی سبق یاد کرتی ہے''۔ اس جملے میں ''اچھی لڑکی درون مرکز ترکیب ہے۔ ایسی تراکیب جن میں جزو کا استعمال ویسا ہی ہو جیسے کُل ترکیب کا اس کو جزو مرکز کہتے ہیں۔ اور دوسرا جزو وصف کہلاتا ہے۔ مثلاً موجودہ جملے میں ''لڑکی'' مرکز اور ''اچھی'' اس کا وصف ہے۔ بیرون مرکز تراکیب میں جزو متصل کا استعمال یا جزو کی نوعیت وہ نہیں ہوتی کہ وہ کُل کی نمائندگی کر سکے۔ ''لڑکا گیا''۔ اس میں لڑکا اور گیا دونوں اجزا کے استعمال کے طریقے وہ ہو سکتے ہیں جو کُل کے معنی دے سکیں۔ جیسے اندرون مرکز ساخت کے جملے کے جزو دے سکتے ہیں۔

درون مرکز تراکیب کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ ایک وصفی ترکیب دوسری ترکیب عطفی کہلاتی ہے۔ وصفی ترکیب میں مرکز اور وصف دونوں موجود ہوتے ہیں جن کو جملوں میں درج ذیل چار طریقوں سے استعمال کیا جاتا

ہے۔

۱۔وصف پہلے اور مرکز بعد میں مثلاً خوبصورت لڑکا، عمدہ باغ، بڑا گھر وغیرہ۔

۲۔مرکز پہلے اور وصف بعد میں مثلاً قیمت زیادہ، پانی میٹھا، کنواں گہرا وغیرہ۔

۳۔ وصف غیر مسلسل جبکہ مرکز درمیان میں ہوتا ہے۔ مثلاً ''ایسی خواہش جو مکمل ہو جائے''۔خواہش وصف جبکہ مکمل ہو جائے مرکز ہے۔اس میں وصف غیر معین ہے۔

۴۔مرکز غیر مسلسل جبکہ وصف جملے کے درمیان ہو۔مثلاً '' آنہ سکے، کھا نہ سکے، آ بھی جاؤ وغیرہ۔ میں نہ اور بھی وصف کی صورت مرکز میں موجود ہیں۔جبکہ جملے کے باقی ارکان غیر مسلسل حالت میں موجود ہیں۔

عطفی ترکیب

اس ترکیب میں دونوں جز و متصل مرکز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ان میں وصف موجود نہیں ہوتا ان کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔''اور'' کے استعمال سے پہچانی جانے والی تراکیب کو ضافی تراکیب کہا جاتا ہے۔مثلّا ناصر اور مہران، کمزور اور طاقتور، وغیرہ۔کئی مواقع پر اردو زبان میں اور کی جگہ ''وْ'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ ط دل و جان، خس و خاشاک وغیرہ یہ بھی اضافائی تراکیب کہلاتی ہیں۔بعض ایسے مقام بھی ہیں جہاں ''اور''، ''وْ'' کے استعمال کے بغیر بھی دو جز و اضافائی سمجھے جاتے ہیں مثلاً بھائی بہن، ماں بیٹی، چھوٹی بڑی وغیرہ۔

اضافائی کے بعد متبادل تراکیب بھی مستعمل ہے۔ایسی تراکیب میں ''یا'' کو استعمال کیا جاتا ہے۔مثلّا '' ناصر یا احمد، کل یا آج وغیرہ۔بعض حالتوں میں ''یا'' کا استعمال کے بغیر بھی متبادل تراکیب کا استعمال سامنے آتا ہے۔مثلاً ''ناصر احمد''، ''آج کل'' وغیرہ۔

ایسی تراکیب جن کے اجزا کے درمیان نشان موجود نہیں ہوتا ''برجستہ تراکیب'' کہلاتی ہیں۔اور ان

دونوں میں سے کسی کو بھی مرکز قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وزیر اعظم نواز شریف، صدر ممنون حسین وغیرہ۔

درون مرکزی تراکیب کی طرح دنیا کی زبانوں میں بیرون مرکز تراکیب بھی لاتعداد ہیں۔ ان تراکیب کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا گروہ اس کی آمری حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں ایک جزو متصل آمری یا رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جبکہ دوسرا جزو متصل محور کا کام کرتا ہے۔ مثلاً ''دریا میں'' اس ترکیب میں ''دریا'' اور ''میں'' رہنما ہے۔ اسی طرح آسمان میں، زمین پر وغیرہ اس کی امثال ہیں۔ دوسرا گروہ ربطی ترکیب کہلاتا ہے۔ جس میں ایک جزو متصل رابطہ اور دوسرا خبری وصف ہوتا ہے۔ مثلاً ''حیرت ہے'' میں ''ہے'' خبری وصف کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ جبکہ حیرت رابطے کے طور پر سامنے آ رہا ہے۔ اردو میں عام طور پر یہ رابطہ غیر مسلسل ہوتے ہیں۔ خبری تراکیب میں ایک جزو متصل ''عنوان'' کہلاتا ہے۔ جبکہ دوسرا جزو ''تبصرہ'' ہوتا ہے۔ یہ مکمل جملے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ''راشد نادان ہے۔'' ''راشد'' عنوان ہے۔ کیونکہ اس کے بارے میں مکمل جملہ ادا کیا گیا ہے۔ جبکہ ''نادان انسان'' تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ''وہ عورت جو کل آئی تھی'' میں ''وہ عورت عنوان جبکہ ''جو کل آئی تھی تبصرہ ہے۔ ان تراکیب کی مزید اقسام ''امری، ربطی اور خبری'' ہیں۔ امری، تراکیب کو معنوی تراکیب، جاریہ تراکیب، اور عطفی تراکیب میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ ربطی تراکیب کو جملے کو بامعنی بنانے کے لیے رابطہ اور وصف میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور خبری تراکیب کی تقسیم عنوان اور وصف میں کی جاتی ہے۔ (۳۱)

نحوی عمل

جملوں میں الفاظ کی ترتیب عمودی ہوتی ہے جس میں الفاظ ایک کے بعد دوسرا خاص ترتیب میں ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کہ ایک دوسرے کے قریب موجود الفاظ ساخت اور معنی کے لحاظ سے بھی قریب ہوں۔ الفاظ کے درمیان موجود رشتہ عمودی ترتیب میں ہوتا ہے۔ الفاظ میں رشتہ یا قربت قائم کرنے کے عمل کو نحوی عمل

کہتے ہیں۔ جب الفاظ اپنے معنی کی وجہ سے ایک دوسرے سے مربوط سمجھے جاتے ہیں۔ تو ایسے عمل کو انتخابی عمل کہا جاتا ہے۔ ان جملوں میں اسم اور صفت میں پائی جانے والی قربت معنی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً اچھا آدمی، خوبصورت رومال، وغیرہ۔ انتخابی رابطہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعض حالات میں دو الفاظ کی قربت ذو معنویت کو جنم دیتی ہے۔ جس کو صرف سیاق وسباق کے تناظر میں دور کیا جاسکتا ہے۔ سیاق ہی الفاظ اور معانی کے رشتے کو واضح کرتا ہے۔ اس لیے اس کو مربوط عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ''پی لی ہے''۔ ذو معنویت لیے ہوئے جملہ ہے۔ جب تک اس کو سیاق میں نہیں بولا جائے گا اس کی ذو معنویت کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر فقرہ اس طرح تحریر کیا جائے'' مریض نے دوا پی لی ہے''۔ تو ذو معنویت دور ہو جائے گی۔ اس لیے جب الفاظ کسی نشان کے ذریعہ سے منسلک ہوں گے تو یہ عمل ''نشان گر'' کہلائے گا۔ مثلاً ''اور، پر'' وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ نشان گر ناقص بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''لیکن، اگر'' وغیرہ۔ کتاب اور کاپی، قلم یا پنسل میں ''اور، یا'' کے الفاظ نشان گر کی صورت موجود ہیں۔ ایسے اعمال کے ساتھ الفاظ تصریفی اعمال سے بھی ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں۔

مطابقت

کسی جملے میں الفاظ کی اشکال اس جملے میں موجود دوسرے الفاظ کی اشکال پر منحصر ہوتی ہیں۔ اس حالت کو مطابقت کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو میں صفتی الفاظ اسم کی شکل پر انحصار کرتے ہیں۔ مثلاً ''اچھی لڑکی، اچھا لڑکا'' وغیرہ۔ اسی طرح اردو زبان میں اسماء اور اشکال بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً ''لڑکے گئے، لڑکا گیا، لڑکی گئی'' وغیرہ۔

مطابقت

دنیا کے اکثر مما لک میں الفاظ کی نوعیت ان کے تصریفی عمل سے منسلک ہوتی ہے۔ اردو میں بھی اسم حالت کو تصریفی بنیاد پر کئی طرح سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اسم کی اشکال فاعلی یا غیر فاعلی حالتوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ''آدمی کہتا ہے''۔ فاعلی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ ''آدمی نے کہا'' غیر فاعلی حالت کا اظہار ہے۔ ارو میں فعل اور مفعول میں جنسی لحاظ سے مطابقت موجود ہے۔ مثلاً ''میں نے کتاب پڑھی، میں نے خط لکھا''۔ دونوں فقرات میں فاعل ایک ہی ہے لیکن اس کا نحوی عمل ایک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان میں مطابقت پیدا کرنے کا داخلی حوالہ دیا جاتا ہے۔

ترتیب الفاظ کی اہمیت بعض زبانوں میں بہت زیادہ ہے۔ اردو میں بھی الفاظ کی ترتیب کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی جملے میں الفاظ کی ترتیب اس جملے کو با معانی اور با مقصد بنانے کے ساتھ اس جملے کی قدر و منزلت کو کم کرنے کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ جملے میں الفاظ کے مقام کا چناؤ اور ساختی الفاظ کی ترتیب، ان سے پہلے اور بعد میں آنے والے الفاظ کی اہمیت فقرے کے بامعنی ہونے میں اہم کردار ادا کرتے ہین۔ مثلاً ''ارشد نے کتاب کو پڑھا'' یا ''ارشد نے کتاب پڑھی''۔ ان فقرات میں نے اور کو ساتھی الفاظ ہیں۔ جن کے اپنے لغوی معانی نہیں ہیں۔ مگر جملے کی ساخت میں ان کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان فقرات میں اگر ''ارشد اور کتاب'' کی ترتیب کو بدل دیا جائے تو معنی بھی تبدیل ہو جائیں گے۔ اس یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقرات کی تشکیل میں الفاظ کی ترتیب کس قدر ضروری ہے۔ ان فقرات کی روشنی میں ایک بات کی مزید وضاحت سامنے آتی ہے کہ ''کو'' کی اہمیت ان فقرات میں اس قدر نہ ہے جتنی ''نے'' کو حاصل ہے۔ مگر اس سے یہ مراد ہرگز نہ لی جائے کہ ''کو'' بے معنی لفظ ہے۔ بعض فقرات میں ''کو'' بنیادی نوعیت اور حیثیت میں موجود ہوتا ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی فقرات کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ مثلاً ''حامد نے اسلم کو مارا''۔ اس فقرے سے ''کو'' کے اخراج سے ''حامد نے اسلم

مارا'' جیسا بے معنی فقرہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے ''کو'' کی اہمیت اپنی جگہ موجود اور مسلم ہے۔ کیونکہ ''کو'' کی موجودگی اور عدم موجودگی میں فقرات کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے قطعی مختلف معنی دینے لگتے ہیں۔ (۳۲)

اس طرح اردو زبان میں ساختی الفاظ اور ترتیب الفاظ دونوں نحوی عمل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی نحوی عمل کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ''لاطینی زبان'' دنیا کی واحد ایسی زبان ہے جس میں الفاظ کی ترتیب کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ کیونکہ اس زبان میں جملے کے تمام الفاظ میں مختلف تصریفی اعمال ہی فاعل اور مفعول کی حالت کو واضح کر دیتے ہیں۔ جس سے ان کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔ (۳۳)

ولیم جانسن نے تقابلی لسانیات کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ میکس مولر نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کی بدولت سنسکرت تعلیم میں لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ ولیم جانسن کے نظریہ پر عمل کرنے کی وجہ سے میکس مولر نے سنسکرت، یونانی، لاطینی اور فارسی زبانوں کو ایک خاندان کے طور پر پیش کیا۔ اس نظریہ کی بدولت لسانی مماثلتوں پر زیادہ اور اختلافات پر کم توجہ دی گئی۔ معاملہ یہیں تک ختم نہیں ہو جاتا یہ جدید لسانیات کے مباحث کا پس منظر ہے جس کی مدد سے ہم لسانیاتی میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کی غیر معمولی نوعیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ولیم جانسن کے بعد میکس مولر شعبہ لسانیات میں اہم نام ہے۔ ان کے اہم ترین کاموں میں لسانیات کے عمل میں ''شہادتوں کے ذریعہ قدیم اداروں کی تشکیل نو'' کا نظریہ پیش کیا۔ میکس ہولر نے ایک اور نظریہ ''ثقافتی تشکیل نو'' کا بھی پیش کیا۔ (۳۴) جو غیر سائنسی پن کی بدولت اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ میکس مولر زبان کو درجہ بندی کا آلہ قرار دیتے ہیں۔ اُس نے یورپی اور ہندی مذاہب کی از سر نو مطالعہ کی اہمیت پر زور دیا اور تشکیل شدہ زبانی

جڑوں کی بازیافت پر زور دیا۔میکس مولرلسانیات کے تاریخی ارتقاء پر اپنے نظریہ کی بنیاد قائم کرتا ہے۔سر برٹرینڈ رسل اور فائٹ ہیڈ کی تصنیف (Principal Mathematic) نے تجزیاتی ریاضی کو ختم کرنے میں اہم کردارادا کیا تجزیاتی ریاضی کے اس اختتام نے لسانیات پر بھی اثرات مرتب کیے۔وٹ گن اسٹائن کے خیالات نے لسانیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وٹ گن نے فلسفہ کو''لسانی تجزیہ'' بنا کر رکھ دیا۔ان نظریات نے ساختیات،اورعمرانیات کو بھی خاصا متاثر کیا۔وٹ گن کوترقی پسندوں نے محض وجودی فلاسفر سے زیادہ اہمیت نہ دی یہی وجہ تھی کہ وہ ہم عصری زبانوں کے ادراک میں کافی پیچھے رہ گئے۔وٹ گن سٹائن پر'' کامتے'' کے اثرات کافی گہرے ہیں۔کامتے جس نے اپنی زندگی کے آخری سال یک ایجابی کی تشکیل میں گزارے جس میں اُس نے خدا کی جگہ انسانیت کو دے دی۔کامتے نے تاریخ کو کافی اہمیت دی۔کامتے تکمیل کے مراحل طے کرنے کے لیے رجائیت کا سہارالیتا ہے۔صوری زبان کے مقلداس دعویٰ پر مصر ہیں کہ روزمرہ میں استعمال ہونے والی زبان بہت ابہام رکھتی ہے اور کافی پیچیدہ ہے یہ مائع کی طرح بہتی ہے اوراس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔جدیدصوری زبان منطقی ممکن طور پر زیادہ سے زیادہ قطعیت کی بات کرتی ہے۔اس کا حصول اُسی وقت ممکن ہے پائیدار اور قابلِ ادراک نشانات اور علامات پر مشتمل درست زبان تشکیل پائے۔وٹ گن اسٹائن علامتی زبان کا بڑا دعوی ہے۔ ہماری نئ اُردوشاعری کے اکثر مجموعے وٹ گن اسٹائن کی اشاراتی زبان کے تناظر میں تحریر کیے گئے محسوس ہوتے ہیں۔وٹ گن کے خیال میں روایتی شاعری کا بیشتر حصہ اس لیے ضائع کردینے کے قابل ہے کہ اس میں استعمال ہونے والی زبان قطعیت اور منطیت کا فقدان ہے۔ یہ زبان مابعدالطبیعاتی توہمات سے بھرپور ہے۔وٹ گن اسٹائن زبان کے بارے میں اس تخیل کے حامی تھے کہ ایک علاقہ میں فکر کا ایسا اظہار جو محسوسات کی وجہ سے ممکن ہوسکے۔وٹ گن اغلاط سے بچنے کے لیے اشاراتی زبان کے استعمال کی حمایت کرتے ہیں۔وہ اشاروں میں ابہام کر رد کرتے ہیں۔اُن کے مطابق ایک اشارہ مختلف علامتوں کے لیے استعمال نہ ہوسکے۔وٹ گن کا خیال تھا کہ حقیقتوں کو حقائق

ہی رکھا جائے اُن کو اشاروں کی زبان نہ دی جائے تا کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ قابل فہم بنایا جا سکے۔ وٹ گن اسٹائن نے اشاراتی زبان کے استعمال میں جو بنیادی اضافہ کیا وہ یہ تھا کہ ایک پیچیدہ اشارہ اشیاء کے درمیان پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے وٹ گن اسٹائن اپنے رسالہ (Tratartus) میں اپنی بات کو یوں آگے بڑھاتے ہیں دنیا ہی سب کچھ ہے۔ حقائق کی منطق تصور پر مبنی ہے۔ تصور ایک بامعانی جملہ ہے ہر جملہ ابتدائی جملوں کی تصدیق کرتا ہے اور جب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تو اُسے خاموشی اختیار کرنی چاہیے (۳۵)۔

وٹ گن سٹائن کا رسالہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اس رسالے کی وجہ سے لسانیات کی دنیا میں تہلکہ پیدا ہو گیا۔ وٹ گن کے مطابق جو زبان یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ منطقی شرائط پر پوری اُتر سکے وہ زبان ہی نہیں وٹ گن کے نزدیک ہر جملہ میں الفاظ اور فعال کے عناصر ایک دوسرے کے برابر ہوں۔ جہاں بھی اس توازن میں فرق پیدا ہو گا وہیں سے انتشار جنم لے گا۔

وٹ گن سٹائن ایک طرف تو ایجابیت کی طرف جاتے محسوس ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف انیسویں صدی کے میکانکی فلسفے سے بے زار نظر آتے ہیں۔ اس طرح وٹ گن سٹائن کے نظریات کو سمجھنے میں بے پناہ مشکلات درپیش ہو جاتی ہیں کیونکہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۱ء کے دوران وٹ گن سٹائن کی فکر میں کافی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہمیں ایک مقامی زبان کے سحر میں گرفتار نظر آتے ہیں جبکہ ان کی وفات کے دو سال بعد شائع ہونے والی Philosphical Insvestigation میں وٹ گن کے خیالات میں تبدیلی کی صورت سامنے آتی ہے۔

آخری دور کا وٹ گن سٹائن اپنے فلسفہ لسانیات میں کئی تبدیلیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے جس کے مطابق مثالی زبان کے ذریعہ غلطیوں کی اصلاح ممکن نہیں۔ اس طرح وٹ گن ۱۹۲۱ء میں قائم کئے گئے اپنی فلسفہ کی نفی کر دیتے ہیں۔ کیونکہ پہلے وہ اس خیال کے حامی تھے کہ تمام کلمات کو سادہ اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ منطق

کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے مگر بعد میں اپنی آخری کتاب میں وہ لسان کو شطرنج کے کھیل سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ جتنی زیادہ کھیل میں مہارت حاصل ہوگی اتنا ہم اس کی چالوں کو سمجھ پائیں گے بالکل اس طرح زبان کے استعمال سے ہی ہم الفاظ کے معانی اخذ کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ خود اپنے نظریے کی نفی کرتے ہیں کہ لسانی تشکیلات ممکن ہیں زبان تشکیل نہیں دی جا سکتی بلکہ زبان کا کھیل ہی درست زبان تک رسائی کو ممکن بنا سکتا ہے۔ Wisdom of the west میں برٹنڈ رسل اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ عام زبان خیالات کی رسائی کے لیے کافی ہے لسانیات میں سارے مسئلے صرف ونحو کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ سوشلسٹوں نے لسانیات کے مسائل پر اب تک جو کچھ لکھا ہے اُس میں بھی مثالی زبان کی وکالت نہیں کی۔ وٹ گن سٹائن کی مثالی زبان پر ایک اور اعتراض جو کیا جاتا ہے وہ Sign Language کو مکمل کرنے کے لیے کون سے معروضی اصولوں کو اپنایا جائے۔ فانیا پاسکل نے Wittguistein Apersonal میں وٹ گن سٹائن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سوشلزم کے خلاف تھے۔ فانیا پاسکل، وٹ گن اسٹائن کے اُستاد تھے۔ انہوں نے وٹ گن سٹائن کی مارکس سے نفرت پر اظہار ناپسندیدگی کیا۔ وٹ گن اسٹائن فرائڈ کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسٹائن کے ہاں Super Ego یا Ego کی کشمکش موجود نہیں۔ عقل سلیم کے نظریہ کے بعد سے وٹ گن اسٹائن نے اپنے اولین خیالات کو بے معنی قرار دیا جس کی وجہ سے اسٹائن نے آنے والی محققین پر بھاری ذمہ داری عائد کر دی ہے۔

معنیات

علامتی نظام کے اظہار کے لیے معانی ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ معانی وہ قوت ہے جو علامت اور بیان کے درمیان تعلق قائم کرتی ہے۔ گفتگو کے مختلف انداز مختلف معانی کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس انداز میں گفتگو ہوگی وہ معانی کی جانب اشارہ کرے گی۔ معانی کے معلوم کرنے کے طریقے مکمل طور پر ثقافت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ اور یہی معانی اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرنا کہ مخصوص ثقافت میں رہنے والوں کا اسلوب مخصوص

ہوتا ہے۔ نہ تو مکمل درست ہے نہ ہی غلط ہے۔ تاہم آزمائش اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ یکساں معاشرتی حالات میں رہنے والے لوگ عموماً ایک روپ کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی روزمرہ زندگی اور گفتگو میں متوازی پن پایا جاتا ہے۔ اس سے معاشرہ کی تنظیم ظاہر ہوتی ہے یہ معاشرتی تنظیم کرداری حوالوں سے انسانی رویوں کی تشکیل میں مدد کرتی ہے۔

ڈاکٹر رقیہ حسن منظّم خیالات اور تصورات کو انسان میں پنہاں تصور کرتی ہیں۔(۳۶) کچھ خیالات اور تصورات ہی ایک مخصوص معاشرے کے اس دنیا کے بارے میں نظریات قائم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق ''یہ کائنات مکمل طور پر ایسی ہی مسلط نہیں کی گئی'' انسان نے کائنات کو تشکیل کرنے اور موجودہ صورتحال تک اس میں تبدیلی لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کائنات میں موجود بے رحم پن اور پختہ عقائد انسانی تصورات کی پیداوار ہیں۔ اسلوب میں موزونیت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب انتشار پیدا کیے بغیر ضروریات زندگی کی تکمیل ممکن ہو سکے۔ ایک ثقافتی معاشرہ میں رہنے والوں کے درمیان موزوں پن مخصوص ثقافت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی پہلو ایک دوسرے کی مخالفت اور جارح پن سے بچاتا ہے۔ ایک مخصوص ثقافت میں موزونیت کی بنیاد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس سماج کو سمجھنا ضروری ہے۔

مخصوص ثقافتوں کا اسلوب کا اطلاق براہ راست معنویات پر ہوتا ہے۔ معنویاتی اسلوب ہمیں بہتر طور پر ادا کیے گئے الفاظ کی معانی سے روشناس کرانے میں مددگار رہتا ہے۔ اسی طرح ایک معنویاتی اسلوب کو بھی ایک مخصوص ثقافت میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ منطقی طور پر یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ایک مخصوص ثقافت میں استعمال کیے جانے والے لسانیاتی اسلوب کو 'معانیات'' ہی اُس ثقافت سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہے۔ ثقافتی حد کو قائم رکھنے کا کام مشکل ہے کوئی بھی ثقافت دوسری ثقافت کی ہم جنس نہیں ہوتی اور نہ ہی زبان مشترک ہوتی ہے۔ اس طرح کسی ایک ثقافت میں بسنے والوں کے خیالات اور تصورات کو کسی دوسری ثقافت میں رہنے

والوں پر لاگو کرنا غلط ہو سکتا ہے۔ دو ثقافتوں کے درمیان موجود تعلقات پیچیدگی کا اظہار ہیں۔ ڈاکٹر رقیہ حسن نفاست کے اعتبار سے ثقافتی حد تغیر پر یقین رکھتی ہیں۔ اُن کے مطابق ثقافتی نفاست اپنی وضع قطع کے ساتھ ہی منفی تغیر کو قائم رکھنے کا باعث ہوتا ہے۔ ثقافتی حدود کا تعین کرنا اُن کو تسلیم کرنا ہی ثقافتی تضاد کو جنم دیتے ہیں۔ ثقافتی تضاد سے مراد ثقافتی انحراف ہے جو دو ثقافتوں کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ دو ثقافتوں میں جو قریب ترین تعلق موجود ہے وہ لسانی رشتہ ہے جو اشیاء کی بعض حالتوں کو دونوں معاشرتوں میں یکساں طور پر پیش کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں ثقافتوں کے درمیان خاص نوعیت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر رقیہ حسن مخالفین کی اس تنقید کو رد کر دیتی ہیں جس کے مطابق بڑے پیمانے پر ماحولیاتی اجتماع کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر رقیہ حسن ثقافت اور اُس کی ذیلی ثقافتوں کے درمیان تضاد کو خود ساختہ تضاد قرار دیتی ہیں۔ یہ تضادیاتی ثقافت زبان کو بولنے والے کے لیے نا قابل فہم اس لیے ہو جاتی ہے کہ اُس کے باطن میں نظریاتی تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق لسانیات ایسا لباس ہے جو گفتگو کرنے والے کو تبدیل نہ ہونے کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔ یقیناً معانیات کی اہمیت کو اس معاملے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تضاداتی ثقافت اور معنویاتی اسلوب کی وضاحت میں کوئی ایسا مسئلہ درپیش نہ ہے جو نا قابل تسخیر ہو۔ لسانیات اپنی حدود کے اندر معانی کے اظہار کے بے شمار ذرائع رکھتی ہے۔ لسانیاتی نظام بولنے والے کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے الفاظ کا چناؤ کرے۔ اور اپنی بات کو درست انداز اور نا قابل فہم انداز میں واضح کر سکے۔ پہلے سے سوچے گئے خیالات کو زبان پر لانے کے لیے ثقافتی تناظر کا خیال رکھنا اہمیت کا حامل ہے۔ وگرنہ مخاطب اور سامع ایک دوسرے کے معانی تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گے اور ابلاغ بے معنی رہ جائے گا۔

معانویاتی فاصلے

لسانیات بھی ثقافت سے مماثلت کی بنا پر معانیاتی اسلوب میں اختلاف رکھتی ہے۔ یہ لسانی اختلاف

ثقافتوں کے درمیان طرزِ عمل میں اختلاف کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ (ولنگسٹن ۱۹۲۱ء) کے مطابق ''انسان خود کو جس کیفیت میں پاتا ہے اُس کا اظہار کرتا ہے'' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے انسان کو مختلف ثقافتوں میں اظہار کے طور طریقے اور الفاظ کے معانی سے شناسائی نہ ہونے کے باعث وہ اُس ثقافت کے رہنے والے لوگوں کے قدم سے قدم ملا کر چل نہیں پاتا۔ معنویاتی فاصلوں کی سب سے بڑی وجہ وہ حقائق ہیں جو معانی کی تشکیل دیتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ دو مختلف زبانوں کے درمیان معانوی فاصلوں کی پیمائش لغتی فرق یا انفرادی اختلافات کے باعث ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے زیادہ مناسب طریقہ معنویاتی تنظیم کی بنیاد کا مطالعہ ہوگا۔ ڈاکٹر رقیہ حسن سمجھتی ہیں کہ معنویاتی فاصلے موجود زبانوں کے درمیان موجود ہوتے ہیں ان کی وضاحت کے لیے اُن اصولوں کو جاننا اور مطالعہ کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے دو زبانوں نے معنویاتی فاصلوں کو جانا جا سکے۔

معانوی فاصلوں کی وضاحت کے Whorf نے اپنی تحقیقات میں ایک قدم آگے بڑھایا۔ انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ پتھر کا پتھر یلا پن اور بادل کا ہلکا پن دونوں حقیقت ہیں۔ اور ٹھوس حالت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لیکن ایک ہندو کے لیے آپ ایک پتھر کو دیوتا ہونے سے نہیں روک سکتے۔ اس طرح ایک ۔۔۔۔ بادلوں کو روح پھونکنے کا سبب سمجھنا ہے۔ Whorf کے مطابق پتھر ایک وقت میں دو حالتوں کی اہمیت اُس سخت شے سے زیادہ نہیں جو پاؤں کو زخمی کر دیتا ہے۔ دوسری جانب وہ ایسے دیوی دیوتاؤں کے روپ میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جو خواہشات کو پورا کرنے کا اہل قرار پاتا ہے۔ حقیقت میں ٹھوس شے کے اظہار کے دو مختلف طریقے ہیں جو معانی میں اختلاف کے باعث ایک ہی علامت کو اظہار کے مختلف روپ عطا کر دیتے ہیں کہ اُس کی معانویت اور اہمیت یکسر بدل کر رہ جاتی ہے۔ (۳۷)

ڈاکٹر رقیہ حسن اُن ماہرین لسانیات پر نقطہ چینی کرتی نظر آتی ہیں جو اپنی توجہ کا مرکز لغتی گرامر کو بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں ایسے ماہرین اپنے مقصد سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور وہ معانی کی تبدیلی کی وجوہات جاننے سے

قبل ہی اپنے سفر کا اختتام کر بیٹھتے ہیں۔ جو ڈاکٹر رقیہ حسن کے نزدیک محض ابتدائی امکان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس مفہوم کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم بات کرنے کے دو خاص طریقوں پر گفتگو کریں۔ ایک طریقہ غیر مبہم اور ممکن جبکہ دوسرا طریقہ مبہم گفتگو کا ہے۔ اس سے ایک بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ خاص قسم کا مکمل اسلوب خاص سماج کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اسلوب اُس معاشرت میں رہنے والوں کے رویوں کا عکاس ہوتا ہے۔ اس اسلوب کا تعلق سماجی ڈھانچے سے ہوتا ہے۔ یہ اسلوب ایسی مطابقت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے جو خاص علاقوں تک اپنے اثرات کو مرتب کرتا ہے جس سے دو مختلف زبانوں میں تقابل پیدا ہوتا ہے وہ ثقافتی فرق جو دو معاشروں کے درمیان موجود ہوتا ہے وہ معانویاتی فاصلوں کو جنم دیتا ہے۔

واضح اور پوشیدہ اسلوب بھی معانویاتی فاصلوں کا باعث بنتے ہیں۔ جب کوئی بھی شخص اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے کسی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ واضح اسلوب کے بیان کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا سامع بھی موجود ہو جو اُس زبان سے متعلق ضروری معلومات بھی رکھتا ہو جس میں وہ پیغام دیا جا رہا ہے۔ تا کہ وہ اُس پیغام کو درست طریقے سے سمجھ سکے اور کہنے والے کا مدعا مکمل ہو سکے۔ دوسری صورت میں اگر پیغام کا اسلوب پوشیدہ ہے تو اُس کے لیے ایسے سامع کی ضرورت ہو گی جو اُس کے پوشیدہ معانی تک رسائی کی اہلیت رکھتا ہو۔ ایسے سامع کی عدم موجودگی میں پیغام کی ترسیل بے معانی ہو کر رہ جائے گی۔ ضروری ہے کہ سامع کو اُن حالات سے بھی آگاہی حاصل ہو جس میں وہ پیغام جاری کیا گیا۔ عمومی لسانی معلومات کا حصول بے حد ضروری ہوتا ہے مگر بعض حالات میں یہ معلومات ناکافی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ابلاغ مکمل نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ کسی مخصوص نقطہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے سیاق وسباق تک بھی رسائی حاصل ہوتا کہ سامع کو ابلاغ میں موجود واضح اور پوشیدہ دونوں اسلوب کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

واضح ابلاغ بغیر کسی خارجی حوالہ کے عام بولنے والے اور سامع کے لیے ایک خاص مجوزہ تاویل رکھتا

ہے۔ واضح اسلوب خود انحصاری طور پر معانیاتی مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔ جبکہ پوشیدہ ابلاغ کے معانی تک رسائی کے لیے خارجی ذرائع سے مدد حاصل کی جاتی ہے۔ غالباً تمام انسان زبانوں میں واضح اور مضمراتی اسلوبوں کے درمیان فاصلے موجود ہیں۔ کسی بھی متن کی مکمل تفہیم کے لیے یہ فاصلے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ ہالیڈے کے مطابق ایک ہی وقت میں کی جانے والی بات چیت میں دونوں قسم کے اسلوب کی موجودگی کا امکان بھی موجود رہتا ہے۔ گفتگو کے کچھ واضح اسلوب اور کسی حد تک پوشیدہ اسلوب پر اس انداز میں ہوتا ہے کہ گفتگو کا سامع اس سے کیا معانی اخذ کرتا ہے۔ پوشیدہ حالت بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ حالت جس کے ذریعے سے آپ ایک گروہ کسی موجودگی میں بھی اپنا مدعا کسی خاص شخص تک پہنچا دیں یہ حالت صرف دو لوگوں یعنی مخاطب اور سامع کے درمیان تعلق کا ہے جبکہ دوسری صورت مضمراتی اسلوب کی اشاروں، تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے اپنی گفتگو کے معانی دوسرے تک پہنچانا ہیں۔ واضح رہے مکمل مضمراتی اور مکمل صریحی اسلوب دونوں ابلاغ کے اہم پہلو ہیں۔(۳۸)

کسی بھی متن کی تشکیل میں مضمراتی اسلوب اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مضمراتی ذرائع سے تلخیص نگاری بنیادی متن کی معنویات کی عکاس کرتی ہے۔ یہ معنویاتی نقطہ خود کلامی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس طرح مضمراتی تدابیر انسانی تدابیر کا حصہ قرار پاتی ہیں۔ انگریز کا زبان میں ان تدابیر کو زیرِ بحث لانے کے لیے Ellipsis کی اصطلاح کو استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم تمام گفتگو کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مضمراتی اسلوب کی ترجمانی کو کس طرح ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

مضمراتی تراکیب کی وضاحت

بعض حالات میں گفتگو کے دوران استعمال کیے گئے الفاظ کی ترجمانی موجود متن فراہم نہیں کر پاتا۔ کئی موقع پر ہمیں اُن الفاظ کے درست معانی تک رسائی کے لیے سیاق وسباق کا جاننا ضروری ہو جاتا ہے جس کے

تناظر میں وہ گفتگو ہو رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ الفاظ کا اظہار متعلقہ حالات میں لپٹا ہوتا ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ الفاظ کے معانی ہمیشہ یکساں ہوں بلکہ الفاظ اپنے معانی کو موقع بہ موقع بدل دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں ایک لفظ مختلف مقامات پر مختلف معانی دیتا محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح محل وقوع کے ساتھ ساتھ معانی بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اگر مضمراتی ترکیب کی تشریح کا تعلق متن کے ذیلی حصہ سے ہو تو عام طور پر گفتگو کرنے والوں کے لیے معانی تک رسائی میں بہت کم دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ یا بالکل دشواری پیش نہیں آتی اُس کی وجہ مضمراتی تراکیب میں معانی کی ترتیب ہے جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے نہیں ہوتے۔ بعض اوقات متن میں ترکیب فطرت خود فراہم کرتی ہے۔ جب اسماء کے درمیان معانوی رابطہ پیدا ہوتا ہے تو تشریحی ذرائع بہتر بنتے ہیں یہ تشریحی ذرائع شے کی معنویت کے لیے معیار مقرر کرتے ہیں۔ یہ معیارات معانوی رابطے ہو سکتے ہیں اور تعلقات کی وضاحت بھی ان سے کی جا سکتی ہے۔ سامع عموماً ذیلی متن کو جاننے کا مستند ذریعہ ہیں۔ موضوعاتی طور پر شروعاتی عملداری کا مطلب آسان اور سادہ زبان کا استعمال ہے جس کے ذریعے سے مطالب جانے جا سکیں اور معنویاتی ربط کو قائم رکھا جائے اگر چہ ہماری طور پر یہ سادہ بات ہے مگر اس پر عمل کرنا پیچیدگیوں کو جنم دیتا ہے۔ مترادف الفاظ کے زیر اثر انتشار، تکرار اور اختلاف معانی کو آپ اس عمل میں شامل کر سکتے ہیں۔

چنانچہ ذیلی متن سے رسمی اصولوں کی جانچ واضح اور مستند طور پر موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ترمیمی حالت لغت میں انتشار پیدا کرتی ہے۔ ایسی کوئی وجہ نہیں ہوئی کہ ایک ہی ثقافت کے رہنے والے مخاطب اور سامع ایک دوسرے کی گفتگو سے واقفیت نہ رکھتے ہوں۔ معنویاتی تشریح ظاہری طور پر اگر چہ سادہ عمل ہے۔ جس کو بغیر کسی مسئلے کے ایک ہی مرحلے میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر چہ سامع اُن تمام عوامل سے بے خبر ہوتا ہے۔ کہ وہ فطری طور پر کسی طرح سے بات کو جانچنے کے عمل میں خود کو مصروف کر لیتا ہے۔ تشریحاتی عمل کی پیچیدگی کو جاننے کے لیے ماہر لسانیات بہت سے معانوی تعلقات کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ایک پائیدار مفروضے

کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ مگر جہاں تک عام بولنے اور سننے والے کا تعلق ہے اُن کا مدعا صرف درست تعلق کو استوار کر کے بات کو سمجھنے تک محدود ہوتا ہے۔ اور اس عمل کے لیے ضروری بات محض اتنی ہے کہ سامع اور مخاطب اپنی زبان سے واقفیت رکھتے ہوں۔ ہالیڈے نے اس کی وضاحت ایک جملے میں اس طرح کی ہے ''یہ جاننا ضروری ہے کہ نقطہ کے معانی کیا ہیں''؟

اگر ہم اس بحث سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پوشیدہ معانی اور واضح تدبیر میں کوئی فرق نہیں۔ مضمراتی معانی کی رسائی کے لیے متن کے سیاق وسباق کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔ جبکہ واضح تدبیر کی وضاحت کے لیے محض زبان کے بارے میں عمومی علم کی ضرورت ہے۔ اگر ایک ہی جملے میں واضح اور مضمراتی دونوں تدابیر موجود ہوں تو بھی زبان کا عمومی علم رکھنے والا درست معانی کی رسائی کے لیے محل وقوع اور حوالے کا محتاج ہوتا ہے۔ ایسا مشکل ہوتا ہے کہ ہم لفظ کے استواری تعلق کی مدد سے اپنی خواہش کے مطابق معانی تک پہنچ سکیں۔ کیونکہ مضمراتی اور واضح اسلوب کا تعلق لسانیات سے آگے ماحول کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ بالمشافہ ملاقات میں واضح تدابیر کا استعمال ماحول کا زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ کسی بھی ابلاغ کے بامعانی اور موثر ہونے کا انحصار بصری ذرائع پر بھی ہوتا ہے جو مخاطب اور سامع استعمال کرتے ہیں۔

ان مشاہدات کے زیر اثر تدابیر کے لیے معانی کی ذیلی درجہ بندی ضروری ہوتی ہے یہ معیارات گفتگو کے حالات پر مبنی ہوتے ہیں جو واضح اور درست ہوں۔ ''حالات'' ایک ایسا لفظ ہے۔ جو واضح تدبیر کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جو فطری طور پر اُس ماحول کا حصہ ہوتے ہیں۔ جن میں سب سے اہم باہمی تعلقات ہیں۔ مخاطب کی خواہش ہوتی ہے کہ سامع اُس کی بات کو سمجھے اور اُس سے وہی معانی اخذ کرے جو اُس کے بیان کا مدعا ہیں یہ سب اُسی وقت ممکن ہو پاتا ہے جب سامع غور سے بات کو سنے تب ہی وہ اُن معانی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے جو مخاطب کی گفتگو میں مضمر ہوتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ معانی مخاطب کے خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔

''فرتھ ۱۹۵۰ کے مطابق'' عام مشاہدہ ہے کہ ایک ہی ثقافتی گروہ سے تعلق رکھنے والا مخاطب سامع کو یہ سمجھا سکتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

اس بات کو بعینہ درست قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انسانی زبان میں موجود نامیاتی فطرت ہے کہ بولنے والا سامع کی سمجھنے کی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زبان کی سرعت کو استعمال کرتا ہے تا کہ سامع تک درست انداز میں اپنے معانی کو پہنچا سکے۔ اور وہ اُس کی بات کے درست معانی تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس تمام عمل یہ بات بھی یاد رہے کہ دو گفتگو کرنے والوں کے درمیان موجود دیگر سامعین کے اذہان میں الفاظ اُس طرح سے ترتیب نہیں پا سکتے جس طرح مطلوبہ سامع الفاظ کے معانی تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے سامع اتفاقی سامع کہلائیں گے۔ بعض حالات میں وہ مخاطب کے الفاظ کے دوست معانی تک پہنچنے پائے ہیں لیکن اکثر اوقات اُن کی رسائی معانی تک نہ ہونے کے باعث اور سیاق وسباق محل وقوع کے بارے میں نہ جاننے کے سبب وہ گفتگو کو بہتر طور پر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق مادی صورت حال میں تبدیلی اور متن کے سیاق وسباق میں فرق کی وجہ سے الفاظ ہم معنی نہیں رہتے۔ کسی مضمون کی ساختی ترتیب پر ماحول بہت کم اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن حالات اور تناظر کو جانے بغیر درست معانی تک رسائی اور متن کی تشریح ممکن نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام سامع گفتگو کو بصری روابط اور ماحول کے تناظر میں ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ اتنا آسان صرف دو وجوہات کی بنا پر ہی ہوسکتا ہے۔ ایک وجہ پیغام کی تشکیل جس میں مضمراتی تدبیر موجود ہے جو مادی تناظر سے واضح ہوتی ہے اور دوسری وجہ الفاظ کی معنویاتی ساخت ہے جو متن کی جانب ایک اشارہ فراہم کرتی ہے جس سے سامع وہ معانی اخذ کرتا ہے جو مخاطب کا مدعا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بولنے والے کی جسمانی حرکات بھی سامع کو معانی کے قریب ترین لے جانے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ جبکہ یہ معانی اتفاقی سامع کے لیے مبہم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک بات واضح ہے کہ چاہے تدبیر خارجی ہو یا مضمراتی ہو معانی تک رسائی کے لیے حالات کے تناظر کا جاننا انتہائی اہم ہے۔ اس کے بغیر

سامع کے لیے ممکن نہیں کہ وہ گفتگو کے متن کی وضاحت کر سکے۔ اگر سامع حاضر ہو اور وہ دیکھ اور سُن رہا ہو تو وہ مادی اور ماحولیاتی تناظر میں جان لے گا کہ بات کا مدعا کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر سامع سے بات کتاب کے حوالے سے ہو رہی ہو اور سامع کتاب کو دیکھ بھی رہی ہو تو وہ اس بات کو جاننے سے قاصر رہے گا کہ کتاب کے اندر مواد کیا ہے۔ ماحولیاتی تناظر سے اُسے یہ تو آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ماحول محض ایک اشارہ فراہم کرتا ہے جس کسی اسم یا شے کے اظہار کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن جہاں تک اس اظہار کی معانوی حالت کا تعلق ہے اُن کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب اور سامع اپنے ذہن میں خاص معیارات رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مضمراتی اسلوب کو سمجھنے کے لیے صرف دیکھنے اور سننے تک محدود نہیں رہا جا سکتا۔ جب مضمراتی تدبیر نا معلوم ہو اس کے اندر معانی مقاصد کے لحاظ مختلف ہو سکتے ہیں۔ پس سامع اس بات کو مکمل طور پر نہیں جان سکتا کہ کچھ خاص معلومات جو اُس نے حاصل کی ہیں آیا وہ اُن کے درست معانی اور مفہوم تک درست رسائی حاصل کر چکا ہے کہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماحولیاتی تناظر میں بات کو خاصی حد تک سمجھ لیتا ہے۔ اُس کی سمجھ اور مفہوم تک درست انداز میں پہنچنا اس کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ سامع گفتگو کو کتنی دلچسپی سے سنتا ہے اور اُس پر کتنا غور کرنا ہے اس طرح یہ بات یقین سے نہیں کی جا سکتی کی گئی گفتگو سے سامع نے جو معلومات حاصل کیں آیا وہ مکمل تھیں یا تشنگی باقی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ کچھ معیارات ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان کو مستقل شناخت فراہم کرتے ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ معنی مکمل طور پر گفتگو کے سیاق وسباق میں موجود ہوتے ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیاق وسباق مکمل معانی فراہم کرے بلکہ سیاق وسباق محض درست معانی کی طرف نشاندہی فراہم کرتا ہے۔ سامعین میں سے جس کے پاس جس قدر علم ہوگا وہ گفتگو کے متن سے اُس قدر مستفید ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ مضمراتی معانی تک درست رسائی میں ماضی میں کی گئی گفتگو سے حاصل ہونے والے تجربات بنیادی طور پر پہچان کے لیے دلیل

فراہم کرتے ہیں۔اس بحث سے حقائق کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے جب سوال کیا جاتا ہے کہ مضمراتی تدبیر میں پوشیدہ معانی تک پہنچنا کتنا سہل ہے؟ اس کا جواب اتنا آسان نہیں ہے تمام معاملات کی وضاحت اتنی آسان نہیں ہوتی۔ ایسی وضاحت کا انحصار موقع اور محل پر ہوتا ہے۔ مادی ترتیب تک مکمل رسائی کی بدولت سامع اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ گفتگو کو شفاف طریقے سے سُن اور سمجھ سکے جس سے مضمراتی تدبیر کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

خارجی تدابیر میں معانی کے لحاظ سے اختلاف موجود ہوتا ہے ان کی اس خاصیت کی بدولت لغت میں درجہ بندی کو بنیاد میسر ہوتی ہے۔''خارجی'' اور مضمراتی کی اصطلاح میں ''عام'' اور ''خاص'' کے متوازی استعمال ہوتی ہیں۔جتنی گفتگو مضمراتی ہوتی جائے گی اُس کے معانی محدود ہوتے جائیں گے۔اس طرح تدبیر کی عمومیت سے معانی میں بھی عامیانہ پن کا اظہار ہوتا ہے۔مگر جیسے جیسے ہم عمومیت سے تسلسل کی جانب بڑھتے جاتے ہیں عمومیت میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے اور معانی میں خاصیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چونکہ مخاطب گفتگو کے مضمراتی معانی سے واقف ہوتا ہے اس لیے وہ توقع رکھتا ہے کہ سامع بھی ان مضمرات کو جان کر اُس کی گفتگو کے درست معانی کو سمجھ لے گا۔مگر مخاطب کے اس دعویٰ کی درست ہونے کا انحصار سامع کی قابلیت پر ہے کہ وہ بات کے مضمراتی پہلوؤں تک کسی حد تک رسائی حاصل کر پاتا ہے۔ ڈاکٹر رقیہ حسن کا دعویٰ ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ مڈل کلاس لوگ گفتگو کے دوران خارجی انداز اپناتے ہیں۔اُن کا یہ دعوی جن دو مشاہدات کی بنا پر ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ زبان کا نظام بذاتِ خود خارجی انداز کو اپنانے کے امکان کی اجازت دیتا ہے۔اور دوسرا یہ کہ خاص ماحول میں ہی چند خاص مضمرات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ اس بات کا عکاس ہے کہ لسانیاتی نظام خود اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کرتا۔

تکرار باہم معانی الفاظ کسی ایسے شخص کے لیے حیران کن نہیں ہوتے جو اُن سے شناسا ہو۔(ایجن اور سلیڈ ۱۹۹۷) کے مطابق انسان گفتگو کی تمام اقسام میں سے عمومی گفتگو سے زیادہ شناسا ہوتا ہے۔ جب تک ہم کسی ماحول

اور گفتگو کا باقاعدہ حصہ رہیں گے وہ گفتگو ہمارے لیے شناسا قسم کی گفتگو رہے گی۔ ڈاکٹر رقیہ حسن کہتی ہیں الفاظ کا مخصوص ڈھانچہ مستقل نوعیت پر قائم رہتا ہے اس لیے ہمارا پختہ یقین ہے کہ ایک ہی قسم کے تمام معاملات میں ہم ایک ہی طرح کی گفتگو میں مشغول رہتے ہیں۔(۳۹) لیکن جب گفتگو بے ربط ہو تو اُس میں اکثر تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے اقتباس کی بناوٹ کو جانے بغیر گفتگو کے معانی تک رسائی ممکن نہیں۔ سماجی لسانیات میں اگر اس الجھن کو شامل کرلیں تو یہ مزید پیچیدگیوں کو جنم دیتا ہے کیونکہ سماجی لسانیات ایک مضبوط اولیت کی حامل ہے جو سماج کے غالب گروہوں کے رویوں اور اثرات کی عکاس ہے جو مغلوب کے رویوں اور اثرات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

غالب گروہوں کی گفتگو چونکہ خارجی نوعیت کی ہوتی ہے لہذا ان میں اکثر بے ربطگی نہیں پائی جاتی۔ جہاں تک کسی سماجی گروہ میں اختلاف کا تعلق ہے وہاں ہم کو یقیناً اس غلط فہمی سے بچنا ہوگا۔ کہ ان کی گفتگو بے ربط ہوگی۔ بعض اوقات ایسا ہی ممکن ہے کہ دو سماجی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان ہونے والی گفتگو مکمل ربط کی حامل ہو۔ کیونکہ بے ربط گفتگو کے درمیان ہونے والے اختلافات کا تجزیہ کرنے کے لیے سمجھ بوجھ اور واضح سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''ہالیڈے'' اس حوالے سے کہتے ہیں زبان ایک مسلسل عمل کے نتیجے میں تبدیل ہوتی ہے اس کے استعمال کے درمیان حوالہ جات کے استعمال سے معانی میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کو استعمال کرنے والے ہی اس کے تغیر کا باعث بنتے ہیں۔ زبان استعمال کرنے والے مختلف لوگوں کی اقدار مختلف ہونے کے باعث زبان میں ''منطقی تبدیلی'' پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بھی مختلف تغیرات معانی میں تفسیر پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان تغیرات میں سیاق وسباق ترکیب اور بناوٹ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کو جانے بغیر درست معانی تک رسائی کا عمل گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ بعض کلمات ایسے ہوتے ہیں جن کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں۔ معانی کی کثرت اس بات کا اظہار ہے کہ معانی کے درمیان کوئی نہ کوئی

اشتراک ضرور موجود ہے۔ایک ہی کلمہ مختلف سماجی حالات میں مختلف معانی تک محدود ہو جاتا ہے۔معنیاتی تجرید بھی معانی کی کثرت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔معانی اُن سماجی حالتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں وہ رائج ہوتے ہیں۔علمی سطح پر کثیر المعانی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ نئے الفاظ کو وضع کرنے کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ اور اصطلاحات کو نئے معانی فراہم کیے جاتے ہیں۔ ہر معانی اپنے اندر ایک الگ تدبیر لیے ہوتا ہے۔ کچھ الفاظ ہم معنی یعنی مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ یہ کلمے ایک ہی حلقہ مفاہیم سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان میں معنیاتی اشتراک موجود ہوتا ہے۔مگر سیاق وسباق کے لحاظ سے ان کے مفاہیم میں فرق پیدا ہوسکتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ایسے الفاظ کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے محل استعمال اور محل وقوع کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ علاقہ، گروہ، مخصوص علم اور موضوع کے ساتھ لفظ کے معانی بدلتے جاتے ہیں۔لغوی معنی غیر جانب دار، غیر جذباتی اور مجرد تصور کیے جاتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر رقیہ حسن نے یہ باتیں ۱۹۸۴ء سے پہلے ۱۹۷۳ء میں بیان کیں (دیکھیے b,mimeo)

۲۔ SFL میں ادب کو حدود و قیود کا پابند رکھنا اشاعت کی روایت کی خلاف ورزی تسور کیا جاتا ہے۔ اگر ہم فرتھ کے مشاہدات ۱۹۵۱ء کو مدنظر رکھیں جن کی پیروی بعد میں مچک ۱۹۵۷ء نے کی۔ ہالیڈے اور ڈاکٹر رقیہ حسن نے ۱۹۷۶ء میں متن کے تجزیے کو اہمیت دی اس کے بعد بہت سے ماہرین نے اس میدان میں تحقیقات کیں۔

3. Benjiman lee whorf,The relation of habitual thought and behaviour to language, carrol,1939.

۴۔ ڈاکٹر رقیہ حسن نے ۱۹۹۹ء میں جو نظریات پیش کیے لسانیات میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان سے لسانیاتی جال کو آگے بڑھانے اور مزید مستحکم کرنے میں مدد حاصل ہوئی۔

۵۔ ۱۹۸۸ء میں ہالیڈے نے اس تصور کی سب سے پہلے وضاحت کی۔ جب کہ اس حوالے سے دوسرا بیانیہ Ghaderry کی دوسری اشاعت ۲۰۰۷ء میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ ارتقا کا بیانیہ ہالیڈے اور رقیہ حسن کے ہم عصر ماہرین لسانیات نے پیش کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رقیہ حسن اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ان کے کام کے مقابلے میں ہالیڈے کا کام مفصل اور بڑا ہے۔ رقیہ حسن کے مطابق ان کے کام میں معانی کے کردار اور اس کے التوا پر بحث کے تناظر میں مزید گنجائش موجود ہے۔

۷۔ روزمرہ کی زبان کے استعمال میں نامکمل لسانی اظہار جیسے مسائل موجود ہیں۔ لیکن ان کو تجزیات میں جگہ نہیں دی جاتی۔

8. Halliday, M.A.K. and Hassan,R. Coheision in English, long man, London,1976.

9. Koul,Omkar Nath, Linguistics, theoretical and applied, Indian institute of

language studies.

10. Hassan,R. Sementic Variation, Meaning in society vol.2 Jonathan webster,Equinox.

11. Hassan,R. Ways of Saying,Ways of Meanings,Edited by camel Cloran, London.

۱۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۷۰ء۔ص، ۳۴۷۔

۱۳۔ اصطلاحات۔

condensation,(انجماد)

Classification, (درجہ بندی)

Segmentation, (ٹکڑے ٹکڑے ہونا)

Morpheme,(صرفیہ، زبان کی مختصر ترین بامعنی اکائی)

Allophone (لسانیات، وہ صدائے کلام جس میں اسی آواز کا متبادل موجود ہو۔)

۱۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، الاسلام پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۰ء، ص، ۲۵۴۔

۱۵۔ کسی بھی جامع بیانیہ کا اطلاق کسی نظام پر اسی صورت ممکن ہے جب ہم اس نظام کو ثقافت اور سمیات کے تناظر میں ہونے والی تبدیلی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے زبان اور ثقافتی نظام کی خصوصیات ایک دوسرے میں ضم اور تبدیلی کی خاصیت رکھتے ہیں۔

۱۶۔ مورس ہالے، صوتی تجزیہ کی مبادیات، رائل انسٹی ٹیوٹ، سٹاک ہوم، ۱۹۵۲۔

۱۷۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی ۱۹۷۰ء۔

18. Bloom Field,language,Published by Geoge Allen London,1958.

۱۹۔ خلیل صدیقی، پروفیسر، زبان کیا ہے، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۹ء۔

۲۰۔ عبدالحق، ڈاکٹر، قواعد اردو، الناظر پریس، لکھنو، ۱۹۱۴ء ص، ۱۵۔

۲۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد، (حصہ صرف) لاہور، مرکزی بورڈ، ۱۹۷۱ء۔

22. Bloom Field,language,Published by Geoge Allen London,1958.

۲۳۔ انشاءاللہ خاں انشاء، دریائے لطافت، (مرتبہ مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو اشاعت دوم، کراچی۔
۲۴۔ شیدا، امانت اللہ، صرف اردو، ہندوستانی چھاپہ خانہ، کلکتہ، ۱۸۱۰ء۔
۲۵۔ بنجمن شلزے، ہندوستانی گرامر (مرتبہ و مترجمہ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء
۲۶۔ خلیل صدیقی، ڈاکٹر، ''زبان کیا ہے''، بیکن بکس ملتان۔ ۱۹۸۷ء۔
۲۷۔ شمس الرحمان فاروقی، ''لفظ و معنی''، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء
۲۸۔ عبدالحق، ڈاکٹر، ''صرف ونحو''، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء۔
۲۹۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''جامع القواعد''، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۱ء۔
۳۰۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ''اردو قواعد''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۲ء۔
۳۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''جامع القواعد''، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۱ء۔
۳۲۔ شمس الرحمان فاروقی، ''لغات روزمرہ''، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء۔
۳۳۔ عبدالحق، ڈاکٹر، ''صرف ونحو''، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء۔
34. Max Muller, A History of Ancient Sanskrit literature,1859.
۳۵۔ وٹ گن اسٹائن کا رسالہ (Tratartus) ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اس رسالے کی وجہ سے لسانیات کی دنیا میں تہلکہ پیدا ہو گیا۔
۳۶۔ ڈاکٹر رقیہ حسن نے ۱۹۹۹ء میں جو نظریات پیش کیے لسانیات میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان سے لسانیاتی جال کو آگے بڑھانے اور مزید مستحکم کرنے میں مدد حاصل ہوئی۔
37. Benjiman lee whorf,The relation of habitual thought and behaviour to language, carrol,1939.
38. Halliday, M.A.K. and Hassan,R. Coheision in English, long man, London,1976.
39. Hassan,R. Ways of Saying,Ways of Meanings,Edited by camel Cloran, London.

بابِ سوم
اُردو میں صوتیات اور علم الاصوات کا تعارف

اُردو میں صوتیات اور علم الاصوات کا تعارف

لسانیات میں کہ کوشش مسلسل جارہی ہے کہ معلوم کیا جاسکے کہ زبان کی بنیادی ممیّز اکائی کیا ہے۔ اور انسانی ذہن اس کو کسی طرح پہچان لیتا ہے۔ زبان جملوں سے بنتی جملے الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں اور الفاظ حروف اور مارفیم سے مل کر تشکیل پاتے ہیں۔ صرف آوازوں سے بنتے ہیں اور یہی آوازیں ہی ہیں جو معانی کی تفریق کا باعث بنتی ہیں۔ زبان کے اندر موجود تمام آوازیں فونیم پیدا کرتی ہیں۔ کیا فونیم بذاتِ خود شے ہے؟ کیا انسان کا ذہن آوازوں کا ادراک فونیم کی بدولت کرتا ہے؟ ان سوالات کے جواب کے حصول کے لیے ہمیں صوتیات کے مختلف نظریات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنا ہوگا۔ روبن یا کوب سن کا صوتیاتی نظریہ ان سوالات کا جواب دینے کی سعی ہے۔ ہر زبان کا اپنا رمزیاتی نظام ہوتا ہے۔ جو اُس زبان کو استعمال کرنے والوں کے لسانی شعور کا حصہ ہوتا ہے۔ گفتگو کے عمل میں آواز کی لہریں سامع کے کانوں تک پہنچ کر اُس کی سماعت کو متاثر کرتی ہیں صوتی عمل سماعت کے اثرات اذہان تک پہنچاتے ہیں ذہن اس آواز کی شناخت صوتی لہروں کی مدد سے کرتا ہے اور پیغام کا یا بات کا ادراک کر لیتا ہے۔ صوتی لہر ایسی خصوصیات لیے ہوتی ہیں۔ جو زبان کی شناخت اور پیغام کی وضاحت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اس طرح ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ فونیم بذات خود اہمیت کے حامل نہیں بلکہ ان کی اہمیت اس وقت سامنے آتی ہے جب یہ مجموعہ کی حالت میں زبان کے اندر ایک آواز کو دوسری آواز سے ممیّز کرتے ہیں جو سماعت کو متاثر کر کے ذہن تک واضح پیغام پہنچاتے ہیں۔

زبان کی اکائیوں میں امتیاز کو سب سے پہلے سنسکرت زبان دانوں نے تلاش کیا۔ جو ''سپھوٹ'' نام کے

نظریہ میں سامنے آیا جدید دور میں یورپ کے سر یہ سہرا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں جہاں صوتیات کے متعلق باقاعدہ تحقیقات کا آغاز کیا گیا۔ اس کام میں زیادہ توجہ جنگِ عظیم کے بعد کی جانے لگی۔ بین الاقوامی سطح پر اجلاسوں اور بحث و مباحثوں نے جنم لیا جس کی بدولت صوتیات کے میدان میں کئی نئے پہلو سامنے آنے لگے۔ صوتیات کا سائنسی انداز میں مطالعہ کرنے کی کوشش پہلی بار ۱۹۳۹ء میں کی گئی۔ اس کام کو سرانجام دینے میں ''ترو تبزکوی اور فان وائک'' کا کردار اہم نوعیت کا ہے۔ جبکہ تحقیقات کو آگے لے جانے اور باقاعدہ صوتی نظریہ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رومن کوب نے پیش کیا۔ میسوجوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اسٹاک ہون سے تعلق رکھنے والے گنز فائٹ نے رومن کوب کا بھر پور تعاون کیا اور دونوں مشترکہ بھر پور اپنے کام کو ایک رپورتاثر Preliminaries Analysis (صوتی تجزیے کی مبادیات) کی صورت میں پیش کیا۔ یہ کتابی صورت میں ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی۔ آج دنیا بھر میں جدید ترین نظریہ صوتیات کے ضمن میں اس کی حیثیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے۔ نظریہ امتیازی خصوصیات کے نئے مباحث کی بنیاد سامع کے دو رخ انتخاب پر ہے جس کے مطابق جب صوتی لہر سامع کے کان سے ٹکراتی ہے تو اُس کے ذہن کو دو رُخ انتخاب سے گزرنا پڑتا ہے اُسے ایک ہی خاصیت کی دو متضاد صفات میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی خاصیت کی موجودگی، عدم موجودگی، سموع یا غیر سموع اور انفی یا غیر انفی میں فرق کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام میں امتیاز رکھتے ہوئے ذہن سے ایک خصوصیت پر صاد ہو جاتا ہے اور اُس کی یہ شناخت اُن امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے جو صوتیات پیدا کرتی ہیں۔ دو صفات میں سے ایک کو منتخب کرنا امتیازی خاصیت کہلاتا ہے۔ یہی امتیازی خاصیب زبان کی بنیادی ممیّز اکائیاں کہلاتی ہیں۔ آواز کا تنوع حیرت انگیز ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک ہلکی سی سرگوشی سے لے کر بھرپور مسموع آواز تک کیفیات کے کئی مدارج ہیں۔ لیکن امتیازی خصوصیات کی حد تک دو قسم کی آوازوں تک خود محدود کر لیا جاتا ہے یہ حدود قابل مسموع آوازوں سے لے کر نا قابل مسموع آوازوں تک ہے۔

یعنی کوئی صوتی لہر مسموع اور کوئی غیر مسموع ہوگی اور یہ دونوں صوتی لہروں کی انتہائی حالتیں ہیں۔''کوب'' کے اس نظریہ کی رو سے زبان کا رمزیاتی ضابطہ بنیادی طور پر جوڑے دار ضابطہ کہلائے گا۔جس کا جواب محض''ہاں''یا''نہ'' میں ہوگا۔ یہ عملی طور پر بہت سہل اور سادہ ہے۔ یہ دہرا جوڑے دار پن ہی آوازوں کے فوری ادراک کا باعث ہوتا ہے۔

پیغام نہایت قلیل صوتیاتی اجزا میں تقسیم ہو جاتا ہے۔جن کے باعث ذہن تیزی سے تجزیہ کر کے فوری طور پر پیغام کا درست ادراک کر لیتا ہے۔عمل تکلم کے ماہرین بھی اس بات سے متعلق ہیں کہ زبان کی تفہیم کا راز اُس کے سادہ پن میں ہے۔اس نظریہ کی خوبی زبان کی فہم کے بنیادی فطری عمل کو سمجھنے میں ہے۔اس نظریے میں روم یا کوب سن نے سادگی کے معیار کو فونیم کی تعداد سے وابستہ نہیں کیا بلکہ اس کا انحصار اس بات پر ہے ک ایک مخصوص فونیم کتنی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔اسی طرح انہوں نے ایک فونیم سے وابستہ امتیازی خصوصیات کی تعداد بارہ مقرر کی ہے مگر ساتھ ہی اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ یہ تمام خصوصیات ہر فونیم پر مکمل طور پر موجود ہو بھی سکتی ہیں اور کسی فونیم پر ان امتیازی خصوصیتوں کی تعداد کم بھی ہوسکتی ہے۔ یہ امتیازی خاصیتیں وہ مجرد اکائیاں ہیں جن کے ذریعے سے دنیا کی کسی بھی زبان کی آوازوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔اس نظریہ میں مصمتوں اور مصوتوں کے ڈھانچوں میں کوئی تفریق موجود نہیں ہے۔ دونوں قسم کی آوازوں کا تجزیہ ایک ہی ڈھانچے کے زیر اثر کیا جاتا ہے۔جس میں نتائج معلوم کرنے کے ساتھ جانچ پڑتال کا عمل بھی موجود ہے۔امتیازی خصوصیات کے اس نظریہ کو سمعیاتی مواد پر بنیاد کیا گیا ہے۔سمعیاتی صوتیات خاصہ پیچیدہ کام ہے۔اس کی ابتدا پروفیسر مارٹن جوس نے کی۔ انہوں نے امریکہ میں کی جانے والی تحقیقات نتائج کو ۱۹۴۸ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کرایا۔اس سے قبل ان کو اپنی تحقیق کو منظر عام پر لانے کی اجازت نہ مل سکی۔تار، وائرلیس، ٹیلی فون، ٹیلی وژن، اور لسانیات جیسے کئی علوم نے اس تحقیق سے استفادہ حاصل کیا۔

آواز صوتی لہروں سے مل کر بنتی ہے یہ لہریں گیارہ سو فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں یہ لہریں ایک آواز کو دوسری سے الگ پہچان دینے کی خصوصیت رکھتی ہیں۔صوتی تھرتھراہٹ سادہ صوتی لہر کا ہی نام ہے۔گھڑی کا پنڈولم جس طرح حرکت کرتا ہے سادہ صوتی لہر کی حرکت بھی اُس طرح ہوتی ہے اس کی یہ حرکت ایک سائیکل کہلاتی ہے ایک سیکنڈ میں جتنے سائیکل مکمل ہوں گے وہ آواز کا صوتی تواتر یعنی آواز کی فریکونسی کہلائیں گے صوتی لہروں کی رفتار کا انحصار اعضائے صوت کے تناؤ، رکاوٹ، ہوا کے راستہ پر ہوتا ہے۔ایک طرح صوتی تواتر ہمیشہ ایک ہی قسم کی ''لے''(Tone) پیدا کرتے ہیں۔صوتی لہر کا آواز کی شدت سے تعلق بہت گہرا ہے جتنی صوتی لہر اونچی ہو جائے گی آواز کی شدت میں اُسی قدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہر صوتی لہر اپنے راستے میں آنے والے اجسام میں تھرتھراہٹ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس عمل کو گمک (Resonanse) کہا جاتا ہے۔ انسانی آواز صوتی لہروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔جس کی رفتار اور شدت میں اختلاف ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم آوازوں میں اختلاف کی شناخت کر کے آوازوں کو پہچان سکتے ہیں۔انسانی آواز کو مرکب صوتی لہروں کے ضمن میں رکھا جاتا ہے۔انسان کے اعضائے صوت میں حلق کا درمیانی حصہ پہلا گمگ پیدا کرنے والا خول ہے۔انفی آوازوں کو پیدا کرنے میں ناک گمکدار خول کا کام دیتا ہے۔(صوتی/حروف علت/Vowels)

مصوتی آوازوں میں واضح سمعیاتی خط موجود ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس غیر مصوتی آوازوں میں سمعیاتی خطوط واضح نہیں ہوتے۔مصوتی آوازوں کے لیے صوتی راستہ کُھلا رہتا ہے۔ان میں مسموع کیفیت پیدا ہوتی ہے۔لسانیات میں زبانی گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔لکھی یا تحریر کی گئی زبان کا تعلق اس سے نہیں ہوتا۔کسی بھی زبان کا مطالعہ آواز کے مخارج کی مدد سے کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لسانیات میں ہر سطح پر آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔جن میں تین اہم ہیں۔سمعیاتی صوتیات، سماعی صوتیات،اور تلفظی صوتیات تینوں مطالعاتی طریقے کارآمد ہیں۔سمعیاتی اور سماعی صوتیات کے مطالعہ کے لیے تجربہ گاہ اور مختلف آلات کا ہونا

ضروری ہے جبکہ تلفظی صوتیات میں تجربہ گاہ اور دیگر مشینوں کے بغیر بھی مطالعہ ممکن ہے۔ انسان کے وہ اعضاء جو گفتگو میں اُس کا ساتھ دیتے ہیں اور جن اعضاء سے آوازیں پیدا ہوتی ہیں اُن کا مطالعہ تلفظی صوتیات کے ضمن میں آتا ہے۔

وہ اعضاء جن سے زبان کی مختلف اصوات پیدا ہوں اعضائے تکلم کہلاتے ہیں۔ سانس لینے کے عمل کے دوران جو ہوا کے اعضائے تکلم کے راستے باہر نکلتی ہے اُس کے بولی کا نام دیا جاتا ہے۔ زبان کی آواز دو قسم کی ہوتی ہے ایک قسم ''مصوتے'' اور دوسرے ''مصمتے'' کہلاتی ہے۔ ایسی آوازیں جن سے ہوا بغیر رگڑ کے اعضاء سے گزر جائے مصوتے کہلاتے ہیں۔ اس کے متضاد اعضائے تکلم جن آوازوں کے درمیان رگڑ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ مصمتے کہلاتے ہیں۔

مصوتوں کو پیدا کرنے کے عمل میں صوتی تانت میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ مصمتوں کی ادائیگی میں صوت تانت کا تھرتھرانا ضروری نہیں ہے۔ مصمتوں کی دو اقسام ہیں ایک مسموع کہلاتی ہے۔ جبکہ دوسری قسم کو غیر مسموع کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ آوازوں کی ایک اور قسم نیم مصوتے کہلاتی ہے۔ یہ ایسی آوازیں ہوتی ہے جن کی ادائیگی کے دوران زبان یا حلق سے کوئی رگڑ پیدا نہیں ہوتی لیکن اس کی ادائیگی میں صوت تانت تھرتھراتے ہیں انگریزی میں W اور Y کی آوازیں اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ صوتی رکن کے لحاظ سے یہ مصمتوں کے مقام پہ متعین ہوتے ہیں اس لیے نیم مصوتے کہلاتے ہیں۔

ضروری ہے کہ مصوتوں کی درجہ بندی کے دوران تین چیزوں کا خیال رکھا جائے۔ پہلی بات یہ کہ دیکھا جائے کہ بات کرتے ہوز بان کس قدر اوپر اونچائی کی جانب اُٹھتی ہے۔ تالو کو اونچائی کا بلند ترین مقام مقرر کرتے ہوئے یہ جانا جاتا ہے کہ لفظ کی ادائیگی میں زبان تالو سے ٹکراتی یا درمیان تک اٹھی یا اُس سے بھی کم درجے تک زبان نے حرکت کی اس حرکت کو جانچنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ معلوم ہو کہ زبان کے کسی حصہ

میں لفظ کی ادائیگی کے دوران تحرک پیدا ہوا اس لحاظ سے زبان کو تین حصوں میں یعنی اگلا حصہ، وسطی حصہ اور رجمی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تیسری اہم چیزوں میں ہونٹوں کی حرکت ہے لفظ ادا کرتے ہوئے ہونٹوں کی حرکت کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے ہم مصوتوں کی درجہ بندی کر سکتے ہیں کہ ہونٹوں کی شکل گول ہو جاتی ہے یا ہونٹ پھیل جاتے ہیں یا معمولی حرکت کرتے ہیں۔ مصوتوں کی درجہ بندی کرنے کے ان تینوں عوامل میں اختلاف ہیں جو مصوتوں کی لاتعداد ہونے کی جانب اشارہ ہے۔ اس لیے کسی ایک زبان کو استعمال کرنے کے لیے ماہرین لسانایات مختلف طریقہ کار کو استعمال کرتے ہیں۔ ''ڈینل جونس'' نے مصوتوں کی درجہ بندی پر خاصہ کام کیا اپنی تحقیقات کی روشنی میں آٹھ مصوتوں کے مجموعہ کو معیاری مصوتے (Cordinal Vowels) کہا ہے۔ ان آٹھوں مصوتوں کا تعلق کسی خاص زبان سے نہیں ہے بلکہ یہ محض ڈینل جونس کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ لیکن اُن کو بہت واضح انداز میں بیان کیا گیا اور ان کے معیارات میں بھی کوابہام نہ مل سکا۔ ان مصوتوں کو مصوتے تسلیم کرنے کا واحد مقصد کسی بھی زبان کے مصوتوں کا ان کو معیار مانتے ہوئے ان کے ساتھ تقابل ہے۔ ان معیاری مصوتوں کی اہمیت تقابل اور حوالے کے طور پر ہے۔ ڈینل جونس کے ان معیاری مصوتوں کے بارے میں جاننے کے لیے ہم ان آٹھ مصوتوں کی وضاحت کی جانب چلتے ہیں۔

ڈینل جونس کا مصوتہ
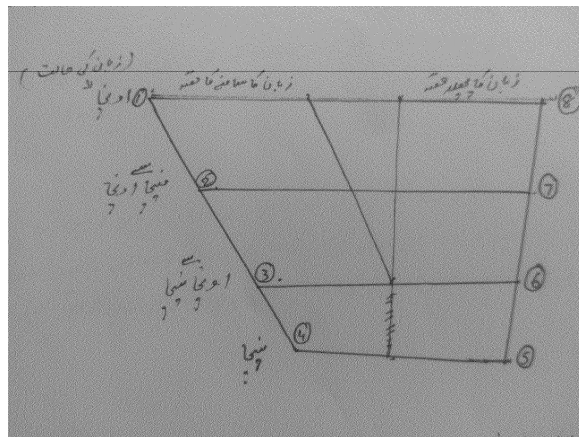
یہ مصوتہ سامنے کی طرف سے زیادہ اونچا ہے۔ جو پھیلے ہوئے ہونٹوں سے تشکیل پانے والے لفظ کی طرف اشارہ کر رہا ہے اُس کو سامنے کا پھیلا ہوا اونچا کہتے ہیں اور سامنے کی طرف سب سے نچلا حصہ پھیلا ہوا نچلا کہلاتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان موجود فاصلے کو برابر تقسیم کر دیا جاتا ہے جس کی بدولت درمیان میں دو اور معیاری مصوتوں کی تشکیل ہوتی ہے ان مصوتوں کو نمبر ۲ اور ۳ کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے جبکہ پچھلی طرف موجود چار معیاری مصوتے ان کی تعداد کو ۸ بنا دیتے ہیں۔

اس تصویر میں زبان نچلی حالت میں موجود رہتی ہے یعنی زبان تالو کو چھوٹے بغیر جہاں تک جا سکتی ہے وہاں ایک لائن ڈال دی گئی ہے۔ زبان کی سطح کو سامنے اور پیچھے میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ تصویر میں موجود لائن کا آگے کی جانب سے زیادہ بڑھنا اس بات کا عکاس ہے کہ زبان کا اگلا حصہ پچھلے کی نسبت زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ جبکہ پیچھے کا حصہ پیچھے کی جانب اس قدر حرکت نہیں کر سکتا۔ ڈینل جونس کے ماڈل میں معیاری مصوتہ چاٹ استعمال کے ذریعے وضاحت۔

مصوتہ نمبر ا۔

زبان کی اونچائی زبان کا سامنے کا حصہ استعمال کیا جا رہا ہے اور ہونٹ پھیلی ہوئی شکل میں معیاری مصوتہ نمبر ا اسکے لیے اُردو زبان میں جو الفاظ بطور مثال لیے جا سکتے ہیں اُن میں تین، مشین، نمکین وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے زبان کو انتہائی بلندی یعنی تالو سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ان الفاظ کے استعمال کے دوران زبان کے سامنے کا حصہ حرکت کرتا اور استعمال ہوتا ہے اور ہونٹوں کی شکل میں پھیلاؤ بھی واضح ہوتا ہے۔

مصوتہ نمبر۲۔

اس میں زبان کو اُونچا نیچا دونوں طرح سے حرکت دی جاتی ہے اوران الفاظ کے استعمال کے لیے زبان کا سامنے کا حصہ حرکت کرتا ہے۔ ہونٹ پہلے مصوتہ میں شامل الفاظ کی نسبت کم پھیلے ہوئے ہوتے ہیں انگریزی زبان کا لفظ Set کو لے لیں اس مصوتہ میں زبان نیچے سے اوپر کی طرف حرکت کرتی ہے۔ ہونٹ ان الفاظ کے استعمال کے دوران کم پھیلتے ہیں۔اور زبان کا بھی سامنے کا حصہ ہی متحرک ہوتا ہے۔

مصوتہ نمبر۳۔

اس مصوتہ میں شامل الفاظ کے استعمال میں زبان کی حرکت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ جو مصوتہ نمبر دو کے برعکس ہے جبکہ باقی تمام خوبیاں مصوتہ نمبر۲ کی ہی استعمال ہوتی ہیں مثلاً زبان کے سامنے والے حصے کا استعمال اور ہونٹوں کا کم پھیلاؤ وغیرہ مگر چونکہ بنیادی تبدیلی زبان کی اوپر سے نیچے کی جانب حرکت ہوتی ہے جو اس کو ممتاز کرتی ہے مصوتہ نمبر۲ سے اس کی مثال انگریزی کا لفظ "Rafe" ہے۔

مصوتہ نمبر۴۔

اس مصوتہ میں ایسے الفاظ کو رکھا گیا ہے جن کی ادائیگی کے دوران زبان کو نیچا رہنا پڑتا ہے اُس کو بلندی کی جانب اٹھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان الفاظ کو ادا کرنے کے لیے زبان کا سامنے کا حصہ استعمال کرنا پڑتا ہے اور ہونٹ اس میں کم کھلے اور کم پھیلے ہوتے ہیں۔ اس مصوتہ کے زیر اثر استعمال ہونے والے الفاظ میں ''گئے، ہے'' وغیرہ جیسے الفاظ شامل ہیں۔

مصوتہ نمبر۵۔

ایسے الفاظ جن کے اظہار میں زبان کی سطح نیچی رہے اور زبان کا پچھلا حصہ استعمال ہو اور کھلے اور پچھلے ہونٹوں کو استعمال کیا جائے کو مصوتہ نمبر۵ میں رکھا گیا ہے۔ اُردو زبان میں آم، کام وغیرہ جیسے الفاظ اس انداز میں

ادا کیے جاتے ہیں۔

مصوتہ نمبر ٦۔

ایسے مصوتے جن کے لیے زبان کو اوپر سے نیچے کی جانب حرکت دی جائے۔ اس حرکت میں زبان کا پیچھے کا حصہ استعمال ہو اور ہونٹ کھلے اور گولائی میں ہوں۔ اِس کی مثال انگریزی کے الفاظ "Cot,Hot" ہیں جن کو ادا کرنے کے عمل میں زبان کا پچھلا حصہ حرکت میں آتا ہے اور ہونٹوں کو گول بنا کر زبان کو اوپر سے نیچے کی طرف حرکت دی جاتی ہے۔

مصوتہ نمبر ٧۔

اس میں زبان کی حرکت نیچے سے اوپر کی جانب ہوتی ہے جبکہ باقی خصوصیات مصوتہ نمبر ٦ والی ہوتی ہیں یعنی ہونٹ ان الفاظ کی ادائیگی میں بھی گولائی میں لائے جاتے ہیں۔ اور زبان کا پچھلا حصہ استعمال ہوتا ہے زبان کی نیچے سے اوپر کی جانب حرکت دونوں مصوتوں میں باعث امتیاز ہے۔ مثلاً "Coat" اور اُردو میں ''شور'' جیسے الفاظ مصوتوں کے اس گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مصوتہ نمبر ٨۔

اس میں زبان اوپر کی جانب حرکت کرتی ہے اور بلندی یعنی تالو تک حرکت کرتی ہے نیز اِن مصوتوں میں شامل الفاظ کی ادائیگی کے لیے بنیادی طور پر زبان کا پچھلا حصہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہونٹ گول اور آگے کو نکلے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال انگریزی الفاظ RooT,CooL,FooL وغیرہ ہیں۔

ڈینئل جونس کا مصوتوں کے بارے میں نظریہ محض معیاری مصوتوں تک محدود ہے ان کو اُردو زبان کے مصوتوں سے ملتا جلتا قرار دیا جاتا ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اُردو اور کئی دوسری زبانوں کے مصوتے ان سے مختلف بھی ہوں۔ لہٰذا ان معیاری مصوتوں کو بالکل درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زبانوں میں ایسے مصوتے بھی موجود ہوتے

ہیں جن میں زبان کی حالت ڈینیل جونس کے پیش کردہ معیاری مصوتوں کے مطابق رہتی ہے مگر صرف ہونٹوں کی شکل میں اختلاف لاکر مثلاً سامنے سے ہونٹ گول اور پیچھے سے پھیلے ہوئے بنا کر بات کی جاتی ہے اُردو زبان کا لفظ ''کہاں'' اپنے اندر انفیت لیے ہوتا ہے اس لیے اس مصوتے کے استعمال ہونٹ بھی معیاری مصوتوں کے ماڈل سے ہٹ کر گولائی اور پھیلاؤ اختیار کرتے ہیں جب کہ زبان معیاری مصوتہ نمبر ا کے مطابق حرکت کرتی ہے لہٰذا انفیت کی موجودگی مصوتوں کی خاصیت کو بدلنے میں اپنا کردار ادا کرسکتی ہے۔

ایسے مصوتے جو گفتگو کے دوران اپنے خصائص کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ''ڈفتھا نگ'' کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ مصوتہ ہے جو شروع میں واضح مگر بعد میں مبہم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسے مصوتوں میں ''بل'' آغاز میں زیادہ اور آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے۔ دوسری قسم اُن مصوتوں کی جو آغاز میں مبہم ہوتے ہیں مگر بعد میں واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ان میں ''بل'' آغاز میں کم اور بعد میں زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں پہلی قسم کے مصوتوں کا کثرت سے استعمال موجود ہے۔

اُردو مصوتے

ڈاکٹر اقتدار حسین کے مطابق اُردو میں کل آٹھ مصوتے ہیں جبکہ دو مصوتے دُہرے مصوتے ہیں۔ انہوں نے اُردو مصوتوں کا ماڈل کچھ یوں پیش کیا ہے۔
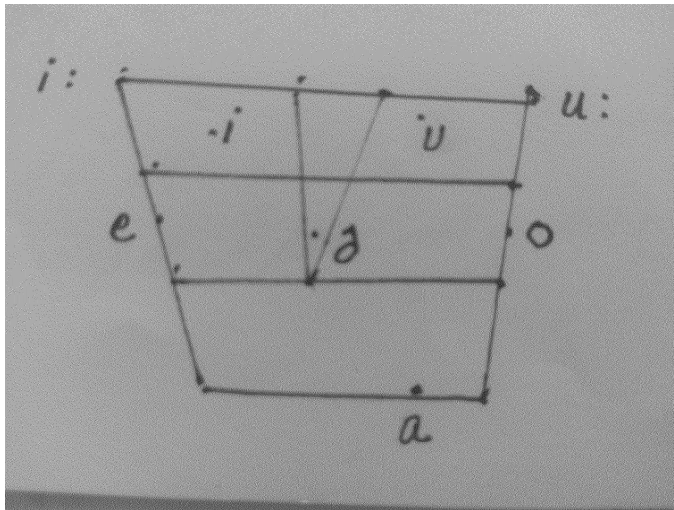
صوتیاتی نظام کے حوالے سے ہر زبان کو دو اہم حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یہ حصے مصوتے اور مصمتے کہلاتے ہیں۔اردو کے تمام مصوتے تعداد کے لحاظ سے اور نوعیت کے اعتبار سے عربی اور فارسی مصوتوں سے یکسر مختلف ہیں۔کیونکہ اردو کے مصوتے ہند آریائی ہیں۔ان کے اظہار کے لیے جب عربی اور فارسی رسم الخط کو اپنایا گیا تو کئی پیچیدگیاں سامنے آئیں جن میں سے کچھ تا حال حل طلب ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان میں ماہرین کے درمیان اختلافات موجود ہیں۔(۱)

لسانی روایات کے مطابق اردو کے خالص لسانیاتی مصوتوں کی تعداد آٹھ ہے۔جبکہ دوہرے مصوتوں کی تعداد دو ہے۔دیوناگری رسم الخط اور سنسکرت زبان لسانی نقطہ نظر کی اہمیت کے باوجود چند مغالطّوں کا شکار ہے۔جدید صوتیاتی تجزیات سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مصوتوں کے درمیان موجود اختلاف محض لمبائی کا نہیں بلکہ مخارج کا بھی ہے۔لحاظہ بین الاقوامی سطح پر ان کے مخارج کے پیش نظر ہر مصوتے کے لیے علیحدہ علامت کو استعمال کیا جاتا ہے۔اردو مصوتے خالص آریائی ہیں لیکن اردو کے مصمتوں کی صورتحال خاصی دلچسپ ہے۔کیونکہ ان میں ہندی، فارسی اور عربی کی آمیزش موجود ہے۔ان آمیزشی آوازوں کو کچھ اس طرح سے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

خالص فارسی الفاظ۔ ژ

خالص عربی الفاظ۔ ق

خالص ہندی الفاظ۔ بھ۔پھ۔تھ۔ٹھ۔جھ۔چھ۔کھ۔گھ۔دھ۔ڈھ۔ڑھ۔ٹ۔ڈ۔ڑ۔

فارسی اور ہندی کے مشترک الفاظ۔

ب۔پ۔ت۔ج۔چ۔د۔ر۔س۔ش۔ک۔گ۔ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ی۔

فارسی عربی مشترک۔ ب۔ت۔خ۔ج۔د۔ر۔س۔ز۔ش۔غ۔ف۔ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ی

ہندی فارسی عربی مشترک۔ ب۔ت۔ج۔د۔ر۔س۔ش۔ک۔م۔ن۔و۔ہ۔ی۔

جبکہ اردو میں ان کے علاوہ حروف بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے ذ،ط،ظ،ض،ث اور ص وغیرہ۔ یہ تمام حروف ہیں صوت نہیں ہیں جو اردو رسم الخط کے لیے مشکلات کا باعث ہیں۔عربی فارسی لسانیات آج بھی اردو زبان پر اپنی اجارہ داری کو قائم رکھے ہوئے ہے جس سے کوشش کے باوجود تا حال چھٹکارہ نہیں پایا جا سکا۔صوتیاتی طریقے سے اردو کی صوتیات کو یوں مرتب کیا جا سکتا ہے۔

اردو کے مصمتے۔

دولبی۔دندانی۔معکوسی۔حنکی۔غشائی۔لہاتی۔(کوے کی)۔

غیر معکوسی۔

پ۔ت۔ٹ۔چ۔ک۔ق۔

غیر بندشی آوازیں۔

ہکاری

پھ۔تھ۔ٹھ۔چھ۔کھ۔

مسموع۔

ب۔د۔ڈ۔ج۔۔گ۔

ہاکاری

بھ۔دھ۔ڈھ۔جھ۔گھ

انفی (ناک کی)

م۔ن

رگڑالو چیستانی غیر مسموع۔

ف۔س۔ش۔خ۔ہ

صفیری مسموع۔

و۔ز۔ژ۔غ

تالیکا مسموع۔

ر

پہلوئی مسموع

ل

تھپکدار مسموع

ڑ

ہکار مسموع

ڑھ

نیم مصمتہ

ی

اس طرح اردو کے مصمتوں کی تعداد ۳۸ بنتی ہے۔سب سے کم تعداد میں مرکب الفاظ ''ژ'' سے بنتے

ہیں۔ ہا کار آوازیں اپنی وسعت اور تقسیم کے باعث اردو کی منفرد اور مخلوط نظام صوت کی مفرد آوازیں ہیں۔ ہندی رسم الخط میں ان کے لیے علیحدہ حروف کو استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اردو کے حروف تہجی میں ان کو الگ حروف تسلیم کیا گیا ہے۔ اوران کی آوازوں کو مرکب آوازیں تصور کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اردو کا یہ تدریسی انداز تا حال جاری ہے جیسا کہ گ، ھ، ر (گھر)۔ ب، ھ، ر (بھر)۔ صوتی نقطہ نظر سے یہ مہمل حرف کے تصور پر مبنی ہیں۔ کچھ ایسے حروف کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو عربی زبان سے اردو میں داخل ہوئے اور اب اردو مصمتوں کے ذکر میں ان کی اہمیت ہے۔ یہ حروف اردو حروف تہجی کا اہم حصہ متصور کئے جاتے ہیں۔ یہ حروف ذ۔ض۔ظ۔ط۔ص۔ث۔ح۔ و۔وغیرہ ہیں۔ صوتی نقطہ نظر سے ان مردہ الفاظ کا بوجھ اردو نے محض اس لیے اٹھا رکھا ہے تا کہ اردو کا رشتہ عربی کے ساتھ قائم رکھا جا سکے۔ (۲)

عربی فارسی کے جو مصمتے اردو صوتیات کا حصہ ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

ف۔ز۔خ۔غ۔ق

ق۔ کے علاوہ یہ تمام حروف رگڑ الو گروہ میں شامل ہیں۔ ان کے اثرات اردو شاعری پر کافی گہرے مرتب ہوئے ہیں۔ جو لوگ آہنگ شعر کے مطالعہ میں دلچسپی لیتے ہیں ان کے لیے یہ حروف خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو کی انفی آوازیں اور ان کی خصوصیات۔

انفیت کے عمل کا اردو صوتیات میں مطالعہ کرنے کے کچھ اصول اور ضوابط ہیں۔ جن پر عمل درامد ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ ان تصورات کا اردو صوتیات میں مطالعہ درج ذیل اصولوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔

۱۔ انفی مصوتے۔

۲۔ انفی مصمتے۔

۳۔انفیاتی ہم آہنگی۔

اردو کے تمام مصوتوں کو انفیائیا جا سکتا ہے۔مگر لفظ کے اندر ہر مقام پر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔مثلاً (ڈانٹ،ڈاٹ)۔(بانٹ،باٹ)۔ایسی مثالیں عام موجود ہیں۔اردو بولے جانے والے بعض علاقوں بالخصوص دہلی اوراس کے نواح میں ایسے الفاظ کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ایسے الفاظ قدیم دکنی میں بھی استعمال ہوتے نظر آتے ہیں۔اس طرح کا غیرضروری انفیانا اردو میں ناشائستگی تصور کیا جاتا ہے۔اس لیے اردو میں انفی حروف اور تلفظ کو معنی کی تبدیلی اورافعال کی جنس اوران کی وضاحت کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

جہاں تک اردوزبان میں انفی مصمتوں کا تعلق ہے وہ صرف دو ہیں۔

''م''اور''ن''

م اورن کا غیرآہنگ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان سے بنن والے الفاظ مفرد نہیں بلکہ مرکب ہیں۔خاص طور پر ''ن'' کو اردو کے کسی بھی ارتقائی دور میں اہمیت کا حامل نہیں گردانا گیا۔اس کی امثال'' ان مول،انمٹ،ان پڑھ''۔وغیرہ ہیں۔مگراردوصوتیات کے عام رجانات کے سبب بعض مرکب الفاظ میں''ن''ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔

اردو کی کوزی آوازیں۔

اردو خالص ہندوستانی یا آریائی زبان نہیں ہے بلکہ یہ مختلف زبانوں کا مرغولہ ہے جس میں درویدی لسانیات کی روایات کا بھی عمل دخل موجود ہے جن کی معکوس اورکوزی آوازوں کو بھی اردو نے اپنایا اوراپنا حصہ بنایا ہے۔یہ آوازیں شمالی ہند کی آریائی زبانوں میں اس قدر شامل نہیں جس قدر یہ ویدی زبانوں میں ہیں۔ہندی کے برعکس اردو نے سنسکرت کی معکوس زبانوں کو اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی دور میں نہیں اپنایا۔مثلاً (ش،ط) جو اردو میں ہمیشہ چھ یا کھ ہوجاتے ہیں۔

اردو کی معکوسی آوازیں ''ٹ۔ڈ۔ڑ'' اور ''ٹھ، ڈھ، ڑھ'' ہیں۔ان میں سے (ڑ، ڑھ)، (ڈ، ڈھ) کی تقسیم اردو نظام صوت کے تکمیلی انداز میں پائی جاتی ہے۔جسے درج ذیل جدول کے ذریعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

	لفظ کی ابتدا میں	لفظ کے درمیان میں	لفظ کے آخر میں
ڈ	p	o	o
ڈھ	p	o	o
ڈ (مشدد)	o	p	o
نڈ (انفی)	o	p	p
ڑ	o	o	p
ڑ (مشدد)	o	p	o
ڑھ	o	o	p

اہم مشاہدات

ا۔''ڈ'' کی آواز ہمیشہ لفظ کے آغاز میں آتی ہے۔مثلاً ڈر، ڈول، ڈال وغیرہ۔یہ ترکیب انگریزی کے مستعار لیے گئے الفاظ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور لفظ کے آخر میں ہمیں ''ڈ'' کی آواز سنائی دیتی ہے۔مثلاً روڈ، بورڈ، کارڈ وغیرہ۔

۲۔ ''ڑھ'' یا ''ڑ'' سے اردو کا کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔

۳۔ ''ڈھ'' کی آواز لفظ کے ہمیشہ آغاز میں آتی ہے۔لفظ کے درمیان میں یہ مشدد کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔جبکہ لفظ کے آخر میں یہ ''ڑھ'' کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔مثلاً مظفر گڈھ کی بجائے مظفر گڑھ زیادہ

فصیح ہے۔

(بوڑھا، بڈھا)، (گڑھا، گڈھا)، (ٹھوڑی، ٹھڈی) وغیرہ ''ڑ'' اور ''ڈھ'' کے تعلق کی وضاحت کرتے ہیں۔اسی طرح ''پوڑی۔پوری''، ساڑھی۔ساری''، ''کچوڑی، کچوری''، ''ر'' اور ''ڑ'' کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

ہاکاری نفسی مصمتے۔

اردو میں ہاکاری آوازیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ان کی تعداد گیارہ ہے۔جن میں سے دس بندشی آوازیں جبکہ ایک تھپک دار آواز ہے۔جو کچھ یوں ہیں۔

بندشی غیر مسموع آوازیں۔	پھ۔تھ۔ٹھ۔چھ۔کھ۔
بندشی مسموع۔	بھ۔دھ۔ڈھ۔جھ۔گھ
تھپک دار مسموع۔	ڑھ

یہ آوازیں اردو کے صوتی نظام میں صوتیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔دیوناگری میں ان کے لیے مستقل اور الگ حروف بھی موجود ہیں۔جبکہ ارو میں ان حروف کو مخلوط ہائے کے استعمال کی وجہ سے غیر متوازی ہاکاری آوازوں کے تبع جانا گیا یہی وجہ ہے کہ اردو حروف تہجی میں ان کے لیے الگ شکلوں کا تعین نہیں کیا گیا۔ہاکاری صوتیوں کی فہرست میں درج ذیل حروف کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

''لھ۔مھ۔نھ۔رھ۔وھ۔'' مگر ان الفاظ کا استعمال اردو میں بہت کم ہوتا ہے۔لیکن مرکب الفاظ میں ان کی موجودگی ہمیں نظر آتی ہے۔مثلاً کولھو، ننھا، تمھارا وغیرہ۔ان ہکاری صوتیون اور بنیادی ہکاری آوازوں میں واضح فرق موجود ہے۔ہندوستانی قواعد نویس ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ اردو میں صوتیات کی کیفیت ان کی کمیت کے مقابل زیادہ اہم ہے۔اردو رسم الخط چونکہ عربی مصوتوں کا ترجمان ہے اس لیے ہند آریائی صوتیاتی نظام

کی ادائیگی اس کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں ۔ اردو میں چھوٹے مصوتوں (زیر،زبر پیش) کو عموماً استعمال نہیں کیا جاتا۔جس کی وجہ سے اردو میں تلفظ بدلتا رہتا ہے۔اور الفاظ کی ادائیگی میں اکثر دشواری کا سبب بنتی ہے۔

مصمتوں کے خوشوں کے سلسلہ میں بنیادی مسئلہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے اردو زبان کے آغاز سے ارتقا اور آج تک یہ مسئلہ موجود ہے کہ کہنے والا یہ بات کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے کہ اس کا کہا ہوا مستند ہے۔اس حوالے سے دریائے لطافت میں انشاءاللہ خان انشاء کا آج سے کئی برس پہلے کہا ہوا کچھ یوں ہے کہ

''ہر وہ لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا خاہ وہ عربی،ترکی، فارسی، پنجابی یا کسی بھی اور زبان سے تعلق رکھتا ہو۔اور وہ از روئے اصل غلط ہو یا صحیح اردو کا لفظ ہے۔اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے غیر موافق بھی مستعمل ہے تو بھی درست ہے۔اس کی صحت اور غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے کیونکہ جو کچھ خلاف اردو ہے وہ غلط ہے''۔(۳)

اردو تعلیقے۔

اردو میں الفاظ کی بناوٹ کے کئی طریقے موجود ہیں ان میں سے ایک طریقے کو تعلیقے کا نام دیا جاتا ہے۔اردو میں اس طرقہ سے بکثرت الفاظ سازی کی جاتی ہے۔تعلیقے بامعنی لسانی روپ ہوتے ہیں جن کو تنہا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔اپنے وقوع کے لیے یہ آزاد روپ کے محتاج ہوتے ہیں۔اردو میں یہ ہمیشہ پابند روپ میں آتے ہیں اس لیے انہیں عربی کے 'لا'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو نہیں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کا استعمال آزاد روپ یعنی وارث کے ساتھ جب ہوتا ہے تو یہ لاوارث کے روپ میں اپنے الگ معنی کا اظہار کرتا ہے۔لاچانی، لاعلاج ااور دیگر الفاظ میں استعمال ہونے کے باوجود یہ اپنے پابند روپ سے آزادی حاصل نہیں کر

پاتا۔ایک اور تعلیقہ جو خود تو پابند ہے لیکن آزاد روپ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے وہ ''ور'' ہے۔مثلاً طاقتور، جانور، ناموروغیرہ۔''لا'' اور ''ور'' اردو میں استعمال ہونے والے دو پابند تعلیقے ہیں جو آزادروپ الفاظ کے ساتھ استعمال ہوکران کے معنی بدل دیتے ہیں۔

تعلیقے لفظ کی ابتدا میں میں بھی واقع ہو سکتے ہیں اور آخر میں بھی ان کی موجودگی ممکن ہے۔اردو میں بعض تعلیقے لفظ کے درمیاں بھی موجود ہوتے ہیں۔اس لیے ان کو تیں اقسام میں ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۔سابقے

۲۔لاحقے۔

۳۔وسطیے

سابقے۔

ایسے تعلیقے جن کا استعمال لفظ کے آغاز میں ہوتا ہے۔یہ الفاظ آزادروپ میں ہوتے ہیں۔یہ عربی سے مستعار لیے گئے ہیں۔قواعد کی رو سے یہ اسم، فعل اور صفت بھی ہو سکتے ہیں۔ہندی سابقے بھی اردو میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔سابقے اردو زبان میں کثیر تعداد میں ہیں۔

عربی فارسی سابقے۔

لا۔(نہیں،نہ)۔ لاوارث،لاحاصل،لاعلم،لاجواب،لاثانی،لاعلاج وغیرہ۔

ذی۔(والا،رکھنے والا)۔ ذی شعور،ذی علم،ذی وقار،ذی شان وغیرہ۔

نا۔(نہ،نہیں)۔ ناامید،ناراض،ناکام،نالائق،نامعلوم،نادار،نابالغ وغیرہ۔

بد۔(برا)۔ بداخلاق،بدکردار،بدنام،بدتمیز،بدذوق،بدقسمت وغیرہ۔

با۔(ساتھ)۔ باادب، بانصیب، باقاعدہ، بامقصد وغیرہ۔

پُر۔(بھرا ہوا)۔ پُر اثر، پُر ذور، پُر درد، پُر جوش، پُرنم وغیرہ

نو۔(نیا، تازہ)۔ نوبہار، نوروز، نوجوان، نونہال، نوعمر۔وغیرہ۔

ہم۔(شریک، ساتھی)۔ ہم عمر، ہم قدم، ہم آواز، ہم وطن، ہم راز، ہمدرد، وغیرہ۔

ہندی الاصل سابقے۔

اَ۔(نہ، نہیں)۔ اَٹل، اَمر، اَتھاہ، اَکارت، وغیرہ۔

اَن۔(نہ، نہیں)۔ ان ہونی، انجان، ان پڑھ، وغیرہ۔

نِ۔(نہ، نہیں) نڈر، نہتا، نکما، نڈھال، وغیرہ۔

بہ۔(کئی)۔ بہروپ، بہروپیا وغیرہ۔

لاحقے۔

ایسے تعلیقے جن کا استعمال لفظ کے آخر میں ہو لاحقے کہلاتے ہیں۔سابقوں کی طرح لاحقے بھی فارسی اور عربی زبان سے مستعار لیے گئے ہیں مگر ہندی لاحقوں کی تعداد بھی اردو میں کچھ کم نہیں ہے۔

عربی اور فارسی لاحقے۔

ہ۔(لاحقہ تانیث)۔ معلّمہ، عزیزہ، ہمشیرہ، ساحرہ، فنکارہ، ملکہ، اداکارہ، صاحبہ، محترمہ وغیرہ۔

ی۔(یائے نسبتی)۔ انسانی، خیالی، آسانی، آسمانی، ہیجانی، ہماری، تمہاری، وغیرہ۔

ات۔(لاحقہ جمع)۔ حالات، تصورات، ہیجانات، خیالات، سوالات، درجات، جوابات،

وغیرہ۔

ین۔(لاحقہ تثنیہ)۔ والدین،کونین،زوجین،عیدین،قبلتین وغیرہ۔

گار۔(کرنے والا)۔ گناہ گار،خدمتگار،طلبگار،وغیرہ۔

ستان۔(جگہ)۔ قبرستان،پرستان،چمنستان،خیالستان،ریگستان،نخلستان،دبستان،وغیرہ۔

گاہ۔(جگہ)۔ آرام گاہ،عیدگاہ،سیرگاہ،شکارگاہ،وغیرہ۔

گر۔(کرنے والا)۔ رفو گر،بازی گر،جادوگر،فتنہ گر،نوحہ گر،وغیرہ۔

کدہ۔(جگہ،گھر)۔ بت کدہ،رحمت کدہ،میکدہ،آتش کدہ،ماتم کدہ،وغیرہ۔

مند۔(والا،رکھنے والا)۔ غیرت مند،عقلمند،دانش مند،صحت مند،حاجت مند،وغیرہ۔

ہندی الاصل لاحقے۔

انا۔(ظرفی لاحقہ)۔ نہانا،گھبرانا،ٹھکانا،وغیرہ۔

انی۔(لاحقہ تانیث)۔ حجانی،انجانی،شیخانی،دیورانی،جیٹھانی،وغیرہ۔

ن۔(لاحقہ تانیث)۔ دھوبن،بھنگن،مالن،وغیرہ۔

ی۔(لاحقہ تانیث)۔ لڑکی،بلی۔بکری،اندھی،وغیرہ۔

بھر۔(لاحقہ مقداری)۔ پیٹ بھر،رات بھر،دن بھر،عمر بھر،گھڑی بھر،وغیرہ۔

ری۔(لاحقہ فاعلی)۔ بھکاری،پجاری،جواری،شکاری،وغیرہ۔

نی۔(لاحقہ تانیث)۔ فقینی،شیرنی،ڈومنی،وغیرہ۔

ر،ار۔(لاحقہ فاعلی)۔ لوہار،چمار،کمہار،سنار وغیرہ۔

وسطیے ۔

ایسے تعلیقے جن کا وقوع لفظ کی ابتدا اور اختتام کے علاوہ لفظ میں کسی بھی مقام پر ہو وسطی تعلیقے کہلاتے ہیں ۔ یہ لفظ کے درمیان کسی بھی جگہ پر عمل میں آ سکتے ہیں ۔ان کی وجہ سے لفظ کی تمام سابقہ آوازیں اس طرح برقرار رہتی ہیں ۔اردو میں وسطی تعلیقوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے یہ عربی کے چند الفاظ کے درمیان موجود ہوتے ہیں ۔مثلاً

وسطیہ جمع	کلمہ واحد
تصاویر	تصویر
تجاویز	تجویز
تدابیر	تدبیر
مساجد	مسجد
نقاش	نقش
نباض	نبض
قہار	قہر
عکاس	عکس
جبار	جبر

اُردو میں بنیادی طور پر دس مصوتے ہیں ۔عمومی طور پر اُردو زبان میں مصوتوں کے لیے محض عین علامتوں کو استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ''ا، و، ی'' کے ہی روپ ہیں جبکہ ''ی اور ے'' ان میں واؤ اور پائے دوہری علامتیں ہیں

یعنی یہ مصوتوں کے ساتھ ہی نیم مصوتوں کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔''الف'' خالصتاً مصوتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اُردو زبان میں اعراب میں سے تین اعراب ایسے ہیں جن کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ اعراب ''زیر، زبر، پیش'' ان اعراب کو بھی محض ابتدائی جماعتوں کی تدریس تک محدود کر دیا گیا ہے۔ روزمرہ میں یا اعلی تدریس میں ان اعراب کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ بہت ہی کم علامات سے اُردو میں دس بنیادی آوازوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

لسانیات جس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے وہ کسی زبان کے طاقتور یا اُس کے کمزور ہونے کی جانب اشارہ نہیں بلکہ لسانیات کے مطالعہ کا بنیادی مقصد اُس زبان میں موجود آوازوں کا گہرائی سے مشاہدہ مطالعہ کرنا اور مکمل آگاہی حاصل کرنا ہے جس کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ ایسے الفاظ جو دیکھنے میں ایک جیسے نظر آتے مگر محل وقوع کی بدولت اُن کے معانی کس طرح یکسر بدل کر رہ جاتے ہیں۔اس کے پیچھے وہ کونسا محرک ہے۔ جو ایک لفظ کو دو معانی عطا کرتا ہے۔ مثلاً ''پیر'' کو کبھی بزرگ کے طور پر تو کبھی جسم کے عضو کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ''میل'' کو کبھی فاصلہ ماپنے کے لیے تو کبھی گندگی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہوتا ہے۔ ایسا محض اتفاقاً نہیں بلکہ زبان کا پورا نظام اس کی پشت پر کھڑا ہوتا ہے جس کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ'' کہتے ہیں کہ اُردو میں آوازیں زیادہ ہیں اور علامتیں کم ہیں وہ اس معاملہ کو مصوتوں کی حد تک رکھتے ہیں۔

مصمتے حروف صحیح (Constant)

ایسی آوازیں جن میں رکاوٹ اور رگڑ کا عنصر شامل ہو۔ جو آواز ایسی رگڑ یا رکاوٹ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اس عمل میں صوتی تانت میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مصوتوں کے برعکس مصمتوں کے مسموع ہونے کی شرط نہیں ہے مصمتے مسموع اور غیر مسموع دونوں حالتوں میں ہو سکتے ہیں۔ انگریزی میں مصوتے Constant کہلاتے ہیں۔ مصمتے کی ادائیگی کے لیے سانس کو منہ کے کسی نہ کسی حصہ میں روک کر یا رگڑ کر باہر نکالا جاتا ہے۔اُردو میں ۳۸

مصمتے ہیں۔ ان میں سے بعض مصمتوں کے لیے عربی اور فارسی زبان سے آوازیں ادھار لی گئی ہیں۔ ''ف، ز، ژ، خ، غ اور ق'' کی آوازیں انہی دو زبانوں سے مستعار ہیں جبکہ ''ژ'' کا چلن نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان میں ''ق'' ایک ایسا حرف ہے جو انفرادی حیثیت کا حامل ہے جب کہ باقی تمام حروف کی ادائیگی ہوا خفیف رگڑ سے باہر نکلتی ہے۔

سنسکرت میں مصمتے ''ونجن'' کہلاتے ہیں۔ یہ زبان کی بنیادی اور حقیقی آوازیں ہیں۔ اس کے لغوی معانی ٹھوس شے کے ہیں۔ جن کا مطلب ایسے شے جو اندر سے خالی نہ ہو۔ اس کے لیے استعمال کیا جانے والا سنسکرت کا لفظ ''ویَنجن'' بھی ''بھرا ہوا'' کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ سنسکرت ماہرین اس بات پر متفق کہ حروف صحیح کو ''ویَنجن'' اس لیے کہا جاتا کہ یہ اپنے اندر معانی کی موجودگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ الفاظ کے معنوں کی تشریح کرتے ہیں۔ ان کے بغیر جملہ کی تکمیل ناممکن ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ مصمتوں کے قیام کے لیے مصوتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مصمتوں کی تقسیم تین مدارج کے تحت کی جاتی ہے۔ ایک وہ جگہ جہاں سانس میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس مقام کو مخرج نقطہ یا تلفظ کی ادائیگی کا مقام بھی قرار دیا جاتا ہے۔ دوم وہ طریقہ ہے جس سے رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے اس کو تلفظ کا نام دیا جاتا ہے۔ سوم صوتی تانت کی تھرتھراہٹ اس میں تھرتھراہٹ کا ہونا مصمتے کو مسموع اور تھرتھراہٹ کا نہ ہونا اس کے غیر مسموع حالت کا غماز ہے۔

سب سے پہلے اس بات کا علم ضروری ہے کہ مصمتے کی ادائیگی کے کونسے اعضاء کو متحرک ہونا پڑتا ہے۔ اور حرکت کی وجہ سے ان اعضاء میں کون سی تبدیلی رونما ہوتی ہے یہ اعضاء کتنی دیر تک تبدیل شدہ حالت میں رہتے ہیں۔ نیز اس بات کا علم بھی ضروری ہے کہ سانس کی ہوا کا اخراج کس رفتار سے ہوا۔

سانس کے اخراج میں سانس پھیپھڑوں سے منہ کی طرف باہر کو آتا ہے اخراج کے دوران سانس کو مختلف جگہوں پر روکا جا سکتا ہے جن جگہوں پر سانس روکی جا سکتی ہے اُن گلبھڑوں کو مخارج کا نام دیا جاتا ہے اور اِن مخارج

کی بنیاد پر مصمتوں کو نام دیئے جاتے ہیں۔ سانس کی ہوا کو جن مقامات پر روکا جا سکتا ہے اُن میں سے ایک مقام ''لب'' یا ہونٹ ہیں۔ کچھ حروف کی ادائیگی کے لیے ہوا کو دونوں ہونٹوں کی مدد سے روک لیا جاتا ہے۔ مثلاً ''پ اور ب'' وغیرہ کی ادائیگی میں دونوں ہونٹ کے درمیان ہوا کو روک لیا جاتا ہے۔ ایسے مصمتے ''دوہی'' کہلاتے ہیں۔ جب ہوا کو نچلے ہونٹ اور اوپر کے دانتوں کی مدد سے روکا جائے تو ''ف'' جیسے حروف کی ادائیگی میں مدد ملتی ہے اور اِس حالت کو ''لب دنتی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ''ت اور د'' وغیرہ کی ادائیگی کے یے زبان کو نوک کی مدد سے اوپر والے دانت پر سانس کی ہوا کو روکا جاتا ہے۔ ''ٹ'' کے لیے زبان کی نوک اور لثہ کی مدد سے سانس کو روکا جاتا ہے۔ اس کو ''لثوی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ زبان کی نوک اوپر ہو کر پیچھے مُڑ کر تالو کو چھوتی ہے جس کی وجہ سے ''ٹ اور ڈ'' کی آوازوں کی ادائیگی ہوتی ہے زبان کے مڑنے کے باعث اس عمل کو معکوسی کا نام دیا جاتا ہے۔ ''تالوئی'' میں زبان کے مختلف حصے الفاظ کی ادائیگی کے لیے تالو کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''ج، چ'' حروف کی ادائیگی کے لیے زبان کا نوک سے پھیلا حصہ تالو کی طرف حرکت کرتا ہے جب کہ ''س اور ش'' کی ادائیگی کے لیے زبان کا درمیان کا حصہ اوپر تالو کی جانب حرکت کرتا ہے۔ زبان کا پچھلا حصہ اور نرم تالو ''ک، گ'' کی آوازوں کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ''ق'' کی ادائیگی کے لیے کوا اور زبان کا آخری حصہ مل کر سانس کو روکتے ہیں۔ ''غ'' کی ادائیگی کے لیے صوتی تانت بند ہو کر ہوا روکتے ہیں۔

ایسی آوازیں بند آوازیں جن میں مصمتوں کی ادائیگی کے عمل میں چند لمحوں کے لیے ہوا کا راستہ مکمل طور پر بند کرنا پڑتا ہے۔ پھر ہوا شدت کے ساتھ باہر نکالی جاتی ہے۔ ان آوازوں کو بندشی آوازوں کا نام دیا جاتا ہے۔ جاریہ مصمتے ایسے مصمتے کہلاتے ہیں جن میں سے کسی تنگ راستے سے ہوا برابر گزرتی ہے اور آواز بھی ساتھ ساتھ جاری رہے اس کو دو مزید حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ صغیری اور گونج دار مصمتے۔ صغیری مصمتے ایسے ہوتے ہیں سانس کو خارج ہونے کے عمل میں منہ کے کسی تنگ کھلے ہو حصے سے گزرنا پڑے۔ اُردو میں ''ف'' کی ادائیگی کے

لیےاس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔اس کے برعکس گونج دار مصمتوں کی ادائیگی میں سانس بغیر کسی رگڑ کے خارج ہو جاتا ہے مگر منہ کا خلاء زبان کی وجہ سے تبدیل ہو جاتا ہے اور آواز میں گونج پیدا ہوتی ہے۔''ل اور ر'' کی آوازوں کو اِس ضمن میں لکھا جا سکتا ہے۔''ل'' کی ادائیگی میں زبان کا درمیان والا حصہ آگے سے تالو کی جانب اٹھتا ہے اور تالو سے جا ٹکراتا ہے۔اگر سانس کو مکمل طور پر منہ میں روک لیا جائے تو آواز ناک کی مدد سے پیدا ہوتی ہے ایسی آوازیں کہلاتی ہیں۔نیم مصمتے ایسے الفاظ کی مدد سے تشکیل پاتے ہیں جن کو ادا کرنے کے لیے زبان کا وسطی حصہ تالو کی جانب حرکت کرے۔

صوت تانت

صوت تانت کسی بھی مصمتے کی ادائیگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر صوت تانت میں الفاظ کی ادائیگی کی صورت میں کسی قسم کی رگڑ وقوع پذیر نہیں ہوتی اور ان میں تھرتھراہٹ پیدا نہیں ہوتی صوت تانت مکمل طور پر کھلے رہتے ہیں ایسی صورت میں مصمتے غیر مسموع کہلائیں گے۔اس کے برعکس اگر صوت تانت آپس میں جڑے رہیں اور آواز کی وجہ سے ان میں تھرتھراہٹ پیدا ہو تو مصمتہ مسموع کہلائے گا۔واضح ہوا کہ صوت تانت آواز کے لیے بہت اہم ہے جس کی وجہ سے حروف صحیح کے مسموع یا غیر مسموع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔زبان کے استعمال کے وقت ایسا نہیں ہوتا کہ سانس روک لی جائے اور الفاظ ادا کیے جائیں بلکہ گفتگو کے ساتھ ساتھ تنفس کا عمل بھی بیک وقت جاری رہتا ہے۔آواز اور سانس دونوں کے درمیان ربط کی موجودگی بامعنی گفتگو کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ صوتی اعتبار سے ادائیگی کے وقت عمل تنفس کی بدولت آوازوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ ''صوت رکن'' کہلاتے ہیں۔ ہر زبان میں رکن مختلف تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ایک زبان میں عموماً رکن کی تعداد ''چھ'' الفاظ تک محدود ہو سکتی ہے۔ یہاں جو قابلِ غور بات ہے وہ یہ ہے کہ بغیر ''مصوتے'' کے رکن تشکیل نہیں پا سکتا۔کیونکہ آوازوں میں گونج ہوتی ہے۔اور گونج مصمتوں کے مقابل مصوتوں میں زیادہ موجود ہوتی ہے اس کی

وجہ مصوتوں کا مسموع ہونا ہے۔ مصوتوں کی ادائیگی میں رگڑ نہیں ہوتی بلکہ منہ میں بننے والا خلاء گونج کو پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے اور اس طرح ادا کیے گئے حروف عموماً مصوتے کہلاتے ہیں۔

پروفیسر مورس ہارلے اور گنر فائٹ نے ۱۹۵۲ء میں جدید ترین صوتیاتی نظریہ کی بنیاد رکھی جس میں اس بات کو بنیاد بنایا گیا کہ جب صوتی لہر سامع کے کانوں سے ٹکراتی ہے تو اُسے دو رُخ انتخاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک انتخاب آواز کی خصوصیات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یعنی دو متضاد صفات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے یہ انتخاب آواز کی انفی، مسموع اور غیر مسموع حالتوں کو مدِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔

آواز کی خصوصیات

صوتی تواتر کا ایسا اجتماع جس میں ایک آواز دوسری سے الگ پہچانی جا سکے سمعیاتی خط کہلاتا ہے۔ مصوتوں میں کم از کم دو سمعیاتی خط موجود ہوتے ہیں۔ اور یہی مصوتوں کی شناخت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ مصوتے کی ادائیگی میں حلق کا استعمال کیا گیا ہے جو جوف وار دہن کو استعمال کیا گیا ہے۔ بندشی آوازوں میں مصوتوں کی طرح سمعیاتی خط نہیں بنتے اس لیے اس قسم کی آوازوں کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بندشی آوازیں اپنے سے پہلے اور بعد میں آنے والے سمعیاتی خطوط کی وجہ سے شناخت کی جاتی ہیں۔ صوتی آوازوں میں سمعیاتی خطوط واضح طور پر موجود ہوتے ہیں جب کہ غیر مصویاتی آوازوں میں یہ خط موجود نہیں ہوتے اس کی وجہ صوتی آوازوں کا مسموع ہونا ہے۔ صوتی آوازوں میں سانس کی رگڑ اور رکاوٹ کا عنصر نہیں ہوتا جبکہ مصمتوں میں آواز کے راستے میں رکاوٹ موجود ہوتی ہے۔ اسی لیے دنیا کی تمام زبانوں میں موجود مصوتے غیر مصمتی حالت میں ہوتے ہیں اسی طرح مصمتے غیر صوتی حالت میں تقسیم ہوتے ہیں اُردو زبان میں ''ل'' اور ''ر'' کے حروف اس کی مثال ہیں۔ ''ل'' کی آواز رواں ہیں۔ جبکہ ''ر'' کی آواز لرزشی اور تھپکدار ہے۔ ان کے لیے صوتی راستے میں رکاوٹ بھی موجود ہے اور بعض حالتوں میں صوتی راستہ نسبتاً کھلا ہوا بھی ہوتا ہے۔

سمعیاتی خطوط پیوست آوازوں میں مرکز میں اور ساتھ ساتھ جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جبکہ بیشتر آوازوں میں یہ خطوط سمعیاتی مرکز سے ہٹنے ہوتے ہیں پیوست اور منتشر آوازوں میں اہم فرق گملدار جوف کا ہے بڑا اور آگے کا جوف چھوٹا ہوتا ہے۔مصوتوں میں زوردار فونیم کا زمانی وقفہ کمزور فونیم سے زیادہ ہوتا ہے۔ مصمتوں میں بھی زمانے کے وقفوں کا فرق اہم ہوتا ہے۔اسی لیے کمزور آوازوں سے زوردار آوازوں کا زمانی وقفہ زیادہ ہوگا اور ان میں طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے اُردو زبان میں زوردار اور کمزور آوازوں کا تعلق محض مصوتوں تک محدود ہے مصمتوں میں یہ تعلق واضح موجود نہیں ہے۔اس طرح اُردو کی ۳۰ مصمتی آوازوں کی باہمی تفریق کی جا سکتی ہے ان ۳۰ آوازوں میں سے ہر آواز مصوتی ہوگی یا غیر مصوتی ہوگی کیونکہ ہر آواز اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر دوسری آواز سے مختلف ہوتی ہے۔اُردو زبان پر غور کرنے اور چند اقلی جوڑوں کو سننے کے بعد کُل صوتیوں کی تعداد ۶۲ قرار پائے گی (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)۔بعض لوگ انفیائی معنوں کو سادہ اور انفی مصوتوں کا حامل قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔اُن کے مطابق سادہ اور انفیائی مصوتوں کی ادائیگی میں واضح فرق ہے۔سادہ مصوتوں کی ادائیگی حلق سے ہونٹ تک محدود ہے جبکہ انفی مصوتوں کی گزرگاہ حلق اور ہونٹوں کے ساتھ ناک بھی شامل ہے۔''ب'' اور ''بھ'' اس کی امثال ہیں ان دونوں میں ایک صوتیہ سادہ اور دوسرا ہائیہ ہے۔''بھ، پھ، تھ'' وغیرہ انفی اور سادہ صوتیوں کا اصلی مرکب قرار دیئے جا سکتے ہیں۔اُردو زبان کے بعض مصنفین ان دونوں صوتیوں کو یکجا کر دیتے ہیں۔مگر سنسکرت کے قواعد نویس ہائیہ صوتیہ کو ہمیشہ سے الگ صوتیہ قرار دیتے آئے ہیں۔دیوناگری رسم الخط میں ان کی علامات بھی الگ سے موجود ہیں۔دورِ جدید کے اکثر ماہرین بھی اس کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔اس تقسیم کے عمل میں ''ی'' کو صیحوں میں شامل کیا جاتا ہے اگر ہم اقلی جوڑوں کے درمیان تقابل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو تحاریر میں ''ی، ے'' ابتدائی اور درمیانی محلِ وقوع پر واقع ہیں اور کسی مصوتے کی علامت ہیں۔بعض ماہرین ''ی'' کو نیم مصوتہ بھی قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی

رائے میں سوائے انگریزی مصوتوں کی تقسیم کی تقلید کے اس کا اور کوئی جواز نہ ہے۔اس طرح ''ی'' ایک نیم مصوتہ جس کا عمل مصوتے سے مشابہ ہوتا ہے ''انشا اللہ خان'' نے ایسے حروف کی ایک فہرست دی ہے جو ''ی'' اور ''وٗ'' کے ساتھ مل کر ایک ہو جاتے ہی۔اس کی امثال کیاری، گیارہ، گوار سے دی ہے۔

مصوتے اور غیر مصوتے اس قسم کے صوتیے قطعیاتی یا کسری صوتیے ہیں جبکہ کو صوتیے۔ان کے علاوہ اور بھی ہیں جو غیر کسری اور غیر قطعیاتی صوتیے ہیں۔صوتی شکل میں فرق ان صوتیوں میں موجود شدت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔اور اسی وجہ سے معانی میں بھی تبدیل وقوع پذیر ہوتی ہے۔مثلاً ''آؤ'' کے معنی میں حکم یا التجا کے معانی اس کی ادائیگی سے فرق کا پتہ چلتا ہے۔جس کی وجہ سے لفظ کے معانی میں واضح طور پر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ایسے صوتیے انسانی یا فراقی صوتیے کہلاتے ہیں۔اور ان کی اہمیت دوسرے صوتیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ایسے صوتے بالا قطعاتی صوتیے کہلاتے ہیں۔مثلاً ''آپا جی'' کو دو طرح سے ادا کرتے ہیں ایک ''آ'' ''پاجی'' اور دوسرا ''آپا'' ''جی'' اس طرح قطعیاتی صوتیوں میں اتصال اور فراق کی بدولت فرق نئے صوتیوں کو جنم دیتا ہے اور اس لفظ اپنے معانی بعض صورتوں میں مکمل طور پر بدل بھی لیتے ہیں۔اس طرح ابواللیث صدیقی باسٹھ مصوتوں اور غیر مصوتوں کی آواز میں شدت کے فرق اور فراقی اور اتصالی صوتیوں سے مل کر اُردو زبان کے صوتیوں کی تعداد چونسٹھ قرار دیتے ہیں۔

صوتی نظام میں صوتیہ عنصر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔کلمہ کے جزو کے طور پر کم از کم عام گفتگو میں صوتیہ رکن کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔لفظ یا کسی کلمہ کی اکائی یہی رکن ہی ہوتا ہے۔ایک مصوتہ، ایک اکائی، اور دو متصل مصوتے مل کر دو رکنی کلمات میں دو متصل مصوتے موجود ہوتے ہیں۔عموماً اُردو کلمے میں رکنی ساخت چھ قسم کی ہوتی ہے۔

ا۔''ع'' کو صرف ایک مصوتہ قرار دیا جاتا ہے جو آ، او، اے، اے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ ''ص ع'' ایک صحیحہ ہے اگر اس ''جا'' مصوتہ (ج +ا) د+ ے (دے) کو ملایا جاتا ہے۔

۳۔ ''ع ص'' ایک مصوتہ + ایک صحیحہ (آ+م) آم

۴۔ ''ع ص ص'' مصوتہ+ صحیحہ+ صحیحہ عمر (ع +م+ ر)

۵۔ ''ص ع ص'' صحیحہ+ مصوتہ+ صحیحہ چال (ج + آ+ ل)

۶۔ ''ص ع ص ص'' صحیحہ+ علت+ صحیحہ+ صحیحہ (جسم) ج +س+م

زبان ایک متحرک شے ہے زبان کبھی بھی جامد نہیں رہ سکتی۔ قوم کی زندگی کے ساتھ زبان بھی بڑھتی اور ترقی کی منازل طے کرتی جاتی ہے۔ ضرورت کے مطابق زبان میں موجود آوازیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر جب دو مختلف صوتی نظام رکھنے والی اقوام ایک دوسرے کے رہن سہن پر اثر انداز ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کی زبان کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال دو زبانیں عربی اور فارسی کو لیں بعض حروف یا صوتیے ایسے ہیں جو عربی میں موجود ہیں مگر فارسی میں اُن کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی طرح فارسی کے بعض صوتیوں سے عربی زبان خالی ہے۔ اسی طرح بعض صوتیے عربی اور فارسی میں موجود ہیں لیکن اُردو میں موجود نہیں اسی طرح اُردو میں موجود بعض صوتیے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہیں مثلاً ''ٹ، ڈ'' وغیرہ۔ عربی ''ث'' فارسی میں مستعمل نہیں اور اسی طرح فارسی میں موجود ''گ اور چ'' عربی زبان میں موجود نہیں۔ مگر زبانوں کے میل ملاپ سے آوازوں میں تبدیل اور کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے۔

اُردو زبان کو محض ہند میں بولی جانے والی زبانوں سے متاثرہ قرار دینا درست نہیں یا یہ کہنا کہ اُردو آریائی کی زبان پر پراکرت کی ترقی یافتہ شکل ہے تو یہ بھی مکمل طور پر صحیح نہیں۔ عربی اور فارسی زبان نے اُردو کی ترقی پر گہرے اثرات مرتب کیے ان زبانوں کے اثرات اور ہندوستان میں پہلے سے بولی جانے والی زبانوں کی بدولت اُردو میں مجموعی طور پر صوتیوں کی تعداد ان تمام زبانوں میں انفرادی طور پر موجود صوتیوں کی تعداد سے بڑھ گئی ہے۔

صوتیوں کو جن حروف تہجی سے ظاہر کیا جاتا ہے ان میں ''ب، پ، ت، ٹ، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن وغیرہ شامل ہیں۔ ان حروف کو حروف صحیح انگریزی میں Constant کہتے ہیں۔ جبکہ ''ا۔و۔ے'' حروف علت، مصوتے، یا انگریزی زبان میں Vowels کہلاتے ہیں۔ زیر زبر پیش ایسے اعراب ہیں جو نصف حروف علت ہیں جو''ا۔و۔ے'' کے ساتھ مل کر حروف علت کی بہت سے اشکال کو جنم دیتے ہیں۔ حروف صحیح میں ہم صوت حروف بھی شامل ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کے حروف میں صوت الفاظ درج ذیل ہیں۔

ا۔ث،س،ص

۲۔ت،ط

۳۔ح،ہ

۴۔د،ض

۵۔ذ،ز،ظ،ض

۶۔ع،ا

یہ صوتیے ہماری زبان میں موجود ہیں۔ بولتے ہوئے عام طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ زبان کو خاص طور پر بولنا سیکھتے ہیں وہ ان آوازوں کے اصلی مخارج سے ادا کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر ہم اس بات کو مان لیں کہ ان صوتیوں میں آواز کا فرق موجود نہیں تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر ایسے صوتیوں کی رسم الخط میں موجودگی کیا معانی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ابولیث صدیقی کے مطابق اس کا جواب یہ ہے کہ رسم الخط میں ایسے حروف کی موجودگی کے سبب لفظ کے معانی کے تعین میں آسانی ہوتی ہے اگر ہم صوتیہ حروف کو خارج کر دیا جائے تو معانی کے تعین میں مشکلات کا سامنا ہوگا۔ مثلاً ''آم'' اور ''عام'' کا فرق محض املا سے ظاہر ہوتا ہے اس طرح یہ بات واضح

ہوتی ہے کہ ہم زبان کی اصل اُس کی اصلیت اور ہیئت سے واقف نہ ہیں۔ ہر زبان کی اپنی ساخت ہوتی ہے جن میں صوتیوں کی تعدا، ترتیب و ترکیب سے الفاظ کی تشکیل ہوتی ہے اور گفتگو میں اسی ترکیب اور ترکیب کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ مختلف زبانوں کو ملا کر ایک نئی زبان بنائی جا سکے۔ اسی لیے یہ کہنا درست نہیں کہ فارسی، عربی پراکرت اور آریائی زبانوں کے مشترک امتزاج سے اُردو وجود میں آئی۔ ان زبانوں کے عناصر بلاشبہ اُردو میں موجود ہیں جن کی حیثیت دخیل سے زیادہ کی نہیں۔ اسی لیے ان میں یا تو تبدیلی وقوع پذیر ہو چکی یا ان کا تلفظ بدل چکا ہے۔ ان کی اشکال تبدیل ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے معانی تک بدل گئے ہیں۔ اس لیے اگر اب ہم ان الفاظ کو اصل سے نسبت نہیں دے سکتے۔ انگریزی زبان کا حصہ اکثر الفاظ لاطینی، یونانی، جرمن اور آریائی زبانوں کے ہیں لیکن انگریزی تلفظ نے ان الفاظ کو اپنا کر انگریزی زبان کا حصہ بنا دیا ہے۔ اب ان الفاظ کو انگریزی کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں بھی سنسکرت، عربی، فارسی الفاظ اپنی ہیئت، معانی تک کو بدل چکے ہیں۔ ان کا تلفظ اُردو کے مطابق ڈھل چکا ہے اور ہم وہی لکھیں اور بولیں گے جو اُردو زبان کی عکاسی کرے گا تو یہ مطالعہ زیادہ سائنٹفک ہو گا۔

اس طرح حروف کی جو تعداد اُردو میں کم کی جا سکتی ہے اُن میں ''ط، ث، ص، ح، ض، ذ، ظ، ع'' شامل ہیں۔ اگر ان حروف کو حروف تہجی سے نکال دیا جاتے تو ان حروف کی وجہ سے پانچ مکسور اشکال حروف کے ۶۴ جوڑے کم ہونے سے حروف میں کم از کم ۲۰ فی صد بچت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس تبدیل کو قبول کرنے سے املاء معیاری اور آسان ہو جائے گی (ڈاکٹ ابواللیث صدیقی) اس طرح جن لوگوں کی حاوی زبان اُردو نہیں ہے اُن کو اُردو زبان سیکھنے میں آسانی ہو گی۔ اور جن لوگوں کی زبان اُردو ہے وہ زیادہ بہتر اور درست اُردو لکھ سکیں گے۔ املاء کی اغلاط میں بھی کمی واقع ہو گی۔ اور اُردو لکھنے میں آسانی ہو گی۔ ان حروف کی بدولت رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی جس کی مثال پرانے زمانے کی وہ تحریریں ہیں جن میں ''ک، گ'' میں فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا مگر سیاق و

سباق کی مدد سے ہم عبارت کی تفہیم درست کر سکتے ہیں۔جن کی وجہ لفظ سے ہماری صوتی آشنائی ہے۔صوتی اعتبار سے اگر ہم حروف کا موازنہ کریں تو ''ت اور ط'' کی صورت میں واضح اختلاف تلاش کرنا ایک مشکل ہے اسی طرح ''ث،س، اور ص'' کو لیں ان کی آوازیں بھی اشترا کی صوت لئے ہوئے ہیں۔ املا کے دوران ان حروف کی تحریر املاء کی غلطی کا باعث اس طرح کی صورت حال ''ہ اور ح'' کے درمیان بھی ہے ''ذ اور ض'' کے استعمال میں فرق واضح نہیں ہے۔ اور اکثر ان الفاظ کو تحریر میں لاتے ہوئے طالب علم مشکل صورت حال سے دو چار ہوتے ہیں۔ ''ذ، ز،ض اور ظ'' حروف بھی مبہم اور املاء میں اغلاط کے ساتھ صوت میں بھی ملتے جلتے خصائص کے حامل ہیں۔ اور اسی صورت حال کا شکار ''ع اور ا'' بھی ہیں۔

ایک اور مسئلہ جس کی وجہ سے اُردو زبان کی تفہیم میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ حروف کے جوڑوں کا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اُردو حروف کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک حصہ کو وہ 'تمیزی' حصہ قرار دیتے جبکہ دوسرے حصے کو وہ اضافی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر حرف کا ابتدائی سِرا اُس کی بنیادی شکل ہے اِن حروف میں امتیاز نقاط کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے حروف کا وہ حصہ جو دوسرے سے امتیاز کی وجہ بنتا ہے تمیزی حصہ کہلاتا ہے۔ اس حرف سے اگر امتیازی حصہ کو خارج کر دیا جائے تو حرف کی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اضافی حصہ نکال دینے سے حرف کی شناخت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور شناخت برقرار رہتی ہے۔ اس طرح اگر ہم اس اصول کو تسلیم کر لیں تو ہمیں ۶۴ کی بجائے صرف ۳۸ حروف تہجی کے جوڑ درکار ہوں گے۔ جس حروف کی تعداد میں کمی واقع ہو جائے گی جس سے اُردو کی آسانی سے سمجھایا جا سکے گا۔ پیچیدگیوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ چونکہ الفاظ کی بنیادی اشکال برقرار رہیں گی اس لیے تحریر کو پڑھنا آسان ہوگا۔ صوتیات میں زبان کی آوازوں کے پیدا ہونے کے طریقوں اُن کی درجہ بندی کے اصول زیرِ غور لاتے ہیں۔ صوتیات کے زیر اثر جن آوازوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اُن کا تعلق کسی بھی زبان سے ہو سکتا ہے۔ صوتیات میں جن آوازوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے وہ نظریاتی طور پر لامحدود ہوتی ہیں اور واقعتاً ان کو

ادا کیا جاتا ہے۔۱۸۸۶ء میں فرانس بین الاقوامی صوتیاتی انجمن جن نے لوگوں کولسانیات کے بارے میں علم دینے کے لیےنشانات کےاستعمال پرزوردیا۔اس کی وجہ تحریری حروف اورحروف کی ادائیگی کےاختلاف کودورکرنا تھااسکی مثال انگریزی حروف''C'' ہے جوکئی آوازوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"Concious" ایک ہی لفظ میں ''ک اورش'' دونوں کی آواز دے رہاہےاس طرح ایک آواز کے لیےبھی کئی حروف کواستعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً ''Sure'' میں تنہا''S''ش کی آواز دیتاہےجبکہ''Selfish''میں''sh''کو''ش'' کی آواز پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اسی مسئلہ کوحل کرنے کے لیےفرانس میں اس انجمن کوقائم کیا گیا جس کا مقصد آوازوں کو نشانوں کی مدد سےسکھانا تھا۔''آٹو پس پرہن اور ہنری سویٹ''اس انجمن کےروح رواں تھے۔جونشانات انہوں نے دیئے ہیں اُن میں کچھ بعض حروف ہیں جبکہ کچھ نئےحروف کوبھی شامل کیا گیا ہے۔ان نشانات کوکسی بھی زبان کے لیےاستعمال کیا جاتا ہےاسی لیےان کا نام(IPA) بین الاقوامی صوتیاتی حروف کا نام دیا گیا۔اس کی مدد سے زبان کوصوتیاتی اورفونیماتی دونوں طرح سےتحریر میں آسانی رہتی ہے۔اس نظام میں دوالگ الگ آوازوں کومختلف اشکال کی مدد سے دکھایا گیا ہے۔نئ آوازوں کواور۔۔۔آوازوں کوایک ہی نشان سے دکھایا جاتا ہے۔جوحروف بعض نہیں ہیں اُن کوبھی بعض بنایا گیا۔کسی خاص زبان پراس نشانیاتی نظام کا اطلاق کرتے ہوئے زبان کی ساخت اوراُس کےڈھانچےکومدِنظر رکھنا ضروری ہے۔اس طرح ماہرلسانیات کے پاس جوبھی مواد ہوگا۔پھراُس کا تجزیہ کرنے کے لیےاُس کوصوتی اشاروں میں تبدیل کیا جائے گا۔

ہکار آوازیں(Aspirated Sounds)

اُردو زبان میں ہکار آوازوں کی تعداد دس ہے۔"پھ، بھ، تھ، ڈھ، ٹھ، جھ، چھ، کھ، دھ، گھ" یہ خالص ہند آریائی اصوات ہیں جبکہ اُردو میں ہائے مخلوط جن بندشی اور ایفریکیٹ آوازوں کے ملنے سے بنتی ہے وہ درج ذیل ہیں۔"ب، پ، ت، د، ڈ، ک، گ، " بندشی آوازیں اور"ج اور چ" ایفریکیٹ آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُردو رسم الخط چونکہ فارسی زبان سے اخذ ہے اس لیے طویل عرصے تک تحاریر میں"ہ" کو"ھ" کی بجائے استعمال کیا جارہا کربل کتھا میں بھی اسی قسم کی تحریر ملتی ہے جہاں"ادھر اُدھر" کہا اور کھا، پھر اور پہر، بھار اور بہار میں فرق موجود نہیں۔ محمد شاہی عہد تک ہکار آوازوں کے لیے"ہ" کا استعمال تو تھا مگر"ھ" کا استعمال موجود نہ تھا۔ اسی لیے اُردو کو استعمال کرنے والے انہیں دو آوازوں"پ+ہ" اور"گ+ہ" کا مرکب ہی سمجھتے تھے۔ ان آوازوں کو ہائے ہوز سے استعمال کیا جاتا رہا مثلاً مجھ کو مجہ، تجھ کو تجہ، ساتھ کو ساتہہ، لکھا اور پڑھا جاتا رہا۔ آغاز میں دوہری"ھ" سے لکھنے سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لیے ان آوازوں میں ہکار کا عنصر"ہ" سے ملتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک مدت تک اردو کو لکھتے ہوئے فارسی کتابت کا سہارا لیا جاتا رہا ھائے مخلوط"ل، م، ن، ر، ڑ" اور عام بول چال میں"ی، و اور، ز" آوازوں کے ساتھ ملا کر بولی جاتی ہے۔ دولھا، پڑھو، لکھو، ان الفاظ میں"ہ" کی آواز مصمتے کے فوراً بعد جڑواں حالت میں آتی ہے۔ اور کسی حد تک پہلی آواز کے ساتھ اس انضمام ہو جاتا ہے جبکہ یہ انضمام بھ اور پھ کی ہکار آوازوں میں نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے ضم ہونے کو جزوی جبکہ دوسری قسم کے انضمام کو کلی انضمام کا نام دیا جاتا ہے۔ ہکار آوازوں میں"ہ" بعض الفاظ میں آغاز میں موجود ہوتا ہے یعنی پہلے حروف کے بعد موجود ہوتا ہے جس کی امثال یوں ہیں۔"ٹھوکر، کھوے، گھوڑا، جھالر، تھا، چھاتی،" وغیرہ جبکہ بعض الفاظ میں"ہ" وسط میں موجود ہے مثلاً اندھیر، بکھیڑا کاندھے۔ آنکھوں، سمجھایا، سیدھے" وغیرہ۔ اس طرح بعض الفاظ کے آخر میں بھی"ہ" کی

موجودگی ان امثال سے واضح ہے۔ ''دلمیکہ، مجہ، کچہ، رکہ، ساتہ'' وغیرہ کچھ مزید آوازیں ہائے زائد کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کاہہ ان الفاظ ہیں ''ہ'' کی موجودگی ماقبل آواز ہکار ہوگئی ہے۔

فونیمیات

صوتیات میں آوازوں کی طرز ادا کا مطالعہ کیا جاتا ہے جبکہ فونیمیات میں ہم کسی زبان میں موجود اہم آوازوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایسی آوازوں کو تفاعلی آوازیں کہتے ہیں۔ اور ان تفاعلی اکائیوں کو فونیم کا نام دیا جاتا ہے۔ فونیمیات میں نہ صرف ان آوازوں کا جائزہ لینا مقصود ہوتا ہے بلکہ ان کی تعداد کا تعین بھی جاتا ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں یہ تعداد کم سے کم پندرہ اور زیادہ سے زیادہ پچاس ہوسکتی ہے۔ پس فونیمیات میں ہم کسی زبان کی اہم آوازوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں کہ اس زبان میں کتنے فونیم اور ذیلی فونیم موجود ہیں اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ فونیم کسی زبان کی ایسی آواز کو کہتے ہیں جس کے ادا نہ کرنے سے معانی میں فرق پیدا ہوجائے۔ (۴) فونیم آوازوں کا ایسا خاندان ہے جس کے ارکان صوتی اعتبار سے ایک جیسے ہوتے ہیں اور یہ آپس میں مکمل تقسیم کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ان ارکان کو ذیلی فونیم کا نام دیا جاتا ہے۔ فونیم کی تعداد محدود ہوتی ہے مگر آوازیں لامحدود ہوتی ہیں۔ (۵) اسی لیے ایک فونیم کی بہت سی آوازیں ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے کسی بھی آواز کا استعمال تلفظ کی تبدیلی کے باوجود میں معنی میں فرق پیدا نہیں کرے گا۔ اردو زبان سے اس کی ایک مثال ''ل'' کی لیتے ہیں جس کو فونیم /ℓ/ سے ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ اس کے دو ذیلی فونیم /L/ اور ''/ℓ/'' ہیں۔ صوتی اعتبار سے دونوں ایک جیسے نظر آنے کے باوجود دونوں میں پہلوی طریقہ سے سانس کا بہاؤ ہوتا ہے لیکن دونوں کا مخرج الگ الگ ہے۔ /L/ کا مخرج لثہ ہے جبکہ /ℓ/ کا مخرج معکوسی ہے یعنی جہاں ایک ذیلی فونیم استعمال ہوتا ہے وہاں دوسرے کو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ /L/ معکوسی آوازوں سے پہلے آتا ہے مثلاً ''بالٹی'' وغیرہ

جبکہ /l/ باقی تمام جگہ پر استعمال ہوتا ہے مثلاً ''کل'' وغیرہ۔ کسی فونیم کی یہ خاصیتیں ہر زبان میں یکساں اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ انگریزی زبان میں ہکاریت کا عنصر ذیلی فونیم کو تشکیل کرتا ہے جبکہ اردو زبان میں ہکاریت ایک نئے فونیم کو جنم دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبان میں ایک آواز ذیلی فونیم کے درجے میں آتی ہے تو وہی آواز دوسری زبان کے اندر ایک مکمل فونیم کا درجہ رکھتی ہے۔ مثلاً ''Ph'' کی آواز انگریزی میں ذیلی فونیم اور اردو میں فونیم ہے۔ دو زبانوں میں ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک ہی جیسا فونیم موجود ہو مگر اس کا استعمال ایک جیسا نہیں ہوگا۔ ایک زبان کے اندر رہتے ہوئے بعض فونیم ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں جبکہ عین ممکن ہے کہ ان فونیم کا استعمال دوسری زبان میں موجود ہی نہ ہو۔ اس طرح فونیم ایک طرح کی اصطلاح ہے جس سے ایک وقت میں کئی آوازوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فونیم ایک خیالی نشان ہے جو کئی آوازیں لیے ہوتا ہے اگر کسی لفظ کا ساختی مطالعہ کرنا ہو تو فونیم کے نشانات کو استعمال کیا جاتا ہے۔

ایسی تحریر جس میں ایسے حروف کی تعداد کم ہو جن کو نشان کے طور پر استعمال کیا گیا ہو اور ان کی شکل سادہ ہو سادہ فونیمی تحریر کہلاتی ہے۔ ایسی تحریر میں زیادہ تر رومن حروف کو استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی زبان کا جائزہ لینے سے مراد اُس زبان میں موجود فونیم معلوم کرنا ہے جن کا بنیادی مقصد اہم آوازوں کے بارے میں جاننا ہے۔ اس کے لیے ماہرین لسانیات ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جن لوگوں کی وہ مادری زبان ہو۔ ان سے مختلف سوالات پوچھ کر اس زبان کو بار بار سنا جاتا ہے۔ سائنٹفک آلات کی مدد سے اُس کی آواز کو صوتی اشاروں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے پھر ان اشاروں کو فونیمی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ان میں سے وہ الفاظ لے لیے جاتے ہیں جن میں صرف آواز کا فرق ہو۔ ایسے جوڑوں کو اقلی جوڑوں کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً اردو زبان میں ''چل اور چھل'' میں کون سی آوازیں فونیم ہیں اور کونسی غیر فونیم ہیں۔ اب فیصلہ اس امر کا کرنا ہے کہ ''Ph'' کی آواز میں ''P'' اور ''h'' کو الگ تصور کریں یا یہ حالت اکائی میں ہیں۔ صورت حال اردو کے ''پھ'' میں ''پ'' اور ''ھ'' سے متعلق ہے۔ کسی

آواز کے فونیم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے چند بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

تضاد کا اصول

اگر دو آوازوں میں تضاد کی کیفیت موجود ہو یعنی ان میں معانی کا فرق ہو تو ایسی آوازیں دو متضاد فونیم کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ مثلاً ''پل اور بل'' میں ''پ اور ب'' دو مختلف فونیم ہیں جس کی وجہ سے لفظ کے مکمل معانی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان آوازوں کا فونیم ہونا ضروری نہیں مگر یہ آوازیں فونیم کی نمائندگی کرتی ہیں۔(۶)

تکمیل کا اصول

ایسی دو آوزیں تکمیلی تقسیم میں ہوں گی جن میں تضاد نہیں ہوتا۔ اس اصول کے زیر اثر کسی لسانی ماحول میں اگر ایک آواز استعمال میں لائی جا رہی ہے اور دوسری آواز اُسی لسانی ماحول میں استعمال نہیں ہو رہی۔ یہ آوازیں ایک فونیم کی ذیلی فونیم کہلاتی ہیں اس کی ایک مثال انگریزی زبان کا لفظ ''P'' ہے۔ یہ جب ''H'' کے ساتھ آتا ہے تو اس کی آواز میں ہکاریت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے خاص طور پر جب ''PH'' لفظ کے شروع میں آتا ہے۔ مثلاً ''Phone'' (فون) ''Phin'' فن وغیرہ۔ دوسری حالت میں جب ''P'' لفظ کے درمیان آتا ہے تو اس کا اظہار سانس کی نکاسی میں بندش کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مثلاً "Operation" آپریشن وغیرہ۔ جب ''P'' لفظ کے آخر میں آتا ہے تو یہ سانس کی ہوا کو اخراج میں ضبطی بندش پیدا کرتا ہے مثلاً Sip, Dip, Jeep وغیرہ۔ اگر P کے فوراً بعد ''U'' موجود ہو تو ایسی صورت میں بھی بندش سے ان الفاظ کو ادا کیا جاتا ہے مثلاً ''Put'' وغیرہ۔ اس طرح ''P'' چار مختلف آوازوں کو پیدا کر رہا ہے اور چاروں کا استعمال ایک دوسرے سے قطعی مختلف صوتی انداز میں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چاروں ایک ہی فونیم کے ذیلی فونیم کہلاتے ہیں۔

صوتیاتی یکسانیت

ایسی آوازیں جو ایک ہی فونیم کے ذیلی فونیم کی بدولت پیدا ہوئی صوتی اعتبار سے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ یہ

بات بھی ضروری نہیں کہ صوتیاتی اعتبار سے آوازیں اگر ایک جیسی خاصیت کی مالک ہوں تو وہ صوتیا تجزیہ کے لحاظ سے بھی یکساں ہوں۔ مثلاً P کو ہی لے لیں اس کی مختلف اشکال سب بندشی اور غیر مسموع ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ صوتی لحاظ سے یکسانیت کی حامل ان آوازوں کے فونیم کے ذیلی فونیم یکساں ہو مثلاً (N) اور (n) دونوں انفی ہیں اور الگ الگ فونیم ان میں موجود ہیں۔

فونیمیاتی تجزیہ کا اصول

یہ اصول ہر زبان کے ڈھانچے اور فونیمی ساخت کو ایک جیسا قرار دیتا ہے۔ اس اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ فونیمی ڈھانچہ میں توازن کی موجودگی اور آواز کے صاف پن ہونا ضروری ہے۔ اس اصول کے تحت مواد کی چھان پھٹک ایک ضروری عمل ہے۔ مثلاً اگر مواد کے تجزیہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تین بندشی جوڑوں میں سے دو جوڑوں میں ہکاریت کا عنصر موجود ہے جبکہ تیسرے جوڑے میں ہکاریت نہیں ہے تو یہ امکان موجود ہے کہ چوتھے جوڑے میں یہ عنصر موجود ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مواد کا منظّم مطالعہ کیا جائے اور باریک بینی سے جانچ کرنے پر بھی اگر ہکاریت نہ ملے تو مزید مواد اکٹھا کرنے کے بارے میں سوچا جائے۔ سائنس کا اصول ہے کہ موجود مواد کو کم سا ے کم حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ تقسیم قدرتی ہو اس تقسیم کو غیر فطری انداز میں نہ کیا جائے یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ دو مختلف محقق درست اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے بھی مختلف نتائج پر پہنچ جائیں ایسی صورت میں اُس محقق کی تحقیق کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی جس میں فونیم کی تعداد دوسرے کی تحقیق کے فونیم سے کم ہوگی۔ بعض اوقات محقق زبان سے پوری طرح آگاہی نہ رکھنے کی وجہ سے ایک ہی فونیم کے ذیلی فونیم کے لیے الگ نشانات کو استعمال کرتا ہے۔ اردو میں الفاظ ''عام اور فہم'' کو ادا کرتے ہوئے کو تفرق پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے اُردو میں ''ا، آ، ع'' کے لیے الگ ذیلی فونیم کا استعمال غلط ہوگا۔ اس طرح انگریزی میں ''K اور Q'' کی حالت بھی اس طرح ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس بات کا خیال بھی ضرور رکھنا چاہیے کہ دو مختلف آوازیں جو

واقعتاً الگ فونیم ہیں۔اُن کو ایک فونیم سمجھ کر ایک نشان سے ظاہر نہ کیا جائے۔

ڈاکٹر اقتدار حسین کے مطابق، اُردو میں فونیم کی تعداد قطعاتی اور فوق قطعاتی کو ملا کر ۵۶ بنی ہے۔قطعاتی فونیم ۴۵ مصمتے جس میں ایک نیم مصمتہ بھی شامل ہے اور دس مصوتے بھی شامل ہیں۔(۷) اس طرح کل فونیم کی تعداد ۵۶ قرار پاتی ہے۔ان فونیم کو ڈاکٹر اقتدار حسین کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

سادے بندشے:۔

q. g. K. J. C. a. t. d. J. L. P.

ہکاری بندشے:۔

jh. ch. gh. kh. dh. th. dh. th. Lh. Ph.

صغیری فونیم:۔

h. G. K. Z. S. Z. S. f.

رقیق گونج والے فونیم:۔

n. e. n. m.

/L/ کے دو ذیلی فونیم ہیں۔

(۱)۔ (L) کوزی آواز ہے یہ بالٹی، ڈالڈا، الٹا وغیرہ جیسی آوازوں میں آتا ہے۔

(۲)۔ (L) مثلاً قلم، لالا، مال وغیرہ جیسے دیگر تمام الفاظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

/n/ لثوی ارتعاش میں راز، عرض جیسے الفاظ نمائندہ ہیں۔جبکہ سموعی لثوی پہلوی آوازوں میں یہ پہلوی آواز سے پہلے آتا ہے۔ایسے الفاظ کی نمائندگی ''پرلے'' جیسے الفاظ کرتے ہیں۔

۴۔ تھپکدار کوزی آوازیں:۔

اس قسم کی آوازوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک غیر ہکاری /n/ اور ہکاری آواز جن کو /nh/ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ غیر ہکاری آوازوں میں آواز لفظ کے آغاز میں نہیں آتی۔ مثلاً تاڑ، موڑ، جوڑ، وغیرہ ہکاری آوازوں میں جن میں گھوڑا، بوڑھا، گاڑھا، وغیرہ شامل ہیں۔ اکثر ماہرین لسانیات نے /a/ اور /n/ فونیم یعنی ''ڈ اور ڑ'' کو ایک ہی آواز کی دو مختلف اشکال قرار دیا ہے۔ ان کو آزاد تغیر قرار دینا درست بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آزادی چند الفاظ میں تو موجود ہے مثلاً اکھڑ، پکڑ، اُجڑ، وغیرہ مگر ''ڈ اور ڑ'' جب کسی لفظ کے وسطی حرف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو یہ آزاد تغیر نہیں رہتے مثلاً نڈر، سڈول وغیرہ میں ان کی آزادانہ حالت مفقود ہے۔

اُردو میں تین فونیم ایسے ہیں جن کو انفی فونیم کا نام دیا جاتا ہے۔ ان میں سے دو قطعاتی فونیم جبکہ تیسرا عروضی انفی فونیم ہے۔ /m/ یہ دوبھی فونیم ہے۔ مثلاً مال، مان، وغیرہ۔ /n/ یہ لثوی انفی فونیم ہے۔ اس کی امثال میں نام، ناکام ناک وغیرہ جیسے الفاظ شامل ہیں۔ ایسے الفاظ کی ادائیگی کے لیے کئی ہم مخرج ذیلی فونیم موجود ہیں۔ جن میں نمایاں غشائی ذیلی فونیم اور کوزی ذیلی فونیم ہیں۔ غشائی ہم مخرج ذیلی فونیم غشائی آوازوں سے پہلے آتا ہے۔ مثلاً رنگ، جنگ، وغیرہ جبکہ کوزی ہم مخرج ذیلی فونیم کوزی آوازوں سے پہلے آتا ہے۔ مثلاً ڈنڈا، انڈا، جھنڈا وغیرہ۔

اُردو میں تمام مصوتے انفی حالت میں لائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مصوتے انفی فونیم کہلاتے ہیں یہ عروضی حالت میں ہوتے ہیں۔ یہ لفظ کو تبدیلی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً باٹ اور بانٹ میں اسی فونیم کی وجہ سے فرق پیدا ہوتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ مصمتوں کو اس طرح استعمال کرنا کہ ان کے درمیان کوئی مصوتہ نہ ہو مصمتی خوشہ کہلاتا ہے۔ اُردو میں الفاظ کے درمیان اور آخر میں مصمتی خوشہ جات کافی مل جاتے ہیں۔ جب کہ لفظ کے شروع میں مصمتی خوشے اُردو زبان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ (۷) الفاظ کے آغاز میں خوشیوں کی مثال ''کیاری، پیار، کیا اور خواب'' پائے جاتے ہیں۔ جبکہ لفظ کے درمیان میں پائے جانے والے خوشوں کی تعداد

خاصی ہے۔ جن میں لڑکپن، بچپن، خطرہ، اپنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح لفظ کے آخر میں بھی مصمتی خوشے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ''عقل، نقل، نفس، فکر، صدر'' وغیرہ اس کی امثال ہیں۔

اُردو مصمتوں کا خاکہ

	حتمی مقام تلفظ	لہاتی مقام تلفظ	پس غشائی مقام تلفظ	غشائی مقام تلفظ	تالوئی مقام تلفظ	تالوئی لثوی مقام تلفظ	کوزی مقام تلفظ	لثوی مقام تلفظ	دنتی مقام تلفظ	لب دنتی مقام تلفظ	دو لبی مقام تلفظ
بندشیئے طریق تلفظ		q		kkn ggh	cch jJn		ttn ddn		ttn ddn		pph blh
صفیری طریق تلفظ	h		x G			S Z		s z		f	
پہلوئی طریق تلفظ								l			
انفی طریقہ ادائیگی								n			m
ارتعاشی طریقہ ادائیگی							m rh	m			
بے رگڑ باریہ										v	
نیم مصوتے					Y						

الفاظ کی ادائیگی میں زبان کی آواز کئی حالتوں میں یکے بعد دیگرے ادا ہو جاتی ہیں۔ اس طرح لکھتے ہوئے بھی ہم ان آوازوں کو ایسے ہی ترتیب کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا کھا لیا ہے۔ میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن کی آوازیں مزید تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ان تقسیم شدہ آوازوں کو قطعی فونیم کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک جملے کو کئی طرح سے بولا جا سکتا ہے اور اُس جملے کا جواب بھی سوال کے حوالے سے متوقع ہوتے ہیں۔ یعنی اس جواب کا انحصار سوال کی ادائیگی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو گا جبکہ الفاظ ایک ہی رہیں گے یہ فرق کلام کے دوران ''زور'' یا ''بل'' کی وجہ سے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ ''بل اور زور'' کوئی الگ سے استعمال ہونے والی اشیاء نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ کے ساتھ اُس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ''بل'' سانس کے بہاؤ میں زور پیدا کرتا

ہے جس کی وجہ سے ایک صوتی رکن کو دوسروں کے مقابل اہمیت دینے کی وجہ سے زیادہ زور سے بولا جاتا ہے۔ یہ بل صرف اُردو زبان تک محدود نہیں بلکہ تقریباً سب زبانوں میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بل اگر محض صوتیاتی حالت میں ادا ہو تو اُس سے معانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ اس کے برعکس اگر یہ بل فونیم کی ادائیگی میں بھی موجود ہو تو یہ لفظ کے معانی تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ صوتیاتی حالت میں بل کی وجہ سے تلفظ میں فرق پیدا ہوتا ہے۔

اُردو زبان کے چند اقلی جوڑوں کو سننے سے علم ہوتا ہے کہ اُردو زبان میں ایسے صوتے بھی موجود ہیں جن کو قطعاتی یا کسری صوتیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اس کے علاوہ کچھ صوتیہ ایسے ہوتے ہیں جن کو بالا قطعاتی یا بالا کسری صوتیے کہا جاتا ہے۔ ان صوتیوں میں شدت کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ جس سے لفظ کی صوتی شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور معانی میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ''جاؤ'' میں جو دو طرح سے ادا کرنے کے باعث اپنی اہمیت کی وجہ سے معانی بدل لیتا ہے یعنی اسکی ادائیگی میں شدت اس کو حکم یا منت دونوں معانی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان صوتیوں میں زیادہ اہمیت کا حامل فراقی یا اتصالی صوتیہ ہے۔ مثلاً ''آپا جی'' کو دو طرح ادا کرنے سے اُس کے معانی یکسر بدل جاتے ہیں۔ ''آ/ پا جی'' اور ''آپا/ جی'' قطعاتی صوتیے دونوں حالتوں میں ہیں۔ لیکن افتراق اور اتصال کا فرق دونوں صوتیوں میں موجود ایک نئے صوتیے کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ۶۲ مصوتے اور غیر مصوتی صوتیے، ایک شدت اور ایک اتصالی اور فراقی صوتیے کا ملا کر اُردو صوتیوں کی تعداد ۶۴ قرار دی جاتی ہے۔

اُردو کے صوتی نظام میں صوتیے "Element" کی سی اہمیت رکھتے ہیں۔ عام طور پر بول چال جو روزمرہ کی ہوتی ہے اُس میں کلمہ کا مکمل جز و کم سے کم ایک رُکن کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ اس رکن کو لفظ کا نام دیا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک لفظ میں ایک مصوتہ ہوتا ہے اور دو اتصالی مصوتے مل کر ایک رکن یعنی لفظ کی تکمیل

کرتے ہیں۔(۸) مثلاً ''آ،اے،اوٗ'ایک رکنی کلمات کی صورت میں موجود ہیں۔جبکہ ''آؤ،آئے،اورآئی'' دو رکنی کلمات ہیں جو متصل مصوتوں کی موجودگی میں بنتے ہیں۔اُردو میں گفتگو کے دوران رکنی ساخت کے چھ نمونے سامنے آتے ہیں۔جن میں ''ع'' ایک مصوتہ ص ع ایک صحیہ ع ص ایک مصوتہ ''ع س ص مصوتہ+صحیہ+صیحہ+''اور ''ص ع ص صیحہ+مصوتہ+صیحہ'' ص ع ص ص+صیحہ+علامت+صیحہ+صیحہ+اس طرح اُردو میں دو ''ص'' کے ساتھ کسی کلمہ کا آغاز نہیں ہوتا۔

صوتیات میں اُن تمام ممکنہ اصوات کو زیر بحث لایا جاتا ہے جس میں ایک زبان سے لے کر تمام دیگر زبانوں کی اصوات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔جب کہ فونیمیات میں کسی ایک زبان کی صوتیات کو زیر بحث لاکر اس کی اصوات میں پیدا ہونے والے اختلاف سے بدلتے ہوئے معانی کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔فونیم کو اُردو زبان میں صوتیہ کہا جاتا ہے۔جب کہ فونیمیات کو تجزیاتی صوتیات کا نام دیا جاتا ہے۔اس علم میں کسی زبان میں موجود صوتیوں کی دریافت اوران کی ذیلی اقسام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔بعض حالات میں صوتیات کی وجہ سے ہم غیر ضروری قسم کی تفصیلات میں پڑ جاتے ہیں۔ضروری ہے کہ ہم خود کو مفہوم کی ترسیل میں اہم تفصیلات تک محدود کرلیں۔فونیمیات کا بنیادی کام ایک آواز کی تمام ذیلی اصوات کو سمیٹ کر ایک گروہ (فونیم) میں رکھ دینا ہے۔لسانیات میں معنوی تبدیلیوں اورصوتی تغیرات کی تو منطقی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی۔لہٰذا لسانی محقق کا کام ان تمام تبدیلیوں اورصوتی تغیرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی تحقیق مواد کو ترتیب دینا ہے۔لسانی انحراف کا مشاہدہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔لسانی تجزیہ کسی زبان سے تعلق رکھنے والی بولیوں میں موجود اشتراکی اور اختلافی خصوصیات کو تلاش کر کے زبان کے ارتقائی مراحل کا سراغ پیش کرتا ہے۔خلیل صدیقی کہتے ہیں۔ بولیوں کے باہمی فرق اور امتیاز کو تو ہم آسانی سے محسوس کر لیتے ہیں لیکن ہماری اپنی بولی یا زبان میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں ہم ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا محسوس نہیں کر سکتے۔ہم عموماً صوتی میڈیم یا اُس کے اجزا پر نمود نہیں کرتے۔ ہمارا دھیان معانی اور

مطالب کی طرف رہتا ہے ہمارے نزدیک زبان اچھی اور خاص مستقل حیثیت رکھتی ہے اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بھی بالکل وہی زبان استعمال کر رہے ہیں جو ہمارے اجداد استعمال کرتے تھے۔ زبان میں جو بھی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہیں۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ زبان کے استعمال میں اجزا کی حیثیت کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن لسانیات کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک دور کی زبان دوسرے دور کی زبان سے تھوڑی بہت مختلف ضرور ہوتی ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ اختلافات مزید وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ اور خلیج بڑھتی جاتی ہے۔

اُردو میں لسانیات کا جدید دور بیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس صدی میں لسانیات کے علم نے ارتقائی منازل طے کر کے ایک باقاعدہ سائنسی علم کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اب اس علم کے تحت زبان کا مطالعہ مشاہدات، تجزیات، اور تجربات کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے۔ جبکہ انیسویں صدی میں یہ مطالعاتی خصوصیات نہ ہونے کے برابر استعمال کی جاتی تھا۔ ماہرین لسانیات سے قبل زبان کا مطالعہ روایتی انداز میں کیا جاتا تھا جس میں تاثراتی اور بیانیہ طریق کار کا استعمال عام تھا۔ ماہرین لسانیات کی نظر صرف مختلف علاقوں میں استعمال کی جانے والی زبان اور اُس میں لسانی تبدیلیوں کا جائزہ لینے تک محدود رہتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مولوی عبدالحق کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۱۴ء میں مولوی عبدالحق کی قواعد اُردو کے منظر عام پر آنے سے اس کتاب کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں اُردو ''صرف و نحو'' پر روشنی ڈالی گئی۔ جبکہ اجزا کلام کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو میں عربی اور فارسی عناصر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اُردو زبان کی ساخت اور مزاج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُردو زبان کے استعمال کے اصول و ضوابط مرتب کئے گئے ہیں۔ ان قواعد کو مرتب کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے کئی زبانوں کی قواعد سے استفادہ کیا۔ اور ان زبانوں کی قواعد کی روشنی میں اُردو قواعد مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۹)

ڈاکٹر شہاب الدین اس کتاب کے بارے میں اپنے نکات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی قواعد اُردو کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے اصولوں کی محض تقلید نہیں ملتی۔ اُردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے اس لیے اس کی صرف ونحو عربی، فارسی کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ لیکن اُردو کو محض عربی یا فارسی صرف ونحو کے قاعدے میں بھی نہیں ڈھالا جاسکتا۔ اس لیے مولوی عبدالحق نے قواعد اُردو زبان کی ساخت اور اُردو زبان کے مزاج پر مستقل غور وخوض کے بعد تحریر کی ہے۔

دنیا کی ہر زبان ارتقاء پذیر رہتی ہے۔ زبانوں کے ارتقاء اور اس میں ہونے والی لسانی تبدیلیوں پر بحث علم لسانیات میں ہوتی ہے۔ لسانی تحقیق کا موضوع وہ عناصر ہیں جو مختلف زبانوں میں تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ زبان سے تعلق رکھنے والے لہجوں اور بولیوں پر خاص طور پر بحث کو لسانیات میں شامل کیا جاتا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ اس کا جائزہ بھی لسانیات کے زیر اثر ہی لیا جاتا ہے۔ پس صوتیات، تجزیات، نحویات، تشکیلیات، معنیات اور تکلمی آوازوں کی تحقیق مطالعہ لسانیات کا اہم عنصر قرار پاتے ہیں۔(۱۰)

۲ لسانیات اور اُردو رسم الخط

رسم الخط کے بارے میں دو مفروضے جو قابل تردید ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ رسم الخط کے بغیر اُردو زبان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اُردو رسم الخط اُس کا اپنا نہیں بلکہ غیر ملکی ہے۔ ان سوالوں میں سے پہلے مفروضے پر جب بحث کی جائے تو سب سے پہلے رسم الخط کی اہمیت سے آگاہی ضروری ہے۔ بعض لوگ اس رائے کو اہمیت دیتے ہیں کہ رسم الخط کی حیثیت لباس کی سی ہے۔ یعنی ایک لباس کو اتار کر دوسرا پہن لیا۔ جبکہ دوسرا گروہ اس کے متضاد رائے کا مالک ہے۔ اس کے مطابق رسم الخط کھال کی مانند ہے جس طرح کسی جسم کو

دوسری کھال میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ اُس طرح زبان کے کے لیے بھی دوسرا رسم الخط استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لسانیات میں بنیادی اہمیت بولی جانے والی کو دی جاتی ہے جبکہ رسم الخط کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلے زبان وجود میں آئی ہے پھر اُس کے لیے تحریر کی ضرورت محسوس کی گئی جس کے لیے رسم الخط کو استعمال کیا جاتا ہے اس طرح معلوم ہوا رسم الخط زبان کے تابع ہوتا ہے کیونکہ رسم الخط زبان کی آوازوں کا علامت کے ذریعے اظہار کرتا ہے۔ اس لیے زبان رسم الخط سے مقدم ہے اور رسم الخط کی تشکیل، زبان کی بدولت ہوتی ہے۔ جونہی زبان ارتقائی مراحل طے کرے گی رسم الخط بھی زبان کی طرح ارتقائی منازل طے کرے گا۔ اگرچہ کوئی بھی دو زبانیں آوازوں کی ادائیگی کے حوالے سے ایک جیسی نہیں ہوسکتیں مگر کسی بھی زبان کو تحریر کرتے ہوئے دوسری زبان کا رسم الخط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس کے لیے فقط نئی آوازوں کے لیے نئی علامات کو وضع کرنا ہوتا ہے۔ جس کی مثال اُردو زبان کو تحریر کرتے ہوئے رومن اور دیوناگری رسم الخط کو مناسب اضافوں کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ جدید لسانیات میں تجربات کے لیے خواہ اُن کا تعلق کسی بھی زبان سے ہو بین الاقوامی صوتیاتی علامتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ علامات رومن کی توسیعی حالتیں ہیں۔ ان علامات کی مدد سے سائنٹفک انداز میں تلفظ کے نازک ترین فرق کو بھی واضح کیا جاتا ہے۔ جدید لسانیاتی طریقہ سے اُردو کی بھی تدریس کراتے ہوئے اُردو آوازوں کی صوتی تدریس کے لیے رومن رسم الخط کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح ترکی زبان کے لیے بھی رومن رسم الخط جبکہ روسی زبان کے لیے روسی رسم الخط کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کے رسم الخط کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی بھی زبان کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے کسی بھی دوسری زبان کے رسم الخط کو مستعار لیا جا سکتا ہے۔(۱۱)

یہ لسانی اصول جس قدر درست ہے اتنی ہی یہ حقیقت بھی جاننا ضروری ہے کہ اُردو اور ہندی میں قریبی لسانی رشتہ ہونے کے باوجود دونوں کے رسم الخط میں اختلاف ہے۔ اُردو اور ہندی میں جو فرق ہے وہ صرفی اور نحوی سطح پر ضمنی نوعیت کا ہے جبکہ دونوں زبانوں میں بنیادی فرق صوتیات لفظیات اور معنیات کی وجہ سے ہے جس کی حد

بندی رسم الخط کے باعث ممکن ہے۔ اگر رسم الخط کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں تو ہم اُردو کی انفرادی حیثیت سے انکار کرنے کے مترادف حالات میں چلے جاتے ہیں۔ جبکہ اُردو زبان جو صدیوں کی تاریخ لیے ہوئے ہے۔ اور جس کا ادبی اور علمی سرمایہ بیش بہا ہے۔ محض اس وجہ سے اپنی انفرادی حیثیت سے سماجی اسلوب کی بنیاد پر محروم نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح اُردو رسم الخط تبدیل کرنا اس لیے نا قابل عمل ہو جاتا ہے کہ لسانی اور تہذیبی دونوں طرح سے اُردو اور ہندی الگ بنیادوں پر استوار زبانیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ کیا اُردو رسم الخط میں اس قدر کمزوریاں موجود ہیں کہ ہم اس سے اظہار کے معانی دریافت نہیں کر سکے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو رسم الخط کی بجائے دیو ناگری کو اہمیت دی جائے اُردو رسم الخط صدیوں سے علمی اور ادبی ضروریات کو پورا کرتا آ رہا ہے۔ لہٰذا اس سے دستبرداری کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

دوسرا مفروضہ جس کی تردید ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اُردو رسم الخط غیر ملکی ہے۔ (۱۲) ہندوستان میں بولی جانے والی بیس سے زائد زبانوں میں سے سندھی اور اُردو دو ایسی زبانیں ہیں جن کے رسم الخط کی تبدیلی کی بات کی جاتی ہے اس کے پس منظر میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان زبانوں کے غیر ملکی رسم الخط ہونے کا جذبہ موجود ہے۔ اُردو رسم الخط درحقیقت سامی رسم الخط کی بنیادوں پر استوار ہے۔ عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں اس رسم الخط کو اپنایا گیا ہے۔ لیکن یہ بات واضح طور پر اپنی جگہ درست ہے کہ اُردو رسم الخط یکتا کسی زبان کی نقل ہے۔ اُردو زبان نے عربی الاصل آوازوں کی انفرادیت کو ختم کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ''ز، ذ، ض اور ظ'' ایسے مصمتے ہیں جن کا تلفظ عربی میں الگ الگ موجود ہے جبکہ اُردو ان تمام علامات کے لیے ایک ہی صوت یعنی ''ز'' کو استعمال کرتی ہے۔ اسی طرح کئی دوسری علامات کا استعمال بھی اُردو میں ختم ہو گیا ہے۔ مثلاً ث اور ص کی آواز کو اُردو میں ''س'' کی آواز میں ضم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ''ح'' کو ''ہ'' کی آواز میں اور ''ت'' کو ''ط'' کی آواز میں چلانے کی وجہ سے عربی الاصل آوازوں کی انفرادیت کو ختم کیا گیا ہے۔ ہمزہ عربی میں مصمتہ کے طور پر موجود ہے جس کے بغیر کسی

مصوتے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اُردو میں ہمزہ کی حیثیت ایک بے صوت حرف سے زیادہ کی نہیں ہے۔ اُردو میں اس کا استعمال محض اُسی صورت میں کیا جاتا ہے جب دو مصوتے کسی ایک لفظ میں ایک ساتھ آ جائیں۔

اس کے علاوہ ان تحقیقی عوامل کے ساتھ ہی اُردو میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ جو خالصتاً اُردو زبان میں ہی مستعمل ہیں۔ مصوتے جو اُردو زبان میں موجود ہیں یہ وہی دس مصوتے ہیں۔ جو دیوناگری میں موجود ہیں۔ اُردو میں معکوس علامات موجود ہیں۔ جبکہ عربی اور فارسی میں ''ٹ، ڈ، اور ڑ'' کا تصور نہیں ہے۔ ان معکوس علامات کا استعمال اور ان کا ہکار آوازیں مثلاً ''ٹھ، ڈھ، ڑھ'' کا استعمال ہندوستان تک محدود ہے۔ اُردو میں آٹھ ہکار بندشی آوازیں ''بھ، پھ، تھ، دھ، چھ، جھ، کھ، گھ' لازمی ہیں۔ اس طرح ف، خ، ز، غ اور ق کے بغیر بھی اُردو کا تصور ممکن نہیں۔ ۳۶ حروف کے رسم الخط میں چودہ حروف صحیح:۔ چار حروف علت آوازیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اُردو میں دیسی اور غیر ملکی زبانوں کا صوتی توازن موجود ہے۔ ان اضافوں سے ملا جلا رسم الخط اُردو زبان کے فطری تقاضوں میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی سے لیا گیا یہ رسم الخط ہند آریائی صوتیاتی نظام کی ملاوٹ سے ایک نیا روپ اختیار کیا گیا ہے نہ تو ہند آریائی ہے اور نہ مکمل طور پر عربی ہے۔ اس نے خود کو اس قدر بدل لیا ہے کہ عرب اس کو اپنا رسم الخط ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ایرانی اس کو اپنا رسم الخط تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل درست نہیں کہ اُردو رسم الخط عربی یا فارسی کا رسم الخط ہے بلکہ اُردو زبان ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھنے والی زبان ہے اور اُردو رسم الخط بھی آزاد رسم الخط ہے۔

اُردو رسم الخط کے صوتیاتی تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُردو رسم الخط مصمتوں کا نگار خانہ ہے سائنٹفک رسم الخط میں آواز اور علامت میں ایک اور ایک کا تناسب ہوتا ہے جب کہ اُردو میں جتنی علامتیں ہے۔ اتنی آوازیں موجود نہ ہیں۔ بندشی آوازوں میں ہماری اُردو میں سوائے ایک علامت کے دوسری کوئی فاضل علامت موجود نہیں ہے۔ یعنی ''پ، ب، ت، د، ٹ، ڈ، خ، ج، ک، گ، ق'' ان (۱۱) علامات میں ایک اور ایک کا تناسب

موجود ہے صرف ''ت'' ایک ایسی علامت ہے جس کے لیے ''ط'' کی صورت میں دوسری علامت موجود ہے۔ ''ق'' کا استعمال ہمارے ہاں کم ہے صرف شمالی ہندوستان کے علاقہ جات میں اب بھی اس کی انفرادیت برقرار ہے۔ ہندآریائی زبان کی نمایاں طور پر موجودگی اُردو میں ہکار آوازوں کی شمولیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ ''بھ، پھ، تھ، ٹھ، ڈھ، گھ، کھ، چھ، جھ'' خالص ہندآریائی زبانوں کی علامات ہیں جو اُردو میں مستعمل ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اُردو محض فارسی یا عربی سے اخذ نہیں بلکہ اس کے رسم الخط میں دیگر زبانوں کے حروف بھی اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں۔ جو اس زبان کے رسم الخط میں علامتوں کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

اُردو کو ہندی سے جدا کرنے والی آوازیں ''ف، ز، ژ، خ، غ'' ہیں یہ چھ علامات اُردو ہندی کی صوتیاتی حد بندی کرتی ہیں۔ اُردو لب ولہجہ انھیں علامات کی وجہ سے مخصوص حیثیت اختیار کر لیتا ہے ہندآریائی زبانوں میں صغیری آوازوں کی وجہ سے ''ف کو پھ'' یا ''خ کو کھ'' میں بدل دیا جاتا ہے۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو رسم الخط کی سب آوازیں ہندوستانی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُردو کی صوتیات ملی جلی ہندآریائی ہے۔ اُردو میں حروف علت کی حیرت انگیز طور پر کم تعداد نے اسے کفایت حرفی کا شاہکار بنا دیا ہے۔ اُردو میں حروف علت یوں تو چار ہیں۔ ''الف، واؤ، یائے معروف اور یائے مجہول'' (گیان چند جین)۔ لیکن صحیح طور پر ایک حرف کو حرف علت کہا جا سکتا ہے۔ اور وہ ہے ''الف''۔ (۱۳)   کیونکہ یائے معروف و مجہول اور نیم مصوتوں کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ''وہاں، گواہ، یہاں، گویا'' وغیرہ۔ حروف علت کی کمی کو اعراب یعنی ''زیر، زبر، پیش'' لگا کر پورا کیا جاتا ہے۔ اردو میں جو دس مصوتے ہیں۔ اُن کی آوازیں کچھ یوں ہیں۔ ''مِل، میل، میل، مَیل، کل، مال، مول، مُول، مُل، اور مُول'' ان آوازوں میں سے صرف ایک ''مال'' کو حرف علت ''الف'' کی وجہ سے الگ شناخت دی گئی ہے جبکہ باقی تمام آوازوں میں موجود حرف علت کا فرق زیر، زبر، پیش کی مدد سے واضح کیا گیا ہے۔ جبکہ چھ مصوتوں ''مِیل، مَیل، میل، مول، مال، مُول'' کے فرق کو عام طور پر رسم الخط میں ظاہر ہی نہیں کیا جاتا۔ عربی

میں ’’ع‘‘ بطور حرف صحیح کے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ اُردو میں عام بول چال میں اس کا تلفظ حرف علت کا ہے۔ اُردو میں ع کی طرح ہمزہ بھی عجب حالت سے دو چار ہے جہاں اس کے لیے کوئی آواز بھی موجود نہیں ہے۔ اُردو میں ہمزہ کی حیثیت ایک بے صوت علامت کی ہے جسکا محض استعمال دو مصوتوں کے ایک ساتھ آنے کا تحریری اعلان ہے۔ مثلاً ’’کئی، گئی، سوئی، کوئی‘‘ وغیرہ ان میں جو آواز سنائی دیتی ہے وہ ’’ای‘‘ کی ہے۔ اس طرح ’’آؤں، جاؤں‘‘ وغیرہ میں بھی واؤ اور نون غنہ کی آواز آتی ہے۔ یہی معاملہ ’’غائب، عجائب‘‘ کے لیے بھی ہے یہاں بھی ’’ی‘‘ کی خفیف آواز تو موجود ہے لیکن ہمزہ کی اپنی آواز نہ ہے۔ بنیادی طور پر کفایت حرفی کا تعلق اُردو زبان میں حروف علت کی کمی سے ہے۔ مصوتے کسی بھی زبان میں مصمتوں کے تناسب میں بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے صوتی رکن بھی مصوتے کے بغیر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو میں مصوتوں کو اکثر بغیر علامتوں کے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر گفتگو کے دوران لفظ کے تلفظ میں دشواری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی یہی خوبی ہے کہ رسم الخط میں اعراب کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہونے کے باوجود اس کے تلفظ کو آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ جو اُردو رسم الخط میں مختصر نویسی کی اہم وجہ ہے۔

اُردو کے رسم الخط میں الجھاؤ اور پیچیدگیاں اس زبان کی توسیع اور ملا جلا رجحان رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح دوہری تہری علامات بھی رسم الخط میں مسائل پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ مثلاً ’’ز‘‘ کی آواز کو چار طرح سے لکھا جاتا ہے۔ (ز، ذ، ض، ظ) اس طرح ’’س‘‘ کی آواز کا اظہار (س، ث، ص)، (ت، ط)، (ہ، ح) اور ’’ع‘‘ کی تانک جھانک مصوتوں کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ (ذ، ض، ظ، ث، ص، ط، ح، ع) آٹھ فاضل علامتیں ہیں جن کا استعمال الجھاؤ اور پیچیدگیوں کا باعث ہے اگر ان علامتوں کا سائنسی انداز میں مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان علامتوں سے پیدا ہونے والی آوازیں دوسری علامتوں کے ساتھ مشابہ ہیں جو نہ صرف پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ بلکہ ان کی موجودگی املا کی اغلاط کے ساتھ ذہنی الجھاؤ کا باعث بھی ہے۔ اس لیے تجویز کیا

گیا کہ اگر ان فاضل علامتوں کو اُردو رسم الخط سے خارج کر دیا جائے تو نہ صرف رسم الخط سائنسی انداز کا ہو جائے گا بلکہ اسکی علامات بھی ایک چوتھائی کم ہو جائیں گی۔ نیز ان فاضل علامتوں کے اخراج سے اُردو تلفظ کی ادائیگی میں بھی کوئی فرق نہ پڑے گا۔ بلکہ پڑھنے اور لکھنے میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔(۱۴)

موجودہ طریقہ	مجوزہ طریقہ
ذخیرہ	زخیرہ
ضمیر	زمیر
ظالم	زالم
ثمر	سمر
صندوق	سندوق
طریقہ	تریقہ
حاوی	ہاوی

صوتی لحاظ سے اس تجویز کے قابل عمل ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہے مگر تہذیبی اور سماجی نقطہ نگاہ سے اس عمل پر کار بند ہونے سے فائدہ کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ کیونکہ رسم الخط محض آوازوں کی ترسیل کا نام نہیں بلکہ ان کے پیچھے مفہوم اور معنیات کا وسیع نظام موجود ہوتا ہے۔ رسم الخط بنیادی طور پر اگرچہ آواز کی جانب اشارہ کر رہا ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کی پشت پر معنیات کا وسیع نظام موجود ہوتا ہے۔ جو بالواسطہ طور پر الفاظ کو جملوں اور عبارتوں میں تبدیل کر کے وسیع مفہوم اور معانی سمجھانے میں مدد دیتا ہے۔ اُردو میں جہاں صوتیات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہاں لفظیت کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جن الفاظ کو فاضل قرار دے کر خارج کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔ اُن الفاظ کا فائدہ یہ ہے کہ تلفظ میں یکسانیت کے باوجود آپ املا کی وجہ سے

جوفرق ان حروف میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ لفظ کے درست معانی تک رسائی فراہم کرنے کا باعث ہے۔ مثلاً ''عام اور آم''، ''زن اور ظن''، ''بعض اور باز'' وغیرہ۔ ان فاضل علامتوں کو اگر اُردو رسم الخط سے خارج کر دیا جائے تو ان الفاظ اور اس کی طرح کئی دیگر الفاظ کے معانی میں فرق یقیناً مشکل ہو جائے گا۔ اس طرح اُردو کے قدیم ذخیرہ سے استفادہ مشکل ہونے کے ساتھ ان علامات کے اخراج سے اُردو لغت کو از سر نو ترتیب دینا ہوگا۔ غرض صوتیاتی طور پر ان علامتوں کے مردہ ہونے کے باوجود ان کا استعمال اس قدر جڑ پکڑ چکا ہے کہ علامات کا اخراج سے نئے صوتی فوائد تو حاصل ہوں گے مگر تہذیبی اعتبار سے یہ علامات بے معنی نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایسی کوئی تبدیلی اُردو میں ممکن نہیں ہے بلکہ ہر ایسی تبدیلی جس سے اُردو رسم الخط کا تہذیبی ڈھانچہ متاثر نہ ہو اور اُس تبدیلی کی نوعیت جزوی ہو تو اُس کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ ضروری ہے کہ اُردو پڑھنے اور لکھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اقدامات کیے جاتے رہیں۔

لسانیات ایک مضبوط سائنسی علم ہے۔ جس کی تشکیل صدیوں کا سفر لیے ہوئے ہے۔ لسانیات نے محض زبان کو ہی نہیں بلکہ ریاضی، فلسفہ، سمیت بہت سے دیگر سماجی علوم کو بھی متاثر کیا ہے۔ اردو زبان بہت سے مشرقی و مغربی مملک میں پڑھائی جا رہی ہے زبان کی تدریس کے عمل میں صوتیات اور لسانیات ایسے عوامل ہیں جن سے مدد لینا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے باہر کے ملکوں میں پڑھائی جانے والی زبان کی کتابوں کی تدوین کے لیے لسانیات سے مدد لینا ضروری امر ہے۔ اُردو نظام اصوات سے حرف کا جو رشتہ ہے اُس کی نوعیت پیچیدہ ہے۔ قدیم علمی روایات اور جدید لسانیاتی مباحث دونوں اُردو کے مخصوص لسانی کردار اور ثقافتی مزاج کے پیش نظر لسانی مسائل کے حل کے لیے زبان کی تاریخ ثقافت اور سماج کے کردار سے مدد لینے پر مجبور ہیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں حاصل ہونے والے نتائج حقائق سے دور تصور ہوں گے۔ لسانیات سماجی سائنس ہے اس لیے صوتیات کے پاس حقائق کی پہچان کے لیے جو نظام موجود ہے اُس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ لسانیات کے پاس عقیدے

کا آنکھ نہیں ہے۔اس لیے لسانیات جو چیز جیسی ہے اُس کو ویسا ہی بتاتی ہے۔

اس بحث سے حاصل یہ ہوا کہ اُردو ایک آزاد زبان ہے۔اگر چہ اس کا رسم الخط عربی اور فارسی زبان سے لیا گیا ہے۔(۱۵) مگر اس کے آریائی مزاج نے اس میں کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں۔ یہ لسانی تبدیلیاں کسی ایک دن کی پیداوار نہیں ہیں۔ان کا ارتقائی عمل صدیوں جاری رہتا ہے۔اُردو کے صوتی امتیازات دوسری تمام زبانوں سے الگ ہیں۔معکوسیت، ہائیت، اور غنایت، اُردو زبان کے امتیازی اوصاف ہیں جو اسے فارسی اور عربی سے جدا کرتے ہیں۔اس طرح آٹھ بندشی آوازوں ''بھ، پھ، تھ، چھ، جھ، کھ، گھ، دھ'' کا اُردو میں استعمال ہونا اور معکوسی آوازوں ''ٹ، ڈ، ڑ'' اور ان کی ہکار آوازیں ''ٹھ، ڈھ، اور ڑھ'' اُردو زبان میں عام طور پر مستعمل ہیں۔اس طرح غنائیت کا عنصر بھی اُردو صوتیات میں اہمیت کا حامل ہے۔(۱۶) جب زبان کسی مخصوص خطے میں بولی جارہی ہو اور اُس کا رسم الخط کسی دوسری زبان سے لیا جارہا ہو تو یہ بات عین ممکن ہے کہ اس زبان کی کئی آوازیں ختم ہو کر رہ جائیں گی اور بعض ایسی آوازیں جنم لیں گی جو اس مستعار لیے گئے رسم الخط میں موجود نہیں ہوں گی۔اس وجہ سے حروف تہجی اور رسم الخط کا نظام ہمیشہ یکساں نہیں رہتا بلکہ اُس میں لچک پیدا کرنا پڑتی ہے جو زبان کے لسانی نظام کے زیر اثر ہوتی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ علم کی حدود و میں وسعت پیدا ہونے اور نیز زمانے اور سماج کا چلن کسی بھی زبان پر گہرا اثر مرتب کرتا ہے۔جس کے باعث زبان میں کئی الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔کئی الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کو لکھنے کے لیے کوئی ایک طریقہ کار بند نہیں رہتا۔کیونکہ ایک صوتیاتی حقیقت کو ایک لفظ کی صورت میں کئی طرح سے لکھا جاتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ املاء کے عمل میں اصلاحی کوششوں کو جاری رکھنا چاہیے۔تضادات اور عدم مطابقت کو دور کیا جانا ضروری ہے۔ان تضادات کو دور کرتے ہوئے صوتیاتی اور ثقافتی تقاضوں کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تضادات کو دور کرنے کے زبان کو سادہ اور سہل بنایا جائے۔ کیونکہ سماجی فیصلوں میں دراندازی صوتیات کا کام نہیں ہے۔صوتیات کا کام محض حقائق سے آگاہی فراہم کرنا

ہے۔حروف کا چال چلن صوتیات کا حصہ ہے۔لیکن صوتیات تاریخ کا حصہ نہیں ہے۔مثال کے طور پر اُردو میں ''ز''
کے ساتھ ''ذ، ظ،ض'' کی موجودگی صوتی اعتبار سے درست نہیں مگر سماجی حوالوں سے اس کا استعمال تاریخ کا حصہ
ہے۔صوتیات کا کام محض حقائق کی جانب اشارہ کرنا ہے۔صوتیات کسی ایسی تبدیلی پر اسرار نہیں کرتی جس کی وجہ
سے سماج یا تاریخ کو تبدیل کرنا ضروری قرار پائے۔پس صوتیات ایک سائنسی علم ہے اور اسکا کام آوازوں کی
حقیقت کو سمجھنا اور جاننا ہے۔

اُردو زبان میں آوازوں کی تعداد باقی زبانوں کے مقابل سب سے زیادہ ہے۔اس نے اپنے نظام تہجی
میں عربی، فارسی، آریائی اور سامی خاندانوں کی زبانوں سے استعفادہ حاصل کیا ہے۔اس میں غیر ملکی زبانوں سے
لے کر علاقائی زبانوں تک تمام زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ اس کو تمام زبانوں کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔یہ
بات کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُردو زبان اپنے ذخیرہ الفاظ اور صرف ونحو کے اصولوں کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان بن گئی
ہے۔اُردو رسم الخط کا دائیں سے بائیں لکھا جانا یقیناً اسے عربی اور فارسی سے قریب تر کرتا ہے۔لیکن یہ کہنا درست
نہیں ہوگا کہ اُردو رسم الخط عربی اور فارسی کا عکس ہے کیونکہ اُردو رسم الخط میں عربی اور فارسی کے علاوہ ایسے الفاظ اور
ایسی آوازیں بھی شامل ہیں جو عربی اور فارسی میں سرے سے موجود ہی نہیں۔انگریزی اور دیسی زبانوں کی آوازیں
یقیناً اُردو کو عربی اور فارسی سے جُدا کرتی ہیں۔مثلاً ''ڈ، ٹ، ڑ، بھ، تھ، ٹھ، کھ، جھ، دھ'' وغیرہ کی آوازیں نہ تو عربی
میں ہیں اور نہ فارسی میں ہیں۔اس طرح اُردو کی وسعت نے عربی اور فارسی کے ساتھ دیگر زبانوں کی آوازوں کو
بھی اپنے اندر سمیٹ رکھا ہے۔اس حوالے سے ''ولیم جونسن'' اس طرح رقمطراز ہیں:۔

''مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسان دماغ میں آ سکتا ہے۔
نہایت صفائی کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے لیے ظاہر کیا جا سکے۔خیالات
اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ، اور خیال اگر مشکل ہوں تو الفاظ بھی مشکل

ہونے چاہیں اس طرح مکمل رسم الخط وہ ہے جس میں اُس زبان کی ہر آواز
کے لیے ایک مخصوص نشان ہو۔"(۱۷)

اُردو زبان کا ایک اور وصف جو اُسے ہم عصر زبانوں سے ممتاز کرتا ہے وہ اس کا کم جگہ گھیرنا ہے۔ اُردو رسم الخط ناگری اور انگریزی زبان کے مقابل بہت کم جگہ لیتا ہے اس میں اعراب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُردو میں اعراب کے لیے الگ سے حروف نہیں ہیں بلکہ اعراب کا کام "زیر، زبر، پیش" کی مختصر علامات سے لیا جاتا ہے۔ اکثر حالات میں تو ان کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ جملے کی ساخت کے لحاظ سے اور مفہوم کے اعتبار سے الفاظ خود بخود ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ اس طرح کی کئی اور باتیں ہیں جو اُردو رسم الخط کو جامع بناتی ہیں۔

اعتراضات

اُردو رسم الخط پر اٹھائے جانے والے اعتراضات میں حروف تہجی کی زائد تعداد بھی ایک اہم اعتراض ہے۔ اُردو کے برعکس دیگر زبانوں میں موجود کم حروف تہجی کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کہ یہ نئے سیکھنے والے کے لیے آسانی کا باعث ہیں۔ جبکہ اُردو زبان کے حروف کئی اشکال تبدیل کرتے ہیں۔ کبھی پورے لکھے جاتے ہیں کبھی محض اُن کا چہرہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اُردو لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے میں دشواری کا باعث بنتی ہے۔ اس وجہ سے دیگر زبانوں کے مقابل اُردو سیکھنے میں زیادہ دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(۱۸)

اُردو رسم الخط میں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس میں ایک جیسی آواز رکھنے والے یعنی نیم صوت حروف کی کثیر تعداد موجود ہے۔ مثلاً "الف اور ع"، "ت اور ط"، "ث، س اور ص"، "ظ اور ض"، "ح اور ہ"، "ذ اور ز" ایسی آوازیں ہیں جو الجھن پیدا کرنے کا موجب ہیں۔ اکثر طلباء کے لیے اس وجہ سے املا کی غلطیاں ہوتیں ہیں۔

ایک اور اعتراض اعراب کا استعمال ہے۔ اُردو میں ناگری یا رومن زبان کی طرح زیر، زبر، پیش کے لیے

حروف موجود نہیں ہیں۔صرف قیاس اعراب لگانے میں مدد کرتا ہے۔جس سے تلفظ اور املا کی غلطیاں سرزد ہونے کا قوی امکان موجود رہتا ہے۔اُردو رسم الخط پر ایک اور اعتراض جو لگایا جاتا ہے وہ بہت سے حروف ہیں۔جن کو جس طرح لکھا جاتا ہے اُن کو اُس طرح پڑھا یا ادا نہیں کیا جاتا۔مثلاً ''خواب'' کو''خاب'' بولا جاتا ہے۔''و'' کی آواز کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔اس طرح ٹائپ کرتے ہوئے بھی اُردو کے حروف تہجی کی کثیر تعداد مشکل پیدا کرنے کا باعث ہے۔اور اردو زبان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

آیئے اُردو رسم الخط پر اٹھائے جانے والے ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان اعتراضات کو تہہ میں کیا صداقت مضمر ہے۔پہلا اعتراض حروف تہجی کی تعداد ہے۔اُردو چونکہ ایک مخلوط زبان ہے اس لیے حروف تہجی کا دیگر زبانوں سے زائد تعداد میں ہونا اس کے مخلوط مزاج کا اظہار ہے۔اُردو نے عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ علاقائی زبانوں کا بھی گہرا اثر قبول کیا ہے یہ اثر الفاظ،اصوات اور حروف پر بھی واضح طور پر موجود ہے۔فارسی سے اُردو نے خاص حروف ''پ،گ اور ژ'' کو جذب کیا ہے۔عربی زبان سے ''ث،خ،ذ،ص،ض،ط،ظ،اور ع'' وغیرہ کو اپنے اندر جذب کیا ہے اس جذب اور اخذ کی بدولت اُردو زبان کو بین الاقوامی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے یہ اس کی خاصیت ہے کہ اُردو زبان عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ کی تمام آوازوں کو ادا کرنے میں کامیاب ہے۔اگر آوازواں کی یہ کثرت اُردو زبان میں نہ ہوتی تو شاید اُردو کو جو قبول عام آج نصیب ہے وہ نہ ہوتا۔اس لیے حروف کی کثرت کو عیب نہیں ہنر سے تعبیر کرنا چاہیے۔اسی رسم الخط اور بہت سی آوازوں کی موجودگی دیگر زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی اُردو کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب کرتی ہے۔

دوسرا اعتراض اُردو رسم الخط پر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کئی اشکال تبدیل کرتا ہے۔اس میں دو رائے نہیں کہ اُردو زبان میں حروف اشکال تبدیل کرتے ہیں۔مثلاً ''آس،خواب، اخلاق'' ان میں سے ''س''،''ب''،''ق'' کی

اشکال لفظ کے آخر میں آئی ہیں۔اور یہ بات قابل غور ہے کہ ان حروف کی اشکال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔لیکن اگر یہی حروف لفظ کے آغاز یا درمیان میں آئیں تو ان کی اشکال بدل جاتی ہے۔مثلاً ''آسرا، خوابستان، اخلاقیات، ان الفاظ میں ''س، ب، ق'' کی اشکال بدلی ہوئی ہیں مگر یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ یہ حروف اپنے مکمل چہرے کے ساتھ موجود ہیں۔اوران کی شناخت میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔(۱۹) یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اُردو زبان کے تمام حروف اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔ان میں سے ''ا، د، ڈ، ر، ڑ، ژ، ط، ظ، اور و'' ایسے حروف ہیں۔جو لفظ میں جہاں بھی آئیں مکمل لکھے جاتے ہیں۔مثلاً ''نانا، دوڑو، مزار، لفظ، توحید، پہاڑ'' وغیرہ ان الفاظ میں درج بالا حروف اپنی مکمل صورت کے ساتھ موجود ہیں۔باقی حروف میں بھی حرف کا چہرہ نہ بدلنے سے اُس کی شناخت دشوار نہیں ہوتی۔بعض حروف جب کسی دوسرے حرف کے ساتھ مل کر لفظ مکمل کرتے ہیں تو ان میں معمولی سا تغیر پیدا ہوتا ہے۔مثلاً ''ک اور گ'' جب ''ل'' سے ملتے ہیں تو ان کی اشکال قدرے بدل جاتی ہیں مثلاً ''کل، گل، کلی، گلستان'' وغیرہ۔اس طرح نستعلیق میں ''ع اور غ'' میں بھی تغیر ہے مگر اس قدر نہیں کہ ان کو پہچاننا مشکل ہو۔یہ حروف کے اشکال تبدیلی محض اُردو تک محدود نہیں ہے۔بلکہ انگریزی اور دیگر زبانیں بھی اس تغیر سے خاصی متاثر ہیں۔مثلاً کہنے کو تو انگریزی کے ۲۶ "Letters" ہیں مگر حقیقت میں ان کی ۵۲ اشکال ہیں جو "Capital" اور "Small" کی صورت میں موجود ہیں۔اگر ان حروف پر غور کیا جائے تو ان کی اشکال بعض حروف کی مماثلت کے باوجود اکثر حروف مختلف اشکال کے حامل ہیں۔مثلاً (A,a)، (B,b)، (D,d)، (G,g)، (H,h)، (M,m)، (N,n) وغیرہ۔اس کے علاوہ انگریزی زبان کے کچھ حروف ایسے بھی ہیں جن کو مختلف انداز میں تحریر کیا جاتا ہے۔مثلاً ''R'' کو دیکھ لیں کو پاس اس کو small a,b,c میں "............سٹائل ہاتھ سے لکھنے پڑیں گے......", کی صورت میں تحریر کرتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی کے اکثر حروف کی کم از کم تین اشکال اور بعض کی چار اشکال بھی ہیں۔

اس لیٔ کس طرح یہ دعوی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی زبان ۲۶ حروف تہجی تک محدود ہے۔ جبکہ تحریر کرتے ہوئے ہم اس کی اٹھتر (۷۸) اشکال سے زائد حروف کی شناخت کراتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جا ہے کہ اُردو زبان انگریزی سے زیادہ مشکل ہے اس کو محض لاعلمی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

ایک اور اعتراض جو اُردو پر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُردو میں ہم صوت حروف املا میں الجھن پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس حرف کو ''س، ص، یا ث'' سے تحریر کرنا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ اُردو میں بعض حروف موجود ہیں جن کو محض اصوات کی بنیاد پر ضبط تحریر میں لانا دشوار عمل ہے۔ یہ حروف ''(ا، ع)، (ت، ط)، (ث، س، ص)، (ذ، ز، ژ، ظ، ض)، اور (ح، ہ)۔ یہ وہ حروف ہیں جن کی آوازیں اُردو رسم الخط میں دقت پیدا کرتی ہیں۔ اُردو کے مخلوط زبان ہونے کے سبب ایک ہی چیز کے لیے ہم متعدد الفاظ کو استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے مترادفات کا سلسلہ اُردو میں وسیع ہے۔ دوسری زبانوں میں ایک چیز کے لیے ایک لفظ یا زیادہ سے زیادہ دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ (۲۰) جبکہ اُردو میں ایک چیز کے لیے کئی کئی الفاظ ہیں۔ مثلاً ''چاند'' کو لیتے ہیں۔ اُردو میں اس کو ''چاند، قمر، ماہ، ماہتاب، ہلال، بدر، چندا'' وغیرہ صرف ایک چاند کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔ ان مترادفات کی بدولت اُردو زبان میں وسعت کے ساتھ اس میں پیچیدگیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ یہ وسعت شاید دوسری زبانوں کا خاصہ نہیں۔ اس کی مثال انگریزی زبان میں ''چ، د، اور ش'' کی آوازوں کی ادائیگی میں پیچیدگی سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً Chapter, Match, Picture ان تین الفاظ میں ''چ'' کی آواز کے لیے بار بار حروف کو تبدیل کیا گیا ہے۔ یہ ''tu'' یا ''ch'' کی صورت میں آ رہا ہے۔ اس طرح ''ڈ'' کی آواز کے لیے That, This اور ''ش'' کی آواز کے لیے Mention, Admission, She جیسے الفاظ میں ''ش''، Tio, Ss, sh کی مدد سے آواز پیدا ہو رہی ہے۔ یہ انگریزی رسم الخط کا نقص ہے جبکہ اُردو میں ہر آواز کے لیے ایک مستقل حرف کی موجودگی اس رسم الخط کو ایسے نقائص سے پاک کرتی ہے۔

اُردو زبان میں ہم صوت الفاظ کی تعداد ۱۳ ہے۔ ان کو پانچ گروہوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے اس طرح ہر گروہ سے ایک حرف کو رکھنا ہوگا۔ اس طرح نو حروف ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ املا میں مغالطہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے حروف اُردو سے زائد تعداد میں دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ انگریزی زبان کو ہی لے لیں جس میں آوازوں کو کوئی نظام ہی موجود نہیں ہے۔ نشانات کچھ ہیں اور آوازیں مختلف دے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اکثر املا اور تلفظ کی اغلاط سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے ہی ہر لفظ کے ساتھ معانی اور املا رٹائی جاتی ہے۔ ان امثال کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اُردو زبان کا رسم الخط ہی چند ہم صوت حروف لیے ہوئے نہیں دنیا کی بیشتر زبانوں میں یہ حروف کثیر تعداد میں موجود ہیں جبکہ اُردو میں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے اس لیے اس اعتراض کو جو ہم صوت حروف کے بارے میں ہے کی بنیاد پر اُردو کو ناقابل فہم زبان قرار دینا درست نہیں۔

اُردو کی ایک کمزوری ''اعراب کا درست تعین'' کہی جاتی ہے۔ یعنی کہ کسی لفظ کے تلفظ کی ادائیگی کے وقت یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ زبر سے پڑھا جائے یا زیر سے پڑھا جائے۔ اس لیے کہ اُردو میں اعراب بہت کم استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب زبان اور اُردو زبان میں اسے اُردو رسم الخط کی خوبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور تحریر کرتے ہیں:۔

> ''اُردو رسم الخط کا وصف یہ ہے کہ اس میں حروف علت کی تعداد صرف تین ''ا، و، ی'' ہیں۔ یہ بھی اعراب کا کام کرتے ہیں۔ لیکن ان سے زیر، زبر، پیش کے معمولی نشانات بطور اعراب استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اُردو تحریر بہت کم جگہ گھیرتی ہے۔''

اُردو پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اُردو میں بعض ایسے حروف ہیں جو آواز نہ دینے کے باوجود تحریر کیے

جاتے ہیں۔ مثلاً عبد الرشید میں ''ا،ل'' خاموش ہیں۔ اُردو میں ایسے الفاظ کثیر تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ ان حروف کے متعلق اگر شمسی اور قمری حروف کی تقسیم ذہن نشین کر لی جائے تو یہ وقت دور ہو جائے گی۔ ا،ل عربی زبان میں مشتمل ہیں۔ لہٰذا ان کی ادائیگی بھی عربی زبان کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے۔ انگریزی بھی بہت سے Silent حروف کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اُردو رسم الخط کی اصلاح کے لیے دی جانے والی تجاویز

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اُردو کے موجودہ رسم الخط کے حامی وداعی ہیں۔ اُن کے مطابق:۔

''اُردو کو اس کے اپنے رسم الخط کے سوا اگر کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنے یا موجودہ رسم الخط میں غیر ضروری تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے وجود کو من وعن برقرار نہ رکھ سکے گی اور اس کا سرمایہ تباہ ہو جائے گا۔''

اُردو رسم الخط کے بارے میں ایک تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ کسی بھی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ہیں صرف انہیں لحاظ رکھ کر اُس لفظ کو تحریر کریں اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے۔ مثلاً ''ہما اور شمع'' میں ''ا، اور ع'' کی آوازیں ''تراز واور طراز''، ''سحر اور صحرا''، ''حد اور ہُد ہُد'' ذاکر، زاہد ضامن، ظاہر وغیرہ میں ''ت، اور ط'' کی آوازیں ''س اور ص'' کی آوازیں ''ح اور ہ'' کی آوازیں ''ذ، ز، ض، اور ظ'' کی آوازیں ایک جیسی ہیں۔ اگر عربی زبان کی حد تک ان آوازوں میں کوئی فرق ہو تو لیکن اہل اُردو کے ہاں ان حروف کی آوازوں کے لیے تفریق موجود نہیں ہے۔ اس لیے جن لوگوں نے ہم آواز حروف کی اُردو سے اخراج کی بات کی ہے وہ اس مدعا کے لیے جو دلائل پیش کرتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم آواز حروف کی میں صرف ''ا، ت، س، ز اور ہ'' کو لے لیا جائے اور باقی آٹھ حروف ''ع، ط، ث، ص، ذ، ظ، ض، اور ح'' کو اُردو حروف تہجی سے خارج کر دیا جائے۔ اُن کے نزدیک ایسا کرنے سے جو فوائد حاصل ہوں گے اُن میں املا کی وقت ختم ہو گی۔ اور اُردو

زبان تیزی سے ترقی کی منازل طے کرے گی۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اس نے دنیا کی مختلف زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ چند زبانوں مثلاً عربی، فارسی اور ہندی کے اس پر گہرے اثرات ہیں۔ جو اس کے تلفظ کی ادائیگی میں بھی موجود ہیں اور رسم الخط میں بھی ان کے اثرات گہری نوعیت کے ہیں۔(۲۱) اگر طالب علموں کو یہ بات واضح کرا دی جائے کہ کون سے حروف کون سی زبان سے اُردو میں آئے ہیں تو اُن کو زباندانی اور لسانی مطالعے میں خاصی مدد مل جائے گی۔ اس طرح اُسے الفاظ کے ساتھ اُس کے معانی تک رسائی میں بھی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اگر ہم ''ا، کو، ع'' کی جگہ استعمال کرنا شروع کریں اور ''ع'' کا استعمال متروک کر دیں تو بہت سے مسائل حل ہونے کے بجائے نئے مسائل جنم لے لیں گے۔ مثلاً ''ع'' کی جگہ ''ا'' کے استعمال پر ''عقل'' کو ''اقل'' کا ''علم'' کو ''الم''، ''عقلیت'' کو ''اقلیت''، ''عمل'' کو ''امل'' اور ''عمارت'' کو ''امارت'' وغیرہ تحریر کرنا شروع کر دیں تو جو مسئلہ سب سے بڑا درپیش ہوگا وہ معانی کی تفہیم کا ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم معانی میں ابہام کے مسئلہ سے دوچار ہو جائیں گے۔ مثلاً اگر عقل کو اقل تحریر کیا جائے گا تو اقل جن حروف میں موجود ہے اُن کے معانی متاثر ہوں گے جیسے ''ذو اضعاف اقل''۔ اسی طرح ''علم'' کو ''الم'' لکھنے سے ''رنج والم'' جیسے الفاظ اپنے معانی سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ بعینہ صورتحال سے دیگر الفاظ بھی دوچار ہو جائیں گے۔ اُردو زبان میں ہم صوت الفاظ کی کثیر تعداد موجود ہے۔ املاء کا فرق ختم ہو جانے سے ان الفاظ کے معانی متاثر ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ تو ان کے ماخذ کا پتہ لگانا بھی ممکن نہ رہے گا۔ جس کے بدولت معانی تک رسائی دشوار ہوگی۔ جس کے سبب بہت سے الفاظ مہمل ہو کر رہ جائیں گے۔

اُردو رسم الخط میں بہتری لانے کی تجاویز میں ایک تجویز ۱۹۵۸ء میں حکومتی تعاون سے زور پکڑ لیا کہ اگر اُردو رسم الخط کو رومن طرز پر تحریر کیا جائے تو کیا اس میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ یعنی اُردو کو اگر ا، ب، پ کی بجائے

A.B.C.D سے لکھا جائے۔اس تجویز کی حمایت میں بعض لوگوں نے رائے دی کہ اس طرح کرنے سے اُردو کی املاء میں آسانی کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اُردو زبان کو پذیرائی حاصل ہوگی جو اُردو زبان کی ترقی میں مدد ومعاون ثابت ہوگی۔اُردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوگا۔اور اُردو دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوگی۔اس تجویز پر عملدرامد ممکن اس لیے نہیں کہ رومن حروف کی تعداد محض ۲۶ ہے۔جبکہ اُردو میں ۵۰ سے زائد حروف مستعمل ہیں۔ اس طرح کیسے ممکن ہے کہ ۲۶ حروف ۵۰ سے زائد آوازوں کی نمائندگی کر سکیں۔مثلاً چ اور ش کے لیے رومن حروف میں کوئی آواز موجود نہ ہے۔اس لیے ''چ'' کی آواز پیدا کرنے کے لیے مختلف مقامات پر مختلف حروف کا سہارا لیا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے الجھن کم ہونے کی بجائے بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔مثلاً "Picture" میں "tu" چ کی آواز پیدر کر رہے ہیں۔جبکہ "Chair" میں چ کی آواز کی نمائندگی "Ch" سے ہو رہی ہے۔اس طرح ''ش'' کی آواز کے لیے بھی رومن حروف کبھی "sh" تو کبھی "ss" کا استعمال کرتے ہیں۔یہی صورتحال دیگر کئی حروف کے لیے بھی ہے پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رومن حروف میں آوازوں اور الفاظ کے تلفظ کا مستقل نظام موجود نہ ہے۔ایسی صورت حال میں اُردو اصوات کے لیے رومن حروف کا استعمال کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔لہٰذا اُردو رسم الخط کو رومن میں ڈھالنے سے فوائد کی بجائے نقصانات کا احتمال زیادہ ہے۔ایسی بنیادوں پہ آل پاکستان اُردو تدریس کانفرنس جس کا انعقاد ۲۶ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کراچی میں ہوا کا اختتام رومن رسم الخط کی ناقص صوتیات کے سبب رومن رسم الخط کو اپنانے کی تجویز مسترد کر دیا گیا۔خود برنارڈ شاہ نے رومن رسم الخط میں تبدیلیوں اور اصلاح کی تجاویز دیں انھوں نے سات سو ایسے الفاظ ماہرین کے سامنے رکھنے جن کا تلفظ رومن حروف ادا کرنے سے قاصر ہیں۔برنارڈ شاہ کی اس تجویز سے ماہرین کی اکثریت کے اتفاق کے باوجود انگریزی زبان کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ لائی جا سکی۔اور وہ آج بھی اپنی پرانی راہ پر گامزن ہے۔کیونکہ زبانوں کے نظام کو تبدیل کرنا خواہ اس زبان کا رسم الخط اُس کی صوتیات کا ساتھ دینے میں نقائص کا شکار بھی ہو۔ماضی کے ادبی اور علمی سرمائے کو پہنچنے

والے نقصان کو بھی مدِ نظر رکھنے کی وجہ سے اس میں تبدیلی آسان نہیں ہے۔

اُردو میں صرف ونحو کا تعارف

صرف

چھوٹی سے چھوٹی بامعنی لسانی اکائیوں کا مطالعہ ''صرف'' کہلاتا ہے۔لسانی اکائیوں کا یہ مطالعہ لفظ کی حد تک ہوتا ہے۔انگریزی میں صرف کو مارفالوجی کہا جاتا ہے۔''مارفیم'' سے مراد ایک ایسی اکائی ہے۔جو چھوٹی سے چھوٹی ہو اور بامعنی ہو۔لسانیات میں معنی دوطرح سے اخذ کیے جاتے ہیں۔یعنی ایک معانی لغت سے لیے جاتے ہیں۔جو لغتی معانی کہلاتے ہیں۔(۲۲) جبکہ دوسرے معانی قواعدی ہوتے ہیں۔قواعدی کا مطلب روایتی قواعد سے ہے۔مثال کے طور پر ہم اُردو زبان میں استعمال ہونے والے لفظ ''قلمیں'' کو دیکھ لیں۔اس میں دو مارفیم موجود ہیں۔ایک ''قلم'' اور دوسرا ''یں'' ہے۔دونوں بامعنی مارفیم ''قلم'' بذاتِ خود ایک شے کا نام ہے۔جبکہ ''یں'' جمع کے معانی میں استعمال ہو رہا ہے۔لہٰذا ''قلم'' لغتی معانی کے لیے جبکہ ''یں'' قواعدی معانی کے لیے استعمال ہو رہا ہے قواعدی معانی کا مطلب اصل شے سے ہو کر ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔یعنی قواعدی معانی اپنے اظہار کے لیے لغوی معانی کے محتاج ہیں۔اس لیے مارفیم کو دو اقسام ہیں۔ایک آزاد مارفیم اور دوسرا پابند مارفیم کہلاتا ہے۔موجودہ مثال میں ''قلم'' آزاد مارفیم ہے جس کو آپ جہاں پر بھی استعمال کریں گے وہ خود اپنے اظہار کے معانی فراہم کرے گا جبکہ ''یں'' پابند مارفیم کی مثال ہے یعنی آپ اسے قلم کے ساتھ استعمال کریں گے تو یہ قلم کی جمع کی صورت میں بامعانی ہو پائے گا۔آزاد حالت میں اس کی اپنی کوشناخت نہیں ہوتی۔مارفیم کے استعمال کے لیے { } قوسین کو استعمال کیا جاتا ہے۔زیادہ مارفیم اپنی صوتی شکل میں دکھائے جا سکتے ہیں۔پابند مارفیم کے اظہار کے لیے {-} مارفیم کے ساتھ اس علامت کو استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً ''یں'' کو ظاہر کرنے کے لیے جو علامات استعمال کی جا سکتی

ہیں۔وہ{ -e } ہیں۔

آزاد اور پابند مارفیم مزید اقسام میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ پابند مارفیم میں ''اضافائی مارفیم'' ہیں جو کسی آزاد مارفیم کے ساتھ آتے ہیں ان کی مزید تین اقسام ہیں۔ان میں سے ایک ''سابقے'' کہلاتے ہیں۔ یہ کسی آزاد مارفیم سے پہلے آتے ہیں۔مثلاً نامراد، بےکار، وغیرہ میں ''نا'' اور ''بے'' سابقے ہیں۔دوسری اضافائی مارفیم کی قسم ''لاحقے'' ہیں۔ یہ کسی آزاد مارفیم کے آخر میں آتے ہیں۔ مثلاً ایمان دار، روزگار، میں دار، گار لاحقے ہیں۔تیسری قسم ایسے مارفیم کی ہے جو آزاد مارفیم کے بیچ میں آتا ہے۔ اس قسم کا مارفیم فلپائنی زبان TAGALOG میں اس قسم کا وسطیہ موجود ہے۔کچھ زبانوں میں ایسے مارفیم بھی ہیں جن کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر دہرایا جاتا ہے۔ایسے مارفیم تکراری مارفیم کہلاتے ہیں۔انگریزی اور اُردو میں تکراری مارفیم نہیں ہوتے۔ مبدل اور غیر مسلسل مارفیم دو الگ قسم کے مارفیم ہیں۔انگریزی زبان میں ان کی امثال ملتی ہیں جبکہ اُردو زبان میں ان مارفیم کی تعداد بہت کم ہیں۔''تفریقی'' مارفیم میں مذکر اور مونث کے لیے صنعتی الفاظ میں تفریق کی جاتی ہے۔ مونث کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ میں مذکر کے کے لیے ایک مصمتہ اضافی ہوتا ہے۔ ہر لفظ میں یہ مصمتہ الگ الگ ہوتا ہے۔(۲۳) اس لیے اس کو یاد رکھنا مشکل کام ہوتا ہے اس لیے مذکر کو ہی Subtractive مان لیا جاتا ہے۔اس طرح اگر مونث الفاظ کو بنیادی الفاظ تسلیم کر لیا جائے تو مذکر الفاظ تفریقی عمل سے سامنے آئیں گے۔اس طرح جنس کا مارفیم تفریقی ہوگا۔

بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو واحد اور جمع دونوں حالتوں میں اپنی شکل تبدیل نہیں کرتے بلکہ وہ دیگر قواعدی تبدیلیوں کے باوجود بھی اپنی اصل حالت کو برقرار رکھتے ہیں۔مثلاً وہ ایک آدمی ہے اور وہ چار آدمی ہیں۔ ان دونوں جملوں میں واحد اور جمع دونوں حالتوں میں ''آدمی'' کے لفظ نے اپنی شکل تبدیل نہیں کی۔اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ جمع کے جملے میں استعمال ہونے والا ''آدمی'' میں جمع کا مارفیم صفر ہے۔اس طرح انگریزی زبان

میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن میں صفر مارفیم کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً Fish وغیرہ۔ اردو میں ماضی کے مارفیم کو { ya - } (۔یا) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کھایا، سویا، وغیرہ اس طرح بہت سے الفاظ ایسے ہیں۔ جو ماضی میں استعمال ہونے کی وجہ سے اپنا روپ تبدیل کر لیتے ہیں۔ مثلاً حال میں ایک لفظ ہے ''جایا'' مگر ماضی کے لیے ''ج''، ''گ'' میں تبدیل ہو گیا۔ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی حالت میں ایک حرف جب دوسرے کی جگہ پر آ جاتا ہے ایسے حرف کو غضبی حرف کہیں گے اور یہ مارفیم ''غضبی مارفیم'' کہلائے گا۔ جیسے مثال مذکورہ میں ''گ'' نے ''ج'' کو غضب کر لیا اس لیے ''گ'' غضبی مارفیم کہلائے گا۔

بعض مارفیم ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو معانی کے لحاظ سے دو الفاظ کی حالت میں سامنے آتے ہیں۔ (۲۴) ایسے مارفیم ''دو پٹہ مارفیم'' کہلاتے ہیں۔ ''چنانچہ'' کے معانی ''اس لیے'' ہوتے ہیں یعنی یہ معانی دو الفاظ ''اس'' اور ''لیے'' کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسے مارفیم دو پٹہ مارفیم کہلاتے ہیں۔ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ایسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو دو پٹہ مارفیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ذیلی مارفیم

ایسے مارفیم جو مختلف مواقع پر مختلف اشکال اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کے معانی تبدیل نہیں ہوتے ان مختلف اشکال کو ذیلی مارفیم کا نام دیا جاتا ہے۔ اُردو میں جمع کا مارفیم /e-/ سے ظاہر کیا جاتا ہے جس کی امثال لڑکے، مزے، وغیرہ ہیں۔ لیکن چند الفاظ میں /e-/ کی بجائے /a-/ کا مارفیم استعمال ہوتا ہے جیسے کتابیں، لڑکیاں وغیرہ یہ سب اشکال جمع مارفیم کے ذیلی عارف ہیں۔ ایسے تمام اشکال جن کو مشروط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان میں خالی مارفیم بھی شامل ہیں۔ بہت سے ایسے مارفیم ہیں جن کو اکثر زبانوں میں روزمرہ کے استعمال میں ذیلی مارفیم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ''ڈاکٹر اقتدار حسین کے مطابق مختلف شرائط کا مطالعہ ضروری ہے۔ جن میں ذیلی مارفیم استعمال ہو سکتے ہیں۔'' (۲۵)

۱۔ اصواتی مشروط ذیلی مارفیم

۲۔ قواعدی مشروط ذیلی مارفیم

۳۔ مارفیمی مشروط ذیلی مارفیم

۴۔ نحوی مشروط ذیلی مارفیم

۵۔ لغتی مشروط ذیلی مارفیم

اصواتی مشروط ذیلی مارفیم سے ہمارا واسطہ زیادہ تر انگریزی زبان کے الفاظ میں جمع کے صیغوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ انگریزی کے ایسے الفاظ جن کی آخری آوازیں غیر مسموع ہوتی ہیں۔ مثلاً Rat, Hook وغیرہ ایسی حالت میں /S-/ جمع الفاظ بنانے کے لیے آخر میں آتا ہے۔ اس طرح جن لفظوں کی آخری آوازیں مسموع ہوتی ہیں اُن کو جمع کے صیغے میں ڈھالنے کے لیے /Z-/ استعمال ہوتا ہے جب کہ ایسی الفریکٹ آوازیں جو تالو سے زبان ٹکرانے پر پیدا ہوں اُن میں سے جمع کے صیغے کے لیے /Z-/ استعمال ہوتا ہے مثلاً HORSES, BUSHES وغیرہ یہ تمام اشکال ایک ہی معانی کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں۔ اس لیے ان تینوں حالتوں کو جمع کے مارفیم کی ذیلی مارفیم قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ذیلی مارفیم صوتی سب میں ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے ان کو اصواتی مشروط ذیلی مارفیم کا نام دیا جاتا ہے۔

اُردو زبان میں جمع کے مارفیم کی بہت سی صورتیں موجود ہیں۔ /-e/، /o/، /-a/، /e/، /-o/ وغیرہ۔

/-e/، /-o/ /-a/ مذکر کے لیے اور /a/، /e/، /o/ مونث کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

/-e/ لڑکے، کپڑے، جوتے وغیرہ کے لیے استعمال میں آتا ہے۔ /-o/ (کوں) کی آواز کے لیے مثلاً کپڑوں، جوتوں وغیرہ کے لیے۔ /-a/، /-e/ ایسی آوازوں کے لیے بطور ذیلی مارفیم آتے ہیں۔ جیسے، جوتیاں، کتابیں، کرسیاں وغیرہ۔ /ة/ کی آوازوں میں مستعمل ہے۔ مثلاً جوتیوں، بکریوں، کرسیوں وغیرہ۔

مذکر اور مونث حالتوں کے علاوہ ذیلی مارفیم فاعلی اور غیر فاعلی حالتوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ غیر فاعلی حالت میں اسم کے بعد ''نے'' اور ''میں'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں جمع کے لیے چار مارفیم کو استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کے مارفیم کو محض قواعد کے زیر اثر بیان کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے مارفیم قواعد سے مشروط ذیلی مارفیم کہلاتے ہیں۔

اُردو میں ماضی کے اظہار کے لیے جو مارفیم عموماً استعمال ہوتا ہے۔ وہ ''یا'' /ya/ کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثلاً کھایا، سویا، گیا، پیا وغیرہ۔ جہاں تک گیا کا سوال ہے یہ بات ڈھکی چھپی نہ ہے کہ ''گیا'' کو جایا کی جگہ ''جا'' کی ماضی صورت کے اظہار میں تحریر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر گیا کو جا کا ذیلی مارفیم قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ /ga/ صرف ماضی کے مارفیم کے طور پر آئے گا۔ اس لیے اس کو مشروط مارفیم کا نام دیا جاتا ہے۔ (۲۶)

بعض حالتوں میں کسی مخصوص لفظ کے ساتھ ہی مارفیم مشروط ہو جاتا ہے اور وہ اُس لفظ یا فقرے کے بغیر آزادنہ حالت میں استعمال نہیں ہوسکتا یہ مارفیم نحوی مشروط مارفیم کہلاتے ہیں۔ لغتی مشروط مارفیم ایسے ہوتے ہیں جو لغت کے اعتبار سے اپنی اشکال کو بدلتے رہتے ہیں۔ اور {-in}, {-en} جیسی اشکال کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں ایسے الفاظ قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ جن میں لغتی مشروط ذیلی مارفیم استعمال ہوتے ہیں۔

اُردو زبان کے بہت سے مارفیم ایسے ہیں جن کی آوازیں تلفظ دوسرے مارفیم سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ (۲۷) مگر آواز میں یکسانیت کے باوجود ان کے معانی میں فرق موجود ہے۔ مثلاً آم، کام، نام، دام، رام وغیرہ۔ ایسے مارفیم ہم صوت مارفیم کہلاتے ہیں۔ ان میں امتیاز معانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا یہ ایک دوسرے سے الگ مارفیم ہی کہلائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الفاظ کے ہم صوت ہونے سے بھی مارفیم کی حیثیت برقرار رہتی ہے۔ مارفیم صرف صوت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ان کا تعلق معنیات کے ساتھ بھی جڑا ہوتا ہے۔

ایک مارفیم ایک لفظ بھی ہوسکتا ہے اور بعض حالتوں میں ایک لفظ کے اندر دو دو مارفیم بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

کتاب، ایک لفظ بھی ہے اور مکمل مارفیم بھی ہے جبکہ ''کتابیں'' ایک لفظ ہے جبکہ اس میں مارفیم دو موجود ہیں ہر مارفیم کی اپنی مخصوص حالت ہے جس میں وہ استعمال ہوتا ہے۔ جس قسم کا ماحول ہوگا اُس میں مارفیم تبدیل ہوتا رہے گا۔ مارفیم ایک آواز بھی ہوسکتا ہے ایسے مارفیم دوسرے مارفیم سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر اسم سے پہلے اور بعد میں مخصوص قسم کے الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً کرسی، کپڑا وغیرہ سے پہلے ''میں'' اور بعد میں ''جا'' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مارفیم کے استعمال میں وہ تمام لسانی سیاق وسباق شامل ہیں جن کا استعمال ممکن ہو۔ ہر لفظ میں مارفیم کے لیے ایک خاص مقام موجود ہوتا ہے اور مارفیم اُس خاص مقام پر ہی آتے ہیں جو ایک مقررہ کردہ ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ جیسے ''کار'' کو مختلف الفاظ مثلاً ''بے کار، بدکار، سرکار'' وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام الفاظ میں مارفیم ''کار'' کی جگہ متعین ہے جس کی وجہ سے لفظ بامعنی قرار پاتا ہے۔ اگر ہم لفظ کو ''کار بے، کار بد، کار سر کے طور پر تحریر کریں گے تو یہ اپنے معانی کھو دے گا۔

لفظ ایک آزاد شکل ہے۔ جیسے دو یا دو سے زیادہ مارفیم میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک لفظ ''دلچسپ'' میں دو الفاظ ''دل + چسپ'' موجود ہیں۔ دل آزاد مارفیم ہے جو اپنے معنی تنہا بھی دے رہا ہے جب کہ ''چسپ'' پابند مارفیم ہے جو اکیلا اپنے معنی دینے سے قاصر ہے ایسی صورت میں ''دلچسپ'' ایک بامعنی لفظ ہے جو دو مارفیم سے مل کر تشکیل پاتا ہے جن میں ایک آزاد اور دوسرا پابند ہے۔

تحریر کرتے ہوئے الفاظ کے درمیان ایک (Space) وقفہ موجود ہوتا ہے جبکہ گفتگو کے دوران یہ وقفہ موجود نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں بعض لوگ ایک لفظ کو دوسرے میں مدغم کر دیتے ہیں۔ جس کے باعث لفظ کی درست پہچان نہیں ہو پاتی۔ بعض حالتوں میں ایک لفظ پورے جملے کے معانی ادا کر رہا ہوتا ہے۔ لفظ ایک مکمل اکائی ہے اس کے بیچ میں کوئی نہیں آسکتا۔ مگر دو الفاظ کے درمیان میں تیسرے لفظ کی موجودگی اُس کو بامعنی جملے میں تبدیل کرسکتی ہے۔ مثلاً لفظ ''بدمعاش'' کو جب ہم ''وہ'' اور ''ہے'' کے درمیان لاتے ہیں۔ تو ایک بامعانی فقرہ

تشکیل پاتا ہے۔''وہ بدمعاش ہے''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ''بدمعاش'' کے درمیان کوئی دوسرا لفظ نہیں آ سکتا۔ قواعد کے مطابق ہر لفظ اپنے معانی لیے ہوئے ہوتا ہے۔لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کئی الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو دو یا زائد لسانی ٹکڑوں کو ملانے سے بنتے ہیں۔اگر ان کو الگ الگ کر دیا جائے تو ان ٹکڑوں کے الگ سے کوئی معنی نہیں رہتے۔پس قواعد کے اعتبار سے''لفظ'' کی یہ تعریف مکمل نہیں ہے۔اور اس کی صحت مشکوک ہے۔

لفظ کو صوت کے لحاظ سے اس کو صوتی اکائی کا نام بھی دیا گیا۔(۲۸) صوتی اکائی سے مراد ایسے الفاظ جن کو ایک لہجہ کے ساتھ بولا جا سکے۔لیکن ایک ہی سُر یا لہجہ کے ساتھ پڑھے جانے والے الفاظ کو ایک اکائی قرار دینا اس لیے درست نہیں کہ عین ممکن ہے کہ وہ الفاظ قواعدی طور پر بھی ایک ہی اکائی ہوں ایسے الفاظ جو اپنے استعمال کے لیے دوسرے الفاظ پر انحصار کریں پابند الفاظ کہلاتے ہیں۔ایسے الفاظ تحریر کی صورت میں تو اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہیں مگر گفتگو کے دوران ان الفاظ کا بامعنی کا تعین دوسرے الفاظ پر انحصار کرتا ہے۔انگریزی زبان میں ایسے الفاظ کو Clitics کہا گیا ہے۔فرانسیسی زبان میں ایسے الفاظ کا استعمال عام ہے۔اردو زبان بھی ایسے الفاظ سے مبرا نہیں ہے۔مثال کے طور پر رہا ہے، رہے ہیں، وغیرہ۔جیسے الفاظ کو تحریر میں انفرادیت تو حاصل ہے مگر یہ الفاظ انفرادی حیثیت میں بامعنی نہیں ہیں۔اس لیے گفتگو کے دوران ان الفاظ کو اکیلا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔اس کی حیثیت پابند مارفیم سے اس لیے جُدا ہے کہ پابند مارفیم کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ مارفیم کے ساتھ آتا ہے تو اُن کے درمیان کوئی دوسرا مارفیم داخل نہیں ہوسکتا۔جبکہ''رہا'' کے لیے صورتحال قدرے مختلف ہے۔مثلاً''وہ کھا رہے ہیں، وہ کھا تو رہے ہیں، وہ کھا نہیں رہے ہیں، ان تمام حالتوں میں''رہا'' کو اُس کے قواعدی حصہ کھا سے الگ کر دیا گیا ہے۔اس لیے رہا کو ہم پابند لفظ قرار دیتے ہیں نہ کہ پابند مارفیم۔

مادہ لفظ کا وہ حصہ ہے جو بنیادی طور پر اس میں موجود رہتا ہے جبکہ ساق بھی لفظ کا حصہ ہے جس میں تعریفی

مارفیم کو جوڑا جاسکتا ہے۔بعض حالات میں سیاق وسباق اور مادہ ایک ہی ہو سکتے ہیں۔مثلاً ''کامیابی'' میں کامیاب ساق ہے اور ''ی'' ایک اشتقاقی مارفیم کی حیثیت میں موجود ہے اس طرح ''کامیاب'' مادہ کی حیثیت میں بھی موجود ہے۔ایک اور لفظ ''نالائقی'' کی مثال لیتے ہیں۔اس میں ''نالائق'' ساق ہے جبکہ ''ی'' اشتقاقی مارفیم جبکہ ''لائق'' مادہ ہے۔جبکہ ''نا'' بھی اشتقاقی مارفیم کی صورت میں موجود ہے۔ان دونوں امثال سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ بعض صورتوں میں ساق اور مادہ جدا حیثیت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس بعض حالات میں ساق اور مادہ ایک ہو سکتے ہیں۔اگر ہم اوپر دیئے گئے الفاظ کو ''کامیابیوں'' اور ''نالائقیوں'' کی صورت میں لے آئیں تو ''وں'' ایک تصریفی مارفیم کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں۔''مادہ'' کسی بھی لفظ کا بنیادی اور اہم حصہ ہوتا ہے جبکہ ''ساق'' ایک اشتقاقی حالت بھی ہوسکتی ہے۔اس لیے اگر کسی لفظ میں مادہ اور ساق دونوں الگ صورتوں میں بھی موجود ہوں تو مادہ خواہ چھوٹا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو اُس کی اہمیت ساق سے بنیادی نوعیت کی ہوگی۔جبکہ ''ساق'' ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

کسی بھی زبان میں پابند مارفیم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک تصریفی مارفیم اور دوسرے اشتقاقی مارفیم کہلاتے ہیں۔تصریفی مارفیم قواعد کے لحاظ سے اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔جبکہ اشتقاقی مارفیم کی قواعد میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ان کو غیر قواعدی مارفیم کہا جاتا ہے۔مثلاً لفظ ''قلموں'' میں ''وں'' ایک تصریفی مارفیم ہے کیونکہ یہ قواعد میں جمع کے صیغے کو ظاہر کرتا ہے۔جبکہ لفظ ''تیزی سے'' میں ''سے'' اشتقاقی مارفیم کو ظاہر کرتا ہے۔کیونکہ سے کے ہونے نہ ہونے سے جملے کی ساخت پر قواعد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تصریفی مارفیم کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ساق نہیں بناتے یعنی اگر تصریفی لاحقہ استعمال ہو جائے تو اُس کے بعد کسی دوسرے لاحقے کی ضرورت نہیں رہتی۔(۲۹) جبکہ اشتقاقی لاحقے کو استعمال کرنے کی صورت میں یہ گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ اس کے بعد مزید اشتقاقی یا تصریفی لاحقہ آسکے۔اس کی مثال ''نا'' میں ''کام'' جوڑیں تو

''نا کام'' حاصل ہوا۔اس میں کام بطور اشتقاقی لاحقہ استعمال ہوا ہے جس کو''نا کامی'' نا کامیاں کے طور پر بھی لکھا جا سکتا ہے لہٰذا نا کام اور نا کامی میں اشتقاقی مارفیم استعمال ہوا ہے جب نا کامیاں کے بعد کسی مزید لاحقے کی گنجائش موجود نہیں اس لیے اس میں'' آں''بطور تصریفی لاحقے کے استعمال ہوا ہے۔

تصریفی مارفیم عموماً ایک جیسے اور کم اختلاف والے ہوتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس اشتقاقی مارفیم میں مختلف اقسام کے ذیلی مارفیم ہوتے ہیں۔ مثلاً اُردو میں''ان کا'' کی صورت میں استعمال ہونے والے سابقے مختلف الفاظ میں تبدیل صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ جس کی مثال''نا، بِلا، بنا، اور لا'' کی شکل میں ہو سکتے ہیں جیسے نا بلد، بلا سود، بنا بات کے، لا حاصل وغیرہ۔ جب کہ تصریفی مارفیم میں ایسی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ ان کے ذیلی مارفیم میں اتنا زیادہ اختلاف نہیں ہوتا۔ یہاں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایک مارفیم جو کسی ایک زبان میں تصریفی مارفیم کے طور پر آتا ہے۔ دوسری زبان میں وہی مارفیم اشتقاقی حالت میں بھی ہو سکتا ہے۔ جس کے کئی ذیلی مارفیم ہو سکتے ہیں۔ اس کی امثال اُردو زبان میں تذکیر و تانیث کے لیے استعمال ہونے والے مارفیم سے لی جا سکتی ہے۔ جو اُردو زبان میں قواعدی اہمیت کی بدولت تصریفی مارفیم کی حیثیت میں استعمال ہوتے ہیں۔(۳۰) ان تصریفی مارفیم کی بدولت جملے کی ساخت میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ مثلاً''لڑکا کھیل رہا ہے اور لڑکی کھیل رہی ہے'' اب دیکھیں تو یہ بات واضح ہے کہ لڑکا اور لڑکی کی وجہ سے جملے میں رہا ہے اور رہی ہے کا استعمال مشروط حالت میں ہو رہا ہے جبکہ انگریزی زبان میں تذکیر و تانیث کے سبب جملے کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تذکیر و تانیث اُردو زبان میں تصریفی مارفیم جبکہ انگریزی زبان میں اشتقاقی مارفیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کلمہ کے اجزاء(Part of speech) کسی بھی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں آسانی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ کون سے الفاظ بطور اسم استعمال ہو رہے اور کون سے فعل یا صفت کے

طور پر استعمال ہوتے ہیں۔لسانیات اس بات کو واضح کرتی ہے کہ ایک ہی لفظ بعض حالات میں بطور اسم استعمال ہوتا ہے اور بعض حالات میں وہی لفظ بطور فعل ہمارے استعمال میں آ جاتا ہے۔مثلاً (یہ کھانا خراب ہے) اور (یہ آپ کو کھانا ہے) ایک حالت میں ''کھانا'' اسم کے طور پر ہمارے سامنے آ رہا ہے اور دوسری صورت میں کھانا فعل کی حالت میں موجود ہے۔اس طرح کی صورتحال کی وضاحت کے لیے محض معنی پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اُس سیاق وسباق کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔(۳۱)

اسم کے ساتھ استعمال ہونے والے زمرے پابند حالت میں ہوتے ہیں۔ اس لیے تصریفی زمرے کہلاتے ہیں۔(عدد) تصریفی زمرے ہیں اُردو میں یہ واحد اور جمع کی حالت میں استعمال ہوتے ہیں۔عربی میں ایک کے لیے واحد دو کے لیے تثنیہ اور زیادہ کے لیے جمع استعمال ہوتے ہیں۔اُردو میں اعداد کو فعل اور صفت دونوں حالتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً روتا سے روتے، کھاتا سے کھاتے وغیرہ۔

اُردو میں اسم کے ساتھ دوسرا قواعدی زمرہ جنس کا ہے یہ اُردو زبان میں مستعمل ہے۔(۳۲) ہر اسم خواہ جاندار ہو یا بے جان اُس کی تذکیر و تانیث موجود ہوگی۔انگریزی زبان میں جنس کے لیے مذکر، مونث اور مشترک موجود ہیں مگر یہ صرف اسم ضمیر کی حدود تک ہیں یعنی (He, She, It) تک انگریزی میں Gender کو قواعدی حیثیت حاصل نہیں ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ جنس تصریفی مارفیم ہے ہی نہیں بلکہ یہ نحوی زمرہ ہے۔یعنی اسم پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے بلکہ اس کے اثرات فقرہ پر مرتب ہوتے ہیں جس کی وجہ سے جملے میں تبدیلی کی وجہ سے اس کو اُردو میں قواعدی زمرہ کہتے ہیں۔

ماہرین لسانیات کے ہاں جنس کی تین اقسام مستعمل ہیں۔جن کو مذکر، مونث اور مشترک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔جنس کا یہ فرق تعکیر (Article) اور ضمیر (Pronoun) میں پایا جاتا ہے۔اسپینی زبان میں جنس کا فرق Articles تک محدود ہوتا ہے۔اسم میں ایسی تبدیلی جو اُس کے فعل کے ساتھ تعلق کی وجہ سے پیدا ہوا سے اسم کی

حالت کا نام دیا جاتا ہے۔اُردو کی روایتی قواعد انگریزی زبان سے متاثرہ ہونے کی وجہ سے بے حد مبالغہ کا باعث ہے۔کیونکہ حالت کی جو اقسام بتائیں گئی ہیں۔وہ انگریزی قواعد کی تقلید میں لکھی گئی ہیں جبکہ انگریزی قواعد لاطینی زبان کی تقلید ہے۔اُردو زبان میں اسم کی دو حالتیں ہے جبکہ لاطینی میں اسم کی آٹھ حالتیں ہیں۔اُردو اور انگریزی میں اسم کی یہ حالتیں فاعلی اور غیر فاعلی کہلاتی ہیں۔(۳۳) مثلاً احمد کھا رہا ہے، فاعلی حالت ہے جبکہ ''احمد نے کہا'' غیر فاعلی حالت ہے۔غیر فاعلی حالت میں اُردو زبان کے فقرات میں ''نے'' اور ''کو'' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔اُردو میں اسم کو نحوی استعمال میں بھی لایا جا سکتا ہے۔اس طرح اُردو میں محض دو حالتیں ایسی ہیں جن میں قواعدی زمروں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔جو فاعلی اور غیر فاعلی کہلاتی ہیں۔

کسی لفظ کو استعمال کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مخاطب اپنے لیے استعمال کر رہا ہے یا کسی غائب شخص کے یا حاضر شخص کے لیے۔اس کو شخصی زمرہ کا نام دیا جاتا ہے۔جب مخاطب لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تو اُس حالت میں شخص ''متکلم'' کہلائے گا۔اس طرح دیگر صورتوں میں حاضر یا غائب قرار پائے گا۔اُردو میں شخصی صیغہ، ضمیمہ، صفت اور افعال کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

ایسے پابند مارفیم جو افعال کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں فعلی زمرے کہلاتے ہیں۔(۳۴) جمع کے مارفیم بھی فعلی زمرے ہوتے ہیں۔جمع کے مارفیم کے علاوہ چند ایسے اور بھی مارفیم ہیں جو افعال سے مخصوص ہیں۔ ان میں سے ایک ''طور'' (Voice) کہا ہے۔یہ دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ایک ''طور معروف'' (Active) اور دوسرے ''طور مجہول'' (Passive) کے طور پر جانے جاتے ہیں۔یہ زمرے انگریزی زبان میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ایسی حالت میں فاعل کی حرکت فعل پر اثر انداز ہوتی ہے۔اور اس طرح فعل فاعل کو حرکت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مذکر مونث کا افتراق تعکیر اور اسمائے ضمیر میں موجود ہوتا ہے۔

عام طور پر زبانوں میں فعل کے مکمل ہونے یا اُس کے برعکس دو کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ایک کیفیت فعل

کے مکمل پن کی عکاسی کرتی ہے جبکہ دوسری کیفیت فعل کے نامکمل ہونے کی عکاس ہوتی ہے۔ اُردو زبان میں ''چکا ہے، چکی ہے''، مکمل فعل کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں جبکہ رہا ہے، رہی ہے، فعل کی نامکمل حالت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ فعل کے حوالے سے مارفیم آنے کی وجہ سے یہ زمرہ تصریفی زمرہ کہلاتا ہے۔(۳۵) جملہ کی ادائیگی میں فعل کی حالت اثر انداز ہوتی ہے جس کی وجہ سے فقرات میں تین قسم کی حالتیں جنم لے سکتی ہیں۔ ایک ایسا جملہ جس کو سادگی سے ادا کیا جا سکے سادہ بیان جملہ کہلاتا ہے۔ یہ سادہ بیان کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثلاً اکرم جا رہا ہے، ایسا جملہ جس میں حکم موجود ہو جملے کی امری حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسے جملوں میں فعل کا صرف ایک ساق استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جا، کھا وغیرہ۔ تیسرے ایسے جملے جن میں شرطیہ یا شکیہ کیفیت موجود ہو اور اس کیفیت کی وجہ سے فعل متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر وہ آتا تو تو ایسا ہوتا۔ وغیرہ۔ ''اگر'' کا استعمال جملے کو مشروط یا شک کی حالت میں ظاہر کرتا ہے۔

اُردو میں قواعد کے لحاظ سے تین زمانے پائے جاتے ہیں۔ حال، ماضی اور مستقبل۔ زمانہ حال کے اُردو افعال کو ظاہر کرنے کے لیے ''ہے، رہا، رہی ہے''۔ وغیرہ مارفیم استعمال ہوتے ہیں۔ زمانہ ماضی کے لیے افعال کے ساتھ ''تھا، تھی، یا''۔ کو استعمال کیا جاتا ہے جبکہ مستقبل کے جملوں کے لیے ''گا، گے، گی'' کے مارفیم کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اُردو میں نحو کا تعارف

علم نحو میں کلام یعنی جملوں اور فقروں کی ترتیب اور قاعدوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ علم نحو میں فقروں میں الفاظ کی ترتیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ علم صرف میں زبان کا مطالعہ لفظ کی سطح تک محدود رہا مگر نحو میں لفظ کے اوپر کی تمام سطحوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جملے کی تشکیل میں کئی مداراج ہوتے ہیں۔ جو مختلف قدرتی حالت اور گروہوں کے زیر اثر ترتیب پاتے ہیں۔ اس عمل کو ''ترکیب'' کہا جاتا ہے۔ جملے میں موجود تمام الفاظ ایک دوسرے سے

مربوط ہونے کی وجہ سے بامعنی فقرے کو تشکیل کرتے ہیں۔ یہ الفاظ آپس میں یکساں تعلق نہیں رکھتے بلکہ کچھ الفاظ کا آپس میں گہرا جبکہ کچھ الفاظ کا آپس میں عمومی نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ نحوان تراکیب کا مطالعہ ہے جس میں صرف آزادروپ ہوتے ہیں۔ تراکیب اور ترکیب میں رکھنے کے لیے جواصول کارفرما ہیں۔ اُن کے مطالعہ کو نحو کا نام دیا جاتا ہے۔

علم نحو میں جملوں اوران سے چھوٹی تراکیب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی اکائی جزو کہلاتی ہے۔ دواجزامل کرایک ترکیب کی تشکیل کرتے ہیں اجزا کے آپس میں مل کر ترکیب کی تشکیل کرنے کی اس حالت کو اجزا کا اتصال یا جزومتصل کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ نحو میں ہم ایسی تراکیب کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے اجزاء متصل آزادروپ میں ہوتے ہیں۔ یعنی وہ دونوں اجزاء جو آپس میں مل کرایک نئی ترکیب کو جنم دیتے ہیں۔ وہ آزادانہ حالت میں بھی اپنے وجود کو برقرار رکھ سکیں۔

ایسی دو یا دو سے زیادہ تراکیب جن کے آخری اجزاایک جیسے ہوں لیکن جزو و متصل میں اختلاف کی وجہ سے معانی میں فرق پڑ جائے ایسی حالت ساختی تعمیری تجنیس کہلاتی ہے۔ اس حالت کو ابہام کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اگر کسی ترکیب کو زیادہ اجزا میں تقسیم کر دیا جائے اوراس کے جزومتصل دو سے زیادہ بنانے پڑیں تو اسی ترکیب کو کثیر اجزائی ترکیب کا نام دیا جاتا ہے۔ ان تراکیب کی تعداد تین چار اجزا پر مشتمل ہوسکتی ہے۔ جزومتصل دو حالتوں میں موجود ہوتے ہیں۔ اکثر تراکیب میں ان کی نوعیت مسلسل کی ہوتی ہے جبکہ بعض تراکیب میں جزومتصل غیر مسلسل بھی ہوسکتے ہیں۔ ایسے الفاظ جو معانی اور علم نحو کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہوں کو ایک جزو میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ''قلم کتنا کارآمد ہے''۔ اس جملے میں قلم ...... کارآمد ہے۔ ایک، جبکہ ''کتنا'' دوسرا جزو ہے۔ قلم کار آمد ہے۔ زیادہ قدرتی اور بامعنی حیثیت کا جملہ ہے۔ لیکن کتنا کی موجودگی جزو غیر مسلسل ہے۔

دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں ان تراکیب کی ساخت اورنوعیب یکساں نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کے

درمیان اختلافی صورت موجود رہتی ہے۔بعض تراکیب کسی ایک زبان میں زیادہ استعمال ہوتی ہے جبکہ دوسری زبان میں ان تراکیب کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔کسی بھی زبان کا نحوی تجزیہ کرنے کے لیے ان تراکیب کی درجہ بندی اور اجزاء کے لحاظ سے ترتیب ایک لازمی امر ہے جس کے بغیر زبان میں موجود نحوی الجھنوں کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔ان تراکیب کو دو بڑے گروہ میں تقسیم کرتے ہیں۔''درون مرکزی تراکیب'' اور ''بیرون مرکزی تراکیب'' ایسی تراکیب جن کے اجزائے متصل میں سے کوئی ایک جز وایسا ہوتا ہے جس کے استعمال کے طریقے اور کُل ترکیب کے استعمال ایک جیسے ہوتے ہیں۔اس طریقے کو انگریزی میں "Principal of occurence" کا نام دیا جاتا ہے۔جبکہ ایسی حالت درون مرکزی ترکیب یعنی Endcentric Construction کہلاتی ہے۔مثلاً ''اچھا لڑکا'' ایک درون مرکزی ترکیب ہے۔کیونکہ ان مثال میں موجود ''لڑکا'' کا استعمال مرکزی نوعیت کا ہے۔جبکہ کل ترکیب میں ''اچھا لڑکا'' موجود ہے۔اس طرح ''اچھا لڑکا پڑھتا ہے'' اور ''لڑکا پڑھتا ہے'' ان جملوں میں ''لڑکا'' مرکزی نوعیت کا حامل ہیں جبکہ ''اچھا'' اُس کا دوسرا جزو ہے۔جو اُس کا وصف ہے۔یعنی اچھا اگر جملے میں شامل نہ بھی کیا جائے تو جملے کے معانی اپنی حیثیت کو برقرار رکھتے ہیں۔اور اُن کی حالت میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوتی۔اس لیے ''اچھا لڑکا'' میں ''لڑکا'' "Head of centre" اور ''اچھا'' Attitude کہلاتا ہے۔

ایسی تراکیب جن میں مرکز اور وصف دونوں پائے جاتے ہیں وصفی یا تابعی تراکیب کہلاتے ہیں۔ان کی چار اقسام ہوتی ہیں۔پہلی ایسی تراکیب جن میں وصف پہلے اور مرکز بعد میں آتا ہے جیسے خوبصورت لڑکی، اچھا انسان، وغیرہ دوسری قسم کی تراکیب میں مرکز پہلے اور وصف آخر میں آتا ہے۔مثلاً ''لڑکی خوبصورت ہے، انسان اچھا ہے'' وغیرہ، تیسری قسم کی تراکیب میں مرکز غیر مسلسل جب کہ صف بیچ میں آتا ہے۔مثلاً ''وہ نہ آسکے'' وغیرہ۔ اس میں ''نہ'' وصف ہے جو درمیان میں موجود ہے باقی غیر مسلسل مرکز ہیں۔جبکہ چوتھی قسم میں وصف غیر مسلسل جبکہ

مرکز بیچ میں آتا ہے۔مثلاً ''ایسا کام جو پورا ہو سکے'' میں کام مرکز ہے۔جبکہ پورا ہونا وصف ہے۔

درون مرکزی یا تابعی ترکیب کی دوسری قسم کو ترکیب عطفی کہا جاتا ہے۔ان تراکیب میں دونوں جزو متصل مرکز تصور کیے جاتے ہیں۔جب کہ ان کے درمیان وصف کی موجودگی ضروری نہیں۔یہ تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔ پہلے ایسی تراکیب جن کی شناخت لفظ''اور'' سے ہوتی ہے اس لیے یہ اضافاتی تراکیب کہلاتی ہیں۔مثلاً ''مہران اور احمد'' وغیرہ۔اس طرح کبھی کبھی ''اور'' کی جگہ ''وٗ'' کا استعمال بھی اُردو زبان میں کیا جاتا ہے۔مثلاً ''خواب وخیال'' ،''خس وخاشاک'' وغیرہ۔یہ بھی اضافائی تراکیب ہیں۔بعض حالتوں میں اضافائی تراکیب حالت صفر میں چلی جاتی ہیں جہاں ان کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہو جاتا ہے۔مثلاً ''باپ، بیٹے، بھائی، بہن'' وغیرہ۔دوسری ایسی تراکیب جن کی پہچان ''یا'' سے ہوتی ہے یعنی دو اجزاء کے بیچ میں ''یا'' موجود ہوتا ہے۔مثلاً ''مہران یا احمد، آج یا کل'' وغیرہ۔ایسی تراکیب میں بھی ''یا'' کا استعمال بعض حالتوں میں صفر ہو جاتا ہے۔مثلاً '' آج کل، مہران احمد'' وغیرہ۔تیسری قسم کی تراکیب جو درون مرکزی کہلاتی ہیں۔وہ برجستہ تراکیب ہیں۔یہ وہ تراکیب ہیں جن کے اجزاء کے درمیان کو لفظ یا نشان موجود نہیں ہوتا اور دونوں میں سے کسی کو بھی مرکز کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ فونیم، لفظ کا استعمال سب سے پہلے ''ہیوٹ'' نے ۱۸۷۶ء میں کیا۔
۲۔ احسان الحق، ڈاکٹر، اردو عربی کے لسانی رشتے، قرطاس، کراچی۔
۳۔ رشید حسن خان، اردو املا، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۴۔ اقتدار حسین، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء۔
۵۔ الٰہی بخش اعوان، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات لسانیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔
۶۔ روح الامین، سید، اردو لسانیات کے زاویے، عزت اکادمی، گجرات، ۲۰۰۷ء۔
۷۔ عبدالحق، ڈاکٹر، قواعد اردو، الناظر پریس، لکھنو، ۱۹۱۴ء۔
۸۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''جامع القواعد''، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۱ء۔
۹۔ موسیٰ سلمان کرماڈی، اردو کا آسان قاعدہ، اسلامک ایجوکیشنل ٹرسٹ، یوکے۔
۱۰۔ طالب ہاشمی، اصلاح تلفظ واملا، یلقمر انٹر پرائزر، لاہور۔
۱۱۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ایک بھاشا دو لکھاوٹ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵۔
۱۲۔ شیما مجید، اردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔
۱۳۔ خورشید الحسن رضوی، ڈاکٹر، مقالہ الخط العربی القدیم وارتقا، غیر مرتبہ۔
۱۴۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اردو رسم الخط کے مسائل۔ جدید تقاضے، (یہ مقالہ دوسری عالمی کانفرنس میں پڑھا گیا)
۱۵۔ عبدالحیٔ عابد، علم الخط، میانوالی، ۲۰۰۹ء۔
۱۶۔ روح الامین، سید، اردو کے لسانی مسائل۔
۱۷۔ میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
۱۸۔ خلیل صدیقی، پروفیسر، زبان کا مطالعہ، مستونگ قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۶۴ء۔

۱۹۔ عبدالحق، ڈاکٹر، ''صرف ونحو''، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء۔
۲۰۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات، زبان اور رسم الخط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء۔
۲۱۔ اقتدار حسین، ڈاکٹر، ''صوتیات اور فونیمیات''، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۴ء۔
۲۲۔ اقتدار حسین، ڈاکٹر، ''صوتیات اور فونیمیات''، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۴ء۔
۲۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد، لاہور، مرکزی بورڈ، ۱۹۷۱ء۔
۲۴۔ اقتدار حسین، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء۔
۲۵۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر، اردو لسانیات، اردو محل پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء۔
۲۶۔ الٰہی بخش اعوان، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات لسانیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔
۲۷۔ شمس الرحمان فاروقی، ''لفظ ومعنی''، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء
۲۸۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ''اردو قواعد''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۲ء۔
۲۹۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء۔
۳۰۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء۔
۳۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''بنیادی اردو''، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء۔
۳۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''بنیادی اردو''، مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔ ۱۹۶۸ء۔
۳۳۔ عبدالحق، ڈاکٹر، ''صرف ونحو''، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء۔
34. Halliday M.A.K,Language and social man, vol.3,London,1974
۳۵۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی ۱۹۷۰ء۔

باب چہارم

اردو میں معنیات کے مباحث اور ان کا اطلاق

اردو میں معنیات کے مباحث اور ان کا اطلاق

معنیات

لسانیات میں انسان کے سماجی کردار کا مطالعہ ایک خاص پیرائیہ میں کیا جاتا ہے۔ سماجی ارتباط اور تعاون کے لیے استعمال ہونے والی زبانوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی لسانیات میں شامل ہے۔ اس ضمن میں اولین مواد مخصوص موقع محل، سماجی صورت حال اور مخصوص ردعمل ہوتا ہے۔ ہر لفظ اور جملے کا استعمال شعوری اور ارادی ہوتا ہے۔ جسے انسان اپنے ماحول میں استعمال کی بدولت شعوری یا لاشعوری طور پر سیکھ کر استعمال کرتا ہے۔ کلام ان آوازوں پر مشتمل ہوتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتیں بلکہ ان میں اور ان کے سماجی استعمال میں ایک رشتہ ہوتا ہے۔ اس رشتے کا سائنسی مطالعہ ''معنیات'' کہلاتا ہے۔ معانی کو ہر قسم کے علامتی نظام میں نمایاں خصوصیت قرار دیا جاتا ہے۔ دنیا میں موجود تمام علامتی نظاموں میں انسانی زبان کا علامتی نظام سب سے زیادہ وسیع اور ترقی یافتہ ہے۔ اس لیے معنیات سے مراد انسانی زبان کے معانی کا مطالعہ ہے۔ معنی کا تعلق مخاطب کے حقیقی تجربات سے ہوتا ہے۔ اس کے ابلاغ میں سماجی سیاق وسباق موجود ہوتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ معنیات میں سماجی وعمرانی علوم اور عقل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ساختیات کے ماہرین اپنے سائنسی نقطہ نظر کی وجہ سے معنیات کو اس سبب غیر سائنسی کہتے تھے۔ بلوم فیلڈ نے اپنی کتاب ''زبان'' میں اس رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

''معانی کی وضاحت سائنسی صحت کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ایسے مظاہر جو براہ راست معروضی

مشاہدے اور طبعی ناپ تول میں نہیں آسکتے ان سے سرف نظر کرتے ہوئے لسانیاتی بحث کے دوعرہ کار کو معروضی مواد تک محدود رکھنا چاہئے''۔(۱)

نوام چومسکی کی اس رائے کو امریکی ماہرین لسانیات نے مشعل راہ بنالیا اور ایسی انتہا پسندی اختیار کرلی کہ'' معنیات کو لسانیات کے دائرے سے خارج کر دیا اور اس کو فلسفہ اور منطق میں شامل کرنے کی بات کی۔ یہ حقیقت ہے کہ معنی کے تجزیاتی مطالعہ سے جنم لینے والے مسائل اور مباحث سے فلسفہ اور منطق کا گہرا تعلق رہا ہے۔لیکن معنیات کو محض فلسفہ اور منطق کا موضوع قرار دینا درست نہیں ہے۔روزمرہ کے سماجی عوامل میں معنیات کا جو کردار ہے اس کے پیش نظر لسانیات،معنیات کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتی''۔

Michel Breal نے ۱۸۸۳ء میں زبان کے معنیاتی مراحل کی توجیہہ کی اور اپنی کتاب'' معانی کی سائنس''میں یہ جواز پیش کیا کہ'' میں جس نوعیت کے مطالعے کی ترغیب دے رہا ہوں وہ بالکل نئ ہے،ایسی کہ اب تک اسے کسی نام سے موسوم نہیں کیا گیا''۔لسانی ماہرین نے مواد پر توجہ تو دی لیکن معنی کے اصولوں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

اوگڈین اور رچرڈسن نے ۱۹۲۳ء میں ایک کتاب'' معنی کے معنی'' کے عنوان سے تحریر کی۔ جس کو معنایات کی تاریخ کا اہم سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کو فونیمیات اور ساختیات کی چکا چوند نے گہنا دیا۔ بلوم فیلڈ کے محولہ بالا خیالات کی چھاپ نے اس کتاب کو امریکہ تک رسائی ہی فراہم نہ کی۔تاہم بیسویں صدی کے وسط میں اسے پھر سے مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں معنیات کے موضوع پر کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔اور بہت سے ماہرین لسانیات نے معنیات میں دلچسپی لینا شروع کی ان میں'' Nida,Fodor, Ullmann, Sebeok, Demauro, Bar Hillal,

Joos,Carnap, weinreich,lyons اہم ہیں۔

لسانیات کی ہر کتاب میں اس دور میں ایک باب معنیات کے عنوان سے ضرور موجود ہوتا تھا۔معنیات میں جس موضوع سے بحث کی جاتی ہے وہ اس قدر پرانا ہے کہ اس کے ڈانڈے افلاطون اور ارسطو سے جا ملتے ہیں۔لسانیات میں اس کا افق بہت وسیع ہے۔زبان کے وسیع دائرہ کار کی بدولت معنی کی منظّم پرکھ کے لیے معروضی طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔یقیناً ماہرلسانیات کا نقطہ نظر ماہرین منطق اور ماہرین فلسفہ سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔تاہم اس میں منطقی تجربے کے عمل دخل کا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

معانی کی جامع اور واضح تعریف تا حال نہیں کی جا سکی۔اگر چہ مختلف نقطہ ہائے نظر سے وابستہ ماہرین اس کی تعریف اپنے انداز میں کرتے رہے ہیں۔عام طور پر معنی کی تعریف کے ضمن میں یہ بات کہی گئی کہ ’’معنی وہ شے ہے جسے کلمے سے موسوم کیا جاتا ہے‘‘۔افلاطون کی ’’Cratylus‘‘ میں بھی یہی نقطہ نظر موجود ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں ’’شے‘‘ سے کیا مراد ہے۔کیا اس کا کوئی معراضی وجود ہونا ضروری ہے۔یا اس فعل بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔اگر ہم معنی کی اس تعریف پر اکتفا کر لیں تو ’’نہیں،کو،پر،تھا،گا‘‘ وغیرہ کو سمجھنے کا قرینہ کیا ہے؟۔اس کمی کو ختم کرنے کے لیے کلمے کے معانی کو ایک ایسا متحو رخیال کیا جاتا ہے جو بولنے والے اور سننے والے کے اذہان میں پہلے سے موجود ہو۔ایک ہی لسانی گروہ کا رکن ہونے کی وجہ سے متکلم اور سامع کے اذہان میں معنی جا گزیں ہوتا ہے۔اس لیے معنیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ نفسیاتی طور پر ایک صوتی تشبیہ کلمے کی ہئیت میں مماثل ہو کر ذہن میں مرتسم ہو جاتی ہیا اس شبیہہ اور تصور کے باہمی تلازمے کے نتیجہ میں کلمہ وجود میں آتا ہے۔

اوگڈین اور رچرڈسن نے اپنی کتاب ’’ Meaning of Meaning‘‘ میں مثلثی تعلق کے ذریعہ اس کی وضاحت کی ہے۔اور واضح کیا کہ کلمے اور مشارالیہ میں براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔کچھ ماہرین نے اس نظریہ

میں ترمیم کر لی اور معنی کو ایسا مفہوم قرار دیا جو کلمے اور مفہوم کا جوابی رشتہ ہوتا ہے۔ان کے مطابق'' کلمے میں صوتی تشبیہہ ہوتی ہے جو تسور کو ابھارتی ہے جس سے معنی جنم لیتے ہیں''۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر کلمے کا صوتی عکس ہو۔مثلاً ''روایت'' کی صوتی شبیہہ یا عکس کیا اور کیسے ہوسکتا ہے۔

معنی کے ضمن میں یہ بات بھی کی جاتی رہی ہے کہ معنی کی تحقیق انتساب اور تعبیر کے درمیان موجود تعلق کی بنیاد پر بھی کی جاتی رہی ہے۔کلام اور اس کے اجزا کے خارجی ماحول سے رشتے اور تعلق کو اس ضمن میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انتساب اور تعبیر انہی رشتوں میں شمار ہوتے ہیں ۔معنیات اور مباحث میں ایسی اصطلاحیں بھی استعمال ہوتی رہی ہیں جو متنازعہ فیہ رہی ہیں۔مثلاً مفہوم،تعبیر، انتساب تضمیں وغیرہ۔ایک لفظ کو ایک مکتبہ فکر کے ماہرین نے انے طور پر سمجھا اور جانا ہے تو دوسرے مکتبہ فکر کے دانشوروں نے اس لفظ کا مفہوم اور معنی اپنے طور پر اخذ کیے۔مثلاً کچھ لوگ ''تعبیر'' سے وہی مراد لیتے رہے جو دوسرے ''انتساب'' سے مراد لیتے رہے۔

فلسفیانہ مباحث میں اس طرح کی بہت سی الجھنیں اور غلط مباحث کی بھر مار ہے۔گس کی بدولت قاری لسانیات کی دنیا سے باہر نکل جاتا ہے اور فلسفہ اور نفسیات کی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔توضیحی لسانیات میں ان تمام کو مسائل سے پہلو تہی کرتے ہوئے کلمے کے سیاق اور سباق اور اس کے استعمال کے موقع و محل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس کو عملیاتی مطالعہ بھی کہا جاتا ہے۔

زبان میں تجریدی عمل سے ذہنی مواد اور اشیا کی درجہ بندی ہوتی رہتی ہے۔زبان سیکھنے کے عمل میں انسان اس درجہ بندی کو جذب اور قبول کرتے رہتے ہیں۔اسی وجہ سے بعض ماہرین معنی کو تجرید قرار دیتے ہیں۔جس کی اساس ان خصوصیات پر ہوتی ہے جو ملتے جلتے امور میں مشترک ہوتی ہیں۔کلموں کے لفظی معنی، جملوں میں ان کا استعمال سے پیدا ہونے والے معنی کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے۔کیونکہ کسی بھی زبان میں بولے جانے والے

کلمات اور جملوں میں ان گنت امکانات ہوتے ہیں۔ اس لیے مروجہ جملوں سے ہی معنی اخذ اور ترتیب دیے جاتے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ کلمات کبھی جامد نہیں ہوتا۔ اس لئے کلمے ہی مانی کی درست توضیح کے لیے آسان اکائیاں قرار دی جاسکتی ہین۔ لیکن یہ بات واضح ہو کہ کسی جملے کے انفرادی کلموں کے معنی کے مجموعہ کو آپ اس جملے کے معنی قرار نہیں دے سکتے۔

ماہرین ساختیات نے معنیات کی توضیح کے لیے لغت کو بنیاد قرار دیا ہے۔ لغت کا لفظ اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے مارفیم سے مختلف نہیں ہے۔ کیونکی ماہرین ساختیات چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو مارفیم کہتے ہیں۔ مارفیم کی اصطلاح متن یا مواد کی نمائندہ ہے۔ اس طرح مارفولوجی کی بنیادی اکائی مارفیم جبکہ معنیات کی بنیادی اکائی لغت میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ معنیاتی مماثلت رکھنے والے دو کلمے جن جملوں میں استعمال ہو سکتے ہیں ان سب میں ہم معنی ثابت نہ ہوں۔ بلکہ ان کے معنی کی صرحت الگ الگ کی جائے۔ ایسی صورت میں ان کو مترادف قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے معنی اور منصب کی وضاحت الگ سے کی جاتی ہے۔ اگر کلمے میں تشکیلیاتی لحاظ سے بے قاعدگی اور گرامر کے لحاظ سے انحراف ہو تو اس کی توجیہہ بھی کی جاتی ہے۔ اس طرح لگت ایک لحاظ سے گرائمر کا تکمل بن جاتی ہے۔

اصولاً کسی زبان میں استعمال ہونے والے تمام مروجہ کلموں اور جملوں کو لغت میں شامل کیا جانا چاہئے۔ لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں اس لیے لغت میں ایسے جملوں اور کلمات کو جگہ دی جاتی ہے جن کا استعمال زیادہ ہو۔ لغت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ کے معنی کا تعلق کس شعبہ سے ہے۔ متکلم کی معروضی اور تجریدی دنیا کا ہر عنصر کئی پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے خیالات، جذبات اور دیگر کئی لطیف گوشے ایسے ہوتے ہیں جو بولنے والے کی غرض و غایت اور مضٰی و منشا کی رو سے اس کے اظہار کا حصہ ہو سکتے ہیں۔ سیاق کی روشنی میں ہی بتدریج اس کے

جذبات اور احساسات کی درست عکاسی اور وضاحت کی جاسکتی ہے۔ سیاق کے بدل جانے سے سامع کا ذہن دوسرے پہلو یا مفہوم کی طرف منتقل ہوسکتا ہے۔ اس لیے معنی کو نازک فرق رکھنے والے مفاہیم کا حلقہ بھی قرار دی جاتا ہے۔ معنی اور مفہوم میں موجود رشتہ فونیم اور ایلوفونوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ (۲)

کلمے کے معنی میں تغیر کی بڑی وجہ سیاق کی تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ تغیر درحقیقت بولنے والے کے رویہ یا رجحان میں تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی کلمہ مختلف سماجی حلقوں میں مختلف معنی میں رائج ہوتا ہے۔ گویا گفتگو کرنے والے کلمے کے معنی کو اپنی اپنی معروضی اور ذہنی دنیا تک محدود کر لیتے ہیں۔ اسی طرح انفرادی حیثیت سے ادا کیے گئے کلمات کی تفہیم بولنے والے کے پیشے، نقطہ نظر اور مشغلہ کی نوعیت سے کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کلمہ کو نہ مبہم اور نہ ذومعنی سمجھا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی جانکاری کی بدولت سیاق اس معنی کو محدود کر دیتا ہے اور اس سے محدود معنی مراد لیے جاتے ہیں۔

جہاں کلموں کی معنیاتی حدود کا تقرر کیا جاتا ہے وہیں ان کے وسیع تناظر کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس استعمال کی نوعیتیں متعدد ہوسکتی ہیں۔ لیکن معنی کی بنیاد میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود توسیع کی نت نئی صورتیں سامنے آجاتی ہیں۔ معنی کا اس طرح کا اس طرح کا تنوع معنیاتی توسیع کے باعث ہوتا ہے۔ تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل وغیرہ معنیاتی توسیع کی مختلف صورتیں ہیں۔ روایتی گرائمر معنیاتی توسیع کو استعارے کے مرہون منت قرار دیتی ہے۔

یہ دراصل معنی کی ایسی تعمیم ہے جس میں نئے مشارالیہ بھی شامل کر لیے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے بنیادی مشارالیہ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یا اس کے کسی وصف کے حامل ہوتے ہیں۔ استعارہ، مجاز کی ایک قسم ہے جس میں حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہہ کے علاوہ اور بھی رشتے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً جزو اور کُل، سبب اور مسبب،

ظرف اور مظروف کے درمیان ایسا تعلق موجود ہوسکتا ہے۔ ''کنایہ'' بھی معنیاتی توسیع کی ایک صورت ہے۔ جس میں کلمہ حقیقی معنی دیتا ہے اور مجازی معنی بھی دیتا ہے۔ لیکن موثر معنی مجازی ہی ہوتے ہیں۔ علم بان کی تمام صورتیں تلازمہ خیال کی وجہ سے افہام وتفہیم اور حسن کلام کا ذریعہ بن کر معنیاتی توسیع میں اپنا کردار ادا کرتی رہتی ہیں۔

ایک ہی کلمے کے کئی معنی ہوتے ہیں کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کو دوسرے معنوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی اس طرح ابہام پیدا ہوتا ہے۔ لغوی ابہام دو طرح کا ہوتا ہے۔ اس میں امتیاز کرنا خاصا مشکل کام ہے۔

ا۔ دو مختلف معنی رکھنے والے کلمے جن کا تلفظ ایک جیسا ہو۔

۲۔ ایک کلمے کے معنی میں کثرت اور تنوع کی موجودگی۔

معنی کے تعلق اور بے تعلقی کو اختلاف معنی اور کثرت معنی رکھنے والے ہم تلفظ کلمات میں تمیز کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ معنی کے جس تعلق یا لاتعلقی پر کثرت معنی اور اختلاف معنی کے فرق اور امتیاز کا دار و مدار ہوتا ہے اس کی تاریخ بتانا مشکل ہے۔ اہل زبان کا وجدان ہی معنیاتی تشخص کا درست فیصلہ کرتا ہے۔ استعارتی تبادلہ کی صلاحیت ان کی لسانی دسترس کا حصہ ہوتی ہے۔ جو لسانی ماہرین کی تحقیقات کی پابند نہیں ہوتیں۔ اہل زبان کا وجدان ہی استعاراتی رشتوں کو تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان اتفاق رائے کی صورت نہ ہو۔ کثرت معنی اور اختلاف معنی کی گنجائش ہر جگہ موجود رہتی ہے۔

علمی سطح پر معنیات کے تنوع کی امثال کثرت سے ملتی ہیں۔ کثرت معنی اور معنیاتی تنوع کا انحصار زیادہ تر استعاراتی خلاق پر ہوتا ہے۔ جسے اتنا اہم اور مثالی نہیں بنایا جاسکتا کہ ہم تلفظ مختلف المعانی کلموں کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ کثرت معنی معنیاتی تنوع کا انحصار زیادہ تر استعاراتی خلاق پر ہوتا ہے اس لیے اس بات میں دو رائے نہیں کہ کثرت معنی سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ یہ ابہام لغوی نوعیت کا ہوتا ہے۔ قواعدی ابہام نہیں ہوتا۔ سیاق وسباق

کی وجہ سے علمی موضوعات میں معنیاتی رہنمائی کو بنیادی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

کثیر المعنی کلموں کا زیادہ تر استعمال علمی سطح پر ہوتا ہے۔علوم کے فروغ کے نتیجہ میں کلمات کے معنیاتی تنوع میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔مختلف علوم نہ صرف نئے نئے کلمات اور اصطلاحات کو وضع کرتے ہیں بلکہ مروجہ الفاظ کو نئے معانی دے کر استعمال کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر ایک مضمون میں استعمال ہونے والی اصطلاح دوسرے مضمون میں نئے معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔مثلاً ''قاعدہ، راس،محور،عمود'' وغیرہ کی جو اہمیت علم ریاضی میں ہے۔جبکہ ان الفاظ کو دوسرے علوم میں دیگر معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ایک لفظ قاعدہ کو لیتے ہیں۔ریاضی میں اس سے مراد ایک مخصوص زاویہ کے تحت کھینچا گیا خط ہے۔

جبکہ علم عمرانیات میں ہم اس سے مراد اصول وضوابط لیتے ہیں۔جبکہ درس وتدریس کے عمل میں اس سے مراد ابتدائی نوعیت کی کتاب ہے۔اسی طرح علم طبیعات میں مادہ کا مفہوم کچھ اور لیا جاتا ہے جبکہ لسانیات میں مادہ سے مراد کچھ اور لی جاتی ہے۔یہ لسانی مسعلہ محض اردو زبان تک محدود نہ ہے بلکہ دنیا کی دیگر زبانیں بھی اس سے دو چار ہیں۔اس کی ایک مثال انگریزی زبان کا ایک لفظ کلچر ہے جس کے معنی ثقافت لیے جاتے ہیں مگر جب یہ لفظ طب کے شعبہ میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی ومفہوم میں یکسر تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

علمی رجحانات،تغیرات اور تخلیقی میلانات کی وجہ سے اکثر زبانوں کے مروجہ الفاظ اور اصطلاحات میں معنیاتی توسیع ہو رہی ہے۔جس کی وجہ سے معنی میں تنوع کی صورت پیدا ہوتی رہی ہے۔اور عام طور پر ایسے کلموں کی تفہیم دشوار نہیں ہوتی۔کیونکہ موضوع قاری کے ذہن میں سیاق وسباق کی روشنی میں معنی کی جانب اشارہ کر دیتا ہے۔کچھ کلمات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہم معنی اور مترادف قرار دیا جاتا ہے۔یعنی کلام کرتے ہوئے ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ استعمال کیا جائے اور کلام کی افادیت بھی برقرار رہے اور ابلاغ بھی مکمل ہو جائے تو دونوں کلموں کع

مترادف یا ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔لیکن یہ امر اسی وقت واقع ہوتا ہے جب دونوں کلمات کے قواعد اور معنیاتی مناصب یکساں ہوں۔

جدید ماہرین لسانیات اس مفروضہ کو درست سمجھتے ہیں کہ کسی بھی زبان میں مکمل مترادفات کا مکان نہیں ہے۔اگر دو کلمات کے درمیان فونیمی اختلاف موجود ہو تو ان میں معنی کا اختلاف بھی ہوگا۔ایسے کلمات جو مترادف سمجھے جاتے ہیں ان کے متعلق ایسا نہیں ہے کہ وہ ہم معنی ہیں بلکہ ان کے مفاہیم میں نازک سا فرق پایا جاتا ہے۔جس پر عموماً غور نہیں کیا جاتا مگر گہرا اور عمیق مطالعہ اس فرق کو پہچان لیتا ہے۔مثلاً انگریزی کے الفاظ Buy اور Purchase کو عام طور پر مترادف سمجھا جاتا ہے۔لیکن ان میں نازک سا فرق موجود ہے اور ہم Purchsing department کو Buying deprtment نہیں کہہ سکتے۔ ماہرین معنیات اس خیال کے حامی ہیں کہ ''اسلوب کے جدید تصور میں انتخابیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اور اس کا امکان کلمات کے مترادف ہونے کے باعث ہی ممکن ہے''۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جمالیتی تاثر اور آہنگ کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں یا جاسکتا۔

اردو زبان میں بہت سے کلمات ایسے ہیں جن کو مترادف کی ذیل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ان میں سے اکثر کلمات دخیل ہیں۔مثلاً ''انس و محبت، رنج و غم'' وگیرہ۔ان سب میں مفہوم اور مراتب کے حوالے سے لطیف سا فرق موجود ہے۔لیکن عام طور پر انہیں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرنے میں دقت محسوس نہیں کی جاتی۔کلمات کی ساخت اور ترتیب میں تنوع کے ساتھ معنی کے اختلاف اور مترادف پن کا اہم کردار ہوتا ہے۔جس زبان کی لغات میں یہ ہم آہنگی اور تخالف نہ ہو اس لغت کا تصور بھی ممکن نہیں۔معنیات کے ضمن میں کلام کے مقاصد اور منشا متکلم کو اہمیت دی جاتی ہے۔

فونیمیات، صوتیات اور نحو میں بھی یہ ہم آہنگی اور تخالف، تجزیاتی اور ساختیاتی اصولوں کے طور پر موجود رہتے ہیں۔ لسانیات تو اپنی جگہ اگر ہم زندگی کے کسی بھی شعبہ پر نگاہ ڈالیں ہمیں ہر سمت ہم آہنگی اور تخالف کے نظریات کارفرما نظر آتے ہیں۔ بے آہنگ لغات میں اضداد کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ اس میں انسانی ذہن کی دو بنیادی صلاحیتیں ہمارے سامنے ظاہر ہوتی ہیں جو جود نیا اور سا کے متعلقات کے ادراک اور نطق کے سلسلہ میں تقابل اور امتیاز کا سہارا لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کی تمام زبانوں میں متخالف کلمات کے جوڑے موجود رہتے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہے کہ زبانوں میں متقابل اور متخالف جوڑوں کا اصول کارفرما رہتا ہے۔ اور اس کی اساس پر فونیم کی شناخت ہوتی ہے۔(۳)

اس ضمن میں ماہر لسانیات ٹرائر کی یہ رائے ہے کہ ''جو بھی کلمہ ادا کیا جاتا ہے وہ بولنے اور سننے والے کے شعور میں متقابل اور متخالف کلمات کا متقاضی ہوتا ہے۔ کلام کے دوران متکلم اور سامع کے اذہان میں متقابل اور متخالف کلمات موجود ہوتے ہیں جو کلام کو بامعنی اور بامقصد بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں''۔ اضداد کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ یہ دو ایسے قطبین کی نمائندگی کی صلاحیت رکھتے ہیں جنہیں مطلق کہا جا سکے۔ یعنی ایسے کلمات جن کی وصفی تدریج ممکن نہ ہو سکے۔ مثلاً ''زندہ، مردہ۔ برا، بھلا۔ نیک، بد'' وغیرہ۔ اسی طرح تصریفی زبانوں میں صوتیاتی تعلق رکھنے والے اضدادی جوڑے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ''اہل، نااہل۔ رسمی، غیر رسمی۔ محرم، نامحرم۔ ہونی، انہونی''۔ اس طرح جوڑے کے کسی رکن میں سابق بڑھا کر متضاد رکن وضع کر لیا جاتا ہے۔ بعض ایسے جوڑے ہوتے ہیں جن میں سمت کا تخالف پایا جاتا ہے۔ مثلاً ''آنا، جانا۔ آگے، پیچھے۔ اوپر، نیچے۔ دائیں، بائیں'' وغیرہ۔ ان سب امثال میں تخالف اور تقابل کی حیثیت AntiPodal Opposition کہلاتی ہے۔

ایسے کلمات کا تعلق محض طبعی حالت سے نہیں ہوتا بلکہ قدرتی طور پر پائے جانے والے رنگوں سے بھی ان کا

تعلق واضح ہوتا ہے۔ مثلاً سیاہ اور سفید، سرخ اور سبز، ان میں بھی تخالف کی واضح صورت موجود ہے۔ اوگڈین'' لال اور ہرا کو غیر مشکوک تقابلی جوڑا قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے تاثرات بالکل متضاد ہیں۔ اور یہ ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں بہت سی زبانوں میں بھی رشتوں کے اظہار کے معاملہ میں اس قسم کے کلماتی تخالف کا اصول موجود ہوتا ہے۔ یہ اصول صرف معکوس یا مقلوب تک محدود نہیں ہوتا بلکہ کلمہ کا ہر ایک رکن دوسرے سے متخالف قرار پا سکتا ہے۔ مثلاً ''لڑکا، لڑکی۔ مرد، عورت۔ گرمی، سردی، بہار، خزاں'' وغیرہ لغت کے تقابل اور تخالف سمتوں کا تضاد مراد لینا درست نہیں ہے۔ ایک لغت کا دوسری زبان کی لغت سے کئی لحاظ سے تقابل یا تخالف کیا جا سکتا ہے۔(۴)

ان لغتی تضادات اور تقابلات کے باوجود زبانوں میں موجود رشتہ اور تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف زبانوں کی لغات کے درمیان اسمائے عام کا زیادہ عمومیت کے اسم سے رشتہ برقرار رہتا ہے۔ اسے گروہی شمولیت بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے زمروں کی تقسیم اور ترکیب کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ان سب عوامل سے انسان کے ذہن کی درجہ بندی کرنے اور گروہ سازی کی امتیازی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ معنیاتی تجزیے کے دوران مختلف ماہرین لسانیات نے بھی گروہی تقسیم کو اپنایا۔ قدیم ترین زبانوں کے نمونوں میں بھی ہمیں لغات کی تقسیم کا نظام موجود نظر آتا ہے۔

انسان کا فطرت اور کائنات سے تعلق حسی اور فکری نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ انسانی تجربات حسی، تاثراتی اور تصوراتی وفکری ہوتے ہیں۔ جن کے ابلاغ کے لیے صوتی علامتیں وضع کی جاتی ہیں۔ ان صوتی علامتوں اور اور کلمات کی تالیف اور ترتیب سے ادراک کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس طرح کی تراکیب اور ترتیبات مفرد کلمات کے مفہوم کی وضاحت میں مدد دیتے ہیں۔ چونکہ سامع ماضی کے تجربات کی وجہ

سے بہت کچھ پہلے سے سیکھ چکا ہوتا ہے اس لیے سیاق وسباق کی بدولت وہ معنی تک رسائی کے لیے اور اس کے درست تعین کے لیے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔لیکن معنیات کا علم صرف حسیاتی، تاثراتی، تصوراتی اور فکری زمرو میں تقسیم تک محدود نہیں بلکہ اس کے دائرہ کار میں زبان کے خارجی اور کائناتی حوالوں کے ساتھ ساتھ تعبیر، معنی ومفہوم، محل گفتگو، وقوع پذیری کی صورتحال، سیاق وسباق اور اس سے متعلقہ دیگر شعبہ جات معنیات کے دائرہ بحث میں شامل ہیں۔اس ضمن میں بہت سے نظریات سامنے آچکے ہیں۔لیکن ان سب نظریات میں مقبول نظریہ انگریز ماہر لسانیات ''فرتھ'' نے پیش کیا۔

فرتھ کے نظریہ کی بنیاد سیاق کے تصور پر قائم ہے۔

فرتھ کا کہنا ہے کہ ''کلمات عبارت کے سیاق میں ہوتے ہیں۔اس لیے ان کے درست معنی اور مفہوم تک رسائی بولنے والے کے تہذیبی سیاق کو مدنظر رکھنے سے ہوسکتی ہے''۔تہذیبی سیاق وسیع تر سیاق ہوتا ہے جو کلام کے تہذیبی لحاظ سے معینہ موقع محل میں وقوع پذیر ہونے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔کلام کے معنی اس سیاق کی دین ہوتے ہیں۔جب متکلم اپنی مخصوص تہذیبی پس منظر میں گفتگو کرتا ہے تو سامع اپنے جوابی عمل یا تاثر سے اس بات کی توثیق کرتا کہ وہ اس کی گفتگو کے معنی اور مفہوم کو سمجھ رہا ہے۔معنی کے تجزیے کا بنیادی مقصد سیاق کی مدد سے اس کی تجرید اور اس کے منصب کا تعین ہے۔اس طرح فرتھ تہذیبی سیاق کو وہ بنیاد قرار دیتے ہیں جس میں سماجی اور امتیازی اہمیت کی صورت حال واقع ہوتی ہے جو کلام یا گفتگو کا محرک بنتی ہے۔صورت حال کے تناظر میں کلام کے درست معانی تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔

سیاق کے تجزیات ہمیں اس حقیقت سے آگاہی بھی فراہم کرتے ہیں کہ کسی متن کی معنیاتی تفہیم کے لیے تہذیب اور اس کے مسلمات کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔اہل زبان چونکہ بچپن سے ہی ایسے تجربات سے گزر رہے

ہوتے ہیں جو انہیں یہ سمجھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں کہ زندگی میں مختلف فرائض کی ادائیگی کے دوران ان کو کلام اور اس کو ادا کرنے کے لیے کن کن آداب کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔لسانیات کے ماہرین ان بنیادی خصوصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی وجہ سے سیاق وسباق کی روشنی میں ہونے والی گفتگو میں سیاق کی حیثیت کی توضیح ہو سکے۔زبان کے اس عمل اور استعمال سے متعلق اہم نکات کا انضباط بھی ہو جاتا ہے جس کا اکتساب اہل زبان غیر شعوری طور پر کرتے رہتے ہیں۔صورت حال کے سیاق کی وجہ سے کلام کے معنی میں دو پہلو سامنے آتے ہین۔ ایک پہلو انفرادی طور پر ادا کیے گئے کلمات کی جب کہ دوسرا پہلو مجموعی کلمات کی دلالت کرتا ہے۔ رتبے، ذاتی حیثیتیں،سماجی رشتے، دوستی،اور بے تکلفی کے درجات جیسے امتیازات بھی سیاق کے ذیل میں آتے ہیں۔(جنرل لنگوسٹکس ص۔۸)

فرتھ نے معنی کی درست رسائی کے لیے کلمات کی ارتباط اور ترتیب کی بات کی اور Collocation کا تصور پیش کیا۔فرتھ کی رائے میں معانی کے تجزیہ میں صورتحال اور قواعد کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ معنی کا ایک پہلو ایسا بھی ہوتا ہے جس کا انحصار سیاق پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق دوسرے کلمات کی وقوع پذیری پر ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک کلمے کی دوسرے کلمے کے ساتھ وقوع پذیری کو بھی مدنظر رکھا جائے۔کلمات لغتی عناصر کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اس لیے اس نسبت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔مثلاً ''اندھیری رات'' اس ترکیب میں رات ایک لطیف سے ارتباط کے ساتھ اندھیری سے منسلک ہے۔اس طرح ہر کلمے کا دوسرے کلمے کے ساتھ ارتباط بھی معانی کے مضمرات کی وضاحت میں ضروری قرار پاتے ہیں۔کلموں کی ترتیب میں موجود یہ ارتباط روزمرہ کا حصہ ہے۔جس میں کلمات کے حقیقی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔جبکہ مجازی معنی اگر مراد لیے جانے ہوں تو ان کے لیے محاورات کا استعمال کیا جاتا ہے۔

محاورات اسم اور صفت اور اسم اور فعل پر مبنی ہوتے ہیں۔ان میں صفت اور فعل کے مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔محورات نے چندان کلمات کو بھی زندہ رکھا ہوا ہے جن کا استعمال آج کل تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ ہر زبان کی اپنی قواعد، روزمرہ اور محاورات ہوتے ہین۔ دوسری زبانوں میں ان کا ترجمہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔محاورات میں بعض کلمات جوڑوں کی صورت میں ہوتے ہین۔ جو کسی تناسب کی وجہ سے اپنے معنی فراہم کرتے ہیں۔لیکن جملوں میں ان کے مجموعی نہیں بلکہ توسیع شدہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً طول دامن، روٹی کپڑا، بوریا بستر، نان نفقہ، حقہ پانی وغیرہ۔

زبان کے بولنے والے کی تہذیب اس زبان کی معنیات کی عکاس ہے۔معنیات متکلم کے تہذیبی رویوں کا عکس پیش کرتی ہے۔ابلاغ کی درست فراہمی کے لیے صورتحال اور موقع محل اہمت رکھتے ہیں۔ وہی کلام با مقصد اور محرک ہوتا ہے جو سماجی سیاق میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ کہ علم بشریات میں بھی معنیات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ بشریاتی نقطہ نظر سے رشتوں اور فطرتی مظاہر اور عقائد کی گروہ بندی بھی زبان کے معنیاتی امتیازات پر اثر انداز ہوتی ہے۔اسی طرح زبان کے استعمال کرنے والوں کے تصورات، مشاہدات، مطالعات اور ذہنی رجحانات بھی معنیات کو متاثر کرنے والے عوامل ہیں۔ (۵)

انسانی معاشرت کی خصوصیت ہے کہ ہر معاشرہ کے افراد اپنے جذبات، تصورات اور اظہار کے لیے صوتی علامات کا استعمال کرتے ہیں۔ان کے معنی میں مماثلت کے ساتھ ساتھ اختلاف کے بھی یکساں امکانات موجود رہتے ہیں۔مختلف معاشروں میں مرتبہ، ترجیحات، تصورات پر تفہیمی گرفت ایک جیسی نہیں ہعتی۔ان میں خاص اور عام کے تعین میں بھی فرق ہوتا ہے۔اگر زبان کے معنیاتی خاکوں کی تشکیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تخصیص اور تعمیم کا فرق ہر دو معشرتوں میں موجود ہے۔اس لیے یہ معنیاتی خاکے ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف ہوتے ہیں۔

اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک کا معنیاتی نظام اس معاشرے کی تہذیب سے مشروط ہوتا ہے۔مختلف زبانوں میں تقسیم کی صورتین اوران کے لئے استعمال ہونے والی لغات میں امتیاز موجود ہوتا ہے۔

جذبات،تصورات اورفکر کی سطح پر کائنات سے انسانی تعلق اور تضربہ کی بنیاد پر علامات کوصوتی پیک میں ڈھالنامشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ان تعاملات کی سائنسی گرفت بہت دشوار ہے۔اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زبان کس لسانی جماعت یا گروہ کے تجربات اوراکتسابات کومتعین اور محفوظ بناتی ہے۔لہذااس کا معنیاتی مطالعہ تہذیبی تناظر میں ہی ہونا چاہئے۔لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کسی کلمے کا سیکھنا اور ذہن میں اس کا ڈھلا ہوا تصور خود بخود نقش نہیں ہوجاتا۔

معنیاتی گرفت،کلمہ اوراس کی اشارتی قدر کے باہمی رشتے پر منحصر ہوتی ہے۔جس قدر کلمے اوراس کے مشار میں رشتہ مضبوط ہوگا اسی قدر معنیاتی گرفت طاقتور ہوگی۔اس کے بغیر کلمے کی درست تفہیم کے امکانات کم سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔لغات کے مباحث پر مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے توجہ مرکوز رکھنے کے باوجود معنیات کے میدان اُس طرح کی سائنسی پیش رفت نہیں ہوسکی جس طرح کی گرائمر میں ہوئی ہے۔

ساختیات میں معنی کی تقسیم دوطرح سے کی جاتی ہے۔

ا۔لغوی معنی۔

۲۔ساختیاتی معنی۔

لغوی معنی کا عمل،کلمہ کی سطح پر ہوتا ہے۔اورساختیاتی معنی کا عمل مختلف سطحوں پر ہوتا ہے۔جن میں مارفیم اور علامتی سطوحات کواہمیت دی جاتی ہے۔قواعدی معنوں کو اخذ کرنے کے لیے جن صوتی وسائل کو اور اشارات کو استعمال کیا جاتا ہے ان ہی سے گرائمر مرتب کی جاتی ہے۔یہی نقطہ ماہرین ساختیات کی تحقیق کا مرکز رہا ہے۔اور

ان کی عمومی توجہ اسی پر مرکوز رہی ہے۔ روایتی اجزائے کلام کا اطلاق تمام زبانوں پر ممکن نہیں ہے۔ بعض زبانوں میں تو کلمات کی نشاندہی بھی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اکثر زبانوں میں صرف اسم اور فعل کے لیے استعمال ہونے والے کلمات میں ہی تفرق کی جا سکتا ہے۔

ایک ہی کلمہ کئی قواعدی ذیلی زمروں میں استعمال ہوسکتا ہے۔ اوراس کے معنی بھی قواعدی صورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح قواعدی منصب کے لحاظ سے تابع مارفیم کی آزاد معنیاتی اقدار اہم معنیاتی عمل سرانجام دیتی ہیں۔ لغات کی صرفی، نحوی اور معنیاتی خواص زبان کی توضیح اور اس کی فرہنگ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ہر زبان میں لغتی معنوں اور معیاری جملوں کے درمیان ایک طرح کا داخلی رشتہ ہے جو نحوی اور صوتی ہئیتوں کی تقسیم کے درمیان موجود نہیں ہوتا۔ اسی لیے ماہر لسانیات گرائمر کے قاعدوں کو فرہنگ میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ کہ لغت کی درجہ بندی معنی سے مربوط ہو جاتی ہے۔ اور اس کا صوتی ہئیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔

روایتی معنیات میں کلمات کے سرمایہ کو جب کہ جدید معنیات میں جملوں کے معنی کے تجزیات کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ جدید معنیات خاص طور پر ان پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے جن کی تعبیر انفرادی کلمات کے مجموعہ سے نہیں ہوسکتی۔ ایسے معانی گتگو میں استعمال ہونے والے لہجے، آہنگ پر زور دینے سے ابھرتے ہیں۔ مثلاً ''ارشد نے ملتان کا سفر کیا''۔ اس فقرے میں زور ''ارشد'' اور ''سفر'' پر ہے۔ لہجوں سے معنی میں تغیر کا عنصر ابھرتا ہے۔ کیونکہ کلمات اور جملوں کی ادائیگی پر معاشرتی اور عمرانی تعلقات کا اثر موجود رہتا ہے۔ یہ اثرات ہماری بات چیت میں خوش خلقی، درشتی، اور جذباتی پن پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو سے ہماری معاشرتی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔

زبان کا اولین مقصد ابلاغ ہے۔ اگر بات چیت، اسلوب سے معانی کی وضاحت ہو جاتی ہے تو ابلاغ کے

مطلوبہ مقاصد کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔اس کے لیے اگر قواعد اور صرف ونحو کے اصولوں سے انحراف بھی کیا جا سکتا ہے۔لیکن بعض اوقات جملوں کے آہنگ کے لیے کلمات کے انتخاب پر توجہ اس قدر مرکوز کر دی جاتی ہے کہ معنی کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابلاغ کا صحیح حق ادا نہیں ہو پاتا۔عمومی طور پر زبان میں اسلوبی انحراف ہوتا رہتا ہے۔متکلم شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی سہولت کے مطابق اور موقع محل کی مناسبت سے زبان کی ہیئتوں میں سے جسے چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔عام بول چال میں ہونے والے اسلوبیاتی تغیر سے معنی میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا۔مثلاً ''میں نے ناصر کو ایک قلم دیا'' اور ''میں نے ایک قلم ناصر کو دیا''۔ان دونوں جملوں میں تاکید یا زور میں کوئی فرق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے معنی میں فرق نہیں پڑتا۔جموں کی تاکید یا زور میں فرق کی وجہ سے معینات میں انحراف پیدا ہوتا ہے۔

ادبی تحریروں اور گفتگو کے دوران مترادفات یا ایسے کلمات کو استعمال کیا جاتا ہے جو قریب المعنی ہوں۔ ایسی بات چیت میں آہنگ،سلاست اور روانی کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ان کی وجہ سے اسلوب جیسی خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔

''اسلوب کی اصطلاح عام طور پر ادب پارے یا تحریر کی ایسی خصوصیات کے مجموعے کو کہا جاتا ہے جس سے تحریر کا تشخص ہو سکے''۔

ایسے کلمات کے معنی اور مفاہیم میں نازک سا فرق ہوتا ہے۔اس لیے معنیاتی انحراف کا امکان موجود رہتا ہے۔اب سوال یہ جنم لیتا ہے کہ اسلوبیاتی اور معنیاتی انحراف میں حد بندی کیسے کی جائے؟۔ماہرین اسلوبیات، معنی کو اہمیت نہیں دیتے۔ان کے نزدیک ساخت اور ہئیت کا لسانی تجزیہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔وہ مخصوص کلمات کے اعداد وشمار کی مدد سے اسلوبیات کو شماریات کے دائرہ میں لاتے ہیں۔اور ''شماریاتی اسلوبیات'' بنا دیتے ہیں۔

اسلوبیاتی انحراف کا تعین متکلم یا مصنف کے سماجی منصب، کردار، اور ابلاغی مقاصد کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔اس میں سیاقی عوامل کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس طرح کے انحرافات سے الگ انحراف کی ایک اورصورت بھی ہوتی ہے جوشخصیت کے اظہار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اسلوب سے شخصیت کا شعوری اور غیر شعوری اظہار ہوتا ہے۔ماہرین معنیات ان اسلوبی انحرافات کا جائزہ لینا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ان کی نظر لہجوں اور بولیوں کے امتیازات پر بھی ہوتی ہے۔معنیات میں ساختیاتی مباحث کی شمولیت کی وجہ سے ساختیاتی معنیات کے شعبہ نے جنم لیا اور معنیتی تجزیات میں کلماتی نیابت اور تبادل کے تصور کا آغاز ہوا۔امرکی ماہرلسانیات ''جارج کنگسلے'' نے کلمات کی معنیاتی کثرت اور استعمال کے حوالے سے یہ فارمولا پیش کیا کہ'' کلمے کے مختلف معانی کی تعداد اس کے استعمال کے تواتر کی جذر کے مساوی ہیں''۔(جدید لسانیات کے خاص رجحانات۔ص ۱۴)۔

نظام لسان کے ہر ماڈل یا جملے میں صوت اور معنی کی بھر پور نمائندگی ہونی چاہیے۔یعنی ماڈل ایسا ہو جس میں صوتی ،قواعدی اور معناتی اصول ایک مربوط اکائی کی صورت موجود ہوں۔آج کل تخلیقی گرائمر میں ان اصولوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

''ہیرس'' جوتخلیقی گرامر کے ماہرین میں بلند مقام رکھتا ہے۔اس بات پر زور دیتا ہے کہ زیر تبادل جملوں کے معانی کا کچھ نہ کچھ حصہ مستقل حیثیت رکھتا ہے۔لیکن وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ نحو آزاد اور خو اختیاری ہوتی ہے۔ہیرس کے شاگرد نوام چومسکی بھی ابتدا میں اسی نقطہ کے قائل تھے۔لیکن بعد میں وہ نحو اور معنیات کو مربوط کرنے لگے۔چومسکی نے ابتدا میں فونیمیات،تشکیلیات ،معنیات اور نحو سب کو لسانی ماڈل کی اکائی میں سمونے کی اہمیت کو نظر انداز کیا۔اس کا یال تھا کہ معنی کے مترادف ،متشابہ اور افتراق کی کوئی اہمیت نہیں ان کے بغیر بھی گرائمر

کے اصول مرتب کیے جاسکتے ہیں۔اس طرح انہوں نے نحو کو معنیات سے آزاد اور خودمختیار قرار دیا۔ Katz اور Fod نے ۱۹۶۳ء میں یہ نظریہ پیش کیا کہ چومسکی کے خاکے میں نحو اور معنیات کو مربوط کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے گرائمر میں ایسی فرہنگ کا اضافہ کیا جس کی وجہ سے استعمال شدہ ہر لغت کی معنویاتی اور نحوی تشریح ہو سکے۔

چومسکی اس نظریہ سے متاثر ہوئے اوراس کو اپنی تخلیقی گرامر میں شامل کرلیا چومسکی کے ترمیم شدہ ماڈل میں داخلی ساخت کا جو تصور پیش کیا اس میں معنیات اور نحو کے کے تعلق کے مباحث کا اہم کردار ہے۔اردو کے ماہر قواعد ،عربی اور فارسی کے قواعد دانوں کی تقلید میں معنیات کو قواعد کا ایک شعبہ قرار دیتے رہے۔اب جبکہ اردو قواعد کے ماہرین نے مغربی قواعد دانون کے اتباع میں معنیات کو گرائمر سے الگ شعبہ علم قرار دیا اوراس طرح اردو میں گرائمر کو محض حروف کی آوازوں اور صرف ونحو تک محدود کر دیا گیا۔اگر چہ مغرب کے بعض ماہرین لسانیات آج بھی معنیات کو گرائمر کے اندر شامل سمجھتے ہیں تاہم عمومی طور پراسے الگ علم کا شعبہ سمجھا جاتا ہے۔اردو میں معانی کے مباحث کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔یہ مباحث مغربی ماہرین کے ہاں بھی ملتے ہیں۔معنیات کے بعض مباحث اب علم بیان کی ذیل میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ان میں سے بیشتر مباحث مغرب کے ماہرین معنیات کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

تمام انسانی گروہ سماجی نظام کو اوراس سے وابستہ اداروں کو زبان اوراس کے معنیات کو غذا فراہم کرتے ہیں۔زبان کے ساختیاتی سانچے انہی لسانی گروہوں کے مزاج اور فکر کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں۔ہر لسانی گروہ کی تخیلاتی اور ذہنی صلاحیت دنیا کے بارے میں ان کے موجود ادراک اور شعور پر مشتمل ہوتی ہے۔محض زبان ہی انسانی شعور اور ادراک کی ترجمانی کی وسیلہ نہیں بنتی بلکہ انسانی تصورات اور ماحول کی بناوٹ وغیرہ بھی اظہار کا بالواسطہ ذریعہ ہیں۔زبان کی جڑیں لسانی گروہ کے ماضی میں ہوتی ہیں۔اس وجہ سے اس کو مخصوص گروہ کی تاریخ

اور تہذیب کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔

اس لیے انسانی گروہ کا اپنی زبان سے جذباتی وابستگی کا پیدا ہونا قدرتی امر سمجھا جاتا ہے۔تہذیبی اور لسانی وابستگیوں کی بدولت لسانی مسائل نے مخاصمانہ صورت اختیار کی اور لسانی فسادات نے جنم لیا۔اب لسانیات کو جن کا مقصد اظہار کا زریعہ بننا تھا اور لوگوں کے درمیان ہم آہنگی اور انسیت کو پیدا کرنا تھا اس کو محض ذریعہ شناخت سمجھ لیا گیا ہے۔اس تہذیبی اور لسانی وابستگی اور اختلاف نے افسوس ناک تصادم کی صورتیں اختیار کر لی ہیں۔کچھ لسانی خصوصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو متکلم اور سامع اپنی ضرورت اور مرضی کے تحت گفتگو کا حصہ بناتے ہیں۔ اس گفتگو کے لیے کلموں کی ترتیب کا انتخاب متکلم کا اسلوب کہلاتا ہے۔اسلوب کا انحصار سماجی پس منظر پر ہوتا ہے۔ اور ہر سماج میں اسلوب کے اختلاف کی نوعیت عالمی ہے۔اور یہ لسانی ساخت کے کسی پہلو سے متعلق ہو سکتی ہے۔

ڈیوڈ کرسٹل اسلوب کی تمام تعریفوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

ا۔تشخیصی

۲۔توضیحی

تشخیص کے زمرے میں کرسٹل ان مفاہیم کو رکھتے ہیں۔جن کا تعلق ان کی خصوصیات سے ہے جن کے ذریعہ فرد یا شے کو عام سطح سے بلند کرتے ہیں۔ان کے معروضی تجزیے فرد یا شے کی امتیازی حیثیت کی توضیح کرتے ہیں۔ایسا اسلوب، صاحب اسلوب کا تشخص کراتا ہے۔یہ اسلوب مصنف کی تحریر کے تشخص کو ممکن بناتا ہے۔توضیحی زمرے میں مفاہیم کا تعین تعلق کی بنیاد پر نہیں بلکہ تحریر کی امتیازی خصوصیات سے ہی اس کی نشاندھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے تاثرات دوسروں کے لیے اس وقت ہی قابل قبول ہو سکتے ہیں جب ہم ان کی توضیح و توجیہہ ساختیاتی تجزیے سے کریں۔کیونکہ اسلوب کی معروضی وضاحت ساختی تجزیے سے ہی ممکن ہے۔

لسانیاتی نقطہ نظر سے اگر ہم ساخت کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلوب کی امتیازی حیثیت اور معروضی توجیہہ اس طور ممکن ہے کہ ہم ادبی اسلوب پر ساختیات کے اصولوں کا اطلاق کریں۔ کیونکہ ساخت کی مخصوص صورتوں میں جس قسم کا تواتر اور ترتیب ملے گی اس کا امکان اس طرح کی دوسری تحریروں میں نہیں ملے گی۔ ادبی اسلوب کے ساختیاتی مطالعے کو اطلاقی لسانیات میں اسلوبیات کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے معروضی توضیح کی کی ابتدا ہوئی۔ جس کے لیے مصنف کی نمائندہ تحریروں میں سے چند کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان کا تجزیاتی تقابل کرنے سے نئی ترکیبوں کو دریافت کیا جاتا ہے۔ اسی لیے عموماً اسلوبیات سے مراد کسی لسانی گروہ میں مروج زبان کے مطالعہ میں لسانیاتی تکنیک کے اطلاق کا نام ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلوب سے شخصیت کا شعوری اور غیر شعوری اظہار ہوتا ہے۔ اور مخصوص قواعد اور ساختیں اسلوب اور مصنف کی شناخت میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ جس کے لیے ماہرین لسانیات نے ساخت کے صوتی تجزیے کے اصولوں کو مرتب کیا ہے۔ جن کے اطلاق سے اس شناخت کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ آواز کی نوعیت، مخصوص کلمات، اور محاورات سے خاص قواعدی ساختوں اور تشکیلات سے اسلوب کی شناخت اور صاحب اسلوب کی پہچان میں مدد ملتی ہے۔

بلوم فیلڈ کے نزدیک لغت نہ صرف مارفیموں کا مجموعہ ہے بلکہ لسانیات کا شعبہ بھی ہے۔ بلوم فیلڈ نے زبان کے بیان اور توضیح کے دو مراحل بیان کرتے ہیں۔ ایک فونولوجی، دوسرا معنیا تکو مرحلہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح بلوم فیلڈ نے معنیات کو بھی مزید دو اقسام میں گرائمر اور لغت میں تقسیم کیا ہے۔ آر۔ ایچ۔ روبنس بھی مطالعہ لسانیات میں لغت کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہیں۔ ان کی رائے میں ''تمام دوسرے تجرباتی علوم کی طرح لسانی مطالعے میں زیر تجزیہ مواد کی مختلف سطوحات پر تجرید کی جاتی ہے۔ اور اسی حوالے سے لسانیات کی مزید توجیہہ کی جاتی ہے''۔

آر ایچ روبنس تجرید کی دو اقسام بتاتے ہیں۔

ا۔ ماہیت اور مقاصد کے لحاظ سے عمومی اور کلیاتی تجریدی تقسیم۔

۲۔ تخصیصی حیثیت میں تقسیم۔

آر۔ ایچ۔ روبنس صوتیات، گرائمر اور فونالوجی کو تعمیم یا کلیاتی تجرید میں جبکہ لغت کو تخصیصی تجرید کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح لغت، لسانیات کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ اس میں ہر لسانی مد کا مخصوص بیان ہوتا ہے۔ اور یہی لسانی بیانات لغت میں توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہی بیانات اپنی تعمیم شدہ صورت میں صوتیات، فونولوجی اور گرامر میں بھی زیر بحث ہوتے ہیں۔ لغت نویسی کا تعلق اجزائے زبان، صوتی مرکبات اور معنیات سے ہوتا ہے۔ معنی یا مفہوم کے تعین یا منطق کے مروجہ معنی میں تعمیم نہ کرتے ہوئے دوسرے ارکان کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ لغت کا ہر رکن اپنی الگ تعریف اور وضاحت رکھتا ہے۔ جو دوسرے تمام ارکان سے اپنے امتیاز کو برقرار رکھتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس گرائمر اس کلمے کی تجرید کرتے ہوئے اختلافات کی تلاش کی بجائے دو کلمات میں مشترک حیثیت میں تعمیم پر نظر رکھتی ہے اور ایسے اصول وضوابط کو مرتب کرتی ہے جو تدوین میں معاون ثابت ہوں۔ تجریدی حیثیت میں معنی قواعدی ساخت کا مظہر ہو سکتا ہے۔

بلوم فیلڈ لغت کو گرائمر کا ضمیمہ بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ''کسی زبان کی لغت اس کے تمام مارفیموں کی دستاویز ہے اور مارفیم کا جو بھی مفہوم ہوتا ہے، اختیاری روایت کی بدولت ہے۔ یہ کسی قواعدی زمرے سے منسوب ہو جاتا ہے اور لغت اس کی نشاندھی کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے الفاظ اور اس کی ہئیت کے بارے میں وہ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں جن کا تجزیہ گرائمر فراہم کرتی ہے۔ بعض کلمات ایسے ہوتے ہیں جن کے ایک سے زائد معانی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کثرتی معنی کے باوجود ان تمام معنوں میں کوئی نہ کوئی معنیاتی وحدت اور اشتراک

موجود ہوتا ہے۔ ہر معنیاتی کثرت معنیاتی توسیع کا نتیجہ ہوتی ہے۔ معنیاتی توسیع کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جملہ مختلف سماجی سطحوں پر مختلف معنی میں رائج ہوتا ہے۔ کیونکہ بولنے والے اسے اپنی ضروریات کے مطابق اسے محدود معنی تک استعمال کرتے ہیں۔ معنیاتی کثرت کے پیدا ہونے کی ایک وجہ معنیاتی تجرید بھی ہوتی ہے۔ معنی کے ساتھ ان سماجی حلقوں کی نشاندہی ہونی چاہئے۔ جن میں یہ معنی رائج ہوتے ہیں۔

معانی کی افادیت

علامتی نظام کے اظہار کے لیے معانی ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ قسم کے معانی مادی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ بعض مادی نہیں ہوے۔ معانی علامت اور بیان کے درمیان تعلق قائم کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ دنیا میں موجود عقائد انسانی لسانیات کی پیداوار ہیں۔ گفتگو کے مختلف انداز مختلف معانی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہم کس انداز میں بات کرتے ہیں۔ وہ انداز معانی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ یہ معانی مکمل طور پر ثقافت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ جو علامتی اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں۔

یہ دعویٰ کہ ایک مخصوص ثقافت کا مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ مکمل طور پر درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اس کی مکمل تردید ممکن ہے۔ تاہم مختلف آزمائشوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے۔ کہ ایک ہی معاشرہ اور ثقافت سے وابستہ افراد کے درمیان رویوں اور رہن سہن میں متوازی پن موجود ہے۔ یہی ثقافت اور معاشرت ہی ہے جس کے باعث کردار اور انسانی رویے تشکیل پاتے ہیں۔ اسی نقطہ نظر سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ معانی ثقافت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں جو علامتی اسلوب کی تشکیل میں مددگار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر رقیہ حسن کے نزدیک منظّم خیالات اور تصورات ایک خاص معاشرے کے دنیا کے بارے میں نظریات کی عکاسی کرتے ہیں جو علامتی اسلوب میں موزونیت پیدا کرتے ہیں۔(۶) کائنات کی تشکیل سے لے کر

اب تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ سب قدرت کے ساتھ ساتھ انسان کی کاوش کا نتیجہ بھی ہیں۔ یوں کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ جن حصوں کی تشکیل میں انسان کے تصورات کارفرما رہے ہیں وہ بے رحم اور پختہ حقائق پر مبنی ہیں۔ اس کائنات میں جاری مستقل انتشار علامتی اسلوب کی موزونیت کو ایک بڑی وجہ ہے۔ پس ایک مخصوص ثقافت میں اُس کی موزونیت کو جاننے کے لیے اُس سماج کو سمجھنا ضروری ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی ثانوی حیثیت کا حامل ہو۔ اس طرح الفاظ کے معانی سے روشناس ہونے کے لیے ثقافتی پہلو کو نظر انداز کرنے یا اُس سے پہلو تہی کرنے سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کوئی بھی زبان کسی دوسری زبان کی ہم جنس نہیں ہوتی۔ ثقافتی حدود کو قائم کرنا ایک مشکل کام ہے۔ ثقافتی حدود کا تغیر ثقافتی نزاکت اور نفاست کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ ثقافتی تضاد سے ہرگز مراد نہیں کہ ثقافتوں کے واضح شگاف کی شکل میں موجود ہو۔ ڈاکٹر رقیہ حسن اس نقطہ نظر کی حمایت کرتی ہیں کہ دو تقاضوں کے درمیان تضاد کی بنیادی وجہ لسانیات ہے جو بعض مشابہ الفاظ کی وجہ سے ثقافتوں کے بین تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔ اُسی طرح ثقافتوں کے درمیان تفریق بھی الفاظ کے معانی میں تضاد کی بدولت ہوتی ہے۔ معنویاتی اسلوب کا یہ نظریاتی تضاد دو تقاضوں میں خلیج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ایک ثقافت کے رہنے والے دوسری ثقافت میں بسنے والوں کے لیے معنویاتی اسلوب میں تضاد کی بدولت گفتگو ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دونوں تقاضوں میں ایک ہی لفظ کے مفہوم و معانی دو الگ الگ خیالات اور تصورات کو جنم دیتے ہیں۔ اس طرح لسانیات کا ایسا چست لباس قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو بولنے والے کو ناقابل تبدل قالب میں ڈھال دیتی ہے۔ معنویاتی اسلوب کا قیاس بھی اسی اہمیت سے خالی نہیں۔

ایک مخصوص ثقافتی حدود میں معانی کے اظہار کے بے شمار ذرائع موجود ہوتے ہیں۔ جس طرح معانیاتی ثقافتیں کرداری طرز عمل کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف شناخت کی حامل ہوتی ہے اُسی طرح لسانیات بھی

معانیاتی اسلوب میں تبدیلی کی وجہ سے اختلاف کا شکار ہو جاتی ہے۔(۷) یہی وجہ ہے کہ آج تک کائنات کی تشکیل وتخلیق کی مقصدیت کو سمجھا نہیں جا سکا۔ زبان کے درمیان فاصلے معانی کی پیداوار ہے اگر چہ ان فاصلوں کو ماپنا مشکل ہے۔ لیکن زمانی دوری معانوی کا ایک بڑا سبب ہے۔

مذہبی عقائد ونظریات بھی معانوی اختلافات کی ایک بڑی وجہ ہیں۔ ایک ہی ثقافت کے اندر رہنے والے افراد مذہبی افراد مذہبی نظریات میں تبدیلی کی وجہ سے ایک لفظ کو مختلف معانی اور مفہوم سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذاہب کے لوگ خدا کے بارے میں مختلف نظریات اور تصورات کے حامل ہوتے ہیں اور وہ ایک ثقافت میں رہنے کے باوجود مختلف الفاظ کے معانی میں افتراق کرتے ہیں۔ جب کہ اُن کے مقاصد میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ مسلمان خدا کو ''اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے تو ہندو ''بھگوان'' اور عیسائی ''God'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے اسی طرح عبادات میں استعمال ہونے والے حروف اور الفاظ بھی یکساں معانی رکھنے کے باوجود الگ الگ زبان میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ثقافتی تبدیلی الفاظ کے معانی اور مفہوم کو بدل سکتی ہے تو مذہبی نظریات بھی مختلف الفاظ کے معانی اور مفہوم کی تبدیلی کا باعث ایک ہی معاشرے اور ثقافت میں رہتے ہوئے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زبان کے اندر معانوی تبدیلی محض ثقافتی رشتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ مذہبی اثرات کی بدولت بھی معانوی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جو اس بات کی غماز ہے کہ معانی کی تبدیلی کی جو بات کئی ہو سکتی ہیں۔(۸)

معانوی تبدیلی اور ثقافتی تغیرات

جیسا کہ معانوی تبدیلی کی ایک بڑی وجہ ثقافتی تغیر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اُسی طرح دوسری جانب مذہبی تغیر کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ معانوی تغیر کی تیسری وجہ طبقاتی اونچ نیچ کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں

بسنے والے طبقات کے درمیان جب ہم اہم تفریق کی بات کرتے ہیں تو یہ جاننے میں آتا ہے کہ ہمارا معاشرہ گروہی طبقات میں تقسیم ہے جس میں رہنے والے لوگ گفتگو کے مختلف انداز اپناتے ہیں اور معیاری اور غیر معیاری الفاظ کا استعمال اُن کی ذو معنویت اور گفتگو کے درمیان علامات، استعارات، اور تشبیہات کا استعمال ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم دو طبقات کے درمیان معانوی فرق کو واضح طور پر پہچان سکیں۔ ثقافتیں جس طرح طرزِ عمل کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس طرح اپنے معانیاتی اسلوب کی وجہ سے لسانیات بھی مختلف انداز لیے ہوتیں ہیں۔ زبان کے درمیان فاصلے درحقیقت الفاظ کے معانی کی وجہ سے اختلاف کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ معانی میں یہ اختلاف کئی وجوہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ جن میں اختلاف کے لیے ضروری ہے کہ معنوی تنظیم کی بنیادوں کا مطالعہ کیا جائے۔ (Whorf) کے مطابق اگر دو زبانوں میں ایک جیسے الفاظ موجود ہوں لیکن اُن میں معانوی فاصلہ موجود ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں زبانوں کے وہ اصول جو معانی کی تشکیل اور اُن کو بناتے اور چلاتے ہیں اُن کے درمیان اختلاف موجود ہے۔

(Whorf) ایک مثال کے ذریعے سے معانوی اختلاف کی وضاحت کرتے ہیں کہ اگر ہم کسی انگریز سے کسی ایک رنگ کی شناخت کے بارے میں کہتے ہیں تو وہ یقیناً جن الفاظ میں اُس رنگ کی شناخت کرے گا۔ اُس کا اظہار کسی بھی دوسری ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے یکسر مختلف ہوگا۔ اس طرح (Whorf) کو وہ پہلا شخص قرار دیا جا سکتا ہے جس نے پتھر کے ٹھوس پن اور بادل کے ہلکے پن پر بات کی اور کہا ''پتھر کا پتھریلا پن اور بادل کا ہلکا پن دونوں حقیقت اور واضح طور پر ٹھوس دلائل کے ساتھ اپنا وجود لیے ہوئے ہیں۔ انسان ان کی طبعی حالت سے خوب واقف ہیں۔ تاہم یہ ادراک کسی ہندو کو پتھر کو دیوتا ماننے سے اور کسی Hopi کو بادل کو روح پھونکنے کی وجہ قرار دینے سے روک نہیں سکتا۔

ڈاکٹر رقیہ حسن کے نزدیک پتھر ایک ہی وقت میں دونوں حیثیتوں کا حامل ہو سکتا ہے اس میں کوئی دشواری

نہیں ہونی چاہیے۔ایک ایسی سخت شے جو پاؤں کو زخمی کر دے اور ایک ایسا دیوتا بھی جو انسانوں کی خواہشات کو پورا کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہو۔حقیت یہ ہے کہ ایک ٹھوس جسم کی علامت ہے جس کو پتھر اور کہیں دیوتا کا مقام حاصل ہے۔

ماہرین لسانیات اپنی توجہ کا مرکز عموماً گرامر اور اُس کی اقسام پر رکھتے ہیں۔جس کے باعث ڈاکٹر رقیہ حسن کے نزدیک وہ اپنے مقاصد سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔وہ معانی پر توجہ دیئے بغیر اپنے کام کو سمیٹ لیتے ہیں جو میرے نزدیک امکانی ابتدا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔دنیا میں قائم نظریات ہی معانی اور مفہوم کو جنم دیتے ہیں۔ جن کی بدولت ٹھوس پتھر اپنے ٹھوس پن کی وجہ سے علامتی شان وشوکت کا باعث دیوتا قرار دیا جاتا ہے اس طرح ایک دوسرے معاشرے میں بادل ہلکا ہونے کے سبب روح پھونکنے کا سبب قرار پاتا ہے۔اس سبب سے جو تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیاوی نظریات اور طبعی بصارت ہی اشیاء کو جانچنے اور اُن کی اہمیت کے قیام کا ٹھوس طریقہ ہیں۔(۹)

سماجی پہلو کسی بھی قسم کے اسلوب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ان کہے رویوں کا زیادہ تر تعلق سماجی اسلوب سے ہوتا ہے جو اُس سماجی ڈھانچے کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہ اسلوب ایک ایسی مطابقت کو جنم دیتا ہے جو ایک مخصوص نشانیاتی علاقہ پر پھیل جاتی ہے۔انگریزی، ہندی، اور دیگر تمام زبانیں ان معنویاتی فاصلوں کی بدولت ہی ایک دوسرے سے جدا اور الگ شناخت لیے ہوئے ہیں۔ یہ معنویاتی فاصلے زبانوں کے درمیان تعلقات کے آخری راستے قائم کرتے ہیں اور اُس ثقافتی فرق کے اظہار کا باعث ہیں جو دو معاشروں کے درمیان موجود ہے۔

معانی کا درست اظہار

معانی کے درست اظہار کے لیے ضروری ہے کہ معانی جو الفاظ کی بدولت پیدا ہوتے اُن کی حالت پر غور

کیا جائے۔بعض حالتوں میں الفاظ واضح معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جبکہ بعض اوقات یہ صورتحال اس کے برعکس ہوتی ہے۔اور مبہم الفاظ ذو معنویت اور غیر واضح پیغام کو جنم دیتے ہیں۔ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق جب یک عام شخص اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔تو اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا مدعا واضح طور پر سامنے والے شخص تک پہنچا سکے۔اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ سامع کی ضرورت کے مطابق الفاظ اور زبان کا چناؤ کرے۔ایسی زبان و الفاظ استعمال کرے جو سامع پر مدعا واضح کر سکیں اور سامع اُن الفاظ اور اُس زبان سے واقفیت رکھتا ہو اور اُن کو سمجھنے کی اہلیت اس میں موجود ہو۔تاہم جب الفاظ کا چناؤ مضمراتی اسلوب لیے ہوئے ہو تو معانی تک درست رسائی کے لیے اُن حالات کو جاننا ضروری ہے جس میں یہ پیغام جاری ہوا۔(۱۰) بعض حالتوں میں عمومی لسانی معلومات معانی تک درست رسائی کے لیے نا کافی ہوتی ہیں۔بعض مہمل الفظ بعض حالتوں میں گفتگو کو مبہم اور غیر واضح بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں جس کے باعث مکمل جملے کے معانی تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔اگر چہ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ پورا جملہ بے معانی قرار پائے گا۔غیر واضح اسلوب کی تاویل کے لیے خارجی حوالہ جات سے مدد لی جاتی ہے جب کہ اس کے برعکس واضح اسلوب کے لیے بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ اپنے معانی اور مفہوم کو از خود بیان کرتا ہے اور اس کو تاویل کے لیے کسی خارجی حوالہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔واضح اسلوب خود انحصاری طور پر معنیاتی مفہوم رکھتا ہے اس میں تضادات اور مضمرات شامل نہیں ہوتے۔جبکہ مضمراتی اسلوب میں معانی اخذ کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی خارجی حوالے سے مدد لے کر درست معانی تک رسائی حاصل کی جائے۔اسی جملے کا سیاق وسباق بھی بعض مرتبہ معانی کے فرق کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔گفتگو کے تناظر میں معانی تک رسائی یقیناً آسان ہے۔اس کی مثال ایک گروہی مباحثہ ہے۔جس کے آغاز سے شامل ارکان بحث کے دوران ذو معانی الفاظ کے درست معانی تک با آسانی رسائی حاصل کر رہے ہوتے ہیں جب کہ بحث کے درمیان میں شامل ہونے والے شخص کو چونکہ اُس بحث و مباحثہ کے بارے میں وہ معلومات

حاصل نہیں ہوتیں جو دوسرے ارکان کو معلوم ہیں۔ اس لیے بہت سی گفتگو سے وہ شخص نابلد ہونے کی وجہ سے گفتگو میں شامل مضمراتی اسلوب تک رسائی کے لیے اُس شخص کو جو گفتگو کے درمیان میں شامل ہوتا ہے اسے خارجی ماخذات اور حوالہ جات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں وہ اُس مباحث کے مضمرات اور مقاصد کو جان اور پہچان پاتا ہے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا قابل ہو پاتا ہے۔

واضح اور مضمراتی اسلوب میں فرق

(ہالیڈے، ۱۹۷۶ء) کہتے ہیں ''غالباً انسانی زبانوں میں صریحی اور مضمراتی اصطلاحوں میں فاصلے موجود ہیں۔ یہ فاصلے پہلو بہ پہلو موجود رہنے کی ضرورت ہے اس کی سادہ وجہ یہ معلوم کرنا ہے کہ گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان کے کچھ حصے مضمراتی جبکہ کچھ تصریحی ہو سکتے ہیں۔ عموماً زبانی گروہ وہ ہوتا ہے جو معنیاتی مفہوم پر انحصار کرتا ہے۔ جس قدر معانی واضح ہوں گے گفتگو اُسی قدر بامقصد ہوگی۔ (۱۱)

اس نقطہ نظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک لڑی میں موجود مضمراتی پن مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں کچھ زیادہ اور کچھ کم مضمراتی ہو سکتے ہیں ایسی حالت میں ان تدابیر کو سمجھ کر مقداری طور پر خالصتاً صریحی گروہ کی ترتیب کی جا سکتی ہے۔ مکمل مضمراتی اور مکمل صریحی اسلوب دو الگ الگ مقاصد لیے ہوتے ہیں۔ دونوں میں کسی ایک کی اکائی کو تبدیل کرنا یا اُس کی حالت میں تغیر لانے سے مضمراتی ذرائع اور تصریحی ذرائع کے متن میں معنویاتی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی بھی متن کی تشکیل میں یہ تدابیر اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس طرح مضمراتی تدابیر، اتصالی تدابیر کا حصہ ہیں۔ (ڈاکٹر رقیہ حسن، ۱۹۹۱ء) مضمراتی معانی کی تلاش نہایت منظّم طریقے سے ممکن ہے۔ جب اسموں کے درمیان معانوی رابطہ قائم ہوتا ہے تو تشریح ذرائع بہتر ہوتے ہیں۔ یہ معانوی رابطے Hyponymy, Synonymy ہو سکتے ہیں۔ یہ مترادف الفاظ تکرار اور انتشار کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔

مترادف الفاظ کے ذریعہ معانوی ربط کی تلاش اور تشریحاتی ذرائع کے درمیان تعلق کی نوعیت کا تعین ممکن ہوتا ہے۔ اس طرح خاصیت کے معیارات مقرر کرنے میں مدد ملتی ہے۔جن کا بنیادی مقصد معنویاتی رابطے کو قائم کرنا ہوتا ہے۔

کوئی بھی سامع جب تک ذیلی متن سے واقف نہ ہو موضوعاتی طور پر معنویاتی تشریح کے قابل نہیں ہوتا۔ اس تشریحاتی عمل کی پیچیدگی کو جاننے کے لیے ماہر لسانیات کو بہت سے معنوی تعلقات کے بارے میں جاننا ہوگا۔ جب کہ اس کے برعکس عام سامع اور بولنے والے کا کام صرف درست تعلقات کو اُستوار کر کے بات کو سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے ۔جس کے لیے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ بولنے والا اپنی زبان جانتا ہو اور سننے والا اُس زبان میں ادا کیے گئے الفاظ کے مطالب سے آگاہ ہو۔بعض اوقات الفاظ کے اُستواری تعلقات کی وجہ سے ہمیں اپنی خواہش کے مطابق نتائج حاصل نہیں ہوتے۔اس طرح پوشیدہ اور ظاہری معانی کا تعلق لسانیات کے باہر حالات اور واقعات پر ہوتا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ بالمشافہ ملاقات میں وضاحت کے لیے باہر کے ماحول کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔(۱۲) سامع اور مخاطب ایک مخصوص ماحول میں موجودگی اُن کی گفتگو کے معیار کو مقرر کرتی ہے۔اس لیے ''حالات'' اُن تمام تدابیر کا واضح کرنے والا عنصر ہے۔ جو گفتگو کرنے والوں کے درمیان زبان کے معیار ساخت اور اسلوب کو واضح کرتا ہے۔اس طرح سامع مخاطب کی گفتگو کے درست مفہوم کو سمجھ پاتا ہے خواہ اُس میں کس قدر مضمراتی استدلال سے کیوں نہ کام لیا گیا ہو۔

مادی صورت حال اور متن کے سیاق وسباق میں فرق کی بدولت الفاظ ہم معنی نہیں رہتے۔گفتگو کی ساختی ترتیب پر اگر چہ ماحول پر بہت کم اثر انداز ہوتا ہے۔عام سننے والے ان ماحولیاتی تناظر اور بصری روابط کے ذریعے گفتگو کو سمجھ لیتے ہیں۔ایسا دو وجوہات بات کی بنا پر ممکن ہوتا ہے پہلی وجہ پیغام کی بناوٹ ہے جو ماحولیاتی تناظر میں ضروری اشارہ فراہم کرتی ہے دوسری وجہ الفاظ کی معانویاتی ساخت ہے۔ جو متن کی جانب اشارہ کرتی ہے جہاں

سننے والی کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔اس کے ساتھ گفتگو کرنے والے کی جسمانی حرکات بھی معانی کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔اور سامع گفتگو کرنے والے کی جسمانی تبدیلیوں سے مدعا کو اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سننے والا جسمانی حالات سے جو پیغام کا اصل مدعا ہے وہاں تک رسائی حاصل کر لے بعض اوقات یہ معانی مبہم بھی ہو سکتے ہیں۔لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ پیغام کو معانی خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ماحول کا تناظر، بولنے والے کی جسمانی حرکات اور سامع کے بصری روابط پیغام کی وضاحت کے لیے ضروری عناصر ہیں۔ یہ وہ عناصر ہیں جو گفتگو کے مضمراتی تدابیر کو سمجھنے میں کردار ادا کرتے ہیں۔اور سامع تک مخاطب کا مدعا درست انداز میں پہنچ پاتا ہے۔

ماحولیاتی تناظر میں معانی کی شناخت

ماحولیاتی تناظر میں معانی کی شناخت میں اختلاف کا ایک دل چسپ پہلو یہ موجود ہے کہ اگر سامع ماحولیاتی تناظر سے بھی آشنا ہے اور بصری روابط بھی درست ہیں تب بھی بعض حالتوں میں پیغام مبہم رہ جاتا ہے جس کی مثال یوں ہے کہ اگر کسی سامع سے کہا جائے کہ ''کتاب کو مت ہاتھ لگانا''۔اس جملہ سے وہ مادی تناظر کی مدد سے کتاب کو شکل کو تو ذہن میں لائے گا لیکن اس کے باوجود سامع یہ نہیں جان پائے گا کون سا مواد اس کتاب میں موجود ہے جس کو چھونے سے اُسے منع کیا جا رہا ہے۔ پیغام مبہم ہونے کی وجہ سامع کا کتاب کے بارے میں محدود علم ہے۔ یہ ایک سادہ سا اشارہ ہے۔کہ یہ کتاب ہے ماحولیاتی تناظر میں اس بات کی وضاحت موجود نہیں ہوتی کہ کتاب کون سی ہے اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ نام یا اسم کسی بھی شے یا ہستی کی واضح نشاندہی کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔اس بات کا امکان ہوتا ہے مخاطب کے ذہن میں خاص معیارات ہوں جن کا اظہار بولنے والا واضح کرنا چاہتا ہے۔اس معاملے میں محض حالات کا تناظر بولنے والے کے مفہوم کی وضاحت کے لیے

کافی نہیں ہوتا۔اوپر دی گئی مثال میں بات ''کتاب کومت ہاتھ لگانا'' تک محدود ہے جب کہ سامع کے لیے اس میں کوئی واضح پیغام موجود نہیں ہے کہ وہ کن وجوہات کی بنا پر کتاب کو ہاتھ نہ لگائے جب کہ مخاطب کا مدعا جملہ کی تکمیل کے بعد ہی واضح ہوسکتا ہے۔''کتاب کو ہاتھ نہ لگانا، امی ناراض ہوگی''۔اس طرح محض حالات کے تناظر میں ادا کیا گیا جملہ بھی اس بات کی ضمانت نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ واضح معانی کے اظہار تک رسائی فراہم کرے گا بلکہ ماں کا کتاب کے ساتھ تعلق جملے کی معانوی ہیئت کو واضح کرنے میں مدد کرتا ہے۔تصوراتی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ کتاب ماں کی ملکیت ہے۔لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اُس کی ملکیت نہ ہواور محض سامع کو کتاب سے دور رکھنا مقصود ہو۔ایسی صورت حال میں پیچیدگی جنم لیتی ہے۔اور معنی کی درست رسائی تک راستے محدود ہو جاتے ہیں۔اس ضمن میں ضروری ہے کہ ہم ایسی معلومات سے مستفید ہوں جو مخصوص حالات کے تناظر میں کسی معاشرہ اور ثقافت میں سرگرمیوں کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی رہی ہوں۔ایسی صورت حال میں ان سرگرمیوں کو مثالی بنایا جائے۔یہ سرگرمیاں خارجی طور پر ایک خاص عکس کو ظاہر کرتی ہیں۔جو معانی کا اظہار کرتے ہیں۔(۱۳)

اس لیے مضمراتی تدابیر کے درست معانی تک رسائی کے لیے صرف دیکھنے اور سننے کے عمل کو ہی ضمانت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر سامع کی معلومات اُسے پیغام کے مدعا تک رسائی میں مدد دیتی ہیں۔اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ فرض کریں سامع ایک سرگرمی کو دیکھ نہیں پارہا۔تاہم اس حالت میں بھی وہ محض بات کو سن کر اُس کے مدعا کو سمجھ لیتا ہے اس کی مثال محلّہ کی مسجد سے آنے والی اذان کی آواز ہے جس کو سامع محض سُن کر ہی سمجھ لیتا ہے کہ موذن کا مدعا کیا ہے حالانکہ وہ بصری طور پر موذن کو دیکھ نہیں رہا ہوتا۔اس طرح معاشرتی تناظر میں وہ اُس آواز کا مطلب و مدعا سماجی حوالے سے خارجی طور پر جان لیتا ہے۔عام سامع اذان کے الفاظ پر غور کیے بغیر اور اُن کا درست مدعا اور مفہوم جانے بغیر بھی مسجد کا رُخ کرتا ہے کیونکہ وہ سماجی طور پر اس بات کو قبول کر چکا ہے کہ اذان، نماز کا اشارہ ہے۔یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایسا صرف سماجی طور وقوع پذیری

کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ بنیادی طور پر پیغام کی ساخت اور اذان کے اوقات سامع کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔ کہ وہ ایک خاص معاہدہ کے تحت اذان کے اندر مضمر پیغام کو سمجھ لیتا ہے۔ سامع کو خود ہی خارجی تدابیر کا ایک حصہ تشکیل دینا ہوتا ہے۔ جو اُس کو درست معانی تک رسائی دیتے ہیں۔ جس قدر سامع کی معلومات محدود ہوں گی اُسی قدر کے معنی تک رسائی کے ذرائع محدود ہوں گے۔

بعض حالتوں میں معانی تک درست رسائی میں ''اسم'' کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اسم میں ہونے والی ترمیم معانی تک رسائی کے عمل کو متاثر کرنے میں کردار ادا کرسکتی۔ جن کو درج ذیل مثال میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دیئے گئے فقرات میں اسم کی حالت پر غور کریں۔

۱۔ اِس خوبصورت ''شے'' کو دیکھو۔

۲۔ اِس خوبصورت ''تخلیق'' کو دیکھو۔

۳۔ اِس خوبصورت ''شخص'' کو دیکھو۔

۴۔ اِس خوبصورت ''لڑکے'' کو دیکھو۔

یہاں ''اسم'' کو چار درجات میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ''شے'' سب سے کم مختص جب کہ ''لڑکا'' سب سے زیادہ مختص ہے۔ اگر اس بات کو طے کرلیا جائے کہ سننے والا شخص دیکھ نہیں رہا اور ان چاروں کا پس منظر اور سماجی تناظر ایک جیسے ہیں۔ تو سامع جس جملے کے مفہوم کو واضح سمجھ پا رہا ہے وہ ''اُس خوبصورت لڑکے کو دیکھو'' ہوگا۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ''اسم'' بھی معانی کی فصاحت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ چاروں جملے معانی فراہم کررہے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ایک عام سامع شے، تخلیق اور شخص کے بامعانی ہونے کے باوجود ان کی درست شبیہ اخذ کرنے سے قاصر رہے گا۔ جبکہ ''لڑکا'' کی شبیہہ بغیر کسی اضافی سوچ و بچار کے اُس کو مدعا تک پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح سمجھ کا مکمل ہونا اور نامکمل ہونا معانی درست مفہوم تک رسائی اور عدم رسائی میں

اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس لیے اگر مضمراتی تدبیر نامعلوم ہو تو اُس کے اندر موجود معانی مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں۔جن کو ایک عام سامع یقین سے نہیں جان سکتا کہ آیا اُس نے کچھ خاص معلومات کو درست انداز میں حاصل کرلیا ہے یا نہیں۔انگریزی زبان کی واحد مضمراتی تدبیر ''The'' ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ کچھ معیارات ایسے ہوتے ہیں جو مادی شے کو مستقل شناخت عطا کرتے ہیں۔اُس شناخت تک رسائی کے لیے مادی حالت تک رسائی ضروری ہے اور یہ رسائی حقیقی معنی کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ کیونکہ مادی شے کے مکمل معانی اُسکے سیاق وسباق میں مضمر ہوتے ہیں۔سامع کے پاس جس قدر علم ہوگا۔وہ گفتگو کے درمیان کی صورت حال مخصوص تناظر سے اُسی قدر واقف ہونے کی بدولت اُس قدر معانی کی گہرائی اور گفتگو کے مدعا کو سمجھ پائے گا۔ایسا علم محض ماضی کے تجربات کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے۔پس مضمراتی معانی کی درست انداز میں سامع تک رسائی اُسی صورت میں ممکن ہو پاتی ہے جب اُس کے پاس ماضی کی گفتگو سے حاصل ہونے والے تجربات ک بنیاد پر موجود ہو، یہ تجربات پہچان کی دلیل ہیں۔یہ گفتگو کا عوامی معیار نہیں ہے۔مضمراتی تدبیر کی تشریح کا انحصار اسی مشترکہ علم پر ہے جو خارجی عوامل کو گفتگو سے خارج کر دے۔اس عمل کو { Resticted exaphoric } کا نام دیا جاتا ہے۔

اسم ضمیر علامت کے طور پر کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن ''میں اور تم'' کے علاوہ اس کو عموماً مستقل معانی دیئے جا سکتے ہیں۔علامتی اسم ضمیر اُس مضمراتی تدبیر کی مانند ہے۔جس کو سامع مادی شے تک رسائی کے لیے صاف طریقے سے سن کر سمجھ سکتا ہے۔اس کے ذریعے سے مضمراتی تدبیر کو سمجھنے میں اور اُس کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ مضمراتی تدبیر میں چھپے معانی تک رسائی کتنی آسان ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں عام طور پر مقرر کردہ مختلف معیارات مضمراتی تدابیر میں سے معانی کی وضاحت اور دریافت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔تمام معاملات کی تشریح کا انحصار مواقع اور ماحول پر بھی ہوتا ہے۔مضمراتی درجہ بندی ہمیں ایک نئی

جہت عطا کرتی ہے یہ تدبیر اشارہ فراہم کرتی ہے کہ اس کے اندر پوشیدہ معانی تک رسائی کس قدر آسان یا دشوار ہے۔ یہ، وہ، یہاں اور وہاں مضمراتی تدابیر کی اقسام ہیں تاہم اس کے برعکس میں، اور تم ممکنہ تدبیر تک رسائی فراہم کرتے ہیں۔ جو اپنے معانی کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں یہ ایک حوالہ کے طور پر معانی کی تشکیل کرتے ہیں ایسے حوالے وراثتی حوالہ جات کہلاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اسمائے ضمیر کے معانی زیادہ واضح ہوتے ہیں۔

اس طرح ''ان کے'' میں وراثتی مضمرات موجود ہیں۔ جو اُس کے نامیاتی بدل سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ یہ نامیاتی بدل ''ایک یا کوئی سا'' کی صورت میں موجود ہے۔ اگر ہم تین لوگوں کے نام الگ الگ لینے کی بجائے ''اُن''، یا ''وہ'' کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں تو وراثتی مضمرات کی مدد سے ہم ان زبانی متبادلوں کو آسانی سے سمجھ پاتے ہیں۔ تمام اسما کے علاوہ افعال کی صورت حال تبدیل ہوتی ہے کیونکہ اکثر افعال ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے متبادل دستیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے اُن کے الفاظ میں تبدیلی اُن میں معنوی تبدیلی کو جنم دیتی ہے۔ اسم میں متبادل اپنے معانی کو واضح کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے سامع کو متبادل کے ذریعے اسم کی شناخت میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

گفتگو کے بہت سے ایسے پہلو ہوتے ہیں جو سامع کو گفتگو کا مدعا سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق یہ بات سچ ہے ''وہ اور اُن'' ایسی مضمراتی تدابیر ہیں جن کا الگ الگ مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے تھوڑا سا شک جنم لیتا نظر آ رہا ہے۔ کہ کیا اسم ہی واضح اشارہ فراہم کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہے؟

دوسرا حصہ جو معانی اخذ کرنے کا باعث بنتا ہے وہ شے کی اندرونی خصوصیات کی مدد سے ظاہر ہوتا ہے تبدیل شدہ اسم ہی یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ معانی کی جانب واضح اشارہ فراہم کر سکے۔ اس اشارہ کی مدد سے مزید تشریح ممکن ہوتی ہے۔ مگر اس امر کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ مضمراتی تدبیر کے اندرونی سطحی عناصر کو پہچان سکیں۔ جو ہمیں مضمراتی وراثت کی ایک خاص سطح تک رسائی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

محض مضمراتی تدابیر ہی ضروری نہیں کہ معانی ومفہوم تک مکمل رسائی کا ذریعہ ہوں۔اس کے ساتھ ہمیں خارجی تدابیر کی طرف بھی توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے جس سے مزید بحث کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ خارجی تدابیر کو ایک خاص پیمانے پر ترتیب دے کر معانی کے اعتبار سے درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ خارجی اور مضمراتی کی اصطلاح عام اور خاص کی اصطلاح کے متوازی چلتی ہیں۔جتنی زیادہ تدبیر مضمراتی ہوگی اتنے کم یعنی مخصوص معانی پیدا کرے گی۔ جبکہ اس کے برعکس جتنی خارجی تدبیر زیادہ ہوگی اُس قدر معنی بھی عمومی پیدا کرے گی۔تاہم یہ فاصلہ واضح نہیں ہوتا۔مگر دونوں میں خاصیتی فرق موجود ضرور رہتا ہے۔

جیسے جیسے ہم گفتگو کے تسلسل کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔عمومیت میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔اور معانی کی خاصیت اور خصوصیت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جو عمومی سے خصوصی معانی کی طرف اشارہ ہے یعنی ابتدائی طور پر گفتگو خارجی پہلوؤں کے لیے ہوتی ہے لیکن بعد میں مضمراتی تدبیر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ''شے'' کو زبان میں سب سے عام مضمراتی تدبیر کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔جس کا اظہار دوسری اشیاء کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔مضمراتی تدبیر کی وضاحت کے لیے مخاطب کو خود اُن مضمراتی معانی کا پتہ ہونا ضروری ہے۔تبھی یہ ممکن ہے کہ وہ سامع تک اپنی بات کو واضح انداز میں پہنچا سکتا ہے۔ چونکہ مخاطب پر معانی مکمل واضح ہوتے ہیں۔اس لیے وہ سامع سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اُس کی بات کو درست سمجھ سکے گا۔اس کی مثال کمرہ جماعت میں دیئے جانے والے لیکچر کی ہے جس کو معلم خوب تیار کرنے کے بعد جب کلاس میں طلباء کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس یقین کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ طلبا اُس کی تدریس کو سمجھ پائیں گے جبکہ ایسا معلم جس کو اپنے سبق پر مکمل عبور نہیں تو وہ طلباء سے یہ توقع ہرگز نہیں کرسکتا کہ طلباء اُس کی بات کو سمجھ کر مدعا کو جان پائیں گے۔

اگر ''شے'' کے بارے میں مخاطب کے پاس خود واضح معلومات نہیں ہیں تو وہ مخاطب کو اکساتی ہے کہ وہ اُس شے کی جانب اشارہ کر کے سامع کی توجہ اُس جانب مبذول کرائے۔اس طرح وہ مظہر کو استعمال کر کے معانی

کی جانب سامع کو اشارہ فراہم کرتا ہے۔پس اس شے کو معانی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔اگر بولنے والے کی دونوں کیفیات ایک وہ جس میں وہ شے کے بارے میں واضح معلومات رکھتا ہے اور دوسری وہ جس میں وہ شے کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتا۔اگر ان دونوں کا موازنہ کیا جائے تو دوسری کیفیت میں معانی کے اظہار کا انحصار حوالاتی معیار میں مضمر ہوتا ہے۔اُس کو متن کا عمومی حصہ گردانا جا سکتا ہے۔

معنویاتی اسلوب

ڈاکٹر رقیہ حسن خاص معنویاتی اسلوب ایسے اسلوب کو قرار دیتی ہے جو تعلیم یافتہ مڈل کلاس بولنے والے خارجی انداز کے طور پر اپناتے ہیں۔ان کا یہ دعویٰ دو مشاہدات کی بنا پر ہے۔پہلا یہ کہ نظامِ زبان اس امکان کی اجازت دیتا ہے کہ خاص ماحول میں چند مخصوص مضمرات کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔جبکہ دوسرا مشاہدہ یہ کہ زبان کا نظام اپنے اصولوں سے خود انحراف نہیں کر سکتا۔اس لیے اگر معنویاتی اسلوب مخصوص ہو تو بات کہنے یا زبانی گفتگو کا انداز فطرتی طور پر اُس ماحول سے مجبور ہوتا ہے جہاں یہ اسلوب استعمال ہو رہا ہے۔اس مخصوص مضمراتی معنویاتی اسلوب کو اُسی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

منطقی تبدیلی دو عوامل کی پیدا کردہ تبدیلی ہوتی ہے۔ایک گفتگو کے دوران تبدیلی کا وقوع پذیر ہونا دوسرا بے ربط اختلاف اور پیدا ہونے والا پیش منظر جس کا اظہار پس منظر ظاہر کرتا ہے اور یہ عامل گفتگو اور سماجی منطقی تبدیلی پر زور دیتا ہے۔گفتگو جس طرح تغیر اور مماثلت کی خاصیت رکھتی ہے اسی طرح ثقافت بھی توازن اور تبدیلی کی خاصیت رکھتی ہے۔لسانیات اور سماجی نمونہ کی شناخت، گفتگو اور ثقافت کے مخصوص تعلقات کی وجہ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ایسے الفاظ جو تکرار سے استعمال ہو رہے ہوں یا جو الفاظ ایک سے زائد معانی رکھتے ہوں ایسے الفاظ کے درست معانی تک رسائی کے ضمن میں ان الفاظ کا شناسا بھی بعض اوقات حیران رہ جاتا ہے۔کیونکہ سطحی

طور شناسائی مشکوک پیچیدگیوں کی گہرائی تک رسائی کو ممکن نہیں بناتی۔ان مسائلکی ایک وجہ ہمارے عقائد ہیں جن کو لسانیات شاخ درشاخ بیان کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔مگر دیگر عقائد سے وابستہ لوگوں کے لیے پیچیدگی اور الجھاؤ میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔(۱۴) انسانی گفتگو کی تمام اقسام میں عمومی گفتگو سب سے زیادہ شناسا ہے۔ ایسی زبان جو عام طور پر گفتگو کے لیے استعمال ہو عمومی زبان کہلاتی ہے۔اس میں یہ مسئلہ اہم نہیں رہتا کہ ہماری سماجی حالت کیا ہے جب تک ہم گفتگو میں باقاعدہ حصہ لیتے رہیں گے اُس وقت تک ہمارے لیے گفتگو شناسا رہے گی۔اس کی مثال دو دوستوں میں ہونے والی گفتگو ہے۔ہمارا دوست ایک وقت میں گفتگو کا ایک انداز اپناتا ہے تو دوسرے موقع پر گفتگو کا انداز یکسر بدل لیتا ہے۔لیکن یہ مسئلہ ہمارے یقین کو متزلزل کیے بغیر ہمیں دوست کے ساتھ گفتگو میں مشغول رکھتا ہے۔لیکن یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ بات چیت کے ان وسیع اختلافات کو کیسے سمجھا جائے اور ان کی پیدائش کیونکر ممکن ہو۔اس سلسلہ میں (بختن ۱۹۶۰ء) کا یہ دعویٰ کہ ''الفاظ کا مخصوص ڈھانچہ مستقل نوعیت پر قائم رہتا ہے'' ہماری رہنمائی کرتا ہے اس لیے ہمارا پختہ یقین ہے کہ تمام قسم کے معاملات میں ہماری گفتگو ماحول اور مشاہدے سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔جبکہ زبان کے استعمال میں ہر ادائیگی منفرد حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔مگر یہ مشاہدہ اصل الفاظ کے تغیر اور مستقل حیثیت کی وضاحت نہیں کر سکتے۔اس لیے بات چیت کے عمل میں مماثلت اور تغیر کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔یہ ایک سادہ سے تکنیکی نوعیت کی وضاحت ہے۔گفتگو اور تغیر پر بحث کے دوران ہمیں اس بات پر توجہ دینا ہو گی کہ اس گفتگو کے دوران اصطلاحات کا معیار برقرار رہے اور ان کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہ ہو۔(ڈاکٹر رقیہ حسن ۱۹۹۹ء)

(Basil Brinston ۱۹۹۰ء) کے مطابق الفاظ میں مراعائی اصطلاح موجود ہوتی ہے۔پس بغیر کسی دشواری کے ہر شخص گفتگو کرتا ہے۔اس میں حیرانی کی بات نہیں گفتگو کے شعبے کی اصطلاحات کی اہمیت میں گوناگوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔اور اب اصطلاحات شاخ درشاخ تقسیم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔اس بات میں شاید کم ہی

اختلاف پایا جاتا ہو کہ جہاں تغیر پایا جاتا ہے وہاں قیمتوں کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا۔ اسی لیے ادھار لی گئی اصطلاحات اسی طرح کے نظریات کی حامل ہوتی ہیں۔ (ہنری وڈسن ۱۹۹۵ء) فطرتی گفتگو پر تجزیہ کرتے ہوئے گفتگو میں تغیر کے ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ''ہنری وڈسن'' کے مطابق گفتگو میں پیش رفت کے لیے واضح تصور کی موجودگی پر زور دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ارادہ اور اختلاف کو بھی وہی معیار دینے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جو معیار نظریہ کے باقی تصورات کو دیا جاتا ہے۔ (فرتھ، ۱۹۵۷ء) کے مطابق مدلل معیار جو سمجھدار معلم کے ذریعہ پیش ہوتا ہے بہت متاثر کن ہوتا ہے۔

سماجی لسانیات میں تغیر ایک عام اصطلاح ہے لیکن اس کا گہرائی سے مشاہدہ لسانیاتی عمل میں استحکام اور اختلاف کو واضح کر دیتا ہے۔ ہم عمومیت اور ہم آہنگی کے معانی پر توجہ مرکوز کر کے ہی تغیر کے معانی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تغیر اور ہم آہنگی معمولی نوعیت کے ہونے کی وجہ سے ظاہری طور پر اختلاف کو پوشیدہ رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رقیہ حسن تغیر کو ہم آہنگی کی ہی ایک قسم قرار دیتی ہیں۔ جو مختلف سماجی گروہ کے اراکین کے لیے معیاری اختلاف کو ظاہر کرتی ہیں۔

اپنے خطاب کے دوران جولیمکے نے اٹھائیسویں بین الاقوامی فرائضی زبانیات کے اجلاس میں کیا۔ اسی خطاب میں فن کے حقائق کی پیداوار پر لیمکے نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ لیمکے کے مطابق بے ربط ہم آہنگی فن کے حقائق سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ ربط وقت کے قابلِ فہم فاصلوں میں قائم ہو جاتے ہیں۔ بے ربط ہم آہنگی کو فطری طور پر شناخت کے لیے ایک جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''شیکسپیئر کی سانیٹ'' اس کی مثال ہے۔ جس میں با آسانی ذیلی معاشرے کی پہچان موجود ہے۔

اس سانیٹ کی وجہ سے مغربی ادب کی روایات کو فروغ حاصل ہوا۔ شیکسپیئر نے جب اپنی پہلی سانیٹ تحریر کی تو اُس کی سلطنت وسیع ہو گئی۔ اُس دور میں ہر ایسی گفتگو جو سادگی سے ذرا ہٹ کر معیار کی حامل ہو اُسے سانیٹ

کا نام دیا جانے لگا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ سانیٹ کا معیار مزید مستحکم ہوتا چلا گیا۔ اور یہ مخصوص خیالات کے حامل ادب کا مجموعہ قرار پائی۔ اس طرح ساخت کے لحاظ سے بھی اس نے اپنی اہمیت کو قائم کیا جس کے باعث اب یہ ایک واضح اور قابلِ شناخت قسم کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ عام طور پر ترقی یا نشو ونما پانے کا یہی طریقہ گفتگو کی دیگر اقسام پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ مثلاً خرید وفروخت کرتے ہوئے جو اتفاقیہ گفتگو وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اُس میں بھی خاص قسم کی یقینی اور قابل شناخت علامات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جسے فوراً لوگوں کی مناسب اکثریت شناخت کرنے میں دشواری محسوس نہیں کرتی۔ اس قسم کی واضح اور قابل شناخت گفتگو میں مزاحمت اور ہم آہنگی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ پختگی اور تنسیخ کی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو یا تو معاشرے میں راسخ حیثیت سے مستعمل ہو جاتے ہیں۔ یا اپنی وقعت اور اہمیت کو کھو دینے کے سبب ماضی کی بھول بھلیوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔

گفتگو کے تغیراتی پہلو

ہم آہنگی کا عنصر گفتگو کے طویل العمر حصہ ہونے کی اہلیت کو ثابت کرتا ہے۔ جبکہ مزاحمت اس کے برعکس جلد ختم ہو جانے والے عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ انسانوں کی اکثریت ٹکراؤ سے گریز کی جانب جھکاؤ رکھتے ہیں۔ اس لیے اسی گفتگو کو اپنایا اور پسند کیا جاتا ہے جس میں اختلاف کی بجائے اتفاق اور انحراف کی بجائے ہم آہنگی کو اپنایا جائے ایسی گفتگو کو مستحکم انداز اور فیصلہ کن قرار دیا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کی مناسبت سے معیارات کو بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ مثلاً جس قسم کا معاشرتی انداز تکلم ہوگا معیار گفتگو میں شائستگی اور غیر شائستہ پن میں واضح فرق محسوس ہوتا چلا جائے گا۔ پس معاشرہ زبان کا معیار کا مقرر کرنے کی مکمل اہلیت اور اختیار رکھتا ہے۔ جو گفتگو کے معیار کو معروضی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اس لیے گفتگو کے عمل کے دوران ہم آہنگی اور اختلاف کے پس منظر میں

معاشرتی معقولیت کا عنصر کارفرما ہوتا ہے۔اور منسلکہ معاشرہ ہی گفتگو کے معیار کو قائم کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ان مشاہدات کی روشنی میں ڈاکٹر رقیہ حسن تجویز کرتی ہے کہ ہم کو غور کرنا ہوگا کہ چیزیں ہمارے معاشرے میں کیسی ہیں؟ اس میں دورائے نہیں کہ اشیاء دوطرح کی کسی معاشرے میں موجود ہوتی ہیں۔ یا تو اُن کی نوعیت عمومی ہوتی ہے یا دوسرے وہ انقلابی نوعیت کی حامل ہوسکتی ہیں۔ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق نظریاتی شکوک وشبہات اور ذاتی دلچسپیاں کسی چیز کی اہمیت کا تعین کرتی ہیں۔ کہ وہ کس قدر اہم یا غیر اہم ہے۔ ہر انسان کا نظریہ، سوچنے کا انداز اور سمجھنے کی صلاحیت انفرادی ہوتی ہے اور دوسرے سے موافقت کا پایا جانا ضروری نہیں۔اس لیے ہم آہنگی کا حصول دشوار ہو جاتا ہے مگر انفرادی طور پر انسان کا نظریہ خواہ کچھ بھی ہو مگر گفتگو میں اگر معقولیت کا عنصر پایا جائے گا۔ تو ہم آہنگی کا حصول ممکن ہے۔اوراس طرح انفرادی ضبط کو ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تغیر کی کچھ اقسام پیدائشی طور پر لاگو ہوتی ہیں۔ (جیک سن) کے خیال میں تغیر انسانی انفرادیت کی بقاء کا مضمراتی عنصر ہے۔اگر انفرادی تغیر کو مٹا دیا جائے تو زبان پھیکی اور بے معنی سا ہو کر رہ جائے گی۔ایک انسان کے اصول دوسرے کے لیے متغیر ہو سکتے ہیں روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی گھر میں ایک طرح سے پرورش پانے والے بہن بھائیوں کے خیالات اور اعمال میں واضح تغیر موجود ہوتا ہے۔اکثر اوقات یہ تغیر خواہشات کے ٹکراؤ کی صورت میں جنم لیتا ہے۔مگر چند اصول یا ضوابط ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں معاشرتی طور پر شدید اختلافات کے باوجود ہم آہنگی کا عنصر ابھر کر سامنے آتا ہے۔اگر مزاحمت اور ناگہانی طاقت وقوع پذیر ہو تو انفرادی اختلافات کو بھلا کر ہم آہنگی کو اپنا لیا جاتا ہے۔اور گفتگو کے عمل میں معروضی حقیقت پر زور دے کر معاشرے میں مناسب رویے تشکیل دیئے جاسکتے ہیں۔

عام اصطلاح میں تغیر اور ہم آہنگی ایک دوسرے کی ضد کے طور پر آتے ہیں۔موجودہ حالات میں تبدیلی جو نئی تبدیلیوں کو جنم دے سکتی ہے تغیر کے نام سے جانی جاتی ہے۔ جب کہ معاشرتی اقدار کے ساتھ رچ بس جانا اور

معاشرتی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کا نام ہم آہنگی ہے۔ہم آہنگی کی طرح تغیر کی بھی مخصوص اقسام کے درمیان ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔متغیر مضامین عارضی حقائق پر زور دیتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ایک مضمون میں موجود ہم آہنگی یا تغیرات دوسرے مضامین میں بھی یکساں طور پر موجود ہوں ان میں واضح اختلاف کی صورت بھی موجود ہو سکتی ہے۔مضامین عام طور پر بحث کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔اس طرح بغور مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ کچھ ہم آہنگ مضامین میں تغیر کی موجودگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ہم آہنگی بھی ایک معانی خیز تصور پیش کرتی ہے۔ جبکہ تغیر تبدیلی کی قوت کے طور پر موجود ہوتا ہے۔

(لیبو ین،۱۹۶۶ء) نے تغیر کے تصور کو کیفیتی اختلاف کے ساتھ پیش کیا۔لیبو ین کے کام میں تغیر کے معنی خیزی ہونے اور لسانی تغیر کی اقسام پر بھی بحث کی گئی ہے۔لیبو ین (ہائمس) کی تقاریر کی مثالیں دے کر داخلی تغیر کی وضاحت کرتا ہے۔جس کی مزید وضاحت (ہالیڈے) نے سماجی عمل کی تمام اقسام میں داخلی تغیر کی مماثلت کے حوالے سے کی داخلی تغیر کا مقام لیبو ین کے ہاں سماجی لسانیات میں مبہم رہتا ہے۔ بے ربط گفتگو کے دوران بہت سی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔اقتباس کی بناوٹ کو سمجھے بغیر بے ربط اختلاف کی مختلف اقسام کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار کام ہے۔سماجی لسانیات کا یہ عمل مشکلات کو جنم دیتا ہے۔اس لیے بے ربط گفتگو کو سمجھنے کے لیے اقتباس کی بناوٹ،اور غالب سماجی گروہوں کے رویوں کو سماجی لسانیات کی مضبوط روایت کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ کیونکہ غالب سماجی گروہ کے رویے دوسرے مغلوب گروہوں کے رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس کی مثال (Coupladeletion) کی اصطلاح سے ثابت ہو جاتی ہے۔ Coupla ایک اصول ہے لیکن اس اصطلاح کو محض انگریزی زبان بولنے والوں کا غالب گروہ استعمال کرتا ہے۔کسی ایک خاص سماجی گروہ میں ہونے والی بے ربط گفتگو میں اختلاف اور بے ربطی نہیں پائی جاتی۔اس لیے ضروری ہے کہ بے ربط اختلاف کا تجزیہ کرتے ہوئے اس قسم کی غلط فہمی سے بچا جائے۔اور واضح سوچ اور سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تا کہ مدلل انداز میں تجزیہ کیا جا سکے۔

معانی میں تبدیلی کی وجوہات

''ہالیڈے'' نے اپنے نظریے (SFL) میں اصول وضع کیا ہے۔ جس کے ذریعے معانی تبدیلیوں کی وجوہ کو معلوم کر کے ان تبدیلیوں کی اقسام کے ددرمیان امتیاز کو واضح کیا گیا ہے۔ اپنے نظریہ کی حمایت میں دلائل پیش کرتے ہوئے ''ہالیڈے'' نے زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کو ایسا عمل قرار دیا ہے جو زبان کے استعمال کے دوران اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوران گفتگو حوالہ جات کا استعمال زبان میں مزید تغیرات پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہالیڈے کے نزدیک زبان کو استعمال کرنے والا ہی اس میں تغیر کا باعث قرار پاتا ہے۔ (۱۵)

''ہالیڈے'' کے نظریہ کے مطابق زبان کو استعمال کرنے والوں کی کئی اقسام اور گروہ معاشرے میں موجود ہوتے ہیں ہر گروہ دوسرے سے مختلف اقدار اور رویوں کا حامل ہوتا ہے۔ یہ اقدار کا اختلاف منطقی تبدیلی کا نقطہ آغاز ثابت ہوتا ہے۔ لفظ منطقی میں جو وسعت ہے اس کو اکثر سماجی زبانوں کے ادب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ زبان کے استعمال میں ہونے والے اختلاف کو اسی منطقی تبدیلی کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مختلف حرکات جو زبان کو استعمال کرنے میں استعمال ہوتے ہیں بعد میں یہی محرکات زبان میں تغیر کا سبب بنتے ہیں۔ (ہالیڈے SFL) میں اس تغیر کو تنقیدی تغیر کے نام سے درج کرتے ہیں۔ تغیر کا یہ اصول علامتی طور پر جانا جاتا ہے۔ (گریگوری، ۱۹۶۷ء) تغیر کی ان دونوں اقسام منطقی اور تنقیدی تغیرات کو بہت اہم قرار دیتے ہیں۔ (۱۶)

تنقیدی تغیر

تنقیدی تغیر میں سیاق وسباق بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ ناقابل شناخت سیاق وسباق لسانیاتی عمل کو گمراہ کر سکتا ہے۔ لسانیاتی تراکیب اور بناوٹ اگرچہ اس قدر سادہ بھی نہیں کہ سیاق وسباق کی وجہ سے یہ متاثر

ہو۔مگر اس بات میں دورائے نہیں کہ بغیر سیاق وسباق کے لسانیاتی عمل ادھورارہ جاتا ہے۔درحقیقت سیاق وسباق کا لسانی تغیر کے ساتھ مضبوط تعلق ہے۔معاشرتی حالات جو موجودہ گفتگو کے ماحول کو متاثر کرتے ہیں اُن کا زبان اور متن کے ساتھ تناظراتی تعلق ہوتا ہے۔ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق یہ تعلق قریبی نوعیت کا ہوتا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زبان کے نظام کا ثقافت کے نظام سے گہرا ربط اور تعلق ہے۔(ہالیڈے،۱۹۹۲ء)

سیاق وسباق کا گفتگو کے موضوع سے منسلک ہونا زبان کے اقتباس پر مضبوط تعلق کا اظہار ہے۔گفتگو کا زیادہ تر انحصار سماجی حالت پر ہوتا ہے۔حالات کے سیاق وسباق میں اقتباس خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔کسی بھی تغیر کے لیے ضروری ہے کہ سماجی حالات میں مناسب تبدیلی آئے۔اُس تبدیلی کے ردِعمل میں مخصوص حالات جنم لیتے ہیں۔زبان کی ادائیگی کا تعلق براہ راست ان حالات سے ہوتا ہے۔اس لیے الفاظ کے معانی حالات کے پیش نظر ہی سامنے آتے ہیں۔ہالیڈے کا یہ دعویٰ اس لیے اہمیت کا حامل ہے جب سیاق وسباق طاقت ور ہو اور گفتگو میں اس کی اہمیت موجود ہو۔مضمون کی فطرت کے بارے میں لسانیات میں بہت کچھ موضوع بحث رہ چکا ہے۔اس سلسلہ میں ساختیاتی لسانیات کے ضمن میں ادبی مواد موجود ہے۔خیالات کسی بھی موضوع پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔لسانیات کا عمل کسی کی رضا مندی یا ناراضگی کا محتاج نہیں ہوتا۔اس تناظر میں گفتگو سہ فریقی صورت حال اختیار کرسکتی ہے۔جس میں ہر فریق سرگرم رکن کا کردار ادا کرتا ہے۔جو متن کی بناوٹ میں اہم ہوتے ہیں۔پس یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ گفتگو کو سمجھنے کے لیے سماجی حالت کی مخصوص تاویل کو جانا جائے۔اور یہ سب زبان کے استعمال کی وجہ سے ممکن ہے۔معاشرہ گفتگو کا پہلا میدان ہے۔سماجی تعلق کی وجہ سے زبان کو معاشرتی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے۔اور گفتگو سماجی تعلق ہے جو انسانوں کے درمیان قائم ہے۔جن کی بدولت وہ ایک دوسرے کا مدعا سمجھنے کے اہل ہوجاتے ہیں۔متن کی زبان بولنے اور سننے والوں کے درمیان علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔اس عمل میں چند اہم نکات غور طلب ہیں۔کہ آیا سننے اور بولنے والے دونوں حاضر ہیں

یا مخاطب حاضر ہے اور سننے والا غائب ہے۔ مخاطب حقیقی ہے یا غیر حقیقی، گفتگو کا طریق کار کیا ہے۔ گفتگو کا عبور اس بات کی یاد دہانی کراتا ہے۔ کہ ثقافتی اور نظریاتی سرگرمیوں کے تناظر میں گفتگو کرنے والے کا مدعا کیا ہے۔ خاص طور پر موضوع کے ارتقائی تصور تک رسائی کے لیے ذہن کے اندر جاری رہنے والی باتیں بھی خاص سماجی عوامل کے زیر اثر ہی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات زبان کے استعمال کی بنیاد افلاطون کے نظریہ(Organon modelle) کو قرار دیتے ہیں۔

''ہالیڈے'' SFL میں موضوع کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ'' موضوع پیچیدہ ثقافتی نظام کا حصہ ہونے کے باوجود لسانی تاویل نہیں ہوتا۔''(۱۷) متن کی تخلیق اگر مکمل ہم آہنگی کے ساتھ نہ ہو تو اصول موضوع پر عملدر آمد اور نہیں ہوسکتا۔ موضوع کے تینوں اجزا بولنے والے کی ممکنہ گفتگو کے دوران ہونے والی تبدیلیوں کے عکاس ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تبدیلی، بیان کی صلاحیت سے زیادہ حالات کے تناظر میں مضمر ہے۔ زبان کی خارجی سطح پر لسانیات کے تین سطحی نظام کارفرما ہیں۔ ان کی تکمیل میں ٹھہراؤ ہونا چاہیے۔ زبان کے نظام کی وضاحت ہالیڈے چار درجات کے زیر اثر واضح کرتے ہیں۔ وہ سب سے زیادہ اہمیت اُن عوامل کو دیتے ہیں جو سماجی عمل کا حصہ ہیں اور لسانیات کو ان عوامل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہالیڈے کے نزدیک'' ایسا کوئی سماجی عمل نہیں ہے۔ جس کو بیان نہ کیا جا سکے۔''(۱۸) اور یہ عوامل متن اخذ کرنے کے عمل سے منسلک نہیں ہوتے۔ ہالیڈے کا یہ دعویٰ قطعی حیثیت کا حامل نہیں ہے۔ بعض حالات میں یہ دعویٰ درست بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات یہ غلط بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ہالیڈے کا یہ دعویٰ بے ربط اور دلائل سے عاری ہے۔

ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق ہر متن میں دو صفات کا پایا جانا ضروری ہے۔(۱۹)

۱۔ مواد۔ جو متن کی ساخت اور حالات کے تناظر میں اپنے وجود کا اظہار کر سکے ہر متنی مواد الگ ہوتا ہے۔

۲۔ ڈھانچہ۔ متن کا ڈھانچہ ظاہری محل وقوع میں ہونے والی تبدیلیوں کا عکاس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رقیہ حسن متن کے مواد کے لیے متن کی ''ساختی اہلیت'' کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔ سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے متن کے ڈھانچہ اور مواد میں ہونے والی تبدیلیوں کو ساختی تصور تبدیلی کی ایک خاص قسم قرار دیتی ہیں۔ ساختی اہلیت کا نظام ہمارے سامنے متون کی کئی اقسام کو پیش کرتا ہے۔ ساخت کے بنیادی اور ثانوی عناصر کی اس نظام کے ذریعہ نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس نظام میں درجات کے درمیان فرق ترتیب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو متحرک نظریہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس ترتیب کے عناصر میں تسلسل، لازمی عناصر کی وقوع پذیری اور ان عناصر کا ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص جگہ پر منسلک ہونا ضروری ہے یہی خاصیت قدرتی طور پر پہچان کا معیار کا مقرر کرتی ہے۔

متن کے اندر تبدیلی اور گفتگو کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والے سوالات میں تبدیلیوں کے لیے یہ معیارات بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ تغیراتی تبدیلی کا یہ تجزیہ اس بات کا عکاس ہے کہ معیار متن میں مخصوص تنقیدی تبدیلی اور عمومی تبدیلی کے اصولوں میں اتصال اور تسلسل کو قائم رکھتا ہے۔ اس اتصال کو لغت میں ربط کے توسط سے سمجھا جاسکتا ہے۔ (کلورونی، ۱۹۹۹ء)

متن کے ساختی طرز میں تسلسل معانی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور اس کی مدد سے ہمیں متن کی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح متن ساختی تبدیلیوں کو اپنانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جس سے متن کی ساخت کے لچکدار ہونے اور قابل فہم ہونے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

متن میں معانی کی وضاحت کا تعین نہ تو کسی اندرونی جبلی قوت اور نہ ہی کسی بیرونی طاقت کی وجہ سے مسلط کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ صرف معاشرے کے ارکان ہی کسی متن کے معانی کے تعین کی وجہ بن سکتے ہیں۔ معاشرتی انداز سخن ہی معانی کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس کی مثال بچپن میں سنی جانے والی کہانیاں اور عام خرید و فروخت میں استعمال کیے جانے والے الفاظ ہیں۔ بچپن میں سنی جانے والی کہانیوں کے معانی اور مطالب یقیناً

خرید وفروخت کے لیے استعمال کی جانے والی زبان کے الفاظ کے معانی سے مختلف مفہوم رکھتے ہیں۔ایک طرف ہم تخیلاتی سطح پر معانی اور مفہوم کو لے جاتے ہیں جب کہ دوسری حالت میں ہم حقیقی دنیا میں معانی اور مفہوم کا ادراک کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن یہ دونوں حالات ایک ہی معاشرے کی دو متضاد صورتوں کی عکاس ہونے کے باوجود معاشرتی انداز گفتگو ان دونوں تضادات کو قبول کرتا ہے۔اس لیے معاشرہ دونوں صورتوں میں کچھ خاص معانی لغت میں شامل کر لیتا ہے۔تا کہ سرگرمی کو ممکن بنایا جا سکے۔

تنقیدی تبدیلی کا انحصار لازمی عناصر کی ساخت پر ہوتا ہے۔معاشرتی طور پر ایسے معنی کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کو لازمی عنصر کے طور پر تسلیم کیا جا سکے۔اور معانی تنقیدی تبدیلی کے ساتھ تعلق بھی رکھتے ہوں۔متن کا تسلسل کسی بھی تنقیدی تبدیلی کے عمل میں اُس وقت ممکن ہے جب متن کے معانی اور مفہوم کو معاشرتی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔محض فرہنگ کی تبدیلی یا الفاظ کی تبدیلی مقصود نہیں۔ بلکہ اصطلاحی مفہوم کو بھی مدِ نظر رکھنا بے حد ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ جب الفاظ کا یہ چناؤ مخصوص تسلسل میں قائم ہو جاتا ہے۔تو ثانوی سطح پر عناصر کا اختلاف کسی بھی تبدیلی کا تعین کر سکتا ہے۔(۲۰)

یہ تبدیلی کسی بھی متن میں اچانک رونما ہو سکتی ہے پس ثانوی عناصر میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے اتصالی اور لغتی عناصر کو خود مختار نہیں بنایا جا سکتا۔ایسے عناصر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی متن میں ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکیں۔(۲۱) ہالیڈے تجویز کرتے ہیں کہ نثری پیرا گراف، گرامر اور عمدہ ترتیب بھی اظہار زبان کا ذریعہ ہیں۔لسانیاتی نظام میں متن خاص فطری طریق گفتگو ہے۔اظہار اور گفتگو کا مخصوص دائرہ کار متن کہلاتا ہے۔متن کے مسائل اُس وقت سامنے آتے ہیں جب اس کی اصل روح کو واضح کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے جس سے مسلسل رابطوں کا دائرہ کار متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

تغیر بولنے والے کی کرداری خاصیت کا اظہار ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں ضابطہ کی تشکیل ہوتی ہے۔اگر چہ

متن کے عناصر باضابطہ طور پر ایک کلیہ پیش کرتے ہیں جن کی بنیاد مخصوص معاشرتی اصولوں پر رکھی جاتی ہے ان میں بے ربط اختلافات اور بے ربط تسلسل تنقیدی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔ اسی وقت ہم تغیر کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں کہ تبدیلی کہاں واقع ہو رہی ہے۔ اس قسم کے استدلال نظام میں نزاکت کا عنصر بھی شامل رہتا ہے۔ جو گفتگو کی بنیاد فراہم کرتا اور سیاق وسباق کے اجزا کی اہمیت کو اجاگر کر کے مخصوص حالات میں اظہار کو ممکن بناتا ہے۔ ایسے متون کو عام طور ساختی متن سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ اپنے خاصیت کی وجہ سے انفرادی گفتگو تک محدود رہتا ہے۔

عام طور پر متنی اقتباس کے لیے استعمال ہونے والی زبان کے طریق کار کو ساختیاتی سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے اکثر پہلو انفرادی سطح کی بات چیت کے لیے مخصوص گردانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر خرید وفروخت ایک عام سرگرمی ہے جس کے دوران ہونے والی گفتگو کا متن اقتباس کی حیثیت رکھتا ہے۔ خریدی جانے والی اشیاء تک خواہ سبزیاں ہوں، گوشت ہو یا دیگر اجناس تمام گفتگو کا حصہ ہوتی ہیں۔ گرامر کی سطح پر ایسی حالت مجوزہ ہے یہ ایک ایسا نظام ہے جو اکثریت پر لاگو ہوتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس نظام کی خصوصیات اس کی ساخت پر منحصر ہوتی ہیں۔ چونکہ اس کی ساخت کی تشکیل میں لوگوں کا اکثریت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے اکثریتی گروہ کی ساخت انصاف، مفاد اور بہت سے معاشرتی عوامل سے وجود میں آتی ہے۔ جدید محرکات ہمیں اکثریتی گروہ کی خصوصیات رکھنے والی زبان کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر ہم روم میں لسانیاتی اجتماع کو مدنظر رکھتے ہیں تو اُس لسانیاتی نظام میں گرامر کو بائیں جانب کے لیے مخصوص کر دیا گیا جب کہ دائیں جانب کے نظام کو جدید طرز لسانیات پر تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی Lexogramatical اصول انتہائی حساس نظام ہے اور یہی نظام قواعد کا سب سے نازک حصہ ہے۔ (میتھی سن، ۱۹۹۹ء)

اگر اس تصور کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بنیادی طور انتخاب ہی سیاق وسباق کو مدِ نظر یا اہمیت دینے والے نظام میں متن کی تشکیل و تکمیل کرتا ہے۔ اس وجہ سے ساختیاتی متن کو پس منظر کے

حوالے سے قواعدی ساختیاتی لسانیات کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔اس طرح کے متن کی خاصیت اغلاط سے پاک اور ابہام سے دور ہونا ہے۔اس کی بنیادی وجہ اس متن کا سیاق وسباق سے تعلق ہے۔ جو متن کے مفہوم اور معانی کی وضاحت کرتا ہے جس سے متن کا ساختیاتی نظام متحرک ہو جاتا ہے۔(حسن،۱۹۸۵ء) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گفتگو کے عمل میں سے ساختی سطح پر ہم آہنگی اور اختلاف کے اصول پس منظر کے ساتھ منسلک ہونے کی بنا پر اُس کی شناخت کی بدولت ہی اپنے معانی اور مفہوم کی وضاحت کر سکتا ہے۔

لسانیات کی شناخت اور سماجی تناظر

بات چیت، لسانیات کا ایسا اظہار ہے جو لسانیات کی شناخت سماجی تناظر میں کراتا ہے۔ یہ باتیں منطقی حیثیت کی حامل ہیں جب بھی قاری کسی متن کو پڑھنے کے بعد اُس کے مضمرات تک رسائی حاصل کر لے جو ظاہری طور پر اُس متن کا حصہ نہیں ہوتیں۔اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ قاری متن کے پس منظر سے واقف ہے جس کی بنا پر وہ اُن تبدیلیوں کو جو متن میں موجود نہ ہونے کے باوجود اُس کی وضاحت کے لیے ضروری ہیں اُن کو جان لیتا ہے یہی پس منظر ہی تنقیدی تبدیلیوں کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جب متن کے ذرائع میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو ذیلی تبدیلیاں جنم لیتی ہیں اور یہی ذیلی تبدیلیاں تنقیدی تبدیلیوں کی بنیاد بن جاتی ہیں۔

ملتے جلتے معانی کا انتخاب کسی ضروری عنصر میں ابہام کو جنم دے سکتا ہے۔اس کے لیے مفصل متن عبارت کو منتخب اور رد کیا جا سکتا ہے۔اس رد و کد کے نتیجہ میں ایک ایسا عنصر سامنے آتا ہے جس کو بناوٹ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت اختیاری ہے جس کو قبول یا با آسانی رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے ک اس بارے میں لسانیات میں کوئی واضح قانون نہ ہے۔اس لیے اکثر اس قسم کے دعوے پیچیدگیوں کو جنم دیتے ہیں۔اور لسانیاتی عمل میں ان کی موجودگی تناؤ کو جنم دیتی ہے ان میں کوئی ربط نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اکثر ایک مثال کو فراموش کر کے دوسری پھر

تیسری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ منظّم لسانیاتی اصول اس قسم کی بے ربط تبدیلیوں کو اپنے اندر جگہ فراہم نہیں کرتے۔ اس لیے لسانیات کے بنیادی نظام میں ان پر بہت کم انحصار کیا جاتا ہے۔ تفریحی مشاغل کے دوران ہونے والی گفتگو میں اگرچہ اس طرح کے متن کی گنجائش موجود ہو سکتی ہے لیکن اس میں بھی نفاست کے عمل سے پہلو تہی ممکن نہیں۔ کیونکہ تفریحی مشاغل میں بھی ساختی اجزا کی تشریح ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے فرتھ کا یہ دعویٰ کہ ''متن کا حقیقی لسانیاتی نظام کا آغاز ہے عام طور پر اس کی نوعیت ساختیاتی ہوتی ہے جو انفرادی گفتگو کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اس قسم کی گفتگو میں استعمال کیے جانے والے الفاظ عمومی طور پر لغت کا حصہ ہوتے ہیں۔'' اس کی مثال فرتھ روزمرہ کی خریداری کے عمل میں ہونے والی گفتگو سے دیتے ہیں۔ جس میں ہم اُن اشیاء پر بحث کرتے ہیں۔ جو عمومی لغت کا حصہ ہوتی ہیں مثلاً دالیں، سبزیاں وغیرہ۔ گفتگو یا متن کے عبارت نامے کو ترتیب دیتے ہوئے ساختیات کا مخصوص نظام کام کرتا ہے۔ یہ نظام ساختیات بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس میں بناوٹ کا پہلو کم سے کم ہوتا ہے۔ پاس اختیارات لسانیاتی نظام میں جملوں کی ساخت کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں۔ جو زبان میں جدت طرازی اور نفاست پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق لغت، قواعد کی ساخت کو متاثر کرنے والا عامل ہے۔ جدید تعمیراتی ترقی زبان کے نظام میں بنیادی متن کے انتخاب کے لیے ساختی نظام کو موجود ہونا ضروری ہے۔ جبکہ لغتی نظام کا دائرہ کار متن کے نفیس حصوں کے مطالب اور مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔ منظّم ساختیاتی اصولوں اور متن کی سطح پر قواعد کی ساخت کو عام طور پر زبان کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ اقتباس کی ساخت، حقیقت، انفرادیت، اور یقیناً حالات کے سیاق و سباق کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ چاہے گفتگو میں ربط موجود ہو یا نہ ہو ساخت، بناوٹ، اختلاف اور استحکام کا تعلق اس اصول کے ساتھ ہے۔ یہی اصول درست متن کے چناؤ کے لیے تحریک پیدا کرتا ہے۔

موضوع سے انحراف ایسا عمل ہے جو متن میں موجود عوامل میں تبدیلی اور اختلاف کی وجہ سے سامنے آتا

ہے۔ بے ربط تحریر و گفتگو کے دوران اس طرح کی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے جس میں گفتگو کا پیرائیہ بدل جاتا ہے اور گفتگو اپنے نقطہ آغاز سے یکسر انحراف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس قسم کی بے ربط گفتگو کو لسانی عمل کا اہم حصہ اس لیے قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی شناخت اور قابل تشریح حصوں تک رسائی کے لیے ہمیں اُس ماحول اور سماجی تناظر سے آشنا ہونا ضروری ہے جس میں وہ گفتگو وقوع پذیر ہے۔ اگر چہ لسانیات میں بے ربط گفتگو کا فہم ایک پیچیدہ عمل ہے مگر متن کے درست مفہوم تک رسائی اور مخاطب کے مدعا کو پہچاننے کے لیے سماجی تناظر کو سمجھنا اور گفتگو کے سیاق وسباق سے آگاہی لسانیات میں اہم ہے اس لیے خواہ گفتگو بامعنی ہو یا بے ربط اس کے لیے قابل شناخت سماجی تناظر کی موجودگی ضروری ہے۔

ایسی ساختی خصوصیات جو کسی تبدیلی کی بدولت جنم لیتی ہیں۔ آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ عمل کرتی ہیں۔ معانی کے انتخاب کے لیے گفتگو سے جُڑے ضروری حقائق اور عناصر تک رسائی کے بعد ہی وضاحتی معانی چنے جا سکتے ہیں۔ بعض حالات میں ان حقائق اور عناصر کی ترتیب بھی معانی تک درست رسائی میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مگر ان تمام عناصر حقائق تک رسائی آسان اور سادہ نہیں ہوتی۔ ان عناصر کی اقسام اور اکائیاں کئی سمتی ہوتی ہیں۔ لہٰذا بعض اوقات قدرتی طور پر موجود امثال بھی اختلاف کو ظاہر کر رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر Declrative Clause دوسری سے مختلف ہوتی ہے ایسے لوگ جو صاف ستھری گفتگو کو پسند کرتے ہیں وہ ترتیب میں بھی سادگی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہالیڈے نے جو ساختیاتی لسانیاتی ڈھانچہ ترتیب دیا ہے اُس میں ہر قسم کے اتار چڑھاؤ اور گومگو کی کیفیت کو جو کسی بھی قسم کی پیچیدگی کا سبب بن سکتے ہوں سے اجتناب برتا گیا ہے۔

سادہ بات یہ ہے کہ ایک ہی معاشرتی طبقہ گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کسی بھی قسم کی گفتگو میں ہونے والی تبدیلی کو محض بات چیت کا عمومی حصہ تصور کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری

طور پر گفتگو کے عمل میں ہونے والے تغیرات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ان کے تصورات گفتگو کے تناظر کے بارے میں واضح ہونے کی وجہ سے وہ درست اور واضح معانی اخذ کرنے میں دشواری محسوس نہیں کرتے۔(ڈاکٹر رقیہ حسن، ۱۹۹۹ء)

کسی شے کی شہرت بھی اُس کی تحقیق کیے بغیر شناخت کے لیے کافی ہوتی ہے۔اُس شے کے بارے میں ایک واضح اور عمومی تصور کو بنیاد مان لیا جاتا ہے۔اُس شے کا بیان کے لیے خاص ساخت کے متن کو استعمال کیا جاتا ہے۔جس کی بنیاد اُن عمومی تصورات پر ہوتی ہے جس کی بدولت اُس شے کو مشہوری حاصل ہوئی۔ڈاکٹر رقیہ حسن کے نزدیک گفتگو کے عمل میں ایسی اشیاء کی موجودگی کو من وعن تسلیم کر لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی قسم کے واضح تصورات گفتگو کو پختہ بناتے ہیں۔اور ہم آہنگی کو بڑھانے اور تغیرات میں کمی کو فروغ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

متن کی ساخت اور پیچیدگی

بے ربط گفتگو سے معانی اخذ کرنے کے لیے جو اصول وضع کیے جاتے ہیں۔وہ اس قدر طاقت ور ہوتے ہیں کہ وہ تبدیلی پیدا کر سکیں۔ہم مختلف امثال کو لاگو کر کے تنقیدی تبدیلی کی توثیق کر سکتے ہیں۔بے ربط اختلاف کی حالتیں ایک خاص تبدیلی اور نظریات کو جنم دیتی ہیں۔اور یہ سب بے ربط گفتگو کی ساختی قوت کی وجہ سے ممکن ہو پاتا ہے۔بات چیت میں اٹھنے والے سوالات میں موجود اختلافات میں تبدیلی پیدا کرنے کی بہت زیادہ صلاحیت اور طاقت موجود ہوتی ہے۔مگر یہ بات قابل غور ہے کہ ان تمام اختلافات اور تغیرات کے باوجود متن کا اصلی مواد برقرار رہتا ہے۔اس میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ایسے طاقت ور متون، محرک اور سیاق وسباق کو مدِنظر رکھ کر تحریر کیے اور ادا کیے جاتے ہیں ان کی حالت مستقل رہتی ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مخصوص سماجی تناظر میں ہونے والی

سرگرمی جو گفتگو یا ملاقات کی صورت میں ہو یا اُس کو بذاتِ خود تنقیدی تبدیلی سمجھا جائے۔ یہ مشاہدہ خاصی حد تک زبان کے استعمال پر لاگو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ اس کو ہر جگہ مستعمل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر معاشرتی گروہ کے لیے بعض تبدیلیاں مخصوص ہوتی ہے۔ جو کسی بھی دوسرے معاشرتی گروہ سے مختلف ہوتی ہیں اس لیے اس مشاہدہ کو آفاقی طور پر اپنایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ مخصوص تبدیلیاں خود ہی راستہ روک لیتی ہیں۔ اور یہ ایک مخصوص دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنی حد کو عبور کر کے دوسری کی حدود مین داخل نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں (۱۹۹۰ء برنسٹن) نے مشاہدات نے نتائج کے منظر عام پر لائے اور ان کے مطابق قابل شناخت سماجی حالات کا مشاہدہ مضبوط درجہ بندی کرتے ہوئے حدود کے تعین کو ہمیشہ برقرار رکھا جاتا ہے۔

اس قسم کی مضبوط درجہ بندی بھی تبدیلیوں کے عمل کو آفاقی نہیں بنا سکتی۔ ایسے کئی مواقع گفتگو کے عمل میں آتے ہیں۔ جب مخاطب ایک بات کرتے کرتے اچانک دوسری بات کی جانب مُڑ جاتا ہے۔ ایسا کرتے ہونے وہ کسی قدر تغیرات کو اپنا لیتے ہیں اور کئی اقسام کی تبدیلیاں اُس کے اندر نفوذ کر جاتی ہیں۔ اگر چہ ایسی نفوزیت کا مشاہدہ روزمرہ کی عمومی گفتگو میں کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف عام بات چیت میں بلکہ اس کی عکاسی ہمیں سرکاری اداروں میں ہونے والی گفتگو جو بے ربط ہو اور دیگر ہمہ قسمی گفتگو میں جو معاشرہ میں وقوع پذیر ہوتی ہیں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گفتگو کے عمل میں ایسا اشارہ جس سے پہلو تہی ممکن نہیں وہ اُس کا پس منظر ہے۔ جو اپنے ماضی کی حدود میں رہتے ہیں سیاق وسباق کی حدود معاشرتی طور پر اختلاف کی حامل ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے لسانیاتی تغیرات جنم لیتے ہیں۔ یہ اختلاف کسی بھی متن میں تغیرات کا باعث بنتے ہیں جن کی بنیاد محض اس کے معاشرتی تغیرات ہوتے ہیں۔ مختلف معاشرتی ماحول میں ایک ہی متن کے مختلف معانی اور مفہوم اس بات کا اظہار ہیں کہ گفتگو پر سماجی حالات کس قدر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور معاشرتی اختلافات کس قدر زبان کے اختلاف کو جنم دیتے ہیں۔ اور معانی اور مفہوم میں تغیر اور تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔

فرض کریں کہ دعوت پر بہت سے مہمان مدعو ہیں۔ جو بہت سے مکالمے ایک ہی جگہ پر کر رہے ہیں۔ اگر ان تمام مکالموں کو ملا دیا جائے تو ایک پیچیدہ متن ابھر کر ہمارے سامنے آ جائے گا۔ اس طرح کے حالات عموماً زیادہ ہجوم والی جگہوں پر بھی نظر آتے ہیں جیسے ڈاک خانہ، دفاتر یا تعلیمی ادارے وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکالمے اور پہچان کا عمل جگہ کے ساتھ متعین نہیں بلکہ جب مخاطب ایک ہی وقت میں بہت سی سرگرمیوں میں ملوث ہو تو وہ کسی بنیادی متن کی تشکیل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی گفتگو کئی متوازی چلنے والے پیچیدہ متون کو جنم دیتی ہے۔ یہ مخصوص صورت حال ہے جس کی وجہ سے متن کو سمجھنے کے لیے اُس کے تناظر سے آگاہی کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ معانی مدعا سے متضاد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے حالات میں تین اجزا کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

۱۔ الفاظ کا چناؤ

۲۔ اندازِ گفتگو

۳۔ علامات کا استعمال

مکالماتی گفتگو کو عام طور پر سادہ مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور گفتگو کرنے والے معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ حسن، ۱۹۷۸ء، کے مطابق مکالماتی گفتگو کا انحصار مخاطب اور سامع کے تعلقات، معاشرتی کردار، مقام اور معاشرتی اختلافات اور سابقہ تعلقات کی تاریخ پر ہوتا ہے۔ (کارلان، ۱۹۹۵ء) ان میں وراثتی رشتوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ معاشرتی تعلقات میں فاصلے بھی مکالماتی گفتگو کا معیار مقرر کرنے میں کردار ادا کرتے ہیں۔ (مارٹن، ۱۹۹۲ء) مکالماتی گفتگو کی خصوصیات کو پسندیدہ عناصر سے جوڑا ہے۔

بلاشبہ گفتگو مخاطب اور سامع کے تعلقات کی عکاس ہے اس کی مثال ماں اور بچے کے درمیان ہونے والی مکالماتی گفتگو کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس میں تعلقات کی نوعیت انتہائی قریبی ہیں۔ یہ گفتگو کم معاشرتی فاصلوں کی عکاس ہے۔ بولنے والوں کا لہجہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں کا تعلق ایک سماجی گروہ

سے ہے اور دونوں طویل عرصہ سے ایک ساتھ رہے ہیں۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ گفتگو میں تفسیر کی گنجائش نہیں۔ بلکہ سادہ طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تبدیلی کا راستہ عبور کرنے کے لیے تنقیدی تبدیلی کو استعمال کیا گیا ہے۔زبان استعمال کرنے والا خود ان تبدیلیوں کو گفتگو کا حصہ بنا رہا ہے۔ان تنقیدی اور منطقی تبدیلیوں کا انحصار خود گفتگو کرنے والوں پر ہے۔جو سماجی گروہ سے متعلق گفتگو کو بنیاد بناتا ہے۔

منطقی تغیرات:۔

مخصوص سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کے لہجے اُس سرگرمی کی وجہ سے واضح طور پر دوسری قسم کی سرگرمیوں میں شریک گروہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ایسا ایک مخصوص اصول کی وجہ سے ہوتا ہے۔جو مخصوص حالات کے تحت بات چیت کرنے والوں کی مخصوص شناخت کو ظاہر کرتا ہے۔اور یہ شناخت ماحول کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوجاتی ہے۔مخاطب جس ماحول میں گفتگو کرتا ہے وہ اُن حالات کو مدِ نظر رکھ کر اپنے لہجہ اور بولی کو اپناتا ہے کیونکہ وہ جس علاقے میں موجود ہے وہاں کی بولیوں اور حالات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوتا ہے۔اور اپنے اردگرد رہنے والوں کے لہجوں سے باخبر رہتا ہے۔

معاشرتی زبان دان زبان اور لہجے کے لیے کب، کہاں، کیسے کو اہم قرار دیتے ہیں۔یعنی گفتگو کب، کہاں اور کیسے ہوتی ہے وہی لہجہ اور زبان کا معیار مقرر کرتی ہے۔سماجی لسانیات پر تنقید کی بنیاد اس کا نظریاتی ہونا ہے۔اس طرح انگریزی زبان میں بھی (3 Ws) کی اہمیت کو ماہرین لسانیات نے اجاگر کیا ہے۔ جو اُردو زبان کے (۳ ک) سے مماثل ہیں یعنی (When, Where, With Who) یعنی کب، کہاں اور کس کے ساتھ گفتگو ہورہی ہے۔ یہ (3 Ws) انسانی گفتگو کا محور قرار دیئے جاتے ہیں۔اور دو انسانوں یا انسانی گروہ کے تعلقات کی وضاحت کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ یہاں یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ (3 Ws) انسانی معاشرے کی بقا

کے لیے ضروری ہیں۔

مخصوص سیاسی معاشرتی حالات اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اُس کے لیے کونسے متن کا مواد، لہجہ اور اقتدارات درست ہیں اور کونسے غلط ہیں۔ جس طرح آج کے دور کے انسان اور صدی قبل کے انسان کی گفتگو کو موازنہ کرایا جائے تو دونوں کے درمیان لہجے اور متنی مواد کا فرق واضح محسوس ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت زبان پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح (کب، When) کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس طرح معاشرتی حالات اور ماحول بھی لب ولہجہ میں اور متنی مواد میں فرق لانے کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً سبزی منڈی اور بازار میں ہونے والی گفتگو اور ادبی محفل میں ہونے والی گفتگو کا لب ولہجہ اور متنی مواد یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس مثال سے (کہاں، Where) کی لسانی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ گفتگو کو معیار سامع اور مخاطب کے درمیان تعلقات پر بھی ہوتا ہے۔ مخاطب اور سامع گفتار وسماعت کی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر گفتگو نہ کی جائے تو ابلاغ ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جس سے اور جو گفتگو کر رہا ہے دونوں کو ایک دوسرے کی طبعی صلاحیتوں سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ عموماً ایک ہی طرح کے لہجے رکھنے والے لوگوں کا تعلق معاشرے کے ایک ہی جیسے گروہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس طرح (کس کے ساتھ، WithWho) کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

معاشرتی تعلقات ہماری معاشرتی پہچان کی وضاحت کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر سماجی تعلقات میں گفتگو کے معیارات کی تشکیل کی جائے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ معاشرتی زبان دانوں کو ان مہارت کی تشکیل میں کس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

پچھلے چند عشروں میں یورپین زبان دانوں نے لوگوں کے مختلف گروہوں پر تجربات اور مشاہدات کا آغاز کیا ہے۔ جن میں ذات، جنس، مذہب اور دیگر گروہوں کو تجربات، مشاہدات اور تحقیق کا حصہ بنایا گیا۔

(Brinston) کی تحقیق اس ضمن میں قابل قدر اضافہ ہے۔جن کے مطابق معاشرے میں بہت سی اقسام کے انسان رہتے ہیں۔ جومختلف طبقات ذات اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔اوران کی قوت اوراختیارات بھی ایک دوسرے سے کم و بیش ہوتے ہیں ۔(Brinston) کے مطابق معاشرتی زبان دانوں نے پہلے سے موجود نظریات اورتصورات کوہی آگے منتقل کر دیا ہے۔جس میں غالب معاشرتی زبانوں کا سطحی طور پر مطالعہ کر کے اُس کو معاشرے کے لیےمخصوص کر دیا ہے۔ زبان کومحض وراثتی حد تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان کے مطالب کو جاننے کی بجائے الفاظ اورآوازوں کے مجموعے کواہمیت دی گئی۔(Brinston) اس بات کوحقیقت سے بہت دور تصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق الفاظ اور لہجہ کوئی بھی ہو ہمیں ان کے معنیاتی خاصیت (Meaning Potential) پرغور کرنے کی ضرورت ہے۔مختلف الفاظ ایک دوسرے سے مختلف معانی کے حامل ہوتے ہیں۔اور یہی معانی حقیقت ہیں۔انسانی زبان ایک ہی صورت حال کے لیےمختلف الفاظ کا چناؤ کرتی ہےاس طرح ان کے بولنے کےانداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔

(ہالیڈے ۱۹۷۲ء) اس امکان پر بات کرتے ہیں کہ تین دہائیاں قبل کی ذیلی ثقافت میں معانی کے اختلاف کوکم نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے گفتگو کے ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کومحض شعوری طور پرتسلیم کرلیا جاتا ہے۔ ایسی گفتگواورمخاطب کا ماحول میں ہونے والی تبدیلی سے تعلق معانی میں تغیر کا باعث ہوتا ہےاس طرح علم المعانی کا نظام سماجی ثقافت کی وجہ سےتخلیق ہوتا ہے۔اس میں ہونے والے تغیرات کے پس منظر میں بھی سماجی تبدیلیاں موجودرہتی ہیں۔ہالیڈے کےاس دعویٰ کی تصدیق (ڈاکٹر رقیہ حسن،۱۹۹۱ء،کارلون،۱۹۹۵ءاورولیم نے ۲۰۰۱ء)میں کی۔

ذیلی ثقافت سماجی حالات کی وجہ سےتشکیل پاتی ہے۔ یہ ممکنات اور ناممکنات کے اظہار کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ کائنات جس میں ہم رہ رہے ہیں کس طرح وجود میں آئی اور یہاں پر رہنےسہنے اور گفتگو کے کون سے

طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔اُن کی وضاحت حالات کے تناظر میں سماجی حالات کے پیش نظر کی جاسکتی ہے۔

طبقاتی فرق اور معانی میں اختلاف

ہمارے معاشرتی نظام میں موجود طبقاتی فرق کی وجہ سے الفاظ اور معانی کے درمیان تعلق میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ان ثقافتی تغیرات کی بدولت مخاطب کے نظریاتی تصورات بھی تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ سے معانی میں تغیر نظر آتا ہے۔ برنسٹن اس قسم کی صورت حال کو(Culturaly determineal pstioning device) قرار دیتا ہے۔ جو مربوط انداز میں سماجی معنوں کو تخلیق کرنے میں متحرک کردار ادا کرتی ہے۔اس لیے ہم معانی میں ہونے والی منطقی تبدیلیوں کو کسی ایک ہی شے کو مختلف انداز میں کہنے یا محض آواز کے اتار چڑھاؤ لب ولہجہ تک محدود نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ منطقی تبدیلی مخاطب کی نظریاتی حالت کو متحرک کرتی ہے۔ اور یہ نظریات رویوں کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کا تعین کرتے ہیں۔آواز کے زیر و بم کی وجہ سے الفاظ کے معانی میں پیدا ہونے والے تغیرات صوتیاتی سطح پر نشاندہی کے نظام کی حیثیت رکھتے ہیں۔علم صوتیات میں عام طور پر لغتی قواعد کو بیان کیا جاتا ہے۔جبکہ قطعاتی صوتیات کا معانی کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ نقطہ نظر اس بات کو مستحکم کرتا ہے کہ الفاظ کی ادائیگی معانی کے تعین میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس عمل میں معاشرتی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لہجے کے تناسب سے بولنے کی شناخت اور اُس کے تجربات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔گفتگو موجودہ صورت حال کی بھی عکاس ہے۔یقینی طور پر الفاظ اور معنوں کے صوتی توازن کی بدولت ہی بے معانی الفاظ صوتیات کی سطح پر آتے ہیں۔اور سامع مبہم گفتگو کے بھی معانی تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

(کانترالوبو)اس سادہ نظریہ کی قائل ہیں کہ لہجے کی تبدیلی زبان کو استعمال کرنے والے کی اُس حالت کی

جانب اشارہ ہے جس میں وہ بات کر رہا ہے کہ اُس کے ذہن میں کیا ہے۔ جیسے (کہاں) کے ذریعے سے بولنے والے کا مدعا جگہ کے بارے میں معلومات کا حصول ہے۔ اس لیے ماہرین لسانیات نظریات اور لہجے کے تناسب کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اس میں الفاظ کی گہرائی کو بھی جانچنا بہت ضروری ہے۔ گفتگو میں نظریاتی تبدیلی اور لہجے کی تبدیلی منطقی تغیرات کو جنم دیتے ہیں۔ ماحول کے مطابق ڈھلنا اور لہجے کی تبدیلی میں سیاق وسباق اور متن کے مواد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ معانی کی تشکیل میں سیاق وسباق کا متحرک کردار ہوتا ہے۔ منطقی تبدیلی کا براہ راست تعلق سیاق وسباق سے ہے۔

علم المکانی کی سطح پر (برنسٹن) کا نظریہ محض گفتگو تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ سماج کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ جس کے مقاصد وسیع ہیں۔ اس کا تعلق (کیسے) سے نہیں بلکہ پورے مواد سے ہے۔ سماجی شناخت کے زیر اثر ہونے والی بات چیت میں ہی تنقیدی اور منطقی تغیرات نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی بناوٹ میں ربطی انداز اہمیت رکھتا ہے۔ جب کہ بولنے والے کے کردار کی ثانوی اہمیت رہ جاتی ہے۔ جو اُس کی بدلتی شعوری کیفیات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح مخاطب کے نظریات، اُس کی شعوری حالت ہی گفتگو کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ جس کی نشاندہی (میڈ، ۱۹۳۴ء) اور (برنسٹن، ۱۹۷۵ء) نے کی ہے اس کے علاوہ دیگر کئی ماہرین لسانیات بھی اس نظریہ کی توضیح اور تصدیق کرتے ہیں۔

زندگی کے تجربات سے ہم سیکھتے ہیں کہ بولنے والا کس صورت حال میں ہے۔ مخاطب کا معاشرتی مقام جاننے کے بعد ہی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ معلوم ہو سکے کہ مخاطب کی گفتگو کا مدعا کیا ہے۔ (برنسٹن، ۱۹۹۰ء) کے مطابق سیاق وسباق کی روشنی میں الفاظ کے معانی کو جانچنا چاہیے۔ (کارلان، ۱۹۹۴ء) کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کے نظریات متن کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ کارلان نے اس سلسلہ میں ماں اور بچے کی زندگی کے معاملات کو جانچا۔ ماں کو وہ غالب گروہ کا نمائندہ گردانتے ہیں۔ ماں اپنی تمام تر قوت کے ساتھ بچے کی تربیت کرتی

ہے اس طرح کارلان نے مضبوط تعلق کو ظاہر کیا۔ ماں اپنی گفتگو کا محور سیاق وسباق پر قائم رکھتی ہے روزمرہ کے ماحول میں سیاق وسباق کی حیثیت قابل نفوذ لگتی ہے۔ کارلان کا مشاہدہ ہے کہ غالب گروپ ہی صورت حال میں منفی یا مثبت تبدیلی کا آلہ کار ہوتا ہے۔ جبکہ مغلوب گروہ کی گفتگو مقابلتاً کمزور درجہ کا اظہار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس غالب گروہ حدود اور مضبوط تعلق کو قائم رکھتا ہے۔ کارلان کے مطابق ایسی گفتگو جس کا محور ایک مخصوص دائرہ تک محدود ہو میں ہدایات غالب گروہ کی جانب سے جاری ہوتی ہیں۔ یہ ہدایات گفتگو کے تناظر میں غالب گروہ کی طرف سے روزمرہ کی گفتگو میں اکثر موجود رہتی ہے۔ جس میں غالب گروہ مہارت اور تجربات کا اظہار ہوتا ہے۔ کارلان کی تحقیق دو گروہوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے متن کی شناخت کو سیاق وسباق کے تناظر میں کرتی ہے۔ اور گفتگو میں امتزاج اور افتراق میں پس منظر کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ عام طور پر ذیلی متن اکثر تبدیلی اور تغیر سے مبرا ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں لب ولہجہ کو کارلان اہم قرار نہیں دیتے۔

(ڈاکٹر رقیہ حسن، ۱۹۹۹ء) کارلان کے ان تحقیقی نتائج کی تصدیق کرتی ہیں ان کے مطابق منطقی مشق کے دوران عموماً یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن خاصیت میں فرق ہوتا ہے۔ غالب گروہ یعنی ماں کا لہجہ مثبت معلومات فراہم کرتا ہے۔ باضابطہ گفتگو سیاق وسباق کی دوبارہ ترتیب اور تزئین کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ مغلوب گروہ کی گفتگو کا باضابطہ ترین حصہ جہاں ماں بچے کی تربیت کر رہی کہ روزمرہ زندگی کے امور کیسے سرانجام دیتے ہیں۔ اور گھر کا کام کس طرح کرنا ہے۔ ورنہ اُس کو زندگی میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وغیرہ۔ اس طرح غالب گروہ نہایت سادگی کے ساتھ ایک پیچیدہ متن کو کامیابی سے تشکیل دیتا ہے۔ اور مغلوب گروہ کے لیے اُن نظریات کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ گفتگو کا پہلا حصہ جس میں ہدایات جاری کی گئی ہیں اُس کے معانی اور مفہوم تک کو تو سمجھ سکتا ہے۔ مگر ان ہدایات پر عمل نہ کرنے کی صورت میں اُس کے لیے جن مشکلات کا اُس کو سامنا کرنے کی بات کی جا رہی ہے وہ تجربہ کی کمی کی وجہ سے اُن کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے متن متحرک پن سے محروم ہو

جا تا ہے۔اس کی وجہ مخاطب اور سامع کے مختلف تجربات اور نظریات ہیں جن میں یکسانیت عمر کے ساتھ تو آسکتی ہے مگر ماں کے روکنے کے باوجود بچے شرارتوں سے باز نہیں آتے۔اس صورتحال میں متن کی اہمیت علامت کی سی رہ جاتی ہے۔(کونٹرا مارٹن، ۱۹۸۵ء) کہتے ہیں کہ نظریات تنقیدی تغیر کے ڈھانچے کو متحرک کرتے ہیں۔سماجی درجہ بندی مخاطب کے سماجی گروہ کو دوسرے گروہ سے جدا کرتی ہے۔ایسی تبدیلی زبان اورذہن کی مشترکہ تخلیق ہوتی ہے۔

معاشرہ اور گفتگو کے معیارات

معاشرے میں ہونے والی بات چیت ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔اس عمل کے دوران استعمال کی گئی زبان سماجی تشخیص بن جاتی ہے۔جو ایک فرد کے ذہن میں موجود عمومی خیالات میں تغیر کا باعث بنتی ہے۔اور فرد معانی کی تشکیل تجربات کی روشنی میں کرتا ہے۔اپنی ذہنی تغیرات اور تجربات میں علم المعانی کی قوت پوشیدہ ہے۔

گفتگو کے عمل میں طے کیے گئے عہد و پیماں اور سوالات و جوابات کے بارے میں ردعمل غالب اور مغلوب دونوں گروہوں میں مختلف ہوتا ہے۔(ولیم، ۱۹۹۵ء)اس کی مثال ماں اور بچے کے درمیان گفتگو ہے جس میں ماں حکم دیتی ہے۔اور حکم کے ساتھ بعض دفعہ دلائل بھی دیتی ہے اور بچے کو شعوری طور پر اپنے امکانات پر عمل کرنے کے لیے رضامند کرتی ہے۔دل چسپ پہلو یہ ہے کہ رویے ان معاملات میں یکسانیت کا شکار رہتے ہیں۔ اس طرح جب گفتگو کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالی جائے جس میں دونوں غالب (ماں) اور مغلوب (بچہ) سوالات اور جوابات کر رہے ہوتے ہیں۔تو بچے کے سوال کرنے کا انداز اور ماں کی طرف سے کئے گئے سوالات پر ظاہر ہونے والا ردعمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔لیکن یہ ردعمل دونوں گروہوں کے درمیان مضبوط اور واضح ربط کو ظاہر کرتا ہے۔جس سے معانی کی طاقت ظاہر ہوتی ہے۔علم المعانی کے طریق کار میں بولنے والے کو سب سے

واضح اور زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ سوالات کی ترتیب اور وضع اور اُن کے ردعمل میں آنے والے جوابات غالب اور مغلوب گروہوں میں اختلافی حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ (ڈاکٹر رقیہ حسن، ۱۹۸۹ء)

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ ایک ہی سماج میں موجود دو گروہوں کے درمیان کس طرح سوالات کا ردو بدل کیا جاسکتا ہے۔ دونوں گروہوں میں لہجے کا واضح فرق موجود ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت درج ذیل اقتباس کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔

۱۔ ماں:۔ انتظار کرو! جب تک تمہارے والد اور دانیال گھر نہیں آجاتے۔

۲۔ بچہ:۔ وہ گھر نہیں آئیں گے۔

۳۔ ماں:۔ نہیں وہ آئیں گے۔

۴۔ بچہ:۔ کب؟

۵۔ ماں:۔ وہ آج سہ پہر گھر آئیں گے۔

۶۔ بچہ:۔ سہ پہر کب ہوگی؟ (بچہ رونے لگتا ہے)

۷۔ ماں:۔ ہاں، وہ آج سہ پہر میں آئیں گے۔

۸۔ بچہ:۔ سہ پہر میں کتنا وقت باقی ہے؟

۹۔ ماں:۔ ابھی کافی دیر ہے۔

۱۰۔ بچہ:۔ اوہ نہیں!

۱۱۔ ماں:۔ اوہ ہاں! اوہ ہاں! (ماں آہستگی کے ساتھ خود سے مخاطب ہوتی ہے۔)

۱۲۔ بچہ:۔ کیا میں کھیل لوں؟

۱۳۔ ماں:۔ نہیں

۱۴۔ بچہ:۔اوہ کیوں نہیں؟

۱۵۔ ماں:۔بس نہیں۔

۱۶۔ بچہ:۔اوہ(چلانا شروع کر دیتا ہے)

اقتباس نمبر(۲)

۱۔ ماں:۔کیا تم شام کو مجھے آج رات ہونے والی دعوت کے بارے میں یاد دہانی کرا دو گے۔

۲۔ بچہ:۔ہاں: کیسی دعوت؟

۳۔ ماں:۔اور ہاں اس طرح کی ایک اور دعوت کے بارے میں جو اگلے ہفتے کی رات کو ہو گی۔

۴۔ بچہ:۔ہاں جی۔

۵۔ ماں:۔کیونکہ میں نے آج رات کا کھانا اپنے بچپن کی سہیلیوں کے ساتھ کھانا ہے کیونکہ ان میں سے ہماری ایک سہیلی شہر چھوڑ کر جا رہی ہے۔

۶۔ بچہ:۔کیوں جا رہی ہیں؟

۷۔ ماں:۔تم نہیں جانتے وہ کیوں جا رہی ہیں؟

۸۔ بچہ:۔نہیں

۹۔ ماں:۔وہ ایک گھر تعمیر کر رہے تھے۔

۱۰۔ بچہ:۔اوہ وہ خود تعمیر کر رہے تھے۔

۱۱۔ ماں:۔نہیں نہیں وہ خود نہیں اُن کے لیے کوئی دوسرا گھر تعمیر کر رہا تھا۔اور اب وہ تکمیل کے مراحل کو پہنچ چکا ہے اور وہ مئی کے مہینے میں یہاں سے چلے جائیں گے۔

۱۲۔ بچہ:۔مئی میں ہی کیوں؟

۱۳۔ ماں:۔وہ سکول ٹرم ختم ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔

۱۴۔ بچہ:۔اچھا جی۔

۱۵۔ ماں:۔اُن کی بیٹی سکول جاتی ہے اور وہ چھٹیوں کے بعد ہی اپنے نئے سکول جائے گی۔

۱۶۔ بچہ:۔جی

۱۷۔ ماں:۔اگر وہ جلدی جائیں تو اُن کی بچی کو محض ایک یا دو ہفتے کے لیے نئے سکول جانا ہوتا اور اُس کے بعد تعطیلات ہو جاتیں۔تم جانتے ہو کہ اس طرح لڑکی کو دقت اور مشکلات پیش آتیں۔

اقتباس نمبر (۳)

۱۔ ماں:۔ڈبہ کو اٹھاؤ اور کچن میں رکھ دو۔اور اسے وہیں رہنے دیا کرو۔

۲۔ کِرن:۔کیوں؟

۳۔ ماں:۔کیونکہ اس کے لیے مخصوص جگہ ہے

۴۔ کِرن:۔جی میں اس کو وہاں رکھ دیتی ہوں۔

اقتباس نمبر (۴)

(۱) احمد۔تم ہی ہو جو مجھے کانچ کی گولیوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی۔

(۲) ماں۔میں تمہیں اُس وقت کھیلنے سے منع کرتی ہوں جب تم ثاقب کے قریب موجود ہو۔کیا تم کو معلوم ہے۔ جب کل تم کھیل رہے تھے تو تمہاری کانچ کی گولیاں یہی رہ گئی تھی اور ثاقب پاؤں پاؤں چلتا ہوا اُن گولیوں کو اٹھا کر منہ میں ڈال رہا تھا۔تمہیں ان کو دوبارہ اپنی محفوظ جگہ پر رکھنا چاہیے تھا۔مگر تم بھول گئے۔

(۳) احمد۔اور اب۔۔۔۔۔

(۴) ماں۔پس اب میں نے ایک اصول تمہارے لیے بنا دیا ہے کہ ثاقب کی موجودگی میں تم نہیں کھیلو گے۔

(۵) احمد۔ کیا اُس نے گولی نگل لی؟

(۶) ماں۔نہیں:۔ میں اچانک وہاں پہنچ گئی جب وہ گولی نگلنے والا تھا۔ اگر وہ اُسے نگل لیتا تو بہت مشکل میں پڑ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمیں محتاط ہونا پڑے گا۔ اب تم اُس وقت ہی یہ کھیل کھیلو جب وہ سورہا ہو۔ اور پھر تم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ کھیلنے کے بعد تم کانچ کی گولیوں کو سمیٹ کر محفوظ جگہ پر رکھ دو اور ان میں سے کوئی گولی باہر نہ رہ جائے۔

(۷) احمد۔ ماں: میں نہیں۔۔۔۔(کیا یہ تم ہو؟)۔

(۸) ماں۔ہنستی ہے۔ ہاں یہ میں ہی ہوں اور میں جانتی ہوں میں کیا کہہ رہی ہوں۔

درج بالا اقتباسات کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد دو اہم سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

۱۔ کون تغیر کا منبع ہے؟

۲۔ تغیر کی نوعیت کیا ہے؟

ان اقتباسات میں توجہ کا مرکز گفتگو کے عمل میں ہونے والی تبدیلیوں کی اقسام ہیں۔ ان اقسام پر غور کیے بغیر ان سوالات کے جواب دینا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر رقیہ حسن کو یقین ہے ان سوالوں کے جواب کا حصول تبدیلی کی قسم پر انحصار کرتا ہے۔ جن میں تغیر پایا جاتا ہے۔(۲۲) یہ تبدیلیاں منطقی بھی ہوسکتی ہیں اور تنقیدی نوعیت کی بھی ہوسکتی ہیں مثبت بھی ہوسکتی ہیں اور منفی بھی ہوسکتی ہیں۔ ان اقتباسات سے مخصوص تبدیلیاں جس قسم کو ظاہر کر رہی ہیں وہ معاشرتی ارتقاء ہے۔ جس میں لسانیات کی تخلیق بھی ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے۔ معاشرہ اور زبان ایک دوسرے کے لیے منبع کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تنقیدی تغیر معاشرتی تنظیم میں ہونے والی تبدیلی کے ساتھ خود میں تبدیلی لے آتا ہے۔ معاشرتی تنظیم جس کی جڑوں کا قیام اور استحکام کا انحصار غالب لسانی گروہ پر ہوتا ہے غالب گروہ ہی معاشرتی تنظیم کو مقدم اور مستحکم بنانے کے لیے اقدار کو فروغ دیتا ہے۔ جو ایک مخصوص ثقافت کی ریاستی

حدود کو متعین کرتا ہے۔ (ہیر میسی، ۱۹۷۶ء) تنقیدی اور دیگر تغیراتی اقسام کا احاطہ ہمیشہ ثقافتی حالات کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ جس کی نشاندہی کارل مارکس نے اس طرح کی ہے کہ "حکمیہ تخیل کا اظہار حکمران طبقہ سے ہی آتا ہے۔" اس طرح اندرونی تشخیصی قوت ہی تنقیدی تغیرات کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔ اس طرح کسی لسانیاتی نمونہ کو معانی کے اظہار کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ (حسن، ۱۹۹۹ء)

یہ جاننا ضروری ہے کہ تبدیلی کیسے ہوتی ہے اور تبدیلی لسانی عمل میں کیا لاتی ہے؟ تنقیدی تغیرات کا ایک بڑا حصے کا تجزیہ ہمارے سامنے حیرت انگیز صورتحال پیش کرتا ہے۔ محققین کی بڑی تعداد آج بھی اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کیے ہوئے ہیں کہ گفتگو سماجی تبدیلی میں کیا کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم ابھی تک تحقیق مطلوبہ نتائج اور مقاصد کے حصول میں تشنہ ہے کیونکہ اس بات پر تاحال اتفاق نہیں ہوسکا کہ تغیرات کی پرورش کس طرح ہوتی ہے؟ کون کرتا ہے؟ اور ان تغیرات کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟ یہ سوالات پیچیدہ نوعیت کے ہیں۔ یہ بات کہہ کر کہ غالب گروہ طاقت کا فائدہ حاصل کر کے شعوری یا غیر شعوری طور پر تغیرات کا سبب ہوتا ہے ہم اپنی تحقیق کو منطقی انجام تک نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ یقینی طور پر تغیرات کا ذمہ دار محض غالب گروہ ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی دیگر عوامل جو ظاہری طور پر یا پس پردہ ہوتے ہیں۔ جو تغیر و تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں۔ ماہرین لسانیات ان عوامل کی کھوج لگانے اور ان کے لسانیات پر تغیرات مرتب کرنے کے حوالے سے تحقیقات کر رہے ہیں۔

شعور یا غیر شعوری طور پر دھوکہ دہی کو بے نقاب کرنے کے لیے تنقید کو سب سے زیادہ موثر آلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ تنقید علم المعانیات کو نئی سمتیں اور جہتیں فراہم کرتی ہے جو طاقت کی تقسیم کے عدم توازن اور سماجی گروہوں کے درمیان حاکمیت جیسے حساس موضوعات کے ذریعے سے جذبات کو ابھارتا ہے۔ معانی بعض اوقات ناگوار حالات کی وجہ سے بھی جنم لیتے ہیں۔ (برنسٹن) اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ زبان اور تقریر کے درمیان سماجی ساخت موجود ہوتی ہے۔ جس کا وساطتی عنصر انسانی ذہن ہے جس میں نظریات کی پرورش ہوتی ہے

جو مزاج کی تشکیل کرتے ہیں۔ زبان اور تقریر کے درمیان موجود سماجی ساختی تنظیم ہی منطقی تبدیلیوں کو پیدا کرنے کے لیے متحرک کردار ادا کرتی ہے۔ جس کی بدولت شعوری حالتیں تشکیل پاتی ہیں۔

اس بات کی اہمیت مفروضے سے زیادہ نہیں کہ لسانیات میں اور لسانیاتی عمل میں انفرادیت کو سطحی طور پر در خوِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ انفرادی طور پر منتخب کیے جانے والے متن کی ساخت اور اس میں موجود عناصر کی مشابہت اور اس نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کی شناخت ایک پیچیدہ عمل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اگر لسانیاتی نظام کی تشکیل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے انسان جو نظام کا حصہ ہونے کے باوجود مغلوب گروہ کی سرگرمیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کا کردار اس سے زیادہ نہیں کہ وہ جان بوجھ کر محض طاقت کی وجہ سے حق سے روگردانی کرتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کو قصوروار قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو معاشرہ میں غالب گروہ کو مستحکم کرتے ہیں۔ جو ظالمانہ نظام کو وجود میں لاتے ہیں۔

آگاہی کی فراہمی کے لیے علم المعانی کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس استحکام کے راستے میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جو غالب کے موضوع پذیری کو ممکن بناتی ہیں۔ اگر اس قسم کی وجوہات کا خاتمہ کر دیا جائے تو یقیناً یہ سماجی تبدیلی کی طرف اہم قدم ہوگا۔ ڈاکٹر رقیہ حسن لسانیاتی نظام کو متحرک نظام قرار دیتی ہیں۔ ان کے مطابق یہ نظام اور اُس کی ساخت ساکن نہیں بلکہ ساکن وہ طور طریقے ہیں جن کی مدد سے ہم اس نظام کو دیکھتے ہیں۔ (۲۳) ڈاکٹر رقیہ حسن لسانیاتی نظام کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔

۱۔ خارجی لسانیاتی نظام

۲۔ داخلی لسانیاتی نظام

ان کی کتاب "Genetic sutructural potential" کو انگریزی ادب میں بلند مقام

حاصل ہے جس میں انہوں نے متن کے بیچ نفاق اور ساختی ترتیب مقرر کرتی ہے۔اس طرح انہوں نے ماہرین لسانیات کے لیےنئی راہ ہموار کی ہے۔اس کتاب میں تناظر کے لسانیات پر اثرات کے حوالے سے کام انتہائی اہم ہے۔لسانیات میں تناظراتی عوامل کی اثر اندازی پر ذور دیا گیا ہے۔اس کے ساتھ زبان اور ثقافت کے درمیان تعلق کی وضاحت کی ہے۔اس کتاب میں زبان اور سماجی معیارات کے درمیان تعلق کومختلف پہلوؤں سے دیکھنے اورلسانیات پر سماجی معیارات کے اثرات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔مزید اس میں زبان اور علم کے درمیان تعلق پر بھی ڈاکٹر رقیہ حسن نے اپنے نظریات کو دلائل کی مدد سے واضح طور پر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

’’زبان کے کردار اور اُس میں ہونے والی معانوی تبدیلیوں پر دس سال تک تحقیق کی گئی اور اس تحقیق کے نتیجہ میں زبانی تفسیر کی اصطلاح نے جنم لیا۔ڈاکٹر رقیہ حسن کو اعزاز حاصل ہے اُنہوں نے مختلف سماجی اقدار کے حامل ۱۰۰ خاندانوں کے درمیان ہونے والی فطری گفتگو کو جمع کیا۔اوران پر زبانی تفسیر کے حوالے سے کام کیا جس کو’’کیلی فورنیا‘‘یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں بے حد سراہا گیا۔ان کی تحقیقات اہم اور مادی حیثیت رکھتی ہیں جن کی افادیت مسلمہ ہے۔

الفاظ کی اہمیت

اہل یورپ لسانیات میں فن لفاظی پر گہری توجہ مرکوز رکھتے ہیں لفظ اور بولنے والے کے باہمی تعلق کو یورپ میں انتہائی اہم قرار دیا جاتا ہے۔(۲۴) ماہرین کے مطابق جمالیاتی عمل سے لسانیاتی خصوصیات استفادہ حاصل کرتی ہیں۔ ماہرین لسانیات منظر کشی کو متن کے لیے اہم قرار دیتے ہیں۔منظر کسی بھی متن میں موجود الفاظ کے گہرے معنوں تک رسائی میں مددگار رہتا ہے۔اس لیے منظر کو اس قابل ہونا چاہیے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کن حالات میں زبان کو استعمال کیا گیا ہے۔اس طرح گفتگو کے درست معانی تک رسائی ممکن ہے۔کیونکہ لسانی عمل میں معانی

کو ناگزیر حیثیت حاصل ہے۔ معانی ایسی قوت ہے جو علامت اور بیان کے درمیان تعلق کو قائم کرتا ہے۔ معانی مکمل طور پر ثقافت کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجہ سے ایسے اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں جس کو مخصوص ثقافتی تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔

ثقافتی ہم آہنگی اور تضاد پر یورپی ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ثقافتی حدود کو قائم رکھنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ثقافتی حدود متغیر ہوتی ہیں۔ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق:۔

''میں نہیں سمجھتی کہ ثقافتی تضاد کو ثقافتوں کے درمیان مکمل انحراف سمجھا جائے۔
بلکہ یہ تضاد ایسے لسانی رشتہ کو جنم دیتا ہے جو اشیاء کی بعض حالتوں کو دو ثقافتوں
میں مشابہ طور پر ظاہر کرے۔اور دو ثقافتی رویوں میں تعلق پیدا کرے۔''

ہالیڈے،کلورون اور برنسٹن معنویاتی فاصلوں پر بحث کرتے ہوئے اپنی تحقیقات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جس طرح ثقافتیں اپنے کرداری طرز عمل کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس طرح لسانیات بھی اپنے معنوی اسلوب کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ معنویاتی فاصلے زبانوں میں پیدا ہونے کی وجہ وہ اختلافات ہیں جو معانی کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہی فاصلے دو معاشرتوں کے درمیان ثقافتی فرق میں موجود تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رقیہ حسن واضح اور مضمراتی اسلوب میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے واضح اسلوب کے لیے ایک ایسے سامع کی ضرورت کو محسوس کرتی ہیں۔ جو متعلقہ زبان میں عمومی معلومات رکھتا ہو جبکہ مضمراتی اسلوب کے لیے ایسے سامع کی ضرورت ہے جو اُن حالات سے بھی آگاہی رکھتا ہو جن میں پیغام جاری ہوا۔ غالبًا تمام انسانی زبانیں صریحی اور مضمراتی اسلوب کو بیک وقت اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔(۲۵) کسی بھی متن کی تکمیل میں یہ فاصلے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ مضمراتی تدبیر کی ترجمانی ہمیشہ موجود ذرائع سے نہیں کی جاسکتی۔ کئی مواقع پر ان

تدابیر کی ترجمانی کے لیے معاشرتی تناظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رقیہ حسن اتفاقی سامع تک بات کا مفہوم پہنچانے کے لیے ضروری خیال کرتی ہیں کہ مضمراتی کی بجائے واضح اسلوب کو اپنایا جائے۔ تاکہ وہ گفتگو اور اُس کے تناظر کو درست طور پر سمجھ سکے اور ابلاغ کی تکمیل ہو سکے۔ چونکہ ایسا سامع زبان کے مضمراتی پہلو سے واقف نہیں ہوتا۔

حاصل بحث۔

بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے متعدد معانیوں میں کس طرح کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختلف المعانی لفظ کو محض ایک لفظ قرار دینا درست نہیں۔ اگر چہ ایسے الفاظ ہم صوت ہوتے ہیں لیکن ہر معنی ایک الگ لفظ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لغت میں مختلف معنوں کو ایک ہی لفظ کے ذیل میں نہ رکھا جائے۔ ہر معنی کے حامل لفظ کا الگ اندراج اور اس کی الگ تشریح ضروری ہے۔ اسی طرح کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو ہم معنی یا مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ کلمات ایک ہی مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں معنیاتی اشتراک محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مفاہیم میں نازک سا فرق موجود ہوتا ہے۔ ہر لفظ معنی، سیاق وسباق اور موقع محل کے لحاظ سے منفرد ہوتا ہے۔ اس لیے کسی ایک لفظ کو دوسرے کا نعم البدل سمجھنا قطعی طور پر غلط ہے۔

الفاظ کی تشریح نگاری کے ساتھ انشقاق نگاری کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ لفظ کے اصل کی کھوج لگانا ہی ماہر لسانیات کا اہم فریضہ ہے۔ اسے شناخت کرنا ہے کہ لفظ زبان کا اپنا ہے یہ اس زبان میں دخیل ہے۔ اور اگر کسی اور زبان سے داخل ہوا ہے تو وہ کون سی زبان ہے۔ اور دوسری زبان میں داخل ہونے سے قبل اس نے کان سے معنیاتی اور صوتی مراحل کو طے کیا۔ ادبی اصطلاحات کی تعرف اور تشریح کے علاوہ لغت کا کام ہے کہ علمی اور فنی

اصطلاحات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ الفاظ کی تشریح کا مرحلہ انتہائی اہم اور نازک ہوتا ہے۔ بعض تصورات ایسے ہوتے ہیں جن کا بیان خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے الفاظ کی غیر مبہم تشریح قاری کو مخمصے میں ڈال دیتی ہے۔ اس طرح کے الفاظ کے باریک اور اور لطیف معنی اور مفہوم کے لیے سیاق وسباق، وسعت مطالعہ، زبان پر قدرت، اور وسیع النظری کا حامل ہونا ضروری ہے۔

لغت کے لیے ضروری ہے کہ بتائے کہ لفظ کی کیا خاصیت ہے۔ آیا لفظ معیاری ہے، عامیانہ ہے، اور سوسائٹی کے کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک لفظ سے کئی مزید لفظ بنائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قواعدی زمروں کے ذریعہ بھی ایسے الفاظ کی وضاحت کی جائے۔ اس طرح کے تمام اصول وضوابط کسی لغت کی تکمیل اور جامع ہونے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ بعض ماہریں لسانیات لغت میں حروف تہجی کی ترتیب کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں ہر موضوعاتی حلقے کے الفاظ باہم مربوط ہوتے ہیں اس لیے مفاہیم کے لحاظ سے الفاظ کو ایک دوسرے کے قریب رکھا جانا چاہئے۔

اس لیے مفاہیم کے لحاظ سے جو الفاظ ایک دوسرے سے مربوط ہیں ان کو لغت میں ایک جگہ درج کرنا چاہئے۔ مثلاً جسمانی اعضاء کے لیے الفاظ کو ایک ہی جگہ درج کیا جائے۔ اس طرح اس مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین لسانیات لغت کی حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب کو درست نہیں سمجھتے اور ان کا زور اس بات پر ہے کہ لغات میں الفاظ کی ترتیب اور تشریح موضوعاتی حوالے سے ہو۔ ان ماہرین کا خیال تھا کہ کلمے حروف تہجی کے لحاظ سے نہیں بلکہ مفاہیم کے لحاظ سے مربوط ہوتے ہیں۔ لغت نویسی کے اس نظریہ کو زیادہ پزیرائی حاصل نہ ہوسکی۔ اور یہ نظریہ مقبول عام نہ ہوسکا۔

لغت کا کام محض تدوین تک محدود نہیں ہوتا۔ کیونکہ زبانیں کبھی منجمد نہیں رہتیں بلکہ زندہ اور پھلتی پھولتی رہتی

ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور محاورات کا اضافہ زبانوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ اس لیے لغت میں بھی ترمیم اور اضافہ ناگزیر ہوتا ہے۔ اس لیے ضراری ہے کہ لغت کی ترتیب اور تدوین کا سلسلہ مسلسل جاری رہنا چاہئے۔ مغرب میں لغات کو جدید بنانے کا کام اداروں کی سطح پر ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اس طرح کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اب جدید لغت نویسی کے تقاضے پورے کرنے کی طرف توجہ دی جارہی ہے۔

اردو زبان کے حوالے سے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ حروف تہجی، اور رموز واوقاف کی زیادتی کی وجہ سے طباعت اور اشاعت میں کچھ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ملک کے مختلف حصوں کے سماجی اور تہذیبی عوامل کے زیر اثر بول چال میں موجود انحرافات ہیں۔ املا کی ہم آہنگی اور یکسانیت طباعت اور اشاعت کے لیے ایک معیار کا کام کرتی ہے۔ یہ کام عمومی طور پر ابتدائی تعلیم کے مراحل میں طے پا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ بچہ تدریس کے زریعہ اردو سیکھتا ہے اور پھر عام بول چال سے اس کو مزید مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ علمی فروغ کے لیے اردو زبان کی کسی نہ کسی طرح معیار بندی کی جائے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اس رائے سے اختلاف مشکل ہے کہ

''لسانیات سائنس ہے اور اس کا کام حقائق سے بحث کرنا ہے۔ لیکن لسانیات طبیعاتی سائنس نہیں ہے کیونکہ اس میں جس مواد سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کا تعلق مستقل اور غیر متغیر حقائق سے نہیں ہوتا۔ لسانیات جس مواد سے بحث کرتی ہے وہ نطقی ہوتے ہیں۔ اور ان میں افقی اور عمودی ہر سطح پر تبدیلیوں کے امکانات موجود رہتے ہیں''۔

لسانیات میں اضافہ اور ترمیم کا زیادہ تر کام غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے مناہج مطالعہ اور طریق بحث کی تعریف اور توضیح ممکن ہوتی ہے۔ چونکہ لسانیات ایک عمرانی علم ہے اس لیے اس کا تعلق لوگوں کے سماجی اور

معاشرتی رویوں اور عوامل کا حصہ ہے۔اس لیے لسانیات کو محض جدید لسانیاتی توضیح ،فونیمیات،ساختیات اور تبادلی گرائمر تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔اور عمرانیاتی لسانیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اسی لیے لسانی نظام کو تجرید کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔(۲۶)

حوالہ جات اور حواشی

1. Bloom Field,language,Published by Geoge Allen London,1958.

۲۔ روح الامیں،سید،''اردولسانیات کے زاویے''،عزت اکادمی، گجرات،۲۰۰۷ء۔

۳۔ ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر،''بنیادی اردو''،مرکزی اردو بورڈ،لاہور۔۱۹۶۸ء۔

۴۔ رشید حسن خان،''زبان اور قواعد''،۱۹۷۶ء۔

۵۔ ناصر عباس نیر،مابعد جدیدیت اطلاقی جہات،مغربی پاکستانی اردو اکیڈمی،کراچی۔

6. Hassan,R. Ways of Saying,Ways of Meanings,Edited by camel Cloran, London.

۷۔ ناصر عباس نیر،لسانیات اور تنقید،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۹ء۔

8. Hassan,R. Process of socialization in language, london,1988.9. Halliday,M.A.K, Place of context in symentic model,New York,2009 page.177.

10. Hassan,R. Ways of Saying,Ways of Meanings,Edited by camel Cloran, London.

11. Halliday, M.A.K. and Hassan,R. Coheision in English, long man, London,1976.

۱۲۔ نصیر احمد خان،ڈاکٹر،اردولسانیات،اردو محل پبلیکیشنز،نئی دہلی،۱۹۹۰ء۔

۱۳۔ سہیل بخاری،ڈاکٹر،معنویات،آزاد بک ڈپو،سرگودھا،۱۹۸۶ء۔

14. Hassan,R. Ways of Saying,Ways of Meanings,Edited by camel Cloran, London.

۱۵۔ ۱۹۶۴ء میں پیش کیے گئے ہالیڈے کے بیانیے کا تقابل بعد کے سیاق وسباق کے حوالے سے لسانیاتی بیانیوں سے کریں۔

۱۶۔ رقیہ حسن، ڈاکٹر، ہالیڈے اور حسن، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۔

17. Halliday M.A.K,Language and social man, vol.3,London,1974.

18. Hassan,R.The place of context in a systamic functional model, Webster,London,2009.

19. Hassan,R.The place of context in a systamic functional model, Webster,London,2009.

20. Hassan,R. Process of socialization in language, london, 1988.

21. Halliday, M.A.K. and Hassan,R. Coheision in English, long man, London,1976

22. Hassan,R. Analyzing discursive variation, Equinox,2004.

23. Hassan R. Linguistic,Language and vibral art, Jeelong Deakin university press,1985.

۲۴۔ میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

25. Hassan,R.The place of context in a systamic functional model, Webster,London,2009.

۲۶۔ ناصر عباس نیر، مابعد جدیدیت اطلاقی جہات، مغربی پاکستانی اردو اکیڈمی، کراچی۔

باب پنجم

اردو میں جدید لسانیات کے مباحث: مجموعی جائزہ

اردو میں جدید لسانیات کے مباحث: مجموعی جائزہ

برصغیر میں میں مسلمانوں کی آمد سے قبل کوئی نہ کوئی زبان اس وسیع خطے میں رابطے کے لیے استعمال کی جاتی رہی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قومی اکائی کو پروان چڑھانے میں بہت سی زبانوں نے علاقائی سطح پر کردار ادا کیا۔اس طرح قومی تشخص کی علامت کے طور پر اردو نے اپنا کردار ادا کیا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔۱۸۰۰ء سے ہی بنگالی میں سنسکرت آمیزی کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔آہستہ آہستہ اس میں سنسکرت کا عمل دخل بڑھ گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ بنگالی سنسکرت کی جا نشین نظر آنے لگی۔اور بنگالی کا پوتھی ادب جو مسلمانوں کی ثقافت کی عکاسی کرتا تھا پس منظر میں چلا گیا۔ بنگال کے شہروں میں اردو زبان ثانوی حیثیت میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔لیکن مغربی پاکستان میں بنگالی کی حیثیت قطعی اجنبی اور انجان کی سی تھی۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں پڑھے لکھے اور اعلیٰ سطح کے طبقات میں رابطے کے لیے انگریزی زبان کو استعمال کیا جاتا تھا۔اس طرح سے مرکز اور تمام صوبوں کی سرکاری زبان ہونے کا شرف بھی انگریزی کو حاصل تھا۔اردو اگرچہ پاکستان کے کسی علاقے کی زبان تو نہ تھی لیکن بین الصوبائی رابطے کی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔اور اسے ثانوی زبان کی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔(۱)

پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق کثیر زبانوں کی موجودگی کو لسانی مطالعے کے لیے اچھا شگون قرار دیتے ہیں۔مشہور ماہر صوتیات ڈاکٹر سدھیش ورمانے ۱۹۴۲ء

میں برصغیر کولسانی جنت قرار دیا تھا۔ کیونکہ یہاں کی زبانوں کی وسیع انحراف انگیزیاں اس کو بہشتی سیر گاہ بناتی ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قومی اکائی کی تحرک میں جہاں علاقائی زبانوں نے اہم کردار ادا کیا وہیں یہ قومی تشخص کی واضح ترین اور صریحی علامت بن گئیں۔

لسانیات کے مختلف شعبوں کے لیے عمدہ اور وافر مواد کی موجودگی جہاں ایک نعمت ہے وہیں یہ مسائل کا سبب بھی ہے جن کو سلجھانا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس وقت جب لسانی نفرتیں فسادات کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہیں۔ اور یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ زبان مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ معاشرہ کی تقویت کی وجہ افراد کا سماجی رویہ ہوتا ہے جو مستقل طور پر تقویت پاتا رہتا ہے اور افراد کے لسانی اور ابلاغی اعمال میں نئی روح پھونکتے ہیں۔ جو وسیع تر قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اہم قردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے مملک جن میں زبانوں اور بولیوں کی کثرت ہو۔ وہیں ایسے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ مثلاً کس زبان کو کس قدر اہمیت دی جاے؟۔ کس زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے؟۔ ملک کے سماجی اور سیاسی ارتقا کے لیے ان سوالات کا درست جائزہ اور ان کا صحیح حل ناگزیر ہوتا ہے۔ جس کے لیے لسانی پالیسیوں کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ پالیسیاں کسی زبان کے مخصوص مقاصد کے لیے منتخب کرنے کے بعد بھی ایسے اقدامات لازمی ہوتے ہیں جو زبان اور مقاصد کی مناسبت اور اول الذکر اور موزانیت کے ضامن ہوسکیں۔ ان اقدامات کا تعلق زبان کی معیار بندی سے ہوتا ہے۔

لسانی پالیسی کو ترتیب دیتے ہوئے تین اہم مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۱۔ قومی وحدت اور قومی تشخص

۲۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی پر دسترس

۳۔ بین الاقوامی مواصلاتی رابطہ

جذباتی انداز میں مرتب کی جانے والی لسانی پالیسی سماجی اور علاقائی وقبائلی رقابتیں پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ملک کے عمرانی اور جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی لسانی پالیسی ترتیب دی جائے جو قومی تشخص کی آئینہ دار ہو۔ ہر وہ زبان جو ملک میں زیادہ بولی جاتی ہو ضروری نہیں ہوتا کہ اسے قومی زبان کے درجہ پر فائز کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ وہ زبان اپنے حلقے سے باہر نکلتے ہی اجنبی ہو جائے۔ اس حوالے سے بنگالی اور سندھی کی امثال کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ جن کو کثیر تعداد میں لوگ استعمال کرتے ہیں مگر ان کو ایک مخصوص علاقے تک محدود سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ جس کے باعث بین الاقوامی حیثیت میں خود کو تسلیم کرانے میں یہ زبانیں کامیابی حاصل نہیں کر سکیں۔

اس لیے ضروری نہیں کہ وسیع علاقے میں بولی جانے والی زبان کو قومی تشخص اور وحدت کی علامت قرار دی جا سکے۔ کسی زبان کو پہلی زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ وہ قومی تشخص کی علامت ہے۔ بلکہ قومی وحدت اور تشخص کے لیے ایسی زبان کا انتخاب کیا جاتا ہے جو ثانوی زبان کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استعمال کی جاتی ہو۔ ''ڈاکٹر سینتی کمار چیٹر جی'' اس حوالے سے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے بنگلہ کو ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کہا گیا۔ اسے دنیا کی ساتویں سب سے زیدہ بولی جانے والی زبان کا اعزاز حاصل ہوا۔ لیکن جب دنیا کی اعلیٰ زبانوں کی صف بندی میں بنگالی کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دور تک اس کا نشان نہیں ملتا۔(۲)

عمرانی لسانیاتی مواد سے زبان کے انتخاب میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن پاکستانی زبانوں سے متعلق ایسے مواد کی فراہمی مشکل کام ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر خلیل صدیقی کے مطابق ''پاکستان کا لسانیاتی جائزہ کبھی نہیں لیا گیا۔ یہاں کی زبانوں سے بحث کرتے وقت عموماً لسانی معلومات گریرسن کے (لسانیاتی جائزہ ہند) سے لی جاتی

ہیں''۔اس جائزے کا تعلق بیسویں صدی کے آغاز سے ہے۔اس میں مواد کی فراہمی اور مطالعہ کا جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ جدید لسانیات کی رُو سے نا قابل اعتماد ہے۔اس وقت سے اب تک جو تبدیلیاں لسانی حالات میں ہو چکی ہیں ان کا جائزہ گریرسن کے ماڈل سے لینا کئی مسائل کو جنم دیتا ہے۔لیکن چونکہ اس کے علاوہ نئے جائزے کا فقدان ہے اس لیے گریرسن کے ماڈل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قومی اور سرکاری زبان کے انتخاب کے لیے کوئی بھی معقول اور معروضی کسوٹی ہو فیصلہ اردو کے حق میں ہو گا۔اور اس فیصلے کو ہر سطح پر تسلیم بھی کر لیا گیا ہے۔لیکن جب ہم صوبوں کی سطح پر دیکھتے ہیں تو اگر صوبوں کی تشکیل لسانی جغرافیہ کی رُو سے ہو تو صوبے کی اہم ترین زبان کو صوبائی نظم ونسق چلانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہئے۔اس کے لیے شرط اس زبان کی توانائی اور گہرائی ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ صوبے میں بولی جانے والی سب سے بڑی اور اہم زبان کون سی ہے۔لیکن یہ کام خاصا دشوار ہے۔کیونکہ ایک زبان اپنی لسانی گروہی وسعت کی وجہ سے بڑی زبان کہلا سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس میں اتنی وسعت اور گہرائی موجود ہو کہ وہ ہر سطح پر ابلاغ کا اچھا وسیلہ بن سکے۔یہ بھی ممکن ہے کہ زبان مخصوص معشیت،معاشرت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔لیکن تجرید اور تعمیم کی صلاحیت کا اس میں فقدان ہو۔جنوبی ایشیاء کی اکثر زبانوں سے متعلق ایسی شکایات موجود ہیں۔

فرانسیسی ماہر لسانیات جیولز بلاک اپنی مشہور کتاب''L,Indo Aryan'' میں یہ خیال ظاہر کیا کہ'' ہندوستان کی زبانوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ جدید نظام تعلیم کا ذریعہ بن سکیں۔کیونکہ ان زبانوں میں وہ نثری نحو موجود نہیں جو سائنس کی زبان بن سکے۔یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں میں سائنسی اصطلاحات اور تکنیک کا فقدان ہے''۔جیولز بلاک نے یہ رائے کئی سال پہلے پیش کی۔اس کے بعد ہندوستانی زبانوں نے اس کمی کو دور کرنے کی بھر

پور کوشش کی جس میں اردو اور بنگالی کی کوششیں دوسری زبانوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہیں۔لیکن تا حال جدید ترین سائنس کی افہام و تفہیم کی کمی موجود ہے۔(۳)

مادری زبان کو ابتدائی تعلیم کے لیے بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن پاکستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب کو ابتدائی ذریعہ تعلیم بنانا ممکن نہیں ہے۔اس کی ایک وجہ تو اس زبان کی استعداد ہے جو تعلیم کی سطح پر ضروری فرائض سرانجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔اس کے علاوہ معاشی اور انتظامی حوالوں سے بھی ان کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔کسی زبان کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے سے قبل لسانی انتخاب کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے کا فائدہ یہ ہے کہ بچے میں صحیح تصورات کو پیدا کی جاسکتا ہے۔لیکن اس سطح پر قومی زبان کو بھی مکمل نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے۔کیونکہ اسکی ضرورت اور اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جدید ترین سائنسی اصطلاحات اور ٹیکنالوجی کے بارے میں رائج علوم تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ کسی نہ کسی عالمی زبان کا سہارا لیا جائے۔پاکستان میں اس کام کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔انگریزی کو تعلیم کی ہر سطح اور اور ہر شعبہ تعلیم کے لیے ذریعہ بنانا بھی درست نہیں ہے۔کیونکہ بہت سی اصطلاحات سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے دوسری زبانوں کے علم کو جاننا بھی ضروری ہے۔مادری زبان فکر کا بہترین وسیلہ بن سکتی ہے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی لسانی ضروریات پر پوری توجہ دی جائے۔ان نازک اور اہم مسائل کو حل کرنے کے لیے جذباتی وابستگی اور مصلحت سے بالاتر ہو کر جدید لسانیات کی روشنی میں ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نو آزاد اور پسماندہ ممالک میں سیاسی رجحانات کی بنیاد عموماً جذباتی

نعروں پر ہوتی ہے۔ جس سے گروہی مفادات کے لیے لسانیات کو استعمال کرنے کے امکانات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ممالک میں لسانیات کو عوام کے جذبات کو ابھارنے اور اشتعال انگیزی پیدا کرنیکی روش اختیار کی جاتی ہے۔ لسانی جائزے کی بدولت مختلف زبانوں کے ماہرین اور دانشور اور دوسرے متعلقہ مسائل کے سلسلہ میں کام کرنے والے لوگ ذہنی اور فکری ہم آہنگی کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ مختلف لسانی اور ادبی تنظیموں کو زبانوں کے فروغ اور زیادہ سے زیادہ توانائی اور صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کام کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ (۴)

زبانوں کی باہمی اخذ اور استفادہ، اثر و نفوذ کا سلسلہ غیر شعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ جبکہ اس کی شعوری کوشش ادبی اور علمی سطح پر کی جا سکتی ہے۔ کسی مخصوص لسانی خطے اور دوسری خطے میں بولی جانے والی زبانوں کے درمیان موجود تعلق ایک زبان کے دوسری پر اثرات کو قبول کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ عام لسانی دنیا جمہوری مزاج رکھتی ہے اور یہ کسی حکم کی تابع نہیں ہوتی۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی احساس محرومی اور ذاتی مفاد کے لیے لسانیات کو استعمال کیا جاتا ہے۔

پاکستانی زبانیں علاقائی اور ذیلی تہذیبوں کی شناخت کی علامات ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تمام زبانوں کو طالع آزماؤں کے قبضے سے آزاد کرایا جائے۔ اور ان سب کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ اور ان عوامل کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش کی جائے جو لسانی نفرتوں کو جنم دیتے ہیں۔ مختلف لسانی سرگرمیوں کے زریعہ تعلیمی، ادبی، اور قومی مقاصد کو اجاگر کر کے ہم لسانی مسائل پر قابو پا سکتے ہیں۔

اردو میں جدیدیت کی فکری اساس

اردو میں جدیدیت کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس اصطلاح سے وہ تمام مطالب وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ جو جدیدیت کے ممکنہ اور لغوی معانی ہیں۔ جدیدیت کے حوالے سے اردو میں لکھے گئے مقالات

ایک عجیب صورت حال پیش کرتے ہیں۔ جدیدیت کے مرکزی خیالات میں تعقل اور تعبیر کے حوالے سے انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جدیدیت کی وضاحت کرتے ہوئے ہمارے ماہرین نے آزادی سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے جدیدیت کے مباحث میں انتشار کو راہ دی۔

آل احمد سرور کے مطابق ''جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ اور اس کی نفسیات کی تحقیق کی صورت میں عیاں ہے۔ جدیدیت محض انسان کی تنہائی نہیں بلکہ اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں''۔(۵)

ن۔م۔راشد کے مطابق جدیدیت کی ایک تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ''جو انداز نظر اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور ماضی سے کسی قسم کی یگانگت نہ ہو۔ وہ انداز نظر جدیدیت کا حامل ہے۔ یعنی ایسا نقطہ نظر جس میں تخیلاتی یا مصنوعی زندگی کی ترجمانی کی بجائے جیتی جاگتی اور حقائق پر مبنی دنیا کی ترجمانی کی گئی ہو''۔

وزیر آغا کے مطابق ''جدیدیت خالصتاً ایک ادبی تحریک ہے ایک وسیع تحریک جس میں سماجی شعور کے علاوہ روانی، ارتقا اور تہذیبی نکھار اور تخلیقی سطح بھی شامل ہے''۔(۶)

جدیدیت کی تعریف کے ضمن میں ''شمیم حنفی'' لکھتے ہیں۔ ''شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی روایت کے تناظر میں جدیدیت ایک ذہنی اور تخلیقی اشاریہ ہے۔ تجدید پرستی کے مضمرات تاریخی اور مذہبی نوعیت کے ہیں''۔(۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی جدیدیت کے بارے میں رقمطراز ہیں ''ایک زمانے میں سرسید کی تحریک کا نام جدیدیت تھا۔ گویا جدیدیت سے مراد ایسا نقطہ نظر ہے جس کے ذریعہ سرسید نے قوم کو ماضی اور حال کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اور جس کی مدد سے قوم کا احیا ممکن ہوا۔ ۱۹۳۵ء تک ٹیگور اور رومانی تحریک جدیدیت کے مترادف تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جدیدیت ترقی پسندی کا نام تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اجتماعی شعور کا غزل کی صورت میں اظہار جدیدیت کہلاتا تھا۔ لیکن

آج ہم اسے جدیدیت نہیں کہہ سکتے۔اس سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے جس کے معنی ہر دور اور ہر نسل کے ساتھ بدل جاتے ہیں''۔(۸)

''محمد حسن'' کہتے ہیں۔ ہر ایسا ادب جدید ہوتا ہے۔جو موجود زمانے کی حقیقتوں کی توضیح کرتا ہو اور اپنے طور پر توجیہہ اور تعبیر کرر ہا ہو۔

فضیل جعفری ''ہر زمانے میں ہونے والی نئی شاعری جس کا تعلق معاشرہ،عصریت اور سماج سے ہوتا ہے کو جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔

جدیدیت کے بارے میں ان تعریفوں کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو جدیدیت کو معاصریت کے مفہوم میں لیا گیا۔جس میں ہر عمل،انداز فکر اور اظہار کے لیے اپنایا گیا ہر انداز جدید ہے۔اور یہ انداز معاصر حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو۔بڑی حد تک اس کو جدیدیت کا لغوی مفہوم سمجھا گیا۔''جدید''انگریزی زبان کے لفظ ماڈرن کا ترجمہ ہے۔ ماڈرن کا مادہ لاطینی زبان کے لفظ Modo سے ہے۔جس کا مطلب Just Now سے ہے جس کا مطلب اردو میں ''اسی لمحے'' ہے۔جس کا مفہوم زمانہ حال لیا جاتا ہے۔عہد وسطیٰ میں فرانسیسی زبان میں یہ لفظ Moderene بنا اور جدید انگریزی میں یہ لفظ Modern بن گیا۔تاہم عربی لفظ جدید کا کم وبیش وہی مفہوم ہے جو Modo کا تھا یعنی ''اب''۔ نئے زمانے اور نئے حالات اور خیالات کو ماڈرن کہا گیا۔

جدیدیت اور مشرقی شعریات

جدیدیت اقبال کی معاصر یورپی تحریک تھی لیکن اقبال کی شاعری پر اس کے اثرات نظر نہیں آتے۔اگر چہ علامہ اقبال مغربی ادبیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔اس کا اندازہ ہمیں بانگ درا میں شامل امریکی اور برطانوی

شعرا کی نظموں کے تراجم سے ہوتا ہے۔علامہ اقبال جدیدیت سے مختلف تصور کائنات اور ذہنی رجحانات رکھتے تھے۔مگر جدیدیت کے بعض تصورات علامہ اقبال کی شاعری کے بعض پہلوؤں سے تقابل کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

جدیدیت کی تجربہ پسندی، روایت شکنی، انفرادیت پسندی، اقبال کے ہاں مغربی پس منظر میں موجود نہیں۔اقبال نے نئی ہیئتوں کو تلاش اور استعمال کرنے کی بجائے روایتی ہیئتوں کے استعمال کو موزوں سمجھتے ہیں۔ اس طرح علامہ اقبال نے روایت سے اپنے تعلق کو قائم رکھا۔ جسے توڑنا جدیدیت اپنی شعریات کے اظہار کے لیے لازم سمجھتی ہے۔ جدیدیت میں اس تصور کو بتا گیا کہ ہرفن پارہ ''مواد اور ہئیت'' پر مشتمل ہوتا ہے۔اوران دونوں میں موجود تعلق لازم اور ملزوم کا ہے۔علامہ اقبال نے اسلوبی سطح پر تجربہ پسندی اور روایت شکنی کا مظاہرہ کیا جوایک خاص مفہوم میں ان کی شاعری میں موجو ہے۔علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے زریعہ قطعی منفرد ڈکشن کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ تخلیقی شان کے ساتھ اسے پیش کیا ہے۔اتنی شدید انفرادیت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں موجود ہو۔جس کا مظاہرہ اقبال نے کیا۔ جدیدیت میں انفرادیت پر زور ملتا ہے۔لیکن اقبال کی انفرادیت ان کی اپنی انفرادیت ہے۔(۹)

مشرقی شعریات میں انفرادیت کے مظاہرے کو جدت کا نام دیا گیا ہے۔اس ضمن میں حسن ادا، مضمون آفرینی، نازک خیالی جیسی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ یہ تمام اصطلاحات جدیدیت کی فروع ہیں۔اس طرح جدیدیت کا تعلق معنی اور اسلوب دونوں کے ساتھ ہے۔ جدیدیت کو مانوس اشیا کے مخفی امکانات کی دریافت کا عمل قرار دیا جاسکتا ہے ۔ جدیدیت اگرچہ روایت سے نمودار ہوتی ہے لیکن روایت پرستی سے انحراف کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جدت کا انحراف اس وقت ممکن ہے جب روایت کا علم موجود ہو۔روایت کا جتنا وسیع اور گہرا تصور

اقبال کے ہاں ملتا ہے دوسرے شعرا کے ہاں یہ تصور اتنی شدت سے موجود نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے نہ صرف مشرقی ادبی روایات کو دریافت کیا بلکہ اسے مرتب بھی کیا ہے۔

علامہ اقبال کا تصور روایت، مابعد جدید تنقیدی اصطلاح بین متنی ہے۔ فارسی، عربی، اردو اور سنسکرت ادبیات مختلف متون ہیں۔ جن کو اقبال نے باہم اکٹھا کیا ہے۔ اس طرح اقبال نے مختلف مشرقی روایات کو ایک نئے متن میں منقلب کر دیا ہے۔ اقبال کا شعری متن کے اجزا متن کے میکانکی نہیں بلکہ نامیاتی عناصر ہیں۔ اقبال کا شعری متن ایک زندہ متن ہے۔ جدیدیت کے نظام فکر میں فرد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بطور منفرد اور تنہا وجود فرد کا زندگی کو براہ راست اور طریقے سے تجربہ کرنا اور اس تجربے کے نتیجے میں اپنی تقدیر پر انحصار اس کی بے چارگی کا اظہار ہے۔

جدیدیت کی توضیح جیسے کہ اوپر کی تعریفوں میں کی گئی ہے اس میں جدیدیت کو انسانی عظمت کا ترانہ کہا گیا ہے۔ انسان کی عظمت کا تصور ہیومن ازم کے فلسفے نے دیا۔ جسے روشن خیالی نے آگے بڑھایا۔ لیکن اس میں انسان کی عظمت کے حقیقی جدید تصور کی وضاحت نہیں کی گئی۔ بعض ماہرین نے جدیدیت کو ''اضافی'' کہا ہے۔ جس کے مطابق ہر زمانے کی اپنی جدیدیت ہے۔ یہ جدیدیت کی من مانی تعبیر ہے۔ (۱۰)

سرسید کی تحریک اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے تخلیقی رویوں کو جدیدیت قرار دینا اور اس نتیجہ کو اخذ کر لینا کہ جدیدیت اضافی چیز ہے، جدیدیت کے حقیقی تصور سے چشم پوشی کے سوا کچھ نہیں۔ درحقیقت سرسید کی تحریک نے عقلیت اور رجائیت کے ان عناصر کو قبول کیا جو ماڈرنیٹی سے مخصوص ہیں۔ انہی عناصر کو ذرا مختلف مفہوم کے ساتھ ترقی پسند تحریک نے جذب کر لیا۔ لہذا اسے بھی ماڈرنیٹی سے ہم رشتہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ رومانی تحریک اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے تخلیقی رویوں کے پس پشت ماڈرن ازم کے تصورات موجود ہیں۔

جدیدیت کے ان امتیازات کو ملحوظ نہ رکھنا اور انہیں نظر انداز کرنا بظاہر تساہل پسندی سے کام لینے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا عمل دراصل جدیدیت کا ایک مخصوص ڈسکورس قائم کرنے کے مترادف ہے۔ اس ڈسکورس کی خصوصیت جدیدیت اول وثانی کی اصل روح اور حقیقی تناظر تک عدم رسائی ہے۔ اس کی بڑی وجہ نوآبادیات ہے۔ جو نوآبادکار ممالک کی تہذیب اور علوم کو قابل قدر اور تقلید کے قابل بنا کر پیش کرتی ہے مگر ساتھ ہی مقامی باشندوں کو ان کی روح سے دور رکھنے کا سامان بھی کرتی ہے۔ چنانچہ تمام نوآبادیاتی ممالک میں ایسی ذہنیت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ جو سطحی ہو۔ اردو میں جدیدیت کے مباحث میں اسی ''نوآبادیاتی ذہنیت'' کو کارفرما دیکھا جاسکتا ہے۔ اور اسی ذہنیت کے سبب اردو میں جدیدیت نہ اپنے حقیقی سیاق وسباق کے ساتھ زیر بحث آسکی ہے اور نہ جدیدیت منطقی صلاحیت کے ساتھ رائج ہوسکی ہے۔ آج بھی اردو میں جدیدیت کے مباحث کی یہ صورت حال، جدیدیت کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے۔

لسانیات کے عمومی مغربی رجحانات

لسانیات کی مختلف تعریفوں کو اگر ہم ایک لمحے کے لیے نظر انداز کردیں تو بھی ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا موضوع زبان ہے۔ ادب زبان کی قلب ماہیت کرتا ہے۔ یہ زبان کو نشانیاتی سطح پر تبدیل کرتا ہے۔ یہ تبدیلی مارفیمی سطح پر بھی ہوتی ہے اور معمولی نحوی تبدیلی بھی ہوسکتی ہے۔ باالفاظ دیگر یہ کہنا درست ہوگا کہ ادب ''نئی زبان'' کی ایجاد کا موجب بنتا ہے۔ اس نئی زبان کے اندر خاص نوعیت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ جس کے مطابق زبان کسی سماجی گروہ کی روزمرہ ابلاغی ضروریات کی تکمیل کا نظام ہے۔ بلوم فیلڈ ادبی زبان کو لسانیاتی تحقیق کا کوئی شعبہ نہیں سمجھتا۔ ان کے مطابق ایک ماہر لسانیات تمام افراد کی زبانوں کا مطالعہ یکساں طور پر کرتا ہے۔ اسکسی ادیب کی زبان کے انفرادی اوصاف سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی دلچسپی کا محور اس زمانے کے تمام لوگوں کی

زبان کے اوصاف جاننے میں ہوتی ہے۔ بلوم فیلڈ کا یہ بیان لسانیات کا ادب کی طرف عمومی رجحان کا عکاس ہے۔

لسانیات زبان کا سائنسی مطالعہ کرتی ہے۔ سائنسی مطالعہ تفہیم، وضاحت، توجیہہ اور تجزیے سے غرض رکھتا ہے۔ لسانیات میں ایک قسم کے اظہار کو دوسرے پر ترجیح دینے کا اقدام نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ ترجیح دینے کا عمل اقداری ہے جبکہ لسانیات کو اقدار سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس لیے ایک زبان کو دوسری سے برتر یا کم تر ثابت کرنے کی کوشش ہمیں لسانیات میں نہیں ملتی۔ اس لیے لسانیات ایک عام آدمی کی زبان اور کسی عظیم ادیب کی زبان میں فرق نہیں کرتی۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خالص لسانیات کی رو سے اقبال اور عام شخص کی زبان میں کوئی فرق نہیں۔ لسانیات دونوں کے اسلوب میں محض فرق کو دیکھتی ہے۔ اور اس صورت حال کو جاننے کی کوشش کرتی ہے جو اس فرق کی ذمہ دار ہے۔

لسانیات اپنے مفہوم کے حوالے سے سماجی علم ہے۔ اور زبان اس کی سماجی تشکیل ہے۔ لسانیات اس تشکیل کی نوعیت اور اس میں مضمر قوانین اور ارتقا کا جائزہ لیتی ہے۔ لسانیات کا معروض یعنی زبان، عمرانی، ثقافتی، اور ذہنی تشکیلات سے مختلف اور ان سب پر حاوی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے زبان دیگر سماجی علوم سے مختلف اور ان سب پر حاوی ہوتی ہے۔ لسانیات کو اصولی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک کو عمومی لسانیات سے جبکہ دوسرے کو توضیحی لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ عمومی لسانیات زبان کا جبکہ توضیحی لسانیات کسی مخصوص زبان کا مطالعہ کرتی ہے۔

مغرب کے جدید لسانی مباحث اور اردو پر ان کے اثرات

جدید لسانیات کا آغاز ۱۸۶۷ء سے متصور ہوتا ہے۔ جب ولیم جونز نے اس بات کا انکشاف کیا کہ سنسکرت، یونانی، لاطینی، اور جرمن زبانون سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر در حقیقت یہ تاریخی اور تقابلی لسانیات کا آغاز تھا۔ پوری انیسویں صدی میں تاریخی لسانیاتی مطالعہ کا دور رہا۔ تاریخی لسانیات زبان کی جامع سوانح مرتب کرنے کا نام

ہے۔ یہ زبان کے عہد بہ عہد تغیرات کا جائزہ لیتی ہے۔اور زبان کے ارتقا کا جامع تصور سامنے لاتی ہے۔اس طرح تاریخی لسانیات زبان کے تحرک کو ثابت کرتی ہے اوراس کے جامد پن سے انکار کرتی ہے۔زبان کا یہ تحرک الفاظ، معنی،صرف ونحو تمام سطحون پر موجود ہوتا ہے۔ جہاں تاریخی لسانیات زبان کے ارتقا اورتحرک کو سامنے لانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے وہاں یہ ایسا علم فراہم نہیں کرتی جو ایک زبان کے بولنے والوں کے لیے ابلاغی ضرورتوں کے کام آ سکے۔اس طرح تاریخی لسانیات کا دائرہ کار محدود ہو جاتا ہے۔اس کے محدود ہونے کی تین وجوہات ہیں۔

۱۔ تاریخی لسانیات،زبان کے ابلاغی عمل کی وضاحت نہیں کرتی۔

۲۔ تاریخی لسانیات کا علم ابلاغی عمل کے درمیان موجود نہیں ہوتا کہ زبان میں وقت کے ساتھ کیا تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔

۳۔ تاریخی لسانیات زبان کی صوتی، تکلمی،نحویاتی اور معنیاتی تغیرات کا علم ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

اس طرح لسانیات غیر ضروری نہیں تو غیر سائنسی ضرور ہو جاتی ہے۔سوسیور نے زبان کے یک زمانی مطالعہ کی بنیاد رکھی۔اس کے ذریعہ زبان کے ان بنیادی قوانین کو مرتب کیا جاتا ہے جو کسی زبان کے پس پشت موجود ہوتے ہیں۔اور زبان کے ابلاغی کردار کو ممکن بنا رہے ہوتے ہیں۔عام لسانی ابلاغ فوری،زبانی اور عارضی ہوتا ہے۔اس لیے عام زبان کی کئی باتوں کا اندھا دھند اطلاق ادبی زبان پر نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے زبان کا تاریخی علم ادبی متن کی تفہیم اور نئی تعبیرات کے فکر انگیز تجزیے میں معاون ہوسکتا ہے۔ ''میر'' کے اشعار کی شرح میں شمس الرحمان فاروقی نے تاریخی لسانیات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔(۱۱)

سوسیور کے ساختیاتی لسانیات سے متعلق نظریات طریق کار اور موضوع کے حوالے سے تاریخی لسانیات سے خاصے مختلف ہیں۔ تاریخی لسانیات اپنے اثرات کے حوالے سے مائیکرو ہے۔ یہ ایسے نتائج اور ایسے انکشافات کرنے سے قاصر ہے جو ماورائے لسانی اور دیگر علوم کے لیے فائدہ مند ہوں۔ یہ محض لسانیات کی تاریخ سے آگاہی فراہم کرتی ہے۔ اس سے آگے تاریخی لسانیات کی رسائی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ساختیاتی لسانیات کا دوئرہ کار وسیع ہے۔ یہ اپنے اثرات اور نتائج کے لحاظ سے میکرو ہے۔ سساختیاتی لسانیات زبان کا سائنسی ماڈل پیش کرتی ہے اور اسے مزید سماجی علوم کے حوالے کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ تاریخی لسانیات کی طرح اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی۔ ساختیاتی لسانیات کے ضمن میں لیوی سٹراس اس سے بھی چند قدم آگے کی بات کرتے ہیں۔ اور ساختیاتی لسانی ماڈل کو انسانی ذہن کی بنیادی ساخت کو منکشف کرنے کا باعث سمجھتے ہیں۔ ژاک لاکاں انسانی لاشعور کو ساختیاتی لسانی ماڈل کی مانند کہتے ہیں۔ یعنی لسانیاتی اصول اپنی اپنی حقیقی شکل میں انسانی شعور کے پس منظر میں کار فرما ہوتے ہیں۔ ان نظریات کی وجہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساختیاتی لسانی ماڈل سے مبالغہ آمیز توقعات وابستہ کر لی گئی ہیں۔

اس کے باوجود خاص بات جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ لسانیات کے اس ساختیاتی ماڈل کو اس قدر مبالغہ آمیزی کے باوجود اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہوئی۔ اس بارے میں دو نکات توجہ کے قابل ہیں۔ ایک تو اس لسانیات کے ماڈل نے زبان کی اس تہ کی جانب نشاندھی کی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمہ قسم لسانی کارکردگی ممکن ہوتی ہے۔ سوسیور نے اس کو لانگ کا نام دیا ہے۔ لانگ کی وجہ سے ہم سینکڑوں جملے اخذ کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ ہر مظہر کی تہہ میں ساخت یا لانگ کارفرما ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ساختیات نے زبان اور دنیا کے رشتے کا نیا تصور پیش کیا۔

یونان کے فلاسفروں سے لے کر بیسویں صدی تک زبان کے شفاف میڈیم ہونے کا تصور عام اور مقبول رہا ہے۔ افلاطون نے تو زبان کی اس حد تک اہمیت کو بڑھا کر پیش کیا کہ اسے شے کا علم دینے والا قرار دے دیا۔ گویا زبان، شے یا حقیقت کی متبادل ہے۔ زبان سے متعلق مذہبی نظریات اس نظریے سے ماخوذ ہیں۔ قدیم مذاہب میں تو یہ نظریات مبالغہ آرائی کی تمام حدود کو عبور کر گئے۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ لفظ میں وہ ساری طاقت موجود ہے۔ جسے لفظ سے وابستہ شے میں متصور کیا جاتا تھا۔ ساختیات کے ماہرین ان نظریات کو معصومانہ قرار دیتے ہیں۔

ساختیات کے ماہرین کے مطابق زبان، شے کو نہیں بلکہ ان تصورات کو پیش کرتی ہے جن کو زبان مخصوص قوانین کے تحت تشکیل دیتی ہے۔ زبان میں اشیا کی طرف اشارہ ضرور موجود ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ اشارہ منطقی یا فطری نوعیت کا ہو۔ کیونکہ زبان نشانات کا نظام ہے۔ اور ہر نشان کا دوسرے سے فرق کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ اور یہی فرق ہی تمام لسانی کارکردگی کو ممکن بناتا ہے۔ سوسیور تو بات کو اس حد تک لے جاتے ہین کہ زبان میں فرق کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زبانوں کے درمیان موجود فرق ہی لسانی نظام کے وجود برقرار رکھنے کا باعث ہے۔ لسانیات کے تحت ہم زبان کے مخصوص قوانین کے تحت تشکیل پانے والی دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ساختیات نے دنیا کے لسانی نظام میں زبان کے فعال کردار کو منکشف کیا اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''جس طرح کوپرنیکس نے انسان اور زمین کو بے مرکز کر دیا تھا اسی طرح ساختیات نے انسانی مضمون کو لامرکز کر دیا ہے۔ یہ وہ نکات ہیں جو عموماً اساطیر، لوک کہانیوں اور دیگر ساختیاتی اور پس ساختیات کے مطالعات میں راہنما اصولوں کے طور پر پیش نظر رہے ہیں۔

رومن جیکب سن نے اپنا لسانیتی نظریہ ترسیلی ماڈل کے ذریعہ پیش کیا۔ اس ماڈل کے مطابق ''کسی پیغام کی ترسیل میں چھ عناصر حصہ لیتے ہیں۔'' (۱۲)

۱۔مقرر۔

۲۔پیغام

۳۔سامع۔

۴۔تناظر۔

۵۔کوڈ۔

۶۔وسیلہ

جیکب سن کے مطابق مقرر جب کسی سامع کو پیغام بھیجتا ہے۔تو اس پیغام میں ایک کوڈ مضمر ہوتا ہے۔ جو اپنے مخصوص تناظر میں بامعنی ہوتا ہے۔اوراس پیغام کو ترسیل کے لیے کسی وسطے یا وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو زبان یا کاغذ کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔جیکب سن کا یہ ماڈل زبان کے چھ بنیادی وظائف کا عکاس ہے۔ جو یہ ہیں۔

۱۔ جب ترسیلی عمل میں ذور مقرر پر ہوتو زبان کا وظیفہ جذباتی (Emotive) ہوتا ہے۔

۲۔ جب زور، سامع پر ہوتو زبان کا وظیفہ ارادی (Conative) ہوتا ہے۔

۳۔ جب مرکزی حیثیت تناظر کو دی جائے تو زبان کا وظیفہ حوالہ جاتی ہو جاتا ہے۔

۴۔ جب کوڈ پر توجہ مرکوز ہوتو تو زبان کا وظیفہ کوڈ کھولنے کے لیے(MetaLingual) ہوگا۔جس سے معنی کا تعین ہوگا۔

۵۔ جب وسیلے کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی تو زبان رسمی یا (Pathic) وظیفہ کو انجام دے گی۔

۶۔ جب ساری گفتگو کا محور پیغام ہوگا تو سارا زور اور زبان کا وظیفہ شاعرانہ ہوگا۔ گویا جیکب سن کے نزدیک

شعریات سے مراد محض شاعری ہے۔

ادب کی دیگر اصناف کو جیکب سن نے پیش نظر نہیں رکھا۔ اور اپنے ماڈل کو محض شاعری تک محدود رکھا۔ ان کے نزدیک جب زبان کے ان چھ وظائف میں درجہ بندی قائم ہو جاتی ہے اور پیغام پہلے درجے پر آ جاتا ہے تو باقی تمام عناصر اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اور ان چھ وظائف کے بیک وقت کارفرما ہونے سے شاعری وجود میں آ جاتی ہے۔

جیکب سن کا ترسیلی ماڈل یقیناً محدود ہے اور یہ لسانی وظائف میں فرق قائم کر کے جدید شاعری کے لیے بنیادی اصولوں کو واضح کرتا ہے۔ اور یہ وضاحت اپنے دائرے میں انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ رولاں بارتھ اور تودوروف ساختیات سے شعریات کا تصور تو لیتے ہیں لیکن اسے ادب پر لاگو کرنے کی بجائے اسے ادب میں دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ساختیات زبان کو ضابطوں اور رسمیات سے عبارت قرار دیتی ہے۔ اور یہ ضابطے اور رسمیات ثقافت کے زیر اثر تشکیل پاتے ہیں۔

ساختیاتی لسانیات ''فرق'' کو زبان کے نظام میں بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ اس کے مطابق ہر نشان بامعنی ہوتا ہے۔ اور یہ صوتی اور تکلمی سطح پر دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی فرق اور اضدادی جوڑوں کو متن کی معنی خیزی کے عمل میں بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ ساختیات کی کلیت پسندی پر ضرب دریدا نے ساخت شکنی کی صورت میں لگائی۔ دریدا نے سوسیور کے اس خیال کو تو قبول کیا کہ معنی فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کہ زبان کا سارا نظام فرق سے عبارت ہے۔ مگر دریدا سوسیور کے اس خیال سے متفق نہیں کہ زبان میں تفریق کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہو سکتا ہے۔ دریدا کے مطابق فرق کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور معنی ہمیشہ التوا کا شکار رہتا ہے۔ اس طرح دریدا اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ زبان خود مختار ہے اور مکمل ہے۔ ان کے مطابق متن سے باہر کچھ نہیں۔ تحریر خود سے باہر اپنا

تناظر نہیں رکھتی۔ دریدا کہتا ہے کہ ہر متن کا اپنا لسانی، تناظراتی اور سماجی پس منظر ہوتا ہے جو اس متن کی تعبیر کی راہ کو ہموار کرتا ہے۔ یہ تعبیر آزادانہ اور من مانی سے قائم نہیں رہ سکتی۔ بلکہ لسانی اور تاریخی تناظر کی موجودگی کے زیر اثر یہ تعبیر متن کی تشریح اور توضیح میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

لسانیات اور دوسرے علوم میں تعلق کی وجہ سے پیدا ہونے والی لسانیات کی شاخیں جن میں سماجی اور نفسیاتی لسانیات شامل ہیں کو خالص سائنسی بنیادیں فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔تخلیق لسانیات اسلوبی لسانیات سے مختلف ہے۔ یہ محض ادب کی زبان کا انفراد اور امتیاز کا مطالعہ نہیں کرتی بلکہ اس نفسی تخلیقی حالت کا مطالعہ بھی کرتی ہے جو ادبی زبان کے تناظر میں موجود ہوتی ہے۔اس طرح زبان نحوی سطح پر نئی ترتیب اور معنیات کی سطح پر تقلیب سے ہم کنار ہوتی ہے۔

اس طرح جیکب سن کے ترسیلی ماڈل پر ضروری ہے کہ نظر ثانی کی جائے۔اور ایک نئے لسانی عنصر کو اس میں شامل کیا جائے۔ یعنی متکلم کے علاوہ اس تخیلاتی کردار کو بھی اس ترسیلی ماڈل کا حصہ سمجھا جائے جو باطنی انکشاف کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ کردار تخلیقی عمل کے دوران ہی لسانی دائرے میں اپنے خدو خال حاصل کرتا ہے۔فرد کی نفسیاتی حالت اور سماجی تبدیلی تخلیقی لسانیات کو متاثر کرنے والے عوامل ہیں۔ یہ عوامل تخلیق کار کی تہذیبی حالت کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔

یک زمانی کے علاوہ سوسیور کے لسانی ماڈل میں تین مفروضات اہمیت کے حامل ہیں۔ان مفروضات کو ساختیات کے رہنما اصول قرار دیا جاتا ہے۔ یہ مفروضات درج ذیل تھے۔

۱۔ زبان ایک نظام ہے جو لسانی عناصر کے مجموعہ سے زائد ہے۔

۲۔ لسانی اجزا (نشانات) ارتباط کی خاصیت رکھتے ہیں۔جس کی بدولت ہر جز کو دوسرے کے ساتھ رشتے

کے ضمن میں بامعنی سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ لسانی نشانات من مانے اور ثقافتی ہوتے ہیں۔اس لیے ان کی ماہیت کو زیر بحث لانے کی بجائے ان کے مقاصد کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔

ان سوسیور کے مفروضات کو اکٹھا کرنے سے ساختیات کا مفہوم کچھ اس طرح ہمارے سامنے آتا ہے کہ ’’ہر ثقافتی مظہر ایک ساخت یا تشکیل ہوتا ہے۔ یہ ساخت ان اجزا سے مل کر بنتی ہے جنہیں نشانات، کوڈز اور کنونشنز کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہ ساخت اپنے اجزا کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ساخت کے اجزا سطح پر موجود ہوتے ہیں جبکہ ساخت بذات خود تہ نشین ہوتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے تکلم (پارول) سطح پر ہوتا ہے جبکہ لانگ (گرامر) مخفی ہوتی ہے۔‘‘

ثقافتی تشکیل کے اجزا انفرادی وجود تو رکھتے ہیں لیکن ان کی اہمیت اور معنویت کا تعین ان کے انفرادی وجود کی بدولت ممکن نہیں۔معنویت کا تعین اس رشتے کی وجہ سے ہوتا ہے جو اجزا کے مابین ہے۔ یہ رشتہ فرق کا بھی ہے اور مماثلت کا بھی ہے۔اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ زبان اور دنیا کے درمیان ایک مکمل ثقافتی نظام حائل ہوتا ہے۔سوسیور کی یہ دریافت غیر معمولی نوعیت کی تھی جس نے زبان اور دنیا کے متعلق تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔اسی وجہ سے ان نظریات کو مغرب میں انقلابی قرار دیا گیا۔سوسیور کے ان نظریات نے صدیوں پرانے اس تصور کی تنسیخ کر دی جس کے مطابق زبان کو آسمانی شے قرار دیا جاتا تھا۔ یا اسے دنیا کی حقیقت کو پیش کرنے کے لیے شفاف میڈیم قرار دیا جاتا تھا۔

اس ضمن میں یہ بات ضرور معلوم ہونی چاہیے کہ اس دریافت کا سہرا کلی طور پر سوسیور کے سر نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں پہلے سنسکرت میں اس غیر معمولی دریافت کو پیش کیا گیا۔’’گوتم رشی‘‘ کا حولہ دیتے ہوئے گوپی چند نارنگ

نے لکھا ہے کہ

''شبد اور ارتھ میں کوئی براہ راست رشتہ نہیں ہے۔ اگر ہم شبد (اگنی) کہہ کر جلنے ولی چیز مراد لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض شبد اگنی میں جلانے کے خواص موجود ہیں۔ بلکہ ایسا صرف اس لیے ہے کہ روایت اور چلن کی وجہ سے یہ معنی طے پا گئے ہیں۔ اگر شبد اگنی اور ارتھ کا فطری رشتہ ہوتا تو یہ دونوں شبد ساتھ ساتھ موجود ہوتے۔اور ہر جگہ ایک شبد کا وہی ارتھ ہوتا، اور ہر زبان میں اشیا کے ایک جیسے نام ہوتے''۔ (۱۳) یہ بالکل وہی نظریہ ہے جو سوسیور نے پیش کیا ہے۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ سوسیور نے اس نظریے کو سنسکرت سے ہی اخذ کیا ہو۔ اس لیے کہ وہ جنیوا یونیورسٹی میں سنسکرت اور تقابلی گرامر پڑھاتا تھا۔ کیونکہ یہ کتاب جس میں سوسیور کے یہ نظریات شامل ہیں ان کی اپنی تحریر نہ ہے اگر ایسا ہوتا تو یقیناً سوسیور اپنے نظریات کا اصل ماخذ لکھتا۔ بہر کیف مغرب میں ساختیات، لسانیات تک محدود نہیں رہی۔ اسے ادب، بشریات، فلسفہ، نفسیات وغیرہ کے مطالعات میں بھی استعمال گیا۔ ایسا نظام جو معنی خیزی کا علم بردار ہے کو''زبان'' متصور کیا گیا۔ پھر اس کی ساختوں تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔

ساختیاتی لسانیات کی اہم خصوصیات

اہم ساختیاتی تحریروں کے مطالعہ سے ساختیاتی لسانیات کے اہم خصائص جو ہمارے سامنے آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ساختیات متن کی اساس ہے۔

۲۔ ساختیاتی لسانیات معنی پیدا کرنے والے نظام کو دریافت کرتی ہے۔

۳۔ ساختیاتی لسانیات اور ضابطوں کا نظام

۴۔ ساختیات اور قاری کا تصور۔

۵۔ ساختیاتی لسانیات اور ادب کا نظریاتی ماڈل

جہاں تک ساختیات میں متن کی اساس کا تعلق ہے۔تو اس کے اظہار کے لیے اتنا جان لینا ضروری ہے کہ ساختیات مصنف اور تناظر کی بجائے متن کے مطالعہ پر زور دیتی ہے۔ساختیات کو اس بات سے غرض نہیں کہ کہ تحریر کو کس نے لکھا ہے اور یہ کس زمانے میں لکھی گئی ہے۔اس کے برعکس ساختیات میں اہمیت کے حامل مظاہر ضوابط اور رسومیات ہیں جو کسی ادب پارے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ساختیات کے ماہرین ادب کو لسانی مظہر قرار دیتے ہیں اس لیے ایسے نظریات جن کی اساس متن پر ہوتی ہے۔کسی نہ کسی شکل میں لسانی تجزیے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساختیاتی ماہرین لسانیات جملے کے معنی بتانے کی بجائے جملے کی ساخت کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔اس لیے ماہرین ساختیات نے کبھی متن کے معانی کی وضاحت کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھا۔بلکہ ہمیشہ متن کی ساخت کے تجزیاتی مطالعے کو اہمیت دی۔لیکن اس کا یہ مطلب لے لینا بھی درست نہیں کہ ساختیاتی ماہرین معانی کا تعین نہیں کر پاتے۔اگر وہ معنی کو گرفت میں نہ لے تو کس طرح وہ یہ طے کر سکے گا کہ معنی کی کون سی ساخت متن میں مضمر ہے۔ماہر ساختیات کا کام متن کی شرح کرنا نہیں بلکہ وہ اس عمل تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے جو متن کی تشکیل کر رہا ہے۔اس خاصیت کی وجہ سے ساختیاتی لسانیات سائنسی اور تجرباتی ذہن کا مطالبہ کرتی ہے جو ظاہر کے پس منظر میں موجود وحدت کو گرفت میں لے سکے۔جس کی وجہ سے متن میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

ضابطے اور رسومیات مل کر معنی تخلیق کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معنی کا سرچشمہ متن کی ساخت میں موجود ہوتا ہے کہیں باہر نہیں ہوتا۔تاہم ساخت جن عناصر سے مرتب ہوتی ہے ان کو

ثقافتی اور رسومیاتی ضوابط نے طے کیا ہوتا ہے۔ رولاں بارتھ نے مصنف کی موت کا اعلان اس تناظر میں کیا۔ مصنف کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے دو صورتیں ہمارے سامنے آئیں۔

۱۔ایسی شعریات مرتب کی گئیں جس کا مصنف نامعلوم ہوتا ہے۔

۲۔مصنف کا نام تو لیا گیا مگر توجہ کا مرکز متن ہی کو قرار دیا گیا۔

ضوابط اور رسومیات پر توجہ دینے سے ساخت کا مطالعہ ثقافتی مطالعہ بن جاتا ہے۔ یہ ثقافت متن کی ساخت میں مضمر ہوتی ہے۔ساختیات کو دراصل اصول مطالعہ قرار دیا جاتا ہے۔اس لیے ساختیاتی لسانیات قاری اور قرأت کے تفاعل کو اہم قرار دیتی ہے۔اس سے پہلے متن کے معنی کا تعین مصنف کی سوانح، منشا اور حالات کے تناظر میں کیا جاتا تھا۔مگر ساختیات میں معانی کا تعین قاری، قرأت کے تناظر میں کرتا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ ساختیات مصنف کو قرأت کے راستے کا پتھر قرار دیتی ہے۔اور اس کے ہٹانے کو ضروری قرار دیتی ہے۔اس حوالے سے سوسیور کا کہنا ہے کہ

''زبان کی تاریخ کا علم، زبان کی معنی خیزی کے عمل میں مزاحم ہوتا ہے''۔

اس طرح زبان یک زمانی تناظر میں اپنی صلاحیت کا کامل اظہار کرتی ہے۔اور اس طرح متن اپنے یک زمانی تناظر میں ہی اپنے معنیاتی امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔متن پر مصنف کو مسلط کرنے سے ان امکانات کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔اس ضمن میں بارتھ کی یہ دلیل اہم ہے۔

To give a text an author as to impose a limit on the text, to funish it with final signified, to close the writing.(image- Music -Text, p.146).

اگرچہ یہ رائے سنسنی خیز محسوس ہوتی ہے کیونکہ سمجھا یہ جاتا رہا ہے کہ مصنف متن کو معنی دیتا ہے۔جبکہ بارتھ

مصنف کو متن کے معنی محدود کرنے کا باعث متصور کرتے ہیں۔لیکن وقت نے ثابت کیا کہ بارتھ کا کہنا سنسنی نہیں بلکہ حقائق سے قریب تر ہے۔اور وہ ایک اہم نقطہ کو سامنے لا رہے ہیں کہ مصنف کے حوالے سے متن کا مطالعہ محض مصنف کو معنی کا واحد سر چشمہ قرار دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ جبکہ زبان اور ثقافت مصنف کو بار بار چیلنج کر رہے ہوتے ہیں۔

اگر مصنف کی اہمیت کو تسلیم کرلیا جائے تو ہر متن کی محض ایک معنیاتی سطح کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔جس کو مصنف کی منشا طے کرے گی۔اور یہ منشا کیونکہ خاص زمانی اور مکانی حالت میں تشکیل پاتی ہے۔اس لیے اس متن کی واحد معنیاتی سطح بھی اس صورت حال تک محدود رہے گی۔اس طرح متن اپنے زمانے کی حدوں میں مقید ہو کر رہ جائے گا۔اور متن اگر ایک سے زائد معنی کی سطح فراہم کر رہا ہو تو یقیناً یہ بات مصنف کی منشا کے خلاف ہے۔اس سلسلے میں بارتھ کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے۔

''متن کی تفہیم وتعبیر میں مصنف کو لازمی جگہ دینے کا فائدہ ہمیشہ نقاد کو ہوا ہے۔ کیونکہ اس طرح کو متن کے معنی طے کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے''۔(۱۴)

مصنف کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو متن کی گہرائی تک رسائی کے ضمن میں مصنف رکاوٹ کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ساختیات متن کو اکہرا اور خدا کا پیغام تصور نہیں کرتی بلکہ یہ متن کو کثیر الجہات قرار دینے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ بارتھ نے متن کی معنی خیزی کو محدود کرنے والی ہر صورت کو رد کر دی۔ ان کے مطابق ساختیات کثرت معنی کی قائل ہے۔اور یہی کثرت معنی لسانی اور ثقافتی تشکیل کے تناظر میں متن کے مفہوم تک درست رسائی میں قاری کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لسانی اور ثقافتی تناظر مصنف کی پیداوار نہیں ہوتے اس لیے مصنف خود ان کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان تناظراتی تصورات کو چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔

اس طرح ادبی متن میں وحدت کے تصور کو سختی سے مسترد کر دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساختیات کثرت معنی کا اتباع کرتی ہے۔اس کثرت کو قرأت کا آزادانہ مگر منظّم تفاعل قرار دیا جاسکتا ہے۔

ساختیات میں متن کے معنی اخذ کرنے میں دی جانے والی آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قاری اپنی من مانی سے منشائے مصنف کی بجائے اپنی منشا کو متن پر تھوپ دے۔قاری کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ وہ متن کے مطالعے میں کوڈز کا انتخاب خود کرسکتا ہے۔لیکں ان کوڈز کو شعریات کی روشنی میں منظّم کرنا ضروری ہے۔اور معنی کی کثرت پر قابو پا کراور درست طریقہ سے اس کی وضاحت کے لیے ایک نظام کی ضرورت ہے۔ساختیات اس طرح کا نظام فراہم کرتی ہے۔جسے ساختیات کا حقیقی نظری ماڈل کہا جاتا ہے۔یہ نظری ماڈل دراصل اپنے معروض کے گہرے مطالعہ سے حاصل ہونے والے نتائج پر قائم کیے جاتے ہیں۔اس لیے اُس معروض کی توجیہہ بھی کی جا سکتی ہے۔جو بوقت مشاہدہ نظری ماڈل کا حصہ نہیں تھا۔

ساختیات کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئےس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ،ساختیات کیا ان تمام معیارات پر پورا اترتی ہے۔جن کو معنی کی درست رسائی کے لیے اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔میرے خیال میں کوئی بھی نظریہ اس قدر مکمل نہیں ہوتا کہ ان توقعات پر پورا اتر سکے۔کیونکہ ہر نظریہ نئے آنے ولے نظریات کے لیے مشعل راہ ہے۔اور اس خلاء کو ختم کرنے کی کوشش ہے جو پہلے کے نظریات میں موجود ہوتے ہیں۔ہر نیا نظریہ تمام سوالات کے جوابات مہیا کرنے کا دعویٰ ضرور کرتا ہے مگر نظریہ کا وصف بھی یہ ہے کہ یہ بھی سابق نظریات کی طرح حدود کا پابند ہوجاتا ہے۔ساختیات کا نظریہ بھی ان حقائق سے ماورا نہیں ہے۔

یہ غلط فہمی عام ہے کہ ساختیات کا جمالیات سے لاتعلق ہے۔اگر لاتعلقی سے مراد یہ ہو کہ یہ کسی بندش پر واہ واہ نہیں کرتی اور تعریف کے پُل بنادھنے سے گریز کرتی ہے تو س معاملے میں دیگر لسانی نظریات بھی ساختی نظریہ

کی ہم رکابی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ساختیات، جمالیات کو بالواسطہ طور پر گرفت میں لیتی ہے۔مثلاً ساختیاتی شعریات کا مطمع نظر یہ ثابت کرنا ہے کہ ادب بطور ادب جمالیاتی اقدار کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔اس طرح جمالیات کو بھی ساختیاتی شعریات کا کوڈ قرار دیا جا سکتا تھا۔اور ساختیات کے جمالیاتی کوڈ کو ہم متن کے معنی خیزی کے عمل میں دوسرے کوڈز کی طرح شریک پاتے ہیں۔اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہمیں ساختیات کو دیگر مکاتب فکر پر سبقت دکھائی دیتی ہے۔تاہم جمالیات کو کوڈ کا درجہ دیتے ہوئے اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ نشانیاتی ہو روایتی نہ ہو۔یعنی اس میں متن کی معنی خیزی کا عمل بھی شامل ہو۔(۱۵)

ساختیاتی نظریات کی ساری توجہ کا مرکز ثقافت پر ہے۔تاریخ کے حوالے سے ساختیاتی نظریات ہمیں خاموش دکھائی دیتے ہیں۔اگرچہ ماہرین ساختیات کی اکثریت تاریخ کو ثقافت کا حصہ قرار دیتے ہیں۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ ساختیات،ثقافت کے ذریعہ سے تاریخ کا اثبات کرتی ہے۔مگر اس بات میں حقیقت کا عنصر موجود نہیں ہے۔کیونکہ تاریخ میں تغیر اور ثقافت میں استحکام موجود رہتا ہے۔مغرب میں ساختیات کی جگہ جب پس ساختیات نے لی تو ساختیات کے نظریات پر بڑا اعتراض یہی تھا۔کہ ساختیات تاریخ سے صرف نظر کرتی ہے۔جبکہ پس ساختیات نے تاریخ کا جو تصور پیش کیا وہ مادی واقعے کے طور پر نہیں بلکہ تشکیل کے طور پر تھا۔اس طرح یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ پس ساختیات میں تاریخ کی ساختیاتی پیرہن میں واپسی ہوئی ہے۔

ساختیاتی نظریات کی کلیت پسندی کو دریدا نے چیلنج کیا۔مگر دریدا معنی کے استقرار کا قائل نہیں ہے۔وہ معنی کے سماجی ہونے کا قائل ضرور ہے لیکن معانی کو موجودگی کی ''متھ'' کا پیدا کردہ قرار دیتا ہے۔یورپ میں یہ متھ صوت مرکزیت کی صورت میں موجود ہے۔اس متھ کے مطابق تحریر کے مقابل تقریر کو اولیت اور فوقیت حاصل

ہے۔ اور یہی موجودگی کی متھ ہی معانی کو واحد اور متعین قرار دیتی ہے۔ تقریر کو اولیت دینے کا مطلب متکلم اور مصنف کی موجودگی کو تسلیم کرنا ہے۔

دریدا اس تھیوری کے مقابل ''لوگو مرکزیت تھیوری'' پیش کرتا ہے۔ یہ تھیوری تحریر کو مقدم قرار دیتی ہے۔ اور موجودگی کی متھ کو مسترد کرتی ہے۔ دریدا کی اس تھیوری کے مطابق ''متن واحد معانی کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معانی کے اطراف کھلے دکھائی دیں گے۔ نیز متن کے اندر متن موجود ہوتا ہے۔ جو متن کی ڈی کنسٹرکشن کو متن کا اپنا وقوعہ قرار دیتا ہے''۔ بعض ماہرین ڈی کنسٹرکشن کے اس عمل کو متن کے تجزیے کا طریق کار قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس بات کو اس لیے درست قرار نہیں دیا جا سکتا کہ متن کی ساخت شکنی کا سامان خود متن میں موجود ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے نظریات میں تکثیریت اور اور اضافیت کا جو ذکر موجود ہے وہ بڑی حد تک دریدا کی دین ہیں۔ دریدا معنی التوا، متفرق ہونے کا قائل ہے۔ دریدا نے یہ تصور سوسیور سے لیا تھا۔ دریدا کا کہنا ہے کہ معنی کی کثرت متن پر مسلط نہیں ہوتی بلکہ معنی کی کثرت متن کے اندر موجود ہوتی ہے۔ سوسیور نے ایک لسانی نشان کے دوسرے نشان سے فرق کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ جبکہ دریدا معانی کی کثرت اور عدم استحکام کو زبان کی ساخت میں تلاش کرتا ہے۔(۱۶)

ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے کہ اردو کے بعض ماہرین کی وجہ سے پیدا ہوئی جن کا خیال ہے کہ ''دریدہ کا تصور تکثریت کچھ نیا نہیں ہے۔ معنی کی کثرت کا تصور ہمارے یہاں پہلے سے موجود ہے''۔ دریدا کے یہاں کثرت معانی علامت کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت لسانی وقوعہ کی ہے۔ جب کہ ہماری شعریات میں معنی کی کثرت، سخن سے جڑی ہے۔ دریدا کے ہاں معنی کی کثرت معنی کے عدم استحکام کی وجہ سے ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں معنی کے مسلسل التوا کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ جبکہ دریدا معنی کے التوا کو زبان کی بنیادی

خصوصیت قرار دیتے ہیں۔ ہمارے ماہرین اس سلسلے میں عموماً میر کے اس مصرعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

''طرفیں رکھے ہے سخن ایک چار چار میر''۔

اس سلسلہ میں یہ تسلیم کہ سخن کی چار اطراف کا ذکر بلاشبہ ایک اہم بیان ہے۔ اور ااس کی خاصی اہمیت بھی ہے۔ کیونکہ اس میں منشائے مصنف کی نفی کی گئی ہے۔ اور سخن کو خود مختار قرار دیا گیا ہے۔ اگر معنی ایک سے زائد ہیں تو گویا سخن کا کوئی مرکز نہیں۔ اور منشائے مصنف جو مرکز تک محدود ہوتی ہے۔ جب مرکز کا وجود نہیں رہتا تو مصنف کی کی متن پر اجارہ داری کا بھی خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح متن اپنے معنیاتی اور نشانیاتی عمل میں آزاد ہو گیا۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں اس تصور کو نظریاتی شکل نہیں دی گئی اس لیے اس بات کا اظہار نہیں ہو سکا کہ متن اپنے نشانیاتی عمل میں کس طرح آزاد ہوتا ہے؟۔ نیز معنی کی یہ اطراف لہجے کی پیداوار ہیں یا علامتی پیرائے سے ان کو کشید کیا جاتا ہے؟۔ ہمارے ہاں موجود تصورات محض اس حد تک محدود تھے کہ سخن یعنی شاعری میں ایک سے زائد معنی ہوتے ہیں۔ انکی کیا اہمیت ہوتی ہے اور ان کے پیدا ہونے کی کیا وجوہات ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں محض اندازوں سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ عدمیت اور ڈی کنسٹرکشن کے معمولی سے فرق کو سمجھا جائے۔

۱۔ عدمیت معنی کا انہدام کرتی ہے اس کے برعکس ڈی کنسٹرکشن کا معانی انہدام نہیں ہے۔ اس کے معنی التوا کے ہیں۔

۲۔ ڈی کنسٹرکشن واحد معنی کا انکار کرتی ہے اور معانی کی کثرت کا اثبات کرتی ہے۔ جبکہ عدمیت معانی سے انکار کی قائل ہے۔

معانی کا التوا اس وقت ہوتا ہے جب معانی کو کسی نئے تناظر سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ لفظ کے تناظر کے

بدلنے کے ساتھ ہی اس کے معنی بھی التوا کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس لیے معانی کو غیر مستقل قرار دیا جاتا ہے۔یعنی ایک تناظر میں معانی مستقل ہوتا ہے تو دوسرے میں وہ معنی تبدیل ہو جاتا ہے اور غیر مستقل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت میں معنی کے تناظر کی اہمیت، معنی کے عدم حتمی ہونے اور معنی کی کثریت اور اضافیت جیسے تصورات دریدا کی عطا ہیں۔ جو اس کو ساخت شکن جابت کرتی ہیں۔

دریدا کا مرکز تحقیق زیادہ تر زبان اور کا متن کا مطالعہ رہا ہے۔مگر فوکو سماج اور تاریخ کے مطالعے کو اہم قرار دیتا ہے۔تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔یعنی سماجی، لسانی اور اور متنی تشکیلات کا تجزیہ کرنا۔فوکو بھی تاریخ کو مسلسل آگے بڑھنے والا خط قرار دیتے ہیں۔اور آگے کا ہر مرحلہ پہلے سے بہتر اور مائل بہ ارتقا ہوتا ہے۔فوکو تاریخ کے اس تصور کو ''تشکیل'' کا نام دیتے ہیں۔فوکو تاریخ کو عدم تسلسل کا مظہر قرار دیتے ہیں۔اور اس کو سیدھے خط کی بجائے قوس کا سفر کہتے ہیں۔اور ہر ایک قوس دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔فوکو کے نظریات کا گہرا اثر مابعد نوآبادی نظریاتی تھیوری پر مرتب ہو۔ایڈورڈ سعید اسے ''متنی رویہ'' کا نام دیتے ہیں۔ فوکو کا ڈسکورس طاقت اور غلبے کی شدید خواہش لیے ہوئے تھا۔

''متنی رویہ'' بھی غلبے کی شدید خواہش کا مظہر ہے۔ایڈورڈ سعید اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کہ کس طرح مشرقی ممالک جو غلام تھے کے متعلق لکھے گئے متون میں ان ممالک کے بارے میں کیا رائے قائم کی گئی ور پھر ان متون کی روشنی میں ان ممالک کو نوآبادی بنایا گیا۔گویا یہ متون ہی تھے جن کے ذریعے نوآبادی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اس مزید استحکام دیا گیا۔سامراجی ممالک میں ان ممالک کے حوالے سے جو متن تحریر کیے جاتے رہے وہ پہلے سے موجود متون کی توضیحات اور تشریحات قرار دی جاسکتی ہیں۔جن کا مقصد سیاسی استحکام کے ساتھ ان ممالک کا معاشی استحصال کرنا بھی تھا۔(۱۷) .

اگرچہ ان متون سے یہ گمان جنم لیتا ہے کہ یہ متون محض ان ممالک کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے لیے تحریر کیے گئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان متون کے تحریر کیے جانے کے پس پردہ مقاصد میں غلبے کی خواہش موجود تھی۔ اس قسم کے متو تحقیقی تاریخی واقعات اور سچائیوں کی نمائندگی کے دعویدار تو ہوتے ہیں لیکن ان کو نوآبادیتی ممالک کی خواہشات سے ہم آہنگ نہ ہوتے ہوئے بھی ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس ڈسکورس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ نوآبادیری باشندوں کی اکثریت اسے اپنی تاریخ اور ثقافت کا علم سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ باالفاظ دیگر وہ اس متنی غلبے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس غلبے سے بے خبر ہوتے ہیں۔ مابعد نوآبادیاتی نظریات مابعد جدیدیت کی طرح سچائی کو ہی سماجی تشکیل تسلیم کرتی ہے۔

ایک سوال جو اس حوالے سے اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا جب اس قسم کے متون میں پوشیدہ مقاصد منظر عام پر آ جاتے ہیں تو اس راز کے افشا ہونے پر مابعد جدید مفکر کا رویہ کیا ہوتا ہے؟۔ اس ضمن میں ان مفکرین کو دو مکتب فکر میں تقسیم پایا جاتا ہے۔ ایک مکتب فکر سے وابستہ ماہرین سائنسی رویہ کے حامل جبکہ دوسرے مکتب فکر سے وابستہ ماہرین آئیڈیالوجیکل طرز عمل کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ ان میں سے دریدا، فوکو۔ بادریلا، اور لیوتار سائنس طرز رکھنے والے مکتب فکر سے منسلک ہیں۔ اس کے برعکس تانیثیت پسندوں نے آئیڈیالوجیکل رویے کو قبول کیا۔ اسی لیے وہ تاریخ کے باطل بیانیوں کی بجائے متبادل جدید بیانیوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ نئے اور متبادل بیانیے بھی در اصل نئی تعبیریں ہیں۔ اس لیے بعض ماہرین تعبیریت کو مابعد جدیدیت پر حاوی ڈسکورس قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے اردو میں مابعد جدیدیت کو قبول کرنے کا مطلب متبادل بیانیہ تصنیف کرنا ہے۔ جس میں نئی صورت حال اور تاریخ کا درست بیان کرنا مطمع نظر ہے۔

متن اور نوآبادیات

زبان کو بولنے اور لکھنے کے لیے قدیم یونان میں المیہ کے لیے سب سے پہلے استعمال کیا گیا۔ جبکہ جاپان میں اسے ہائیکو، عرب میں قصیدہ، اور ہندوستان میں داستان کے لیے استعمال کیا گیا۔ لیکن دنیا بھر میں انگریزی کو بولی، لکھی اور سمجھی جانے والی زبان کے طور پر اپنایا جاتا ہے۔ برصغیر پاک وہند ایک طویل عرصے تک برطانوی تسلط میں رہ۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہاں انگریز دور کے اثرات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جہاں تک ہندی زبان کا تعلق ہے۔ بولنے میں اردو ہندی جیسی لیکن تحریر کی صورت میں دونوں زبانوں میں واضح فرق موجود ہے۔ زبان کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس بات میں ہرگز مبالغہ آرائی نہں کہ ہندوستان دنیا کا وہ واحد خطہ ہے جہاں لسانی تنوعات سب سے زائد ہیں۔ یہاں کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات، تمدنی اور تاریخی حالات کی وجہ سے یہاں کی زبانیں باہم اثر پذیر رہیں۔ اس لیے اردو کا مطالعہ محض اردو زبان تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ کئی زبانوں کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ کہلاتا ہے۔ اس لیے لسانی مباحث میں متنوع مگر نزاعی نظریات موجود ہیں۔ ایسے نظریات بعض اوقات متنازعہ بھی ہوتے ہیں۔

ادبی متن کی پہچان یا شناخت غیر ارتقائی یا غیر ثقافتی نہیں ہوسکتی۔ انسان متن ساز ہونے کے ساتھ ثقافت کا جزو بھی ہے۔ سو یہ دوطرفہ معاملہ ہے۔ ادب کی شناخت میں کسی ایک محرک کو اہم قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے کثیر الجہت محرکات ہوتے ہیں۔ مثلاً مقام، حالات، روایات اور تاریخ وغیرہ جیسے محرکات بھی اس شناخت کو واضح کرنے میں اپنا قردار ادا کرتے ہیں۔ یہ محرکات انسان کے دل اور دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ جس کے ردعمل میں انسان کا ثقافتی اور نفسیاتی مقام متعین ہوتا ہے۔ جس سے ابلاغ کی صورتیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تخلیقی مقام میں تغیر

قانون حرکت سے تعبیر ہے۔حرکت، تناظر سیاق اور متن تینوں خطوط پر ہوتی ہے۔ یہ حرکی توانائی کئی قسم کی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے۔ جدید و مابعد جدید اصطلاحات میں لفظ ڈسکورس کو متن کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن ان دونوں میں فرق موجود ہے۔

''متن (ٹیکسٹ) خاص صنف ادب ہے جبکہ ڈسکورس کا تعلق سیاق وسباق کی وضاحت سے ہے''۔

متن ساخت یعنی ہئیت ہے جس کا انحصار لسانی اکائیوں کے انتخاب و انسلاک پر ہے۔ جو لغوی معنی پر ذور دیتے ہیں۔ جبکہ ڈسکورس کے معنی اصطلاحی اور ثقافتی ہوتے ہیں۔عصری تنقیدی ادب کی رو سے کسی صنف ادب میں معنی خیزی اور تعبیر کا عمل متن سے زیادہ ڈسکورس پر انحصار کرتا ہے۔اردو کی موجودہ مابعد جدیدیت مشکل صورتحال سے دو چار ہے۔ کیونکہ اس میں ڈسکورس کے مندرجات کو مرحلہ وار قبول کیا جا رہا ہے۔جس میں متن اور ڈسکورس کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جا رہی۔اردو میں سیمیات اور ساختیات کے فرق کو بھی واضح طور پر سمجھا نہیں جا رہا۔اسی طرح لفظ کے لغوی اور ثقافتی معنوں کا بھی بغور جائزہ لیا جائے تو ساختیات اور پس ساختیات میں بھی کم وبیش یہی فرق نظر آتا ہے۔

ناول اور کہانی میں متن کی جگہ بیانیہ کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ بیانیہ کے ایک حصہ کو پلاٹ جبکہ دوسرے حصے کو کہانی کا نام دیا جاتا ہے۔کہانی اور پلاٹ دونوں کو وحدت تاثر کو ڈسکورس کہا جاتا ہے۔ یہ بیانوی ساختوں میں شعوری اور لاشعوری طور پر نظر آتے ہیں۔ساختیاتی فکر ادبی جمالیات کا صوتی، معنوی اور نحوی سطح پر مطالعہ پیش کرتی ہے۔اس طرح تھیوری نے دو الفاظ کے ذریعہ ادب اور لسان کے درمیان موجود اختلاف کو ختم کر دیا اور یہ الفاظ ''متن اور ڈسکورس'' ہیں۔لسانی تشکیلات اور ڈسکورس کا امتزاج ہی ادبی متن کہلاتا ہے۔(۱۸)

ثقافتی اکائیاں ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں اور وسیع معنوی نظام کی تشکیل کرتی ہیں۔اس لیے فکر اور

خیالات کی اڑان اس سماجی لسان کے زیر اثر ہوتی ہے جس میں رہتے ہوئے ادیب تخلیقی عمل کو سرانجام دیتا ہے۔مغرب میں نظریہ کی اہمیت تخلیق سے زیادہ ہو گئی ہے۔اس کی وجہ تخلیق میں تخلیق کار کا ذاتی عمل دخل ہے۔نظریہ کا حاصل کل ڈسکورس کا تجزیہ ہے۔لہذا اس کا اطلاق کسی بھی سماجی سرگرمی پر ہوسکتا ہے۔کچھ عرصہ قبل کوئی بھی ادب کی ثقافتی یا مادی تعبیر ماننے کو تیار نہ تھا۔بدلتے وقت کے ساتھ جب ادبی مباحث کو ادب میں جگہ ملی تو ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔جس کے بعد مکانی میٹا فورسز بھی ادب کا حصہ بننے لگیں۔ادب میں انسانی رنگ ونسل، شناخت،موضوعیت،اور ثقافت سے الگ دیکھنے کی روایت اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔مغرب ہو یا مشرق وقت کے ساتھ سوچ کے انداز بھی بدلتے چلے جاتے ہیں۔معاشرے میں مفاہمت اور مزاحمت دونوں طرح کے رویے پائے جاتے ہیں۔

انسان کا لفظ سے رشتہ کثیر الجہت ہے۔اس میں اس کا نظریاتی جذباتی یا ادبی شعور کا عمل دخل بھی موجود رہتا ہے۔اس میں اس کے جذبات،معاشی اور سماجی محرکات کے اثرات موجود رہتے ہیں جو محرک کے طور پر کام کرتے ہیں۔ادبی متن کبھی بھی غیر ارتقائی اور غیر ثقافتی نہیں ہوسکتا۔جس طرح انسانی شناخت کو وضع کرنے کے لیے کوئی ایک محرک نہیں بلکہ کئی محرکات مل کر اس کی شناخت میں معاون ہوتے ہیں جن میں سماج،ثقافت،رشتے،ذات پات،گروہی طاقت،معاشی وسائل اس کا معاشرہ میں مقام کا تعین کرتے ہیں اسی طرح ادب کا معاملہ بھی ہے جس کے تعین کے لیے بھی محرکات موجود ہیں۔ان محرکات میں متن کا موضوع،سیاق وسباق،اسلوب اور جمالیات اور ان جیسے دیگر کئی محرکات عقب میں کارفرما رہتے ہیں۔

جدید و مابعد اصطلاحات میں ڈسکورس کو متن کے معنی میں سمجھا جانے لگا۔مگر یہ بات واضح ہو کہ متن اور ڈسکورس ایک دوسرے سے الگ شناخت کے حامل ہیں اور ان کو ایک قرار دینا غلط ہے۔ان دونوں میں موجود فرق

کی پہلی پہچان یہ ہے کہ متن ادبیکی ایک خاص صنف ہے جبکہ ڈسکورس کا تعلق اس صنف ادب کے سیاق وسباق سے ہے۔ جو کہ تاریخی، مذہبی، سیاسی، ثقافتی، سماجی، اور دیگر ایسے عوامل سے ہو سکتے جن کا کام متن کے معنی کے تعین میں مدد دینا ہے۔ دوسر پہچان یہ ہے کہ متن ایس ساخت یا ہئیت ہے جس کا انحصار لسانی اکائیوں کے انتخاب اور انسلاک پر ہے جو لغوی معنی پر ذور دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ڈسکورس کے معنی اصطلاحی اور ثقافتی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ کسی صنف ادب کی معنی خیزی اور تعبیر کا کام متن سے زیادہ ڈسکورس سرانجام دیتا ہے۔(۱۹)

ثقافتی اور نظریاتی تصورات کے زیر اثر فلسفہ، لسانیات، نفسیات اور دیگر علوم کو ایک چھتری تلے جمع کر دیا ہے۔ اس طرح متون کی تفہیم اور تعبیر کی کوششوں کو ایک نئ جہت عطا کر دی ہے۔ اور نئ توانائی فراہم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ نظریہ اور جمالیات میں تعلق کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کو روسی فارمل ازم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جس میں شعر وادب کے جمالیاتی مباحث پر بھر پور بحث موجود ہے۔ ساختیاتی فکر ادبی جمالیات کا صوتی ،نحوی اور معنوی سطح پر مطالعہ کو پیش کرتی ہے۔ اسی طرح مارکسزم اور مابعد جدیدیت کے نظریات نے زمان اور مکان جیسی تراکیب میں فرق کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ اس طرح ان نظریات اور تحریکات نے ادب اور لسان کے درمیان جاری طویل بحث کو دو الفاظ متن اور ڈسکورس تک محدود کر دیا ہے۔ تھیوری میں لسانی تشکیلات اور ڈسکورس کا امتزاج ہی اب ادبی متن خیال کیا جاتا ہے۔

جیکب سن کی شعریات اور نئ تنقیدی تھیوری

نئ تنقیدی نظریات نے شعریات کے ضمن میں دو پہلو سے اپنے نظریات کو پیش کیا ہے۔ ایک تو شعریات کو خود ادب میں دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے دوسرا اس کی تلاش زبان میں کی گئی ہے۔ یعنی ایک طرف یہ سمجھا گیا کہ زبان کی تہہ میں جامع تجریدی نظام موجود ہے جو زبان کی تمام کارکردگی کا ضامن ہے۔ ایسا ہی نظام ادب

کے پس پردہ کارفرما ہے۔اس طرح ادب اور زبان کو تمثیلی منطق کے زیر اثر مساوی تصور کیا گیا۔دونوں کو ایک جیس کارکردگی کے حامل متوں سمجھا گیا۔ساختیات ایک جبر آمیز نظریہ کی بجائے ادب کا مطالعہ سائنسی طریق کار سے کرتی ہے۔اس طرق کار کی مدد سے ادب کی تہہ میں موجود کارفرما عوامل کو منظر پر لایا جاتا ہے۔

دوسری جانب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شعریات زبان کی تہہ میں موجود ہے۔اس طرح شعریات کو زبان کا وظیفہ قرار دیا جانے لگا۔یہ امر واضح رہے کہ دونوں تصورات ساختیات سے ماخوذ ہیں۔جس کی ایک مثال رومن جیکسن اور رولاں بارتھ ہیں۔جن میں سے رومن جیکسن شعریات کو زبان میں جبکہ رولاں بارتھ شعریات کو ادب میں تلاش کرتے ہیں۔رومن جیکسن نے اپنے نظریہ کو ترسیلی ماڈل کی شکل میں پیش کیا۔اس ماڈل کی رو سے ایک پیغام کی ترسیل میں چھ عناصر حصہ لیتے ہیں۔

۱۔مقرر۔

۲۔پیغام۔

۳۔سامع۔

۴۔تناظر۔

۵۔کوڈ۔

۶۔وسیلہ۔

مقرر جب سامع کو کوئی پیغام بھیجتا ہے تو وہ ایک کوڈ میں مضمر ہوتا ہے۔اور تناظر میں بامعنی ہوتا ہے۔نیز اس پیغام کی ترسیل کسی وسیلے (زبان یا تحریر) سے ہوتی ہے۔اس ماڈل کی بنیاد پر زبان کے چھ بنیادی وظائف مقرر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ترسیلی عمل کے دوران جب بنیادی اہمیت مخاطب یا مقرر کو دی جائے تو زبان کا وظیفہ جذباتی ہو جاتا ہے۔

۲۔ ترسیلی عمل میں جب ذور سامع پر ہو تو زبان کا لہجہ ارادی ہوتا ہے۔ جس کا مقصد سامع تک گفتگو کے مدعا کی رسئی ہوتی ہے۔

۳۔ جب ترسیل کے عمل میں اہمت تناظر کو دی جاتی ہے تو زبان کا وظیفہ حوالہ جاتی ہو جاتا ہے کیونکہ اس عمل میں کلام کے معنی کا تعین اس کے سیاق وسباق کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔

۴۔ ترسیلی عمل میں جب مرکز کوڈ کو قرار دیا جاتا ہے تو اس کو کھولنے اور اس سے دریافت ہونے والے معنی تک رسائی کے لئے میٹالینگوئج طرق کا کو اپنایا جاتا ہے۔

۵۔ عمل ترسیل کے دوران جب ذور وسیلے پر دیا جاتا ہے تو اس کا بنیادی مقصد رسمی معنی تک زبان کو رسائی دے کر سامع کو معنی کی فراہمی ہے۔

۶۔ اس طرح ترسیل کا سارا ذور جب پیغام پر ہو تو زبان کا وظیفہ شاعرانہ ہو گا۔

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس ترسیلی ماڈل کے ذریعہ رومن جیکسن کا مدعا یہ ہے کہ شعریات کا مقصد محض شاعری ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کو انہوں نے اپنے ترسیلی ماڈل کا حصہ نہیں بنایا۔ اس کے ساتھ انہوں نے شاعری کی شعریات کو بھی مخصوص زبان کے استعمال تک محدود قرار دیا ہے۔ رومن جیکسن کے مطابق زبان کے یہ چھ اجزا جب ایک ہی وقت میں کارفرم ہوتے ہیں تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ جب ان چھ وظائف کی درجہ بندی کی جاتی ہے تو ہمیں پہلے درجہ پر پیغام نظر آتا ہے۔ باقی تمام وظائف اس کے بعد آتے ہیں۔ پیغام زبان کے حوالہ جاتی، تناظراتی، اور دیگر وظائف پر حاوی ہوتا ہے۔(۲۰)

یہ بات تسلیم کرنا ہو گی کہ شعر کو جب نثری حالت میں ڈھالا جاتا ہے تو زبان کے عناصر کی ترتیب اور درجہ

بندی بدل جاتی ہے۔ چنانچہ پیغام کی ترسیل جس انداز سے شعر میں ہو رہی ہے اس کی ایسی ترسیل نثر کی صورت میں نہیں ہوسکتی۔ شعر پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں تمام لسانی عناصر متحرک ہو جاتے ہیں۔ جس سے ایک ایسا دائرہ تشکیل پاتا ہے جس کا مرکز کوڈ کو قرار دیا جاتا ہے۔ کوڈ وہ پیغام ہے جس کو شعر کے ذریعہ سامع تک پہنچانا مقصود ہے۔ اس پیغام کی شعریت کا دارومدار اس کی مرکزیت پر ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی بدولت نہیں بلکہ اپنے اثرات کی وجہ سے سوسیور کے لانگ سے مماثل ہے۔ اگر بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اگر مرکزیت کو بدل دیا جائے اور پیغام کی جگہ مرکزیت سامع یا تناظر کو حاصل ہو جائے تو کیا ساری شعریت زائل ہو جائے گی۔

جب ہم اردو زبان کی شاعری کے مختلف ادواد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان ادوار میں زبان کے عناصر کی ترتیب میں واضح تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً اردو کی ترقی پسند شاعری میں تناظر کو اولیت دی گئی ہے جبکہ رومانوی شاعری میں اولیت متکلم اور عوامی شاعر میں سامع کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ رومن جیکب سن کے پیش نظر جدید شاعری ہے جس میں وہ مرکزیت پیغام کو دے رہے ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ ایک ہی شعر کو پڑھتے ہوئے ہم ایک سے زأد طریقوں کو استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے لسانی عناصر پر ذور کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ جیکب سن کا ماڈل محدود لسانی ماڈل ہے۔ جو لسانی وظائف کے درمیان امتیازات قائم کر کے جدید شاعری کے بنیادی اصول کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ وضاحت اپنے مخصوص دائرہ کار میں انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ جیکب سن کے ماڈل سے ہم فکشن کی شعریات کو مرتب کرنے میں بھی مدد لے سکتے ہیں۔ مثلاً جاسوس فکشن میں کوڈ پر ذور رہوتا ہے۔ داستان میں سامع پر اور افسانہ نویسی میں حقیقت نگاری کے حوالے سے زور تناظر پر ہوتا ہے۔

ساختیاتی لسانیات فکشن اور شاعری کی شعریات کی تدوین میں کئی طریقوں سے مدومعاون ثابت ہوسکتی ہے۔ ساختیات زبان کے نظام کو ضابطوں اور رسمیات سے عبارت قرار دیتی ہے۔ جن کی تشکیل میں بنیادی اہمیت

ثقافت کو حاصل ہے۔اس طرح ادب کا نظام شعریات بھی ضابطوں اور رسمیات پر مشتمل ہے۔جن کی تشکیل ثقافت کے زیر اثر ہوتی ہے۔اس طرح یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ساختیاتی لسانیات کسی ادب پارے کے تعبیر اور تجزیے میں مدد دینے کی بجائے ادبی متن کی ساخت کو سمجھنے اور ترتیب دینے کے لیے ماڈل فراہم کرتی ہے۔ایسا بھی نہیں ہے کہ ساختیاتی لسانیات متن کے تجزیات کا کوئی نیا طریقہ فراہم نہیں کرتی۔

رومن جیکب سن نے ایک مقالہ بعنوان ''لسانیات وشعریات'' انڈیانا یونیورسٹی میں پیش کی۔جس میں ان کے سامنے یہ سوال موجود تھا کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو لسانی عمل کو آرٹ کا نمونہ بناتی ہے؟۔جیسا کہ معلوم ہے کہ ساختیات زبان کے نظام میں موجود فرق کو بنیادی اہمیت دیتی ہیاس کے لیے ہر وہ نشان اہم ہے جو صوتی، تکلمی اور معنوی سطح پر دوسرے سے مختلف ہے۔ورنہ کسی نشان میں فطری یا منطقی سطح کا کوئی معنویاتی نظام موجود نہیں ہے۔اس اصول کی رو سے ساختیات ''فرق اور اضدادی'' جوڑوں کو متن کے معنی خیزی کے عمل میں بنیادی اہمیت دیتی ہے۔

ان مباحث سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ساختیاتی لسانیات ادبی متن کی تفہیم میں مدد دینے کی بجائے ادبی متن کی ساخت کو سمجھنے کا ماڈل اور طریقہ کار فراہم کرتی ہے۔مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ساختیات متن کی تعبیر کا کوئی نیا طریقہ فراہم نہیں کرتی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مختلف زبانوں کی ساخت اور ہیئت کا مطالعہ کیا جانے لگا۔اس طرح لسانی مطالعے کا ساختیاتی نقطہ نظر فروغ پانے لگا۔اس نقطہ نظر کی بدولت توضیحی لسانیات اور فونیمیات کے تصورات نے جنم لیا۔لسانی ساخت کے تجزیاتی مطالعے کا نام ساختیات ہے۔

فونیمیات اور ساختیات کے بیشتر مباحث مشترک ہیں۔فونیمیاتی ماہرین لسانیات نے مواد اور ہیئت کو

مربوط قرار دے کر زبان کو ایسے عناصر کا بناؤ قرار دیا ہے جن میں سے ہر عنصر کی منصبی قدر اور تفاعلی حیثیت ہوتی ہے۔ ساختیاتی ماہرین نے ان کا اطلاق زبان کے تمام پہلوؤں پر کیا۔ اس طرح ساختیاتی مطالعے کی کئی سطحیں سامنے آئیں۔ جن میں صوتی، تشکیلیاتی، صرفی ونحوی، معنیاتی اور اسلوبی شامل ہیں۔ زبان کا صوتی سطح کا تجزیاتی مطالعہ فونیمیات کہلاتا ہے۔ اسی طرح زبان کا صرفی اور نحوی سطوحات کا مطالعہ جدید لسانیاتی گرامر کہلاتا ہے۔ ان کے جملہ مباحث کو توضیحی لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ معنیات پر ساختیات کے اطلاق سے مانی کے مختف پہلوؤں کے درمیان موجود تضادات اور مترادفات کے متعدد مباحث ایک نئے شعبہ کو جنم دیتے ہیں جسے ساختیاتی معنیات کہا جاتا ہے۔ (۲۱)

ساختیات کا لفظ کم وبیش ہر لسانیاتی دبستان میں موجود رہا ہے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر دبستان نے اس کی تعبیر الگ انداز میں کی ہے۔ اس کی ایک مثال امریکہ اور یورپ کے تصورات میں موجود واضح فرق ہے۔ تاہم دونوں دبستان اس بات پر متفق ہیں کہ زبان کی تالیف وترکیب اور عناصر کے درمیان ربط کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے ساختیاتی اکائی کی ضرورت ہے۔

یورپ میں فروی نند دا ساسور کی کتاب ''لسانیات عامہ کا نصاب'' کو ساختیاتی لسانیات کا آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ ساسور کی وفات کے بعد شائع کیے جانے والے نسخہ کو ساختیات اور فونیمیات کا سنگ میل قرار دیا جاتا ہے۔ (۲۲) ساختیات کی بیشتر اصطلاحیں اسی نسخہ سے لی گئی ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں بہت سے تضادات اور ابہام موجود ہیں تاہم ساسیور کے تصورات کی بنیاد واضح اور وقیع ہے۔ اس کا تصور ساختیات لسان کے نظام کا تکلمی زبان سے تقابل کراتا ہے اسی طرح مواد اور ہئیت کا تقابل بھی ساسیور کے تصور ساختیات کا اہم حصہ ہے۔

نظام لسانیات سے ساسیور کی مراد تشکیلیات کی وہ کُلی حیثیت ہے جو بول چال میں مستعمل ہو اور تکلمی

زبان کی تہہ میں موجود ہو۔ ساسیور کے مطابق ہر لسانی اکائی نسبتوں پر قائم ہونے والی ساخت کا حصہ ہے۔ جس کی ماہئیت اور اس کا وجود لسانی نظام کی دوسری اکائیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ زبان کا نظام خود انحصاری نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس نظام کی بقاء اس کے اجزا اور عناصر کے باہم متصل اور ایک دوسرے کے دست نگر ہونے میں ہے۔ تکلمی زبان ایسا قواعدی نظام ہے جو لسانی گروہ کے اذہان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر گھر کر لیتا ہے۔ گویا وہ اہل زبان کے ذہنوں میں جوڑوں کی صورت میں ترتیب پا لیتا ہے۔ انہی جوڑوں کو لسانی تجرید کہا جاتا ہے۔ ساسیور ان جوڑوں کی توضیح وتشریح کو لسانیات کا حقیقی مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ (۲۳)

ساسیور کے نظریات نے ڈنمارک، چیکوسلاوکیہ، غازان (روس) اور کئی دیگر ممالک میں فروغ پایا۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اہل یورپ میں موجود ساختیات کا تصور ساسیور کے زیر اثر رہا۔ جس کے مطابق ''زبان میں مجرد نسبتی ساخت مضمر ہوتی ہے۔ اس میں اور تکلم میں فرق کیا جانا چاہئے۔ ساختیات کا نقطہ نظر یک زمانی اور محض توضیحی لسانیات تک محدود نہیں ہے۔ معانی، فونیمیات اور گرئمر کا مطالعہ ساختیاتی انداز میں ممکن ہے۔ اگرچہ ساسیور نے ساختیات کو یک زمانی توضیحی لسانیات قرار دیا تھا اور تاریخی لسانیات کو لسانیات کے تاریخی ارتقاء سے موسوم کیا تھا لیکن ساسیور کی اس تفریق کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

نامور ماہرین لسانیات جیکب سن اور ٹروبز کی جن کا تعلق ساختیات کے پراگ دبستان سے تھا نے ساختیاتی نقطہ نظر میں اس قدر وسعت پیدا کر لی۔ جس کی وجہ سے ان دونوں لسانیاتی مناہج کو ساختیات میں سمویا جا سکتا تھا۔

اس طرح ساختیاتی تصور کا اطلاق تاریخی لسانیات پر بھی کیا جانے لگا۔ جس کی وجہ سے فونیمیات اور گرائمر کا مطالعہ کے ساتھ معنیات کا مطالعہ بھی ساختیاتی نقطہ نظر سے ہونے لگا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ عام ماہرین

لسانیات نے لسانیات کے ارتقاء کو نظر انداز کر دیا اور یک زمانی لسانیات کے دائرے تک محدود ہو گئے۔اور کچھ گرائمر کے تصورات میں کھو گئے۔ان میں سے بعض نے مواد اور معنی کو نظر انداز کیا ور ہئیت پر اپنی توجہ کو مرکوز کیے رکھا۔اور اکثر نے خود کو ساختیاتی رشتوں کی تجرید تک اپنی دلچسپی کو محدود رکھا۔

یورپ میں لسانیات کے معروف دبستان

بیسویں صدی کے پہلے نصف تک لسانیات کے معروف ساختیاتی دبستان درج ذیل ہیں۔

۱۔پراگ سکول آف لنگوسٹکس۔(جیکب سن،ٹربز کی)

۲۔کوپن ہیگن سکول۔

۳۔لندن سکول۔ (جس کی بہترین نمائندگی فرتھ نے کی۔)

ان دبستانوں سے وابستہ دانشور ماہرین فونیمیات کہلاتے ہیں۔ان میں سے بعض ماہرین نے فونیمیات کے ساتھ ساتھ ساختیات پر زیادہ توجہ مرکوز کی ان کو ماہرین ساختیات کہا جاتا ہے۔یہ ماہرین زبان کی جزئیات سے زیادہ زبان کے نظام میں دلچسپی لیتے تھے۔ان کے نزدیک جزئیات اور تفاصیل ایک ہی نظام کا حصہ ہیں اور ان کا تجزیہ نظام کے زیر اثر ہی ممکن ہے۔ان ماہرین نے جن میں ٹروبکی کا نام سر فہرست ہے نے زبان کی کُلی اور مجموعی حیثیت کے مابین نہ صرف تعلق کو تلاش کیا بلکہ ان کا نظام لسان کی دوسری اکائیوں کے ساتھ تعلق کا بھی جائزہ لیا۔

ان ماہرین نے زبان کی لسانی اکائیوں کے درمیان تقسیم کا مطالعہ بھی کیا اور ان کی درجہ بندی بھی کی گئی۔اور یہ بھی بتایا گیا کہ کتنے فونیم یا مصوتے کلمے کے آغاز، وسط، اور اختتام میں استعمال کئے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ کلموں کی آوازوں کا سقوط اور ادغام کن مواقع پر اور کیوں ہوتا ہے۔لسانی مطالعے کی اس جہت کی بدولت

زبان کی تشریح اور توضیح کے طریقوں میں بہتری آئی اور یہ مزید واضح اور جامع ہو گئے۔ٹروبز کی کے دور میں قواعدی ساخت کی توضیح اپنی ابتدائی منزل پر تھی۔قواعدی قوانین کی شقوں میں اور مظاہر کے بیان کے لیے مکمل نظریہ موجود نہیں تھا۔

ساختیات کے حوالے سے موثر ترین نظریہ ڈنمارک کے ماہر لسانیات hjelmslev کی یادگار Glossematic میں ملتا ہے۔اس نے ساسیور کے علاوہ ساختیات کے تمام مکاتب فکر کو نظرانداز کرنا چاہا۔ اس طرح لسانیات کو باقاعدہ سائنس بنانے کی کوشش کی گئی۔اور باضابطہ لسانی الجبرا کی داغ بیل ڈالی۔لسانی الجبرا کو ایسا ماڈل قرار دیا گیا جس کی مدد سے کسی بھی زبان کی تشریح وتوضیح ممکن ہو سکے۔یہ ماڈل زبان کو مکمل اور خودمختار نظام عطا کرتا ہے۔جس کی یکتائی مسلم ہے۔

ان حوالوں سے ساختیات کی جو تعریف ہمارے سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے۔''ساختیات تفاعلات یا مناصب کا بناؤ ہے،جس سے اندرونی انحصاریت کی خوداختیاری کا اظہار ہوتا ہے۔اس طرح اس ماہر لسانیات نے منطق اور زبان کے نظام کو مشترکہ اصول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔جسے نیم منطقی طفیلی نظام قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ بات واضح ہے کہ حقیقی اور ظاہر حوالوں کے بغیر منطق کے ماتحت نظام میں تجریدی تشکیلات وجود میں آسکتی ہیں۔اور استدلال کی چھوٹی سی خامی قیاس آرائی کو جنم دے سکتی ہے۔ان فیصلوں کے نتائج کو جو غلط ہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔اس میں دورائے نہیں کہ Hjelmslev نے اپنے نظریہ کی وکالت میں چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔Hjelmslev نے حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے انداز بیان میں قطعیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن محض الجبرا اور سائنس کی بدولت انسان کی سماجی زندگی کے حقائق تک رسائی ناممکن اور محض قیاسی مفروضہ لگتی ہے۔اسی لیے ساختیات کے ناقدین ماہرین ساختیات کو مطعون کرت رہتے ہیں اور ان کو عالم بالا میں کھویا ہوا

قرار دیتے ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ساختیات کے Hjelmslev جیسے ماہرین نے زبان کی ماہئیت اور لسانیات کے بنیادی تصور کوختم کرنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح کی شدید نظریہ پرستی دیگر سائنسی علوم میں بھی اپنے اثرات دکھتی رہی ہے۔

ساسیور کے تصورات کو ساختیات میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ ماہرین ساسیور کے ان چار تصورات کی تشریح اپنے طور پر کرتے رہے ہیں اور ان تصورات کی تنسیخ اور ترمیم و توثیق کا عمل بھی مختلف ادوار میں جاری و ساری رہا ہے۔ساسیور کے چار اہم تصورات یہ ہیں۔

۱۔زبان اور تکلمی زبان میں فرق۔

۲۔ہئیت اور مواد میں فرق۔

۳۔لسانیات کی بنیادی اکائیوں کی صرفی ونحوی تقسیم۔

۴۔ یک زمانی یا تاریخی لسانیات

پراگ اور کوپن ہیگن مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین لسانیات نے ان تصورات میں ایک اور تصور کا اضافہ کر دیا کہ تمام زبانوں کے فونیم کو مزید چھوٹے ارکان میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔آواز اور معنی کے امتیازات کی فہرست آفاقی اور طویل ہو سکتی ہے۔لیکن معانی کا انتخاب ہر زبان اپنے طور پر کرتی ہے۔ یہ مفروضہ لسانی اضافیت کے نظریہ کو جنم دیتا ہے۔ پراگ سکول سے منسلک ماہرین لسانیات نے ساختیات اور تفاعل میں تعلق پید کرنے کی کوشش بھی کیہے ۔ان کے مطابق ''تفاعلیات'' کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ ''ہر لسانی نظام کا تعین اور تشخص ان مناصب اور تفاعلات پر ہوتا ہے جنھیں تمام زبانوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔'' چونکہ کچھ انسانی ضروریات ایسی ہوتی ہیں جو اقوام علم میں مشترک ہوتی ہیں ۔ اور ان مشترک ضروریات کو تکمیل کے مراحل سے گذارنے کے لیے

توضیحات، تشریحات اوراوامر اور نواہی کی ضرورت پیش آتی ہے۔

لہذا زبان کے استعمال میں خبریہ، فجئیہ، بیانیہ اور امرونہی کے جملوں کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔اس طرح حسب ضرورت موقع محل کی مناسبت سے کسی شے یا شخص کی طرف اشارہ کرنے کے لیےصوتی قواعد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔جس کے لیےقواعد اور معنی کے تقاضوں کے زیر اثر لسانی اشارے اور کلمے مرتب کیے جاتے ہیں۔جن میں کلام کی موقع محل کے حوالے سے خصوصیات کی عکاسی ہوتی ہے۔یقیناً ایک سماج کی معاشی اور معاشرت زندگی دوسرے سماج سے مختلف ہوتی ہے۔جس قدر یہ اختلاف دو معاشرتوں میں موجود ہوگا اسی قدر زبان کی قواعد اور لغوی ساخت میں فرق ہوگا۔

اگر ایک مخصوص معاشرے میں کسی ایک شے سابقہ ہی نہ پڑا ہوتو اس معاشرہ کی مروجہ زبان کی قواعد میں اس شے سے متعلق کسی لغت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔اس لیے زبان کی قواعد، اس کے جملے اور اس کی ساخت لسانی گروہ کے رویوں ذہنی رجحان کی عکاس ہوتی ہے۔جے آر فرتھ کی تھیوری کا لب لبھی یہی ہے۔اگر چہ فرتھ اور اس کے مقلدین نے ساسیور کے اثر کو قبول نہیں کیا تاہم ان کی روش ساختیاتی ہی ہے۔برطانیہ میں ساختیات کے جن ماڈلز کو اہم گردانا جاتا ہے ان میں فرتھ کے ماڈل کی چھاپ واضح نظر آتی ہے۔اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ برطانیہ کے ساخت کے حوالے تصورات پر فرتھ دبستان کا غلبہ ہے۔

امریکہ اور لسانیاتی مباحث

امریکہ میں ساختیات کا ن نقطہ آغاز بشریاتی نظریہ سے ہوا۔فرانز بوس نے زبان کی تفہیم اور حقیقت اور ماہئیت سے متعلقہ مروجہ تعمیم پر تنقید کی اور کہا کہ ہر زبان کی تفہیم و توضیح اس کے لسانی شواہد کو مدنظر رکھ کر کی جانی چاہئے۔کیونکہ ہر زبان کی ساخت الگ ہوتی ہے۔اسی طرح ایڈورڈ سپیر نے اپنے تجزیات میں ان امیریکی انڈین

زبانوں کے قواعدی معنی اور اقسام کو پیش کیا۔اور ان ثقافتوں کو زیر بحث لایا جن میں یہ ثقافتیں نشونما پاتی رہیں۔''
وھارف'' نے نظریہ پیش کیا کہ زبان ،فکر و ادراک کا تعین و تشخص کرتی ہے۔ ان تمام ماہرین کے میں بلوم فیلڈ کا
لسانی کارنامہ''Language'' دور رس نتائج کا حامل ہے۔اس نظریے نے در حقیقت امریکہ میں لسانی
ساختیات کی راہ ہموار کی۔بلوم فیلڈ نے ساخت کے تجزیے کا صوتی اور نحوی سطح پر ایک نیا تصور پیش کیا۔اس نے
پراگ دبستان سے لسانیات کی تعلیم حاصل کی اس لیے فونیمیات اور ساختیات کے بارے میں اس کا علم خاصا وسیع
تھا۔اس کا اہم کارنامہ اجزائے متصل کے تجزیے کی جانب ساختیات کو آشنا کیا۔اس لیے بلوم فیلڈ کو امریکہ میں
ساختیات کا امام کہا جاتا ہے۔اس نے زبان کے تجزیات میں فونیم ،تخالف ،ممیّز اور مختص حیثیت پر اپنی توجہ کو مرکوز
رکھا۔ان کا خیال تھا کہ زبان کی کوئی بھی ایسی تعریف جو مختص اور غیر مختص ،ممیّز اور غیر ممیّز میں فرق نہیں کر سکتی وہ
زبان کی وضاحت نہیں کر سکتی۔بلوم فیلڈ کے مطابق فونیم اور غیر فونیم کا کردار زبان کی ساخت میں انتہائی اہمیت کا
حامل ہوتا ہے۔بلوم فیلڈ کرداریت پسند نقطہ نظر کا حامل انسان تھا۔اس لیے اس نے سائنسی معروضیت کو زیادہ
اہمیت نہ دی اس کے نزدیک معنی ،محرکات اور زبان کے عمل اور ردعمل کا باہمی تولق ہی سب کچھ ہے۔بلوم فیلڈ کے
مطابق سائنس بہت سے ایسے تصورات کی جامع توضیح نہیں کر سکتی اس لیے اس کا مطالعہ معنی خیزی کے میں نتیجہ پیش
نہیں کر سکتا۔بلوم فیلڈ کے بعد آنے والے ماہرین پر ان کے نظریہ کی چھاپ اس قدر گہری تھی کہ آج بھی معانی
سے چشم پوشی امریکی ساختیات کی نمایاں خصوصیت ہے۔(۲۳)

بلوم فیلڈ نے صرف کے ضمن میں مارفیم کا تصور پیش کر کے اسے قواعد کی تشریح کی بنیاد قرار دیا۔ان کے
مطابق مارفیم آزاد اور بالذات دونوں حالتوں میں پائے جاتے ہیں۔ایسے مارفیم جو تابع ہوتے ہیں ان کے معنی
لغوی نہیں ہوتے بلکہ قواعدی ہوتے ہیں۔مثلاً کرسیاں اور کتابیں میں ''یں'' کے لغوی معنی کچھ نہیں ہیں لیکن یہ قواعد

کی رو سے جمع کے معنی میں آ رہا ہے۔ تابع مارفیم ہمیشہ دوسرے مارفیم کے ساتھ آتا ہے۔ یہ کبھی اکیلا استعمال نہیں ہوتا۔ مارفیم ایک یا ایک سے زیادہ فونیم پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ کسی بھی زبان کے مارفیموں کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا جائزہ فونیم اور اس کے بعد فونیمی سلسلوں کے حوالے سے ہونا چاہئے۔ بلوم فیلڈ مارفیم کے متن کو Sememe کہتا ہے اور مارفیم کو کلمے کا ایک حصہ قرار دیتا ہے۔ بعد میں آنے والے ماہرین نے اسے تجریدی اکائی کا نام دیا ہے۔ اور ان ماہرین نے کلمے کے اصل ٹکڑے کو ''مارف'' کا نام دیا ہے۔ درحقیقت مارف اور مارفیم میں موجود فرق وہی ہے جو صوت اور صوتیہ میں ہے۔ بلوم فیلڈ نے اسم، فعل وغیرہ کی بجائے ہیئتی زمرے کا تصور پیش کیا۔ ان کا صوتی تجزیہ عام فونیمی تجزیے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انہوں نے اجزائے متصل کے تجزے کو ساختی مطالعے کی بنیاد بنایا اور نحوی ساخت کی ایک نئی سمت کا تعین کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ زبان کی ہر تشکیل خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے۔ جملے کے اجزائے متصل کلمے یا فقرے ہوتے ہیں۔ اور ان فقرات کے اجزائے متصل مارفیم ہوتے ہیں۔ ہر سطح پر اجزائے متصل دو سے زیادہ نہیں ہوسکتے البتہ ایک جزو متصل مزید اجزاء میں تقسیم ہوسکتا ہے۔ جب ان کی تقسیم در تقسیم کے سلسلے کا اختتام ہوتا ہے اور مزید تقسیم ممکن نہیں رہتی ایسی صورت میں آخری جزو آخری (Ultimate) کہلاتا ہے۔

علم نحو میں اجزائے متصل کے تجزیے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان اجزا کی مدد سے اہل زبان بڑے بڑے جملوں اور فقرات کو سمجھتے اور ان کے متوازی معنی اور جملوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس عمل کو ''توسیع کا نام دیا جاتا ہے۔ زبان کی ایسی خاصیت سیاق وسباق میں موجود جملے کے جو حصے ہوں جن کے باضابطہ ذرائع سے ان سانچوں کی توسیع کی جاتی ہے۔ بلوم فیلڈ کے نحوی نظریہ میں ہیئتوں اور ساخت کے اجزا کے تصورات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بلوم فیلڈ کے تشکیلیاتی نظریات میں بھی ملتے ہیں۔ ان ہیئتوں کے استعمال کی شرط یہ ہے کہ

ان کو ایک ذمرے کے اجزاء کہا جاتا ہے۔ اجزائے متصل کے تجزیے کی مزید وضاحت اور ان نظریات میں موجود خامیوں کو دور کرنے کی سعی ہیرس اور ان کے شاگرد نوام چومسکی نے کی۔ ہیرس نے زبان کے قواعدی جملوں میں اور امدادی ذیلی سیٹوں میں فرق اور امتیاز کیا۔ اور ان کو بنیادی اور غیر بنیادی کی اصطلاحوں سے موسوم کیا۔ اور انھوں نے واضح کیا کہ غیر بنیادی جملے تبادلی اصولوں کے زیر اثر بنیادی جملوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ نوام چومسکی نے ہیرس کے ساتھ مل کر تبادلی گرامر کا نیا نظام مرتب کیا جو مقبول ہوا۔ (۲۴)

Syntactic Structures نامی کتاب میں فقرے کے اجزاء، تبادلی اجزاء، اور مارفونیمک اجزاء کے مباحث پیش کیے۔ اس کتاب میں تبادلی قواعد کے نظام میں معنیاتی جز کو بھی شامل کیا گیا۔ اس تجزیہ کی رُو سے نحوی اجزائے ترکیبی زبان کے جملے بناتے ہیں۔ ان کے تجزیے داخلی اور معنوی ساخت کے حوالے سے کیا جاتے ہیں۔ چومسکی نے علامتوں اور خاکوں کی مدد سے بھی قواعد کے نظام کی وضاحت کی ہے۔ چومسکی اس بات کا حامی تھا کہ گرائمر کا نظریہ جدید ریاضیاتی تصورات کے حوالوں پر مبنی ہو۔ چومسکی نے تبادلی قواعد کے نظریہ میں معنیات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن نحو اور معنیات میں مخصوص اور باضابطہ تعلق ہوتا ہے۔ اور عموماً جب دو قواعدی تجزیوں کا انتخاب کی بات آتی ہے تو معنیات کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔

چومسکی کے نظریہ میں نحو اور معنیات کو مربوط کرنے کے لیے چومسکی نے ۱۹۶۵ء میں اپنے ماڈل میں ترمیم کی اور معنوی داخلی ساخت کا تصور پیش کیا۔ ساختیاتی فونیمیات کے اکثر امریکی ماہرین کا خیال ہے کہ تکلم کا فونیمی تجزیہ قواعدی ساخت کو ملحوظ رکھے بغیر کیا جانا چاہیئے۔

امریکہ اور یورپ میں ساخت کی مختلف تعبیریں ہوتی رہی ہیں۔ جن کے متعدد رجحانات سامنے آتے رہے ہیں۔ ساختیات کے حوالے سے جتنے بھی ماڈل ہمارے سامنے آئے ہیں ان سب کی حالت کمزور رہی۔ ماہرین

ساخت نے منطقی طور پر لسانی سطحوں کی جو تشکیل کی اس نے اطلاقی لسانیات کو بنیاد فراہم کی۔اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نظریہ پرستی کی دھن میں ساختیات کو منطق اور شماریات کا مرہون بنا دیا گیا۔اور ساختیات کا لسانیات میں مقام متعین کرنے میں غلو سے کام لیا گیا ہے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید لسانیات،لسانی ساخت کا جو خاکہ پیش کرتیہے اس کی اساس تجرید پر ہے۔اس کے تمام نمونوں میں سامعین اور مخاطب ایسے لوگوں کو کی امثال دی گئی ہیں جنھیں اپنی زبان اور اس کی گرائمر پر مکمل عبور حاصل ہے۔ایسے افراد کا ان ماڈلز میں کہیں ذکر نہیں جو اپنے سماجی تناظر اور موقع محل کے زیر اثر گفتگو کرتا ہے۔اس کی عکاسی کسی ساختی ماڈل یا لسانی اکائی میں دکھائی نہیں دیتی۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ لسانی ماڈل یک رنگی یا یکسانیت کا شکار نظر آتے ہیں۔اس میں تنوع کی عدم موجودگی تجرید کا نتیجہ ہے۔

ساختیاتی مفروضہ ہے کہ ہر زبان کی منفرد ساخت اور نسبتی نظام ہوتا ہے۔نوام چومسکی اس کی تردید کرتے ہیں۔ان کے مطابق تمام دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں بنیادی طور پر مستقل اور صریحی خصوصیات کا اشتراک موجود ہے۔کسی بھی زبان کے جملوں کے تجزیہ کے دوران جن اکائیوں کی طرف نشاندھی کی جاتی ہیان کے وجود کا دار و مدار لسانی نظام کی دوسری اکائیوں پر ہوتا ہے۔ان اکائیوں اور ان کے باہمی تعلق کے نوعیت کی وضاحت اور نشاندھی ساتھ ساتھ کی جاتی ہے۔نظام لسان،لسانی رشتوں کا ڈھانچہ ہے۔لسانی ساختیات میں ہر سطح پر تجزیاتی عمل خاصا پیچیدہ ہوتا ہے۔کوئی فونیمی اکائی ایسی نہیں ہوتی جو مارفیموں میں منضبط نہ ہو۔اور کوئی مارفیم ایسا نہیں ہوتا جس کی چول بالائی سطح کی ساخت میں نہ بٹھائی گئی ہو۔مسلمہ فونیمی ساختوں میں جن آوازوں کی گنجائش موجود نہیں ہوتی ان کی توجیہہ کی جاتی ہے۔اکثر بڑے لسانی سانچوں میں مارفیمی مواد کا سمونا ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے حسب ضرورت توضیحی خاکوں میں وسعت پیدا کی جاسکتی ہے۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے لسانی نظریات

مابعد جدیدیت میں ایک ایسا مفکر جس نے پیراڈائیم کا نظریہ پیش کیا وہ مورخ اور فلسفی ''تھامس کوہن'' تھا۔ یہ امریکہ کا رہنے والا تھا۔ مابعد جدیدیت کا ہمہ قسم سچائیوں کو سماجی تشکیل قرار دینے کا نظریہ دیگر علوم اور نظریات سے ماخوذ ہونے کے ساتھ ساتھ پیرا ڈائیم سے بھی ماخوذ محسوس ہوتا ہے۔'' Structure of Scientific revolution'' نامی اپنی کتاب میں کوہن نے ۱۹۶۲ء میں سائنس کی موضوعی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کے مطابق ہر سائنسی دور اس موجود دور کے پیرڈائیم کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پیرڈائیم ایسا حصار ہے جو ایک عہد کی جملہ سائنسی تحقیقات کو اپنے اس حصار میں لے لیتا ہے۔

کوہن کے نزدیک پیرڈائیم عقائد، اقدار اور تکنیکوں کا ایسا مجموعہ ہے جو ایک سائنسی گروہ میں میں مقبول ہوتا ہے۔ جن میں سے عقائد اور اقدار غیر سائنسی جبکہ تکنیک سائنسی رویہ ہے۔ کیونکہ اس بات میں دو رائے نہیں کہ عقائد اور اقدار سماجی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سماج ہی سائنسی تحقیق کے دائرہ عمل کو تشکیل دیتا ہے۔ چونکہ سائنسی علوم سماج سے متاثرہ ہوتے ہیں اس لیے ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں یہ سائنسی علوم سماجی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ تھامس کوہن کا یہ نظریہ سائنس کے علم کو روایتی طور پر معروضی اور غیر جانب دار کہنے اور ثابت کرنے کی بجائے اس کو سماج سے متاثرہ قرار دیتا ہے اس کا اور مابعد جدیدیت کا تصور اس حوالے سے یکساں موقف ہے کہ

''کوئی شے، کوئی موقف، کوئی علم معروضی اور معصوم نہیں ہوتا''۔

پیرڈائیم اوراے پس کے نظریات تقریباً ایک جیسا مفہوم رکھتے ہیں۔ ان دونوں میں موجود فرق اتنا ہے

پیرڈایم کا تعلق فقط سائنس تک محدود ہے جبکہ اے پس ٹیم، ایک عہد کی جملہ فکری و ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔کوہن نے سائنسی فکر کی تاریخ کو پیرڈایم شفٹ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔اے پس تیم تاریخ کے سفر کو مسلسل کی بجائے انقطاع سے عبارت قرار دیتی ہے۔اور ایک پیرڈایم دوسرے پیرڈایم کی طرف مربوط اور مسلسل سفر کی بجائے انقطاع کا حامل قرار دیتی ہے۔تاہم بعدازاں کوہن نے بھی سائنس کی تاریخ کے سفر کو بتدریج اور مسلسل سفر کہنا شروع کر دیا۔(۲۵)

ان دونوں نظریات (پیرڈایم اور اے پس) سے مابعد جدیدیت نے دو باتیں حاصل کیں۔

ا۔پہلی یہ کہ ہر علم، ہر تصور، ہر قدر، اور ہر نظریہ کسی نہ کسی سطح پر پہنچ کر ''سماجی'' ہو جاتا ہے۔یعنی کوئی شے سماجی تناظر سے الگ نہیں ہے۔سماجی تناظر کو سماج کا نشانیاتی نظام بھی کہا جا سکتا ہے۔سماجی تناظر اور نشانیاتی نظام اجتماعی اور لاشعوری ہے۔اس لیے ''فرد'' غیر اہم ہے۔مابعد جدیدیت فرد، موضوع، مصنف و مفکر کو اولین حیثیت نہیں دیتی۔یہاں ایک سوال جنم لیتا ہے کہ ایک اے پس ٹیم سے دوسری اے پس ٹیم میں منتقلی یا پیرڈایم شفٹ کیا کسی فرد کا کارنامہ ہو سکتی ہے؟۔

۲۔پیرڈایم اور اے پس کی ٹیم سے مابعد جدیدیت نے دوسری بات یہ سیکھی کہ علوم و نظریات کی تاریخ ''باہر'' سے نہیں ''اندر'' سے کنٹرول ہوتی ہے۔یعنی تاریخ واقعات اور سنین کا نام نہیں بلکہ پیرڈایم اور اے پس ٹیم کی حامل ہے۔ہر علم اور فن کو کبھی بھی خارجی واقعات کے زیر اثر نہیں بلکہ عقائد، اقدار اور تکنیک کے کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔جو کسی زمانے میں کسی سماجی اکائی میں رائج ہوتے ہیں۔تاریخ کو اس نقطہ نظر سے دیکھنے کی دو منطقی وجوہات ہیں۔پہلی یہ کہ کوئی سچائی معروضی نہیں ہوتی۔ہر سچائی اپنے پیرڈایم کی پیداوار ہے۔اس لیے ہر سچائی کی معقولیت کا انحصار اس کے پیرڈایم پر ہوتا ہے۔ اس لیے ان سچائیوں کو ان پیرڈایم سے الگ کر کے نہیں

دیکھنا چاہیئے۔ مابعد جدیدیت دوسروں کی سچائیوں کو قبول کرنے اور سمجھنے کا اخلاقی جواز پیدا کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت خودمختاری کے ان تمام تصورات کی نفی کرتی ہے جن کو جدیدیت نے تشکیل دیا اور اختیار کیا تھا۔

جدیدیت کے ان تصورات اور تشکیلات پر تحفظات کا سب سے زیادہ اظہار فرانسس لیوتار نے کیا۔ انہوں نے مابعد جدیدیت کی وضاحت جدیدیت کے تناظر اور تقابل کی روشنی میں کی ہے۔اس لیے لیوتار کے ہاں جو مابعد جدیدیت کا تصور ہمیں ملتا ہے وہ جدیدیت سے الگ ہے۔جدیدیت کے انکار کے لیے اور مابعد جدیدیت کے حق میں لیوتار نے جدیدیت کے مہابانیوں کو بنیاد بنایا۔جدیدیت کی اساس انسان مرکزیت تھی۔(۲۶)

اس فلسفے نے باور کرایا کی انسان معنویت کا پیمانہ ہے۔انسان کے علاوہ دیگر تمام پیمانے رد کیے جانے کے قابل ہیں۔روشن خیالی نے اس فلسفہ کو مزید وسعت دی اور مابعد الطبیعات کی نفی کی گئی۔اور انسانی عقل کی برتری کو تسلیم کر لیا گیا۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ عقل کے آزادانہ طور پر برسرعمل ہونے کے لیے کسی نہ کسی معروض کا ہونا ضروری ہے۔ جسے عقل سمجھے اور پھر تسخیر کرے۔اس تصور نے تعمیر اور ارتقا کے جدید تصورات کو جنم دیا۔اور اس تصور نے عقیدے کا درجہ حاصل کر لیا کہ ''عقل،معروضی علم اور تجدد کا واحد منبع ہے''۔لیکن بعد کے حالات اور واقعات نے اس عقیدے کی اہمیت محض یوٹوپیا تک محدود کر دیا۔

جدیدیت نے عقل کی خودمختاری کے ساتھ ساتھ فرد کی خودمختاری کا تصور بھی قبول کیا۔مگر عقل پر اس حد تک غیر معمولی اعتماد نے وجودیت اور معنویت کے سوال کا جواب تلاش کرنے کی طرف مائل کیا کہ اب اسے اندر اور باہر کی کی سمجھ کے لیے عقل کے سوا کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔اس تصور نے فرد کو ایک طرف تو غیر معمولی اعتماد عطا کیا تو دوسری جانب اسے تنہا ہونے کے احساس میں مبتلا کر دیا۔اسے احساس ہوا کہ وہ سہارا جس کے ساتھ اسنے صدیاں گزاری ہیں اس سے وہ اب محروم ہو گیا تھا۔

لیوتار کے مطابق جدیدیت کے مہابیانوں سے متعلق اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مہا بیانیے کیوں کہا جاتا ہے۔عموماً ان سوالات کا جواب نہیں دیا جاتا؟۔ مابعد جدید مفکرین،لسانیت اور نشانیات سے بنیادی اصول تفہیم کی بدولت ہر مظہر کی ساخت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں اکثر وہ اصطلاحات کے روایتی مفہوم کو یکسر بدل دیتے ہیں۔سب سے پہلے رولاں بارتھ نے بیانیہ کو ''نشانیاتی مظہر'' قرار دیا۔یعنی بیانیہ ایسا ذہنی مظہر قرار پایا جو اشیا کی تفہیم کا مخصوص علم فراہم کرنے کا منبع ہے۔ بیانیہ کے اس ماڈل کی دو خصوصیت قابل ذکر ہیں۔ایک یہ کہ انسانی تجربہ کسی خاص لمحے میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ وہ لمحہ اپنی مکانیت سمیت، تجربے میں ضم ہو جاتا ہے۔دوسرا یہ کہ ہر بیانیہ کو کوئی نہ کوئی بیان کرنے والا ہوتا ہے۔

گویا بیان کنندہ کی حیثیت مطلق ہے۔ لیوتار نے بیانیہ کے اس تصور کو ملحوظ رکھا ہے۔ کہ ظاہری طور پر جدیدیت نے سائنسی علم کو اس قدر اہمیت دے کر خود کو بیانیہ مخالف کے طور پر پیش کیا ہے۔ پھر جب جدیدیت نے یہ دعویٰ کیا کہ ''عقل اور سائنسی علوم انسانی ترقی کے لیے ضروری ہیں''۔تو یہ بیانیہ کی طرف جدیدیت کی ط واپسی ہے۔اس طرح جدیدیت کے بہت سے مہابیانیے تشکیل ہوئے جن میں سے شند اہم یہ ہیں۔

۱۔عقل خود مختار ہے۔اور یہ تمام علوم کی بنیاد ہے۔

۲۔تمام مسائل کا حل ممکن ہے۔

۳۔موضوع معروض سے جدا ہوتا ہے۔

۴۔مغربی تہذیب، ماڈل تہذیب کا مقام رکھتی ہے۔

۵۔انسانی عقل میں اعتقاد اور نہ ختم ہونے والے علوم کا ترقی کرتا ہوا نظام موجود ہے۔

۶۔آدمی کا وجود خود مختار ہے۔

۷۔سائنسی علوم حقیقی اور غیر جانب دار ہیں۔

انہیں مہا بیانہ اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ جدیدیت کے منصوبہ کے پس منظر میں بنیاد کے طور پر موجود تھے۔ جدیدیت نے اپنا سفر دراصل انہی کی رہنمائی میں طے کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر جدیدیت اپنی تاریخ سے اپنے دعووں کی صداقت کو ثابت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ جدیدیت کے ان مہا بیانیون پر شکوک کا اظہار جنگ عظیم اول کے بعد سے ہی شروع ہوا۔ کیونکہ یہ کہا گیا کہ اگر جدیدیت کے یہ تمام بیانیے تمام مسائل کا حل ہیں تو جنگ جیسے بنیادی مسائل کا حل کیوں نہیں نکال سکتے۔ یہ سوال جدیدیت کے داخلی تضادات کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی تھا یا اس کو جدیدیت کے اس دعویٰ کی قلعی کھولنے کے لیے کافی سمجھا گیا کہ انسانی عقل کے ذریعہ ترقی کے نہ ختم ہونے والے سفر کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔(۲۷)

جدیدیت کے ان مہا بیانیوں پر شبہات نے مابعد جدیدیت کے خدوخال کو ابھارنا شروع کر دیا۔اس طرح یہ توقع جنم لینے لگی کہ مابعد جدیدیت کی فکر کے سامنے آنے کے بعد استحصال اور ناانصافی کے دور کا خاتمہ ہو جائے گا۔اوران تمام معاشرت برائیوں سے نجات حاصل ہو جائے گی جو جدیدیت کے دور میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اصل میں مابعد جدیدیت ''فکر'' ہے جس پر عمل درامد کے زمہ دار مقتدر حلقوں کو قرار دی گیا۔لیکن ان طبقات نے مابعد جدید فکر کی بجائے معاشی گلوبلائزیشن اور صارفیت کو اہمیت دی۔

لیوتارنے ان نظریات اور مہا بانیوں کو سمجھنے کے لیے جو تھیوری پیش کی اسے ''میٹا نیریٹو'' کا نام دیا۔ میٹا بیانیہ جن چار اوصاف کی عکاسی کرتا ہے وہ یہ ہیں۔

ا۔آفاقیت

۲۔کلیت۔

۳۔ یوٹوپیا۔

۴۔ اتھارٹی۔

اس طرح ہر مہا بیانیہ انسانی تجربات کے آفاقی ہونے کا تصور رکھتا ہے۔ تجربات کے اجزا کی بجائے، تجربے کی کلیت کے تصور پر یقین رکھتا ہے۔ یہ مہا بیانیہ انسانی تجربات کے تسلسل ااور تاریخ کا خوش آئند یوٹوپیائی تصور رکھتا ہے۔ اور انسان کو مسلسل ارتقا کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ مہا بیانیہ انسانی تجربات کے مستند ہونے پر یقین رکھتا ہے۔ جدیدیت کے مہا بیانیے ان تمام خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ مابعد جدیدیت ان تمام بیانیوں کو تنقید کا نشانہ بناتی ہے۔ جدیدیت کے یہ مہا بیانیے، سیاسی مقصد سے پہلوتہی نہ کر سکے۔ ان مہا بیانیوں کے ذریعہ انیسویں صدی میں اہل یورپ نے نو آبادیاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ جس میں حقائق کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ اہل یورپ نے مقامی تجربے کو آفاقی بنا کر اس لیے پیش کیا کہ وہ اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی فصل کاٹ سکیں۔ یورپی نظام کی اس دورخی پر سے پردہ خود یورپی مفکرین نے اٹھادیا۔

جدیدیت نے ایک اور مہا بیانیہ بھی تشکیل دیا جسے ''عقل کی خود مختاری'' سے تعبیر کیا۔ اس طرح انسانی تجربات کے صرف ایک حصہ کو کو آفاقی اور کلی قرار دیا۔ اور انسانی تجربات کے دوسرے حصوں کو پرے دھکیل دیا۔ اس کے برعکس مابعد جدیدیت نے تمام انسانی تجربات کی موزونیت کو بحال کر دیتی ہے۔ اور انسانی عقل کی خود مختاری کے بطور مختار کل ہونے کے دعویٰ کو چیلنج کرتی ہے۔ اور انسانی تجربات کے تنوع کو بحال کرتی ہے۔

جدیدیت میں ''فرد اور موضوع کی خود مختاری'' کو بھی مہا بیانیہ قرار دیا۔ فرد کی خود مختاری کا تصور عقل کی خود مختاری کے تصور کا منطقی نتیجہ تھا۔ ''ڈیکارٹ'' کا مقولہ ''میں سوچتا ہوں میں ہوں''۔ بھی اس پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ فرد یا موضوع کی خود مختاری کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ فرد اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کر سکتا ہے۔ آسمانی بہشت اور

دوزخ کی جانب دیکھنے کی بجائے فرد اپنی زمین ی بہشت و دوزخ خود تخلیق کر سکتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ فرد مجرد ہے۔ وہ اپنے ذہنی عمال میں آزاد اور الگ تھلگ ہے۔ وہ اپنی معنویت اور شناخت کا تعین اپنی زہنی استعداد کی مدد سے کر سکتا ہے۔ اس طرح فرد اپنی یا باہر کی دنیا کی تفہیم مجرد انداز میں کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اس عمل میں حائل نہیں ہوتا۔ اس لیے دوسرے کی موجودگی خود مختاری کے تصور کو چیلنج کرتی ہے۔

اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ تنہائی، اور بے چارگی کے تصور نے درحقیقت فرد کی خود مختاری سے جنم لیا۔ جبکہ مابعد جدیدیت اس مہابیانیے کو مسترد کرتی ہے اور کسی بھی شے یا مظہر کو آزاد اور مجرد یا الگ نہیں سمجھتی۔ بلکہ یہ ہر شے کو رشتوں کے جال میں جکڑی ہے۔ لہذا فرد سماجی تشکیل ہے۔ خود مختار نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرد سماج کا حصہ ہے۔ بلکہ اس کا مطلب اس بات کی وضاحت ہے کہ فرد سماج کے ثقافتی اور نشانیاتی نظام کی پیداوار ہے۔ فرد اپنے ذہنی عمل میں آزاد نہیں۔ بلکہ وہ ان کوڈز اور ضابطوں میں سوچتا ہے جو ثقافت اور سماج کی دین ہوتے ہیں۔ اس لیے فرد کی کوئی سوچ یا تصور اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ یہ اپنی اصل میں ثقافتی ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا علم مجرد اور خود مختار نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے پیراڈائم کی پیداوار ہوتا ہے۔ اسے مغربی فکر میں بنیادی تبدیلی کا موڑ قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے چار صدی پرانے Cogito یعنی ''میں'' کو تمام ادراک اور تجربے کی نفی ہوتی ہے۔

اس طرح مابعد جدیدیت، جدیدیت کے مہا بیانیوں کی ایک ایک کر کے گمشدگی کا اعلان کرتی ہے۔ مہابیانیوں کی بجائے مابعد جدیدیت چھوٹے چھوٹے بیانیوں کو پیش کرتی ہے۔ اس طرح یہ بیانیے کی موجودگی کو تسلیم کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کا مختصر بیانیہ درج ذیل تصورات کا حامل ہوتا ہے۔

ا۔ ہر تجربہ مقامی ہے، اپنے مخصوص تناظر میں ہی یہ قابل فہم اور قابل عمل ہو سکتا ہے۔

۲۔ دنیا میں تصورات اور نظریات بکثرت پائے جاتے تھے۔

۳۔تاریخ عدم تسلسل کا شکار ہوتی ہے اس لیے ضروری نہیں کہ اس کا سفر لازماً آگے کی طرف ہو۔

۴۔کوئی بھی نظریہ حتمی، جانبدار اور آخری نہیں ہوتا۔

۵۔طاقت کا کوئی ایک مرکز نہیں ہوتا۔یعنی طاقت مختلف اور متعدد مراکز میں تقسیم ہے۔

۶۔کسی نظریے کو مرکزیت حاصل نہیں۔

۷۔کوئی بھی شے آزاد اور خود مختار نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں پر انحصار کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں۔

۸۔دنیا اور متن کی تعبیر کے کئی طریقے ہیں۔ان میں سے کوئی طریقہ یا تعبیر حتمی نہیں۔

مختصر بیانیے کے یہ تصورات، مابعد جدیدیت کی ممکنہ تعریفیں بھی ہیں۔ان سے یہ سمجھ لینا مشکل نہین کہ کہ مابعد جدیدیت کا تعلق مکمل ثقافت اور انسانی صورت حال سے ہے۔ مابعد جدیدیت زندگی، ثقافت اور تاریخ کو سب پہلوؤں سے سمجھنے کی تحریک دیتی ہے۔یعنی کسی ایک مظہر کی تفہیم دیگر مظاہر کی تفہیم کے بغیر ممکن نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ مابعد جدیدیت کی فکر اصل میں یورپی طرز فکر ہے دیگر خطوں میں ان کے حالات میں یہ کس طرح معاون ہوسکتی ہے؟۔ بظاہر اس سوال کی معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔مگر بغور جائزہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ یہ سوال علمی نوعیت سے زیادہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہر صورت حال کا اپنا مقامی فریم ورک ہے۔مگر ان کی تفہیم اس صورت ممکن ہے کہ ایسے مطالعے میں ہمیشہ ماورائے ادب علوم اور نظریات کو استعمال کیا جائے۔ادب کی مقامیت تک رسائی کے لیے غیر مقامی علوم سے استفادہ حاصل کیا جاتا ہے۔آج ایک علم کی سرحدیں محدود نہیں رہیں بلکہ یہ دوسرے علوم کے لیے کھل چکی ہیں۔ مابعد جدیدیت میں علوم کے ایک زبان کے دوسری زبان سے اس طرح کے استفادے کے حصول کو ''اصول کا درجہ دیا ہے۔

اب بین الاقوامی مطالعات زور شور سے جاری ہیں اور علوم میں کسی طرح کی پیچیدگیاں سامنے نہیں آ رہی ہیں بلکہ یہ علوم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ اب ایک علم کی مرکزیت یا اجارہ داری نہیں رہی۔ اس لیے مابعد جدیدیت کو یورپ سے باہر دیگر خطوں میں کسی اجنبیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو اس طرح کے خیالات کو سیاسی بیانات سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اور اس طرح کے خیالات کو اپنانا خود پر علم کے دروازے بند کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ہم جدید، رومانی، نفسیاتی، مارکسی تنقید سے مدد لیے بغیر کلاسیکی اور جدید ادب کا فہم مرتب کرنے میں کامیاب نہ ہوتے جو آج ہمارے اجتماعی ادبی شعور کا حصہ ہے۔

مابعد جدیدیت سے اعتنا، اس نو آبادیتی فریم ورک کو توڑ کر کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ نو آبادیاتی سوچ اصل میں مغرب کی فکر کا ایک مخصوص حصہ ہے۔ جس کی نمو اس دور میں ہوئی جب نو آبادیت کا دور دورہ تھا۔ مابعد جدیدیت کا یہ نقطہ نظر مغربی فکر کے امتزاج کا عکاس ہے۔ اس طرح کی انجذاب اور انحراف کی دونوں صورتیں انتہا پسندانہ اور جذباتی نوعیت کی ہیں۔ اس میں پہلی صورت خود فراموشی اور دوسری صورت جہاں فراموشی کی ہے۔ جب کہ معقولیت اسی میں ہے کہ خود آگاہی اور جہاں آگاہی بیک وقت ہو۔

اس موضوع پر اظہار خیال کا دوسرا زاویہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ''مابعد جدید عہد میں ادب کا کیا کردار ہونا چاہیے''۔ اس حوالے سے کیا گیا مطالعہ معروضی کی بجائے نظریاتی نوعیت کا ہوگا۔ جس میں پہلے ادب کے کردار کا تعین کیا جاتا ہے۔ کسی ایجنڈا یا لائحہ عمل طے کریں پھر اسے ادب میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ باہر سے عائد کی گئی آئیڈیالوجی اور ادب میں مغائرت ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس تاریخی حقیقت کے باوجود مقتدر ادب کے لیے ایجنڈے کو وضع کرتا ہے۔

جب ہم بدلتی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو عام طور پر ہمیں تاریخ سے اس تفہیم کے لیے مدد لینا پڑتی ہے۔کارل پاپر کا خیال اس کے برعکس ہے ان کے مطابق

''بن رہی تاریخ کو پرانی تاریخ کے اصولوں کی مدد سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔اور اس ضمن میں نہ ہی کوئی درست پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ ہر تبدیلی نئی ہے اور اور اس کی تفہیم کا پیمانہ بھی نیا اور تبدیلی کی نوعیت کے مطابق ہونا چاہیئے''۔

درحقیقت تاریخ سے ہم بدلتی دنیا کا کچھ نہ کچھ فہم حاصل کر سکتے ہیں۔ دنیا کی تبدیلی ایک مسلسل عمل ہے۔ مگر اس تبدیلی کی رفتار ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ مثلاً کوئی بھی غیر معمولی واقعہ جو جنگ، سیاست اور فطری نوعیت کا ہو سکتا ہے دنیا کو تیزی سے بدل سکتا ہے۔اس کی مثال سوویت یونین کا انہدام ہے۔ جو اپنی نوعیت کا غیر معمولی تاریخی واقعہ تھا۔جس کی وجہ سے سیاست کا رخ بدل گیا اور سیاست کا رجحان عالمی طور پر بای پولر کی بجائے یونی پولر ہو گیا۔اور نیو ورلڈ آرڈر کی بدولت ایک ملک اب دنیا کی تقدیر اپنے قلم سے لکھنے کا دعویدار ہے۔ دوسری جانب لسانیات اور فلسفہ میں ساختیات اور مابعد جدیدیت کے نظریات غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔جن کی وجہ سے معاصر زندگی کو اور اس زندگی کے شعور کو بدل دیا۔اب ہم سیاسی، معاشی اور فکری سطح پر ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جو سابقہ تین دہائیوں سے بالکل مختلف ہے۔

سچ یہ ہے کہ دنیا واقعہ بھی ہے اور بیان واقعہ بھی ہے۔عملی حقیقت یہ ہے کہ دنیا اصل میں زبان کی طرح ہے۔جس میں اظہار کے کئی پیرایئے موجود ہوتے ہیں۔ جو سطح پر موجود ہوتے ہیں جن کے پیچھے یا زیر سطح وہ نظام یا گرامر موجود ہوتی ہے جو اظہار کو ممکن بناتی ہے۔اس تہہ نشین سے عدم واقفیت کی وجہ سے ہم دنیا کے کلی تصورات سے آشنائی حاصل نہیں کر سکتے۔اس لیے دنیا سے متعلق ہمارا نظریہ ناقص اور بدلتی دنیا کے بارے میں ہمارا شعور بد

نظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ دنیا کا کلی تصور تو ممکن نہیں۔ کیونکہ بدلتی ہوئی دنیا ساخت کے طور پر معروض نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ دنیا کا کلی طور پر فلسفیانہ تصور بہر حال کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ معلوم ہو کہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے پس منظر میں موجود نظام کو سمجھا جائے۔ اور یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ معلوم کیا جائے کہ کیا پس منظر، واقعے کی پیداوار ہے۔ یا پس منظر کی وجہ سے واقعہ رونما ہو ہے۔ دونوں میں درجہ بندی کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے ایک کو سبب اور دوسرے کو اس کا نتیجہ قرار دینا پڑتا ہے۔ یہ حتمی درجہ بندی نہیں ہوتی۔ تاہم دنیا کا کلی تصور ان ہی دونوں کے مجموعے سے مرتب ہوتا ہے۔ اس کی عکاسی ہمیں معاصر دنیا کے تجزیے میں بھی نظر آتی ہے۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہر کلامیہ دنیا سے متعلق تو ہوتا ہے لیکن اس کی تفہیم و توجیہہ کے اپنے معیارات، اصول اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ اور ان تینوں کا تعین ''طاقت'' کرتی ہے۔ اس طرح ہر کلامیہ طاقت کے حصول کی حکمت عملی اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔

''طاقت سے مراد محض سیاسی یا فوجی طاقت مراد نہیں بلکہ طاقت کسی مخصوص نقطہ نظر کا اجارہ بھی ہوتا ہے۔ اور یہ اجارہ متعدد دوسرے کلامیوں کو بے اثر کرنے اور بے دخل کرنے کی در پردہ کوشش کرتا ہے''۔

نیا کلامیہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے نئی اصطلاحات کو رائج کرتا ہے۔ اس کے ساتھ پرانی رائج اصطلاحات کو نئے اور مخصوص ترجیحی طریق کار سے استعمال کرتا ہے۔ اور ان کی مدد سے نئے بیانیے وجود میں آتے ہیں۔ کلامیہ میں یہ قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ انسانی اذہان کو بدل سکے، انہیں کنٹرول کر سکے اور سوچنے کی حدود کو مقرر کرے۔ ہمارے ہاں انگریزی زبان کو کلامیے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس زبان کے ذریعہ کتنے ہی مقاصد ہیں

جن کو حاصل کیا جاتا ہے۔زبان کے ذریعہ سے ان مقاصد کا حصول بھی ممکن ہو جاتا ہے جن کو عسکری طاقت سے حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس طرح کلامیہ بھی اپنی زبان کی بدولت غیر اعلان کردہ مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔

مابعد جدیدیت کے تین عناصر جو بدلتی دنیا کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔تکثیریت

۲۔باہمی ارتباط

۳۔تشکیلی حقیقت

تکثیریت سے مراد یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی ایک ثقافت،نظریے، واحد بیانیے اور حصول علم کے کسی ایک ذریعے کو حتمی خیال نہیں کرتی۔ ہمارے یہاں اس بات کو بہت کم سمجھا گیا ہے کہ مابعد جدیدیت کے اہم مفکرین دریدا، فوکو، اور ایڈورڈ سعید وغیرہ کے افکار مغرب کی سیاسی استحصال پسند سیاسی حکمت عملی کا حصہ نہیں ہیں۔

باہمی ارتباط کے ضمن میں مابعد جدیدیت علوم کے مابین موجود مغائرت کو دور کرنے اور بین التناظراتی مطالعات پر زور دیتی ہے۔آج ایک علم کی افادیت محض اس علم کی داخلی حد تک نہیں بلکہ اس سے دوسرے علوم بھی استفادہ حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً لسانیات کو ادب، بشریات فلسفہ کے مضامیں کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی تعلیم میں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے سرچ انجن میں لسانیات مددگار ہوتی ہے۔

تشکیلی حقیقت،اصل حقیقت کی جگہ لیتی جارہی ہے۔تشکیلی حقیقت نے تخیل کو بے دخل کرنے کی کوشش کی ہے۔جس کی وجہ سے ہم انفعالیت کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔تخیل ایک ایسی قوت ہے جو حقیقت کو خود تشکیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔تخیلاتی قوت کے متحرک ہونے کی وجہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا کو خود تشکیل کرتا ہے۔مگر

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی تشکیل دی گئی حقیقتوں پر زندہ ہیں۔ یہ احساس مزید شدت اختیار کرتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے حقیقت سے متعلق ہمارا تصور اور تجربہ مکمل طور پر بدل چکا ہے۔ اور ہم اپنے اوقات کا زیادہ تر حصہ عکس و لسانی تشکیلات کے زیر اثر گزار رہے ہیں۔

زبان اور انسانی فطرت

سیاق وسباق کو لسانیات کے تمام مطالعاتی پہلوؤں میں اہم قرار دیا جاتا ہے۔ گفتگو کا انحصار انسانی فطرت پر ہوتا ہے۔ جو ثقافتی پس منظر کی عکاس ہے۔ اس لیے معانی کا تبادلہ عام بولنے والے کے سماجی اور ثقافتی پس منظر پر انحصار کرتا ہے۔ زبان کا پس منظر کے ساتھ گہرا تعلق ہے اس لیے کسی بھی گفتگو کے پس منظر کو جانے بغیر درست معانی تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ کیونکہ ماحول، مخاطب کے چہرے کے تاثرات، حرکات یہ تمام عوامل اُس سیاق و سباق کی عکاسی کرتے ہیں جس کے تناظر میں مخاطب سامع تک اپنی بات کے درست معانی اور مفہوم کی ترسیل چاہتا ہے۔ جس قدر سیاق وسباق واضح ہوگا اُسی قدر بات کے معانی صاف ہوں گے۔ اس لیے ڈاکٹر رقیہ حسن کا یہ مطالبہ کہ ''معانی کی گہرائی تک رسائی کے لیے محض الفاظ کی ادائیگی ہی نہیں بلکہ مخاطب کے سماجی اور ثقافتی پس منظر کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔'' (۲۸)

ڈاکٹر رقیہ حسن کے مطابق ثقافتیں اپنے کرداری طرز عمل کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ زبانوں میں معنویاتی فاصلے انہی اختلافات کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ یہی فاصلے معنی کی تشکیل کرتے ہیں اور دو معاشروں کے درمیان ثقافتی فرق میں موجود تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

مخاطب کی شخصی حیثیت کے تناظر میں مرتب ہونے والا معانی دیگر دائروں میں متواتر تبدیل ہوتا جائے گا۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ تناظر کے اندر جو معانی پیدا ہوا وہ مسترد ہو گیا۔ کیونکہ وہ معانی اپنے

دائروی تناظر کے اندر بدستور قائم رہے گا۔اس بات کا دارومدار قاری یا سامع پر ہے کہ وہ خود کو کس تناظر تک محدود کر کے ایک مخصوص معانی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ یا اُس تناظر کو عبور کر کے خود کو معانی کے نئے سلسلوں سے متعارف کراتا ہے۔معانی تناظر سے مشروط ہیں اگر تناظر تبدیل ہو گا تو معانی کے اندر بھی وسعت اور کشادگی پیدا ہو گی۔ معانی کی وسعت صرف مخاطب کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ سامع بھی معانی آفرینی میں مددگار ہوتا ہے۔معانی تناظر کے ساتھ مشروط ہے۔لیکن پس منظر معانی کے ساتھ مشروط نہیں ہوتا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تناظر کے بغیر کوئی معانی مرتب نہیں ہوسکتا۔کسی بھی گفتگو یا تصنیف کے مدعا تک رسائی کے لیے تناظر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ گفتگو یا تصنیف جو اعلیٰ درجہ کی ہو اس میں اکلوتے معانی کی بجائے معانی کے سلسلے موجود ہوتے ہیں۔ ہر معانی نسبتاً ایک گہرے معانی کو چھپائے ہوتا ہے۔تناظر کی تبدیلی متعین معانی کو تبدیل کر دیتی ہے۔اور ایک نیا معانی نمودار ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے تین اہم نظریات

معنی کی آفرینش کا یہ عمل سامع اور قاری کے لیے ایک امتحان ہے اگر اس میں معانی در معانی شناخت کی صلاحیت موجود نہیں ہے تو پھر وہ ایک ہی معانی تک محدود رہے گا۔اس طرح وہ گفتگو کے اکہرے پن سے مطمئن رہے گا۔مخاطب یا مصنف اُس نقطہ پر مرتکز رہتا ہے جو اُس کی خواہش کا مرکز ہے۔یعنی مخاطب کے اندر خواہش کے تناظر میں ہونے والی گفتگو اُس کے نفسیاتی، روحانی اور لاشعور تقاضوں تک پھیلی ہوتی ہے۔لہٰذا اُس کی گفتگو کے تناظر میں معانی کے کئی سلسلے کروٹ لیتے ہیں۔اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اگر خواہش شعوری اور جسمانی ہے تو پیدا ہونے والا تناظر بھی اور اُس کے معانی بھی محدود ہوں گے۔لیکن اگر خواہش لاشعوری ہے تو نتیجتاً نمودار ہونے والے منظر ناموں اور معانی کے سلسلے بھی لامحدود ہوں گے۔

(ٹی ایس ایلیٹ) نے ادیب اور مخاطب کی شخصیت کو تخلیق کے راستے میں بھاری پتھر قرار دیا ہے۔اس طرح وہ گفتگو کے درست معانی تک رسائی کے لیے مخاطب کی شخصیت کا انہدام چاہتے ہیں۔اس طرح مخاطب یا مصنف کے سوانحی حالات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔اور متن کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ایلیٹ نے متن کو اہم قرار دیتے ہوئے شخصی اجارہ داری کو ختم کرنے کی بات کی ہے۔(۲۹)

(رولاں بارتھ) کا یہ اعلان کہ''متن کو مصنف یا مخاطب تخلیق نہیں کرتا۔متن خود اپنے آپ کو تخلیق کرتا ہے۔(Writing writes not the writers)'' (۳۰)اس اعلان کے بعد تخلیق کار ہی پر خط نسخ کھینچ دیا گیا ہے۔ایلیٹ نے شخصیت کو جبکہ رولاں بارتھ نے مصنف اور مخاطب کو سرے سے ہی منہا کر دیا۔بارتھ، سوسیور کے اس موقف کی تائید کرتا ہے جس میں سوسیور زبان کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔یعنی''لانگ'' اور ''پارول''لانگ زبان کا ایسا نظام ہے جو نظر نہیں آتا۔لیکن اس کی عکاسی پارول یعنی جملوں کی ساخت میں ہوتی ہے۔رولاں بارتھ نے لانگ کی بجائے شعریات کا ذکر کیا اور کہا متن کو مصنف تخلیق نہیں کرتا بلکہ شعریات تخلیق کرتی ہے۔شعریات جو نظروں سے اوجھل ہوتی ہے متن کے ذریعے اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔یوں بارتھ نے متن کے حوالے سے مخاطب کی کارگردگی کو نفی کر دیا۔واضح رہے کہ متن سے بارتھ کی مراد اس کے ظاہری اور باطنی نظام کو ایک اکائی کے طور پر پیش کرنا ہے۔بارتھ کی نظر میں دونوں سکے کے دو رخ ہیں۔رولاں بارتھ کے مطابق گفتگو کی تخلیق واحد الیہاتی معانی سے عبارت نہیں ہوتی۔(۳۱)

''دریدا'' نے اس سلسلہ میں اپنے موقف کا یوں اظہار کیا'' معانی کی کوئی دائمی حیثیت نہیں۔'' (Meaning is fiction) دریدا کا کہنا تھا کہ معانی پر ہر قدم پر ملتوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔مثلاً جب لغت میں سے کسی ایک لفظ کے معانی کو تلاش کیا جائے تو ایک لفظ کے سامنے کئی معانی تحریر ہوتے ہیں۔اگر اُسی لغت میں کسی ایک معانی کے مزید معانی تلاش کیے جائیں تو یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہے۔اور متعدد معانی ایک ہی

لفظ کے سامنے آجاتے ہیں۔اس بات سے انکار نہیں کہ معانی متن کا جوہر ہے۔اور کوئی بھی متن،معانی کے بغیر اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسطرح دریدا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ متن اور اُس کی ساخت بھی فکشن ہے۔ ساخت شکنی (Deconstruction) میں دریدا نے معانی کے التوا کو گورکھ دھندا قرار دیتا ہے۔ دریدا نے حقیقت کے حوالے سے متن کو تکثریت اور التوا کا حامل قرار دیا ہے۔دریدا کے نزدیک واحد معانی کی حیثیت فکشن سے زیادہ نہیں ہے۔ جب کہ کثیر الجہت معانی کو وہ حقیقت قرار دیتا ہے۔دریدا واحد اور متعین معانی کو متن اور اُس کی ساخت پر کاری ضرب قرار دیتا ہے۔(۳۲)

ظاہری طور پر رولاں بارتھ، دریدا اور ایلیٹ کے نظریات نے ادب کے مروجہ تصورات کو غلط قرار دیا اور شخصیت کی حیثیت کو مسترد کر دیا۔ٹی ایس ایلیٹ نے جب (Extinction of personality) کا تصور پیش کیا اُس وقت عام تاثر تھا کہ تخلیق کے حوالے سے شخصیت کی آمیزش منفی عمل ہے۔کیونکہ شخصیت اپنے کوائف، سانحات اور دیگر عوامل کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہے اور تخلیق کی آفاقیت کو بری طرح متاثر کرتی ہے جس سے تخلیق نجی معاملات کی سطح پر آجاتی ہے۔ایلیٹ شخصیت کے حوالے سے جذبے کی رقت انگیز،اور تصنع آمیز پیرائے کو ادب کے اعلیٰ معیار کے منافی گردانتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شخصیت کی نفی کے موقف کو تسلیم کرنے کے باوجود مغرب کے اکثر تخلیق کاروں نے غیر شعوری طور پر تخلیقی عمل میں ذات کے کھلنے اور بارآور ہونے کے عمل سے رو گردانی نہ کی۔(۳۳)

ٹی ایس ایلیٹ نے محض مصنف کی شخصیت کی نفی کی تھی مگر رولاں بارتھ نے مصنف اور مخاطب کی ہی نفی کر دی اُس کی بجائے انہوں نے شعریات کو تخلیق کاری کا اہم جزو قرار دیا۔مگر محققین بارتھ کے اس نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے اس سوال کو اٹھاتے ہیں۔کیا متن ہوا میں تخلیق ہو جاتا ہے؟۔اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ کوئی بھی متن مصنف یا مخاطب کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ بلکہ شعریات بھی مصنف کی مرہون منت ہے۔لہٰذا

جب وہ متن کی تخلیق پر منتج ہوتی ہے۔تو محض نظام ہی نہیں۔ بلکہ اس نظام کا حصہ مصنف یا مخاطب کی ذات بھی تجسیم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خود مخاطب شعریات، سمیت اپنی ذات کو تہہ درتہہ متن کے پھیلاؤ میں منقلب کر رہا ہوتا ہے۔ جس سے مخاطب کی نفی نہیں بلکہ اُس کے اظہار میں وسعت آ جاتی ہے۔لہٰذا مخاطب کو مسترد کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

رولاں بارتھ کا یہ نظریہ کہ معنی بتدریج منہا ہوتا جاتا ہے۔حتٰی کہ آخر میں معدوم ہو جاتا ہے۔ جبکہ دریدا کا قول ہے معنی ہمہ وقت ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ اسے کہیں بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا لہٰذا معنی فکشن ہے۔ اگر دریدا اور رولاں بارتھ کے ان اقوال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معنی صورتیں بدلنے اور ملتوی ہونے کی وجہ سے معدوم نہیں ہوتا بلکہ وسعت آشنا ہو جاتا ہے۔ معنی اپنی روانی کی خود ثابت کرتا ہے۔ معانی مقام کو اپنے اندر سمیٹ کر اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے۔ مگر دائمی طور پر نہیں رکتا۔ مقام بدلنے سے معنی میں توسیع ہو جاتی ہے۔ یا اگر یوں کہیں تو درست ہوگا کہ معنی کے نئے پرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زماں اور مکاں کی قیود معانی کو معدوم نہیں بلکہ اس کے وسعت میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ معانی کے حوالے سے دریدا کا رویہ منفی ہے وہ معنی کو سر کے بل گرتا دیکھتا ہے۔ البتہ دریدا معنی کے گہراؤ اور تقسیم در تقسیم کا احساس اجاگر کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے مغربی نقادوں نے شخصیت کو منہدم قرار دے کر معنی کو فکشن کا درجہ دیتے ہوئے اُسے ہمہ وقت التوا کا شکار دکھایا ہے۔ جبکہ عملی طور پر شخصیت کی قلبی ماہیت ہوئی جس سے مخاطب کی تخلیقی کارگردگی کے نئے منظرنامے کا ظہور ہوا۔ مغربی نقادوں نے معنی کی کثرت کا نیا مفہوم فراہم کیا۔

مغرب میں بیسویں صدی سے قبل سوچ کا انداز علت اور معلول کو اہمیت دینا تھا۔ سوچ کا یہ انداز اس مفروضے پر قائم تھا کہ ہر شے ایک ٹھوس وجود رکھتی ہے۔ ہر عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کائنات کے

مظاہر ابتداء اور انتہا کے درمیان سیدھے خطوط پر سفر کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اس نظریہ کو مسترد کر دیا گیا۔ اور ''شے'' کو رشتوں کی اکائی قرار دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ شے کو اُسی رشتے کے حوالے سے جانا جا سکتا ہے۔ جو اُس نے دیگر اشیاء سے قائم کر رکھا ہے۔ پس سوچ کے نقطہ کو بدلنا پڑا اور ان اشیاء کو محض مادے کی اکائی تصور کرنے کی بجائے تعلق کی گرہیں تلاش کرنا پڑیں جو ان کا دوسری اشیاء سے تھا۔ یہیں سے ساختیات کے نظریے کا ظہور ہوا۔ ساختیات کا یہ نظام نفسیات، لسانیات فلسفہ اور دیگر عوام میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

لسانیات اور سوسیور کا نظامِ فکر

لسانیات کے ضمن میں سوسیور نے کہا عام گفتگو یعنی پیرول کے پس منظر میں زبان ایک نظام کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ اور ہم اسی دائرہ میں گفتگو کرتے ہیں۔ نوام چومسکی نے گفتگو اور زبان کے لیے Performance and compitence کے موزوں اور برمحل الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس طرح برگسان نے مرور زبان کے مقابل (Duration) کا نظریہ پیش کیا جس میں تمام زمانے ماضی، حال اور مستقبل بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔

فرائڈ نے شعور دنیا کے پس منظر میں لاشعور کی موجودگی کا انکشاف کیا جبکہ ژونگ نے اجتماعی لاشعور کا تصور دیا جو Archetypes سے عبارت ہے۔ یہ خیال عام تھا کہ زبان کے ساختیے کو ماڈل تصور کر کے انسان کی کارگردگی کو جانچا جا سکتا ہے۔ مگر روجر سپری نے دماغ کے خدوخال کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں اُن سے تمام سابقہ تصورات کی نفی ہوگئی ہے۔ یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ انسانی ذہن، نشانات کی حامل زبان کی تخلیق کر سکتا ہے۔ ہم اشاروں، تشبیہات اور نشانات کی مدد سے حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بادل سے بارش کا تصور اشارہ ہے جو علت اور معلول کے رشتے کا عکاس ہے۔ اس طرح کاغذ پر درخت بنانا

مشابہت پر استوار عمل ہے۔ جب ہم درخت کو درخت کہتے ہیں تو یہ اس کا فطری نام نہیں کہ وہ دنیا اور اس مظاہر پر اپنے اختراع کردہ لسانی نشان ثبت کرے جو شے کی پہچان میں مدد دے اور اُس شے کا ٹھوس حوالہ فراہم کرے۔ ان لسانی نشانات کو انگریزی زبان میں Signifier کا نام دیا جاتا ہے۔

ساسیور کا نظریہ تھا کہ لسانی سطح پر ترسیل اس لیے ممکن ہے کہ ہم نے اپنے اندر داخلی طور پر اجتماعی لسانی قواعد کا ایک نظام بنا رکھا ہے۔ جو نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس سے مراد عام گفتگو کے پیچھے زبان کی موجودگی کا اظہار ہے۔ اُردو میں ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث میں اب دل چسپی لی جا رہی ہے۔ اس سے اُردو مغربی تنقید کے ان مباحث سے بھی آشنا ہو سکے گی جو لسانیاتی سطح پر پھیل چکے ہیں۔

ساسیور کے فکری نظام کا آغاز اس تصور سے ہوا کہ زبان نشانات کا ایک سسٹم ہے نشانات تین طرح کے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جسے ساسیور Index کا نام دیتا ہے۔ مثلاً دھواں اس بات کا Index ہے کہ کہیں آگ جل رہی ہے دوسری قسم نشانات کی Icon ہے جو مشابہت پر استوار ہے مثلاً کسی شخص کی تصویر جو اُس شخص کی مشابہت کو ظاہر کرتی ہے۔ اور تیسری قسم دو اشیاء کے درمیان باہمی تعلق کی جانب علامتی نوعیت کا اشارہ ہے لسانی نشان کا تعلق اس آخری قسم سے ہے۔ جسے سوسیور Linguistic sign قرار دیتا ہے۔

ساسیور کا دوسرا نکتہ یہ ہے لسانی نشان درحقیقت بلا جواز یعنی Arbitrary ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لسانی نشان فطرت کا عطیہ نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ اسے اجتماعی عمل سے جنم دیتا اور نافذ کرتا ہے۔ ''جوناتھن کلر'' لسانی نشانات کو محدود کرنا درست تصور نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں ہر زبان کے سگنی فائڈ ز اپنی مخصوص ثقافتی فضا کی پیداوار ہونے کے باعث دوسری زبانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ با آسانی نہیں کیا جا سکتا۔

ساسیور زبان کو دو حصوں لانگ اور پارول میں تقسیم کرتا ہے۔ لانگ سے سوسیور کی مراد زبان کا ایسا نظام

ہے جو نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور پارول سے مراد گفتگو ہے جو ایک خاص نظام پر قائم ہے۔ ٹیرنس ہاکس کے مطابق گفتگو (پارول) آئس برگ کا وہ حصہ ہے جو پانی کی سطح کے اوپر موجود نظر آتا ہے۔ جبکہ (لانگ) وہ حصہ ہے جو زیرِ سطح ہونے کی وجہ سے آنکھ سے اوجھل ہے۔

جب ہم بات چیت کرتے ہیں تو اُس کے تناظر میں قواعد کا ایک باقاعدہ نظام کام کر رہا ہوتا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ الفاظ کو انہیں قواعد کے زیر اثر جملوں کی صورت میں گفتگو کے عمل میں تصورات یا خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے سوسیور کے مطابق گفتگو کرنا انسانی فطری عمل نہیں بلکہ اس کے لیے فطری عمل وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے سے وہ گفتگو کرتا ہے۔ اور نظام کو وجود میں لاتا ہے جس کے اندر لسانی نشانات کو تصورات کے مظہر کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ نوام چومسکی نے ''یونیورسل گرامر'' کی بات کی اور اسے اکتسابی نہیں بلکہ وہبی قرار دیا تھا۔ وہبی سے مراد نوام چومسکی ایسی صلاحیت کو کہتے ہیں جو بچہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔

سوسیور زبان اور گفتگو کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے شطرنج کے کھیل سے تشبیہ دیتے ہیں جس طرح شطرنج کے اصول ہر حالت میں یکساں رہتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ لیکن ہر بار شطرنج کی بساط ان نہ نظر آنے والے اصولوں کے تحت مکمل کی جاتی ہے۔ دورانِ کھیل مختلف چالوں کے پس منظر میں نظر نہ آنے والے اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ یہی اصول زبان میں بھی کارفرما ہے۔ جس میں گفتگو میں استعمال ہونے والے جملے اور الفاظ جن اصولوں کے تحت جوڑے جاتے ہیں۔ یا گرامر کی جس اساس پر قائم ہوتے ہیں۔ وہ اساس نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ سوسیور کے نزدیک زبان، لسانی صلاحیت Linguistic faculty کا نام ہے۔ جبکہ گفتگو اس صلاحیت کی کارگردگی Performance کی صورت ہے۔

زبان کو محض ایک ایسا نظام قرار نہیں دیا جا سکتا جو جملوں کی تشکیل کرتی ہو بلکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں

جملوں کی تشکیل کے لیے قواعد کا علم بھی مضمر ہے۔ جب ''لانگ'' کو ''پارول'' سے الگ کر دیا جاتا ہے تو دراصل اجتماعی سماجی رویوں کو انفرادی رویوں سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

سوسیور کے مطابق زبان جن تعلقات پر مشتمل ہوتی ہے وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ایسے تعلقات جو انتخاب کی بنیاد پر اُستوار ہیں اور دوسرے وہ جن کا قیام اتحاد اور اتصال باہمی پر ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے تعلقات کو عمومی روابط قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے تعلق کو افقی روابط (Paradigmatic relation) کا نام دیا جاتا ہے۔ عمومی روابط میں عناصر کا تقابل جبکہ افقی روابط ان عناصر کو جوڑنے میں کردار ادا کرتے ہیں۔

سوسیور کے مطابق سارا لسانی نظام ان عمودی اور افقی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی زبان کا ساختیہ ہے۔ تاہم سوسیور ساختیہ کے اندر دیگر مختلف سطحوں کی بات کرتا ہے جن میں ہر سطح پر ایسے عناصر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ جو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے جڑ کر برتر سطح کی تعمیر کرتے ہیں تاہم ان میں ہر سطح ساختیہ کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہوتی ہے۔

سوسیور کے فکری نظام کا آخری نقطہ یہ ہے کہ زبان کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہیے کہ ایک خاص لمحے میں تمام کارگردگی کا جائزہ لیا جا سکے۔ نہ کہ وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو مرکز نگاہ بنالینا چاہیے۔ جان سٹروک نے سوسیور سے پہلے کے ماہرین لسانیات کے بارے میں کہا ہے کہ وہ زبان کا مطالعہ اس کی تاریخ کے تناظر میں کیا کرتے تھے۔ اور زبان کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو موضوع بنایا جاتا تھا۔ سوسیور نے اس رویہ کی مخالفت کی اور اسے دوزمانی (Diachornic) رویہ قرار دیا۔ سوسیور، ساختیات کو یک زمانی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا مقصد زبان کے نظام کو غیر تاریخی پس منظر میں رکھ کر زیر مطالعہ لانا ہے۔

فرانس میں مارکسیت نے ساختیات کی مخالفت اسی بنیاد پر کی تھی۔ کیونکہ مارکسیت میں تاریخ کو فراموش کرنا قابل قبول نہیں تھا۔ کیونکہ مارکسیت سماجی حقائق کی تاریخی سطح کو اجاگر کرنا ضروری خیال کرتی ہے جو دوزمانی

رویہ کی عکاس ہے۔سوسیور اس یک زمانی اور دوزمانی تقسیم سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ''زبان ایسا نظامِ فکر نہیں جو کسی متغیر جوہر کا حامل ہو۔'' وہ زبان کو ہیئت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو اپنے اجزا کے باہمی ربط سے قائم ہے لیکن ان اجزاء کی پہچان ان کی مقرر یا متغیر حیثیت کے باعث نہیں یہ باہمی فرق کی بنیاد پر قائم ہیں۔

زبانوں میں موجود افتراق ہی اصل بات ہے جس سے لسانی نظام کے اندر نشانات کی قیمت مقرر ہوتی ہے۔ یہ قیمت تغیر کا شکار رہتی ہے کیونکہ بنیادی طور پر زبان کا مکمل نظام بلا جواز (Arbitrary) ہے۔زبان کا یک زمانی روپ جس کو سوسیور اہمیت دیتے ہیں کا نقطہ نظر نطشے، ہائیڈگر اور فرائیڈ سے ملتا جلتا ہے۔انھوں نے ''وجود'' کے اصل حقیقت ہونے سے انکار کیا۔سوسیور کی لسانیات بھی حقیقت میں زبان کے بنتے بگڑتے رشتوں سے عبارت ہے۔جس میں نشانات کے نظام کو سوسیور زبان کے اصولوں کے تابع گردانتے ہیں۔ زبان کے بارے میں سوسیور کے نظریات نے بعد ازاں ساختیات کو بہت متاثر کیا۔رولاں بارتھ کا یہ کہنا ''تخلیق پیاز کے پرتوں کی طرح ہے اور ساختیاتی تنقید کا مقصد ان چھلکوں کو اُتارتے چلے جانا ہے''۔ یہ مقصد سوسیور کے نظامِ فکر کو سمجھے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

رولاں بارتھ کے لسانی نظریات (۱۹۸۰۔۱۹۱۵)

رولاں بارتھ خلاق شخصیت انسان تھا۔ جب وہ کسی مسئلہ پر اپنا نقطہ نظر پیش کرتا اور اس مسئلے سے متعلق اصطلاحات کی وضاحت کر لیتا۔تو کچھ عرصہ بعد وہ مسئلہ کے کسی اور پہلو کو اجاگر کر دیتا تو پھر سے نئی اصطلاحات کو مرتب کرنا شروع کر دیتا اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بارتھ کا فکری نظام بار بار اشکال بدلتا رہا ۔مثلاً بارتھ نے اپنی کتاب (Critical Essays) میں اپنے مضامین میں Ecrivains اور Ecrivants میں فرق پیش کیا۔مگر بعد کی تصانیف میں یہ الفاظ غائب ہو گئے۔ اس لیے جوناتھن فکر نے بارتھ پر تحریر کی گئی کتاب میں (Barthes) میں لکھا کہ:۔

"Barth is a seminal thirear but he tries to uproot his seedings as they spout. When his projects flourish, they do so without him or despite him"(P-12)

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رولاں بارتھ جب بھی کسی منصوبہ پر تحقیق کرتا تو بغور مطالعہ کے بعد اُسی سطحی اضطراری رویے کے عقب میں ایک منضبط نظام کی موجودگی نظر آتی۔ اس طرح تخیلات کے دائرے وسیع تر ہوتے چلے جاتے۔ ۱۹۶۰ء میں بارتھ نے مصنفین کی دو اقسام کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اُس وقت بارتھ مصنف کے وجود اور اہمیت کا قائل تھا۔ مگر ۱۹۷۰ء تک اُس کے مصنف کے بارے میں تصورات بدل چکے تھے۔ بارتھ وجودیت سے آغاز ہی سے متاثر تھا۔ اصلیت کا مرکزی نقطہ ''ہر شخص کے عماق میں جوہر موجود ہوتا ہے جو تبدیل نہیں ہوتا'' تھا۔ اس کے برعکس وجودیت اس بات کی داعی تھی کہ ''فرد تبدیلی کے مطالعے میں آزاد ہے۔ وہ فیصلہ کرنے میں ممتاز ہے اور ماضی کا جبہ اُسے مجبور نہیں کرسکتا۔'' (۳۴)

ابتدا میں بارتھ، سارتر سے بھی زیادہ اصلیت کے نظریے کی مخالفت کرتا تھا۔ بارتھ فرد کو وحدت کی بجائے کثرت کا نمائندہ قرار دیتا تھا۔ مگر ۱۹۷۰ء تک وہ مصنف کی کارگردگی تو ایک طرف اُس کے وجود سے بھی انکاری ہو چکا تھا۔ اب بارتھ تو مصنفین کی بجائے تحریر کے مطالعے پر زور دیتا تھا۔ بارتھ کے اس موقف کے اثرات جدید تنقید پر بھی مرتب ہوئے۔ جس نے تصنیف بغیر مصنف کا نعرہ دیا۔ مگر اس کے زیادہ اثرات ساختیات پر پڑے جس کی بدولت نطشے اور ہائیڈگر کے ''مرکز آشنا نظریے'' کی نفی کی گئی۔ نطشے کے اعلان ''خدا کی موت'' جو درحقیقت واحد معنی کو مسترد کرنے کی کوشش تھی۔ جبکہ رولاں بارتھ نے مصنف کو "Author God" کہہ کر اس کی موت کا باقاعدہ اعلان کردیا۔ اس طرح اُس نے نطشے کے قول کی پیروی کی۔

رولاں بارتھ نے گفتگو کی دو اقسام کو موضوع بنایا۔ ایک قسم کو Readesly اور دوسری کو Writesly کہا ہے۔ پہلی قسم میں وہ قاری یا سامع کو اُس شخص کے مشابہ قرار دیتا ہے جو پیاسا ہے اور اُس کے سامنے جب مشروب آتا ہے تو وہ اُس کو فوراً پی جاتا ہے۔ اس قسم کی تحریر و گفتگو قاری یا سامع کو خرچ کرنے والے کی حیثیت عطا کرتی ہے۔ اس کے برعکس رولاں بارتھ کے نزدیک دوسری قسم کی گفتگو قاری یا سامع کو ایک تخلیق کار میں بدل دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ مشروب کو غٹا غٹ پی جانے کی بجائے اُس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ گویا وہ اس کے تمام پہلوؤں اور اوصاف سے تجرباتی طور پر متعارف ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریر کو قاری از سرِ نو ترتیب دیتا ہے۔ اس بحث سے واضح بات یہ سامنے آتی ہے کہ "Readesly" ایسی تحریر ہے جو قاری کو سحر زدہ کر کے ایک خاص منزل کی طرف سفر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور سامع یا قاری اُس کے ساتھ بندھا چلا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس "Writesly" میں قاری قدم بہ قدم گمان کے پہلو کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ''سٹورک'' پہلی قسم کی تحریر میں قاری کو افقی سمت میں جبکہ دوسری قسم میں عمودی سفر کرتا دیکھتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں جب رولاں بارتھ نے دو قسم کی مصنفین کا ذکر کیا تو ایک ایسا لکھاری جو کم درجے کا تھا اُسے ''اکریونت'' کا نام دیا جبکہ اعلیٰ درجے کے مصنف کو ''اکریوین'' کہا تھا۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء میں جب اُس نے مصنف کے وجود کو مسترد کر دیا اور تحریر کی اہمیت پر زور دیا تو اب کی بار بھی رولاں بارتھ نے تحریر کی دو اقسام کی نشاندہی کی۔ ایک عام سی تحریر "Readesly" اور دوسری خاص تحریر کو "Writesly" کا نام دیا۔ اگر بغور جائزہ لیں تو جو بات رولاں بارتھ نے ۱۹۶۰ء میں مصنف کے بارے میں کی تھی وہی بات ۱۹۷۰ء میں وہ تحریر کے بارے میں کرتے ہیں۔ یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ مصنف کی موت کے باوجود تحریر کے عقب میں اُس کی موجودگی کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ مگر رولاں بارتھ اب مصنف کے نام کو سننا پسند نہیں کرتا تھا اور اُس کا کہنا تھا کہ اُس کے سامنے محض تحریر کے حوالے سے سوال کیے جائیں۔ (۳۵)

رولاں بارتھ تحریر کی ان دونوں اقسام کو اقتباس (Text) کا نام دیتے ہیں۔ وہ اقتباس کا ایسی ساخت قرار دیتے ہیں جس میں ہر وقت تغیر آ رہے ہوتے ہیں مگر یہ تغیرات اشارات اور بحث کے تابع ہوتے ہیں۔ جو متن کی ساخت میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بارتھ نے محض متن کو ضروری قرار دیتے ہوئے متن کی ساخت سے مصنف کی کارگردگی کو خارج کر دیا۔ گویا تحریر بذات خود ایک نظام ہے جس میں لکھنے والے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ بارتھ، سوسیئر کے نظریہ پارول کی پیروی کر رہا ہے جس میں سوسیور گفتگو کے عقب میں زبان کی نشاندھی کرتا ہے۔ بارتھ بھی تحریک کے پس پشت موجود (Codes) کی بات کرتا ہے۔ بارتھ تحریر کو ایسی ساکت قرار دیتے ہیں جو پیاز کے مشابہ ہونے کی وجہ سے پرتوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں کوئی پیغام نہیں یعنی ایسے لفافہ ہے جس میں خط موجود نہیں اس حوالے سے بارتھ جاپان کی ثقافت کی مثال پیش کرتے ہیں جو لفافے کو اہمیت دیتی ہے اُس کے اندر کیا موجود ہے اُس سے کسی کو غرض نہیں ہے۔

رولاں بارتھ نے جب دو قسم کے مصنفین کا ذکر کیا تو وہاں متن کی بھی دو اقسام بیان کی کیونکہ Ecrivain مصنف اور Writery متن کے اوصاف ملتے جلتے ہیں۔ لہذا ان دونوں کو ایک ہی خانہ میں رکھتے ہیں۔ اس طرح کا معاملہ دوسری قسم کے مصنفین اور متون کے درمیان بھی ہے۔ جو Ecrivant مصنفین اور Readery متن کے حوالے سے ایک ہی طرح کی خصوصیات رکھنے کی وجہ سے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بارتھ کا اصل موقف اپنی جگہ قائم ہے اور اُس میں کسی طرح تبدیل واقع نہیں ہوتی۔ صرف تبدیلی مصنف کی جگہ تحریر کی اہمیت میں ہوئی ہے۔

رولاں بارتھ نے مصنف، تحریر کی طرح قاری کی بھی دو اقسام بتائی ہیں۔ ایک ایسا قاری جو متن سے سطحی طور پر مستفید ہوتا ہے اور دوسرا قاری وہ ہے جو متن کی مکمل غرض وغایت اور مقاصد اور گہرائی سے مستفید ہوتا ہے۔ درحقیقت بارتھ تحریر کو انسانی جسم تصور کرتے ہیں۔ اس تصور میں وہ قاری کو محبوب اور تحریر کو محبوبہ کے جسمانی حسن

سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس طرح محبوب اپنی محبوبہ کے جسمانی حسن پر فریفتہ ہوتا ہے اور اُس کی ہر ادا و انداز سے لطف اندوز ہوتا ہے اُسی طرح بارتھ کے نزدیک قاری بھی تحریر کے متن سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بظاہر بارتھ عمومی لذت کے حصول پر زور دیتے ہیں۔ وہ کسی نظریے کو معانی کا حامل ہونے کی وجہ سے دل کش قرار دیتے ہیں۔ اس طرح تحریر بھی مادی وجود کی حامل ہونے کی وجہ سے قابل توجہ قرار پاتی ہے۔ جس طرح محبوبہ کے پورے جسم سے کچھ خاص اجزاء مثلاً اُس کی آنکھیں، زلفیں اور اُس کی چال ڈھال اُس کے پورے پیکر کو دل کش بناتے ہیں۔ اسی طرح تحریر کو دل کشی فراہم کرنے کے لیے تشبیہ، استعارات اور محاورات وغیرہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جو قاری کو لطف فراہم کرتے ہیں۔

رولاں بارتھ نے اس حوالے سے چار مراحل کا ذکر کیا ہے۔ جن کے متوازی تحریر ہونے کی وجہ سے پڑھنے اور سننے والا چار مراحل سے گزرتا ہے۔ ان چار مراحل کو بارتھ Paranoid ،Obsessional, Hysteric اور Fetishist کا نام دیتا ہے۔ (۳۶) بارتھ، قاری کے لطف اندوز ہونے کے عمل کو عمومی وظیفہ قرار دیتا ہے۔ بعض اوقات سامع یا قاری تحریر کو پڑھ کر یا سن کر متوازی منفی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس سے لذت حاصل کرنے والی کیفیت کو وہ یکسر بھلا کر گفتگو میں جا بجا خالی جگہیں تلاش کرتا ہے۔ اس قسم کی کوشش بھی قاری کو لذت فراہم کرتی ہے۔ جو یقیناً عمومی لذت سے مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ بارتھ کے مطابق مکمل برہنہ جسم وہ کشش پیدا نہیں کرتا جو نیم برہنہ یا لباس کے اندر سے کشش پیدا کرتے جسم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے رولاں بارتھ نے قاری کو بھی دو اقسام میں تقسیم کیا۔ ایک ایسا قاری جو خود کو زبان کی عمومی غرض و غایت تک محدود رکھتا ہے اور دوسرا وہ جو زبان اور متن کے مختلف پہلوؤں سے استفادہ حاصل کرتا اور انبساط حاصل کرتا ہے۔ (۳۷)

رولاں بارتھ کے نظریات ایک مثلث کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ جو مصنف، تصنیف اور قاری سے ترتیب ہیں۔ بارتھ نے فکری دنیا میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے مصنف کی اہمیت کی جانب نشاندہی کی جس

میں دوقسم کے لکھاریوں کا حوالہ موجود ہے۔Ecrivarstاور Ecrivian جس میں پہلی قسم کو وہ کمتر اور دوسرے کو برتر تصور کرتے ہیں۔ اُس کے بعد تحریر کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے Readerlyاور Writerly کا نام دیتے ہیں۔ Readerly کو عام تحریر جبکہ Writerly کو خاص قسم کی تحریر قرار دیا ہے۔ آخر میں بارتھ قاری کی بھی اقسام کرتے ہوئے اُسے دو قسم کے قاری میں تقسیم کرتے ہیں ایک وہ جو متن سے ظاہری طور پر مستفید ہوتا ہے جبکہ دوسرا قاری وہ جو متن کو اُس کی غرض وغایت سمیت اور گہرائی کے ساتھ اُس سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔

بارتھ کا نظام دو خانوں میں تقسیم ہے۔ ایک خانہ میں عمومی نوعیت کے مصنف، متن اور قاری کو رکھا گیا ہے جبکہ دوسرے خانے کو خاص قسم کے مصنف، متن اور قاری کے لیے رکھا گیا ہے۔ بارتھ کے فکری سفر کو تین منزلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس میں سب سے پہلی منزل میں وہ مصنف کو اہمیت دیتا ہے۔ دوسری منزل میں وہ متن کو اہم قرار دیتا ہے جبکہ تیسری منزل میں وہ قاری کی اہمیت پر بحث کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رولاں بارتھ نے آغاز سے ہی توانا اور زرخیز خیالات کو اپنا ہمسفر بنایا۔ وہ چند ساعتوں کے لیے ہر منزل پر رکا اور اُس کا مکمل جائزہ لینے اور اُس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر نظر ڈالی اور اپنے موقف میں وسعت پیدا کر کے اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

رولاں بارتھ معنی کو مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ معانی کو پیاز کے چھلکے اُتارنے یا جراب کے ادھیڑنے سے تعبیر کرتا ہے۔(۳۸) بارتھ کے مطابق اصل لطف کھولنے میں ہے بے نقاب کرنے میں نہیں۔ مثلاً جراب کے دھاگے کھولنے سے گرہوں اور پرتوں سے نجات حاصل ہوتی جائے گی۔ اور آخر میں دھاگے کے سوا کچھ نہیں رہ جائے گا۔ بارتھ اسی دھاگے کو اصلی ساخت قرار دیتے ہیں اور متن کی پیچیدگیوں کے باوجود اس کا مقصد قاری کو اُس بنیاد تک رسائی فراہم کرنا قرار دیتے ہیں۔ رولاں بارتھ کے نظریہ میں نطشے کی جھلک نمایاں طور پر موجود ہے۔ کیونکہ بارتھ جب کہتے ہیں کہ متن میں کوئی معانی موجود نہیں۔ تو وہ اس بات کا اظہار ہے کہ کائنات کے متن میں بھی

دراصل کوئی معانی موجود نہیں۔اس معاملے میں بارتھ، نطشے کا مقلد ہے۔

بارتھ کا یہ کہنا کہ کائنات کے متن میں کوئی معانی موجود نہیں ہے اس لیے درست تصور نہیں کیا جاتا کہ کائنات پیاز ہرگز نہیں جس کے پرت اتارنے سے آپ ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جس سے آگے کوئی مقام نہیں۔اس کے برعکس کائنات کے پرت لامتناہی ہیں۔ان تمام پرتوں کو اتارنا ناممکن ہے۔تو رولاں بارتھ کا یہ کہ دنیا کس طرح درست ہوسکتا ہے کہ پرتوں کے نیچے معانی موجود نہیں ہیں۔

مغرب میں انیسویں صدی تک ایسا نظام مقبول تھا جو نظام شمسی سے مشابہت رکھتا تھا۔جس میں ایک سورج اور ایک معانی کا ادراک موجود تھا۔مگر بیسویں صدی کے آغاز سے ہی مرکز کی بجائے مکمل ساخت کے ہر نقطہ پر غور کرنے کی بات کی گئی۔رولاں بارتھ کے نظریات کو مصنف، تصنیف اور قاری کے حوالے سے درست قرار دیئے جاتے ہیں۔مگر جب بارتھ معانی کی نفی کرتے ہیں تو مختلف ماہرین لسانیات اُن کے اس نظریہ سے اختلاف کرتے پائے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے لسانی مراحل اور مباحث

آخری صدی کے دوران مغربی لسانی تنقید چار مراحل سے گزری ہے۔پہلے مرحلے میں مصنف، اور تخلیق کار کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اس مرحلے کو''تاریخی سوانحی مرحلہ'' کہا جاسکتا ہے۔دوسرے مرحلے میں مصنف کی نفی کرتے ہوئے تحریر کو خود کفیل اکائی کے طور پر تسلیم کیا گیا۔یہ دور نئی تنقید کا مرحلہ قرار دیا جاتا ہے۔تیسرے مرحلے میں اُس نظام کی بات کی گئی جو تصنیف کی ساخت میں کارفرما ہے اس نظام کو شعریات کا نام دیا گیا اور اس مرحلے کو ساختیاتی مرحلہ کہا گیا ہے۔چوتھا مرحلہ ساخت شکنی سے متعلق ہے۔جس میں پیچیدگیوں اور گہرائی کے بارے میں بات کی گئی جس کے پیچھے نہ تو کوئی مرکز موجود ہے اور نہ ہی نظام کی موجودگی اس گہرائی کے پس منظر میں دکھائی دیتی

ہے۔

ساخت شکنی میں سامنے موجود اشیاء اور مظاہر سے منسلک معانی کے ساتھ موجود مخفی معانی کے موجود ہونے کا احساس نمایاں ہے۔ گویا ہر طرف فرق موجود ہے۔ ساختیاتی عمل میں ''مرکز'' کا حوالہ موجود تھا جس سے ایک مخصوص معانی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ جبکہ ساخت شکنی میں معانی کے مسلسل التوا کا ذکر ہے۔ (۳۹)

دنیا کے مذاہب کی تعلیمات میں معانی کا التوا مسلسل دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ دریدا معانی کے فرق اور لا متناہی التوا کے حوالے سے موجودگی کو گہرا اور پیچیدہ عمل قرار دیتے ہیں۔ اور یہ معانی آفرینی کی رو تب تک جاری رہتی ہے جب تک یہ مظہر یا شے کے متعین معانی کی حامل ساخت تک رسائی حاصل نہ کر لے۔

سوسیور کا موقف تھا کہ زبان کا ایک مستند نظام ہے لہذا زبان کا مطالعہ لمحہ حاضر میں ہونا چاہیے۔ نہ کہ تاریخ کے حوالے سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ سوسیور نے لانگ اور پارول دونوں میں جو تعلق قائم کیا ہے نظام اور کارگردگی سے ترتیب ہے۔ لانگ کو زبان کا نظام جبکہ پارول کو زبان کی کارگردگی سے ظاہر کیا ہے۔ زبان میں جملہ سازی کو اگر لانگ کے تابع کر دیا جائے تو معنی کا انشراح ہوگا۔ ورنہ زبان نا قابل فہم قرار پائے گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جملوں کی بناوٹ میں لانگ کا کردار اہمیت کا حامل ہے جبکہ پارول اُس بناوٹ کے اظہار کا نام ہے۔

بیسویں صدی میں روسی ہیئت پسندوں نے متن کو اُس کے لمحہ حاضر میں دیکھنے پر زور دیا ہے۔ مگر وہ متن کی مادی حیثیت کو ہی سب کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ تخلیق کاری میں بنیادی بات تحریر کو لسانی سطح پر ''نامانوس'' بنانا ہے اور کچھ نہیں۔ یوں روسی ماہرین نے تاریخی حیثیت کو رد کر دیا۔ اور متن کے عقب میں کسی بھی ''حقیقت'' کے وجود سے انکار کر دیا۔ اُن کا موقف تھا کہ متن اپنا لسانی وجود رکھتا ہے جو خود کار ہے اس لیے محض غور طلب بات لسانی وجود کی میکانیت ہے۔

یہی انداز نئی تنقید سے وابستہ ماہرین بھی اپنایا۔ انہوں نے لسانی ساخت میں موجود متن کی پیچیدہ بناوٹ کا

احساس دلایا جو معانی کی تشکیل میں اہم تھی۔روسی ماہرین نے زیادہ تو توجہ کا مرکز ''حرکی اصول'' تھا۔جس کے تحت متن کے اجزا باہم مل کر اکائی بناتے ہیں۔اور الفاظ کا کام پیغام کی ترسیل کی بجائے اپنی ساخت اور لسانی وجود کے اظہار سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔جبکہ نئی تنقید کے ماہرین تخلیق کو محض میکانکی ساخت قرار نہیں دیتے۔وہ متن کو ایسی ساخت سے تعبیر کرتے ہیں۔جس کے اندر سے عمل اور ردِ عمل کے نتیجہ میں معانی پھوٹنے لگیں۔بغور مطالعہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ روسی ماہرین اور جدید تنقید سے وابستہ ماہرین نے مصنف کی بجائے متن کے خود کار اور خود کفیل وجود کو اہم قرار دیا لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ روسی ماہرین نے متن کے لسانی وجود کو اہمیت دی جبکہ جدید تنقید کے ماہرین نے متن کے اندر موجود اجزا کو اہم قرار دیا جو متن کے انوکھے پن اور معانی آفرینی کے لیے بطور محرک کام کر رہے تھے۔

ساختیات اور لسانیات کے مباحث

نئی تنقید کے بعد ساختیاتی ماہرین نے زبان کے ثقافتی منطقہ کی بات کی جسے شعریات کا نام دیا گیا۔ایک ایسا نظام جو اشارات اور علامات سے ترتیب ہے۔قابلِ غور یہ امر ہے کہ چاہے وہ روسی ہیئت پسندی ہو۔خواہ نئی جدید تنقید ہو یا پھر ساختیات تینوں میں متن کے وجود کو اہمیت حاصل ہے۔جبکہ مخاطب کے حوالے کو مسترد کر دیا گیا۔تینوں نے متن کی گہرائی میں بھی جا کر لسانی وجود،لسانی ساخت اور شعریات کی کارکردگی کو واضح کیا۔(۴۰)

ساختیاتی ماڈل میں سوسیور نے لسانی ماڈل کو سامنے رکھ کر ادب کو زبان کا درجہ دیا۔اس طرح لانگ کی کارکردگی کو پارول کی بُنت میں واضح کیا۔اس طرح ساختیاتی نقطہ نظر کے حامل ماہرین نے متن کو کھولنے کی بات کی تاکہ شعریات تک رسائی حاصل ہو سکے۔کیونکہ ان ماہرین نے ساخت کو شعریات کے ثقافتی دھاگوں کا جال قرار دیا اس لیے ان کا کہنا ہے کہ متن کو لسانی اکائی تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اُس ثقافتی تناظر کا بھی احاطہ کیا جائے جو متن کی تشکیل میں کارفرما ہے۔

ساختیات کا یہ تصور اس بات کا اظہار ہے کہ ساختیاتی فکر میں مرکز کی نفی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس میں پھیلاؤ کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ مرکز آشنا ساخت کی صورت یہ ہے کہ اس میں جملہ خطوط مرکز کے تابع ہیں۔ لیکن اس بات کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مرکز کی حالت میں ساختیات نے تبدیلی کر دی۔ اور مرکز کو ایک نقطہ تک محدود رکھنے کی بجائے ربط باہم کی حامل ساخت قرار دیا۔(۴۱) یوں ساخت متن کا ہر جزو دوسرے اجزاء سے مشروط نظر آتا ہے۔ ساختیاتی فکر نے مرکز (مصنف) کو دلائل کے ساتھ مسترد کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ساختیات نے مرکز کی کُلی طور پر نفی نہیں کی بلکہ اُسے دبا دیا ہے۔ تاہم وہ اس کوشش میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکی۔

اس لیے مرکز دوبارہ شعریات کی صورت میں سامنے آ گیا۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ساختیاتی فکر نے شعریات کی صورت میں نئے مرکز کو سامنے پیش کر دیا جو نقطہ ارتکاز کی بجائے متحرک ساخت ہے۔ اس طرح ساختیات نے اپنے بنیادی موقف کو ہی شکست و ریخت سے دو چار کر دیا۔ یہ بات ذہنوں میں رہے کہ ساختیاتی فکر نے مصنف کی مرکزیت کو ختم کرتے ہوئے اس طرف نشاندہی کی تھی کہ متن کو مصنف نہیں لکھتا بلکہ متن خود بخود تشکیل پاتا ہے۔ اس سے مراد یہ تھا کہ تخلیق کے عمل میں مصنف کی بجائے شعریات ایک نظام کے طور پر متحرک ہو کر موجود متن کی بناوٹ میں کردار ادا کرتی ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ شعریات کے نظام کو مستعمل کر کے متن کی تخلیق کرنے والے کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق مصنف کے نقطہ کو تج کے اس کی جگہ شعریات کو لفظ لکھ دینے سے مصنف کی نفی نہیں ہو جاتی۔ شعریات تو مصنف کی مخفی قوت، اُس کا لاشعور اور زبان کے حوالے سے اُس کی لانگ ہے جو اُس کی کارگردگی (پارول) کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ورنہ یہ مخفی رہتی۔ اس زاویے سے صاف نظر آتا ہے کہ ساختیات نے مصنف کو تو دبا دیا مگر شعریات میں منقلب ہو کر وہ دوبارہ سامنے آ گئی۔ اس طرح ساختیات نے خود ہی اپنے آپ کو Deconstruct کر دیا۔

لیوی سٹراس (۱۹۰۸۔۲۰۰۹)

لیوی سٹراس نے اساطیر کے نظام کو زبان قرار دیا۔ ساختیات نے ادب کو زبان قرار دیا۔(۴۲) جبکہ لاکاں نے لاشعور کو زبان کا نام دیا۔اس طرح ان تینوں ماہرین نے اس بات کا اقرار کیا کہ لانگ کی موجودگی زبان کو پُراسراراور ماورایت عطا کرتی ہے۔اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ''لانگ'' ہمیشہ اس کوشش کا نام ہے جو متن کے پیچھے نقاب در نقاب تہہ در تہہ شے موجود ہے اُسے تلاش کرے اور متعین معانی سے نجات دلاتی ہے جس سے معنی وسیع سے وسیع تر ہوتے رہیں۔اس طرح ساختیات میں متن سے مراد شعریات کی وہ کارگردگی ہے جو دکھائی نہیں دیتی مگر متن کے اندر اُس کی موجودگی پھیلے ہوئے جال کی مانند ہوتی ہے۔لہذا ہر متن، تمام دوسرے متون سے منسلک ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر میں نظام کی یکسانیت موجود رہتی ہے۔سوسیور کے مطابق ہر نشان دوسرے نشانات سے فرق کی بنیاد پر اپنی انفرادیت کا اعلان کرتا ہے۔اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر متن اپنی انفرادیت کے حوالے سے دوسرے متن سے الگ پہچان رکھتا ہے۔گفتگو کے پس منظر میں ایک نظام موجود ہے جو متن کا اظہار کرتا ہے لہذا کوئی بھی متن اس نظام سے یکسر بغاوت نہیں کرسکتا۔اس طرح متن اپنے سیاق وسباق سے جڑا رہتا ہے اور اس کی ساخت ثقافتی نظام کے بنیادی خدوخال سے ہی عبارت ہے۔اس لیے جب تک کسی متن کو اُس تناظر میں رکھ کر نہ پڑھا یا سمجھا جائے جس میں وہ اُبھرتا ہے اس کے درست مفہوم سے آگاہی حاصل نہیں ہوسکتی۔

سوسیور کا لسانی ماڈل

(سوسیور ۱۸۵۷تا۱۹۱۳) سوسیور کے زبان کے حوالے سے اختیار کیے گئے موقف پر غور کرنے سے جو

بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ سوسیور زبان کے تین چہرے قرار دیتا ہے جن کو وہ گفتار (پارول) دوسرا (لانگ) اور تیسرے کو وہ Language زبان کا نام دیتا ہے۔ ان تمام میں زیادہ اہمیت سوسیور، گفتار (پارول) کو دیتا ہے کیونکہ اُن کے نزدیک یہ سب سے زیادہ فعال اور نمایاں ہے۔ اس کی مثال موسیقی کے آلات سے نکلنے والی آواز سے دی جاسکتی ہے۔ موسیقی کے آلات بجنے پر دو طرح کی آواز دیتے ہیں۔ ایک ایسی آواز جو کسی اناڑی کے ان آلات کو چھیڑنے سے برامد ہوتی ہے جسے سوسیور شور کا نام دیتے ہیں جبکہ دوسری وہ جو کسی ماہر موسیقار کے ہاتھوں سے اُس آلہ موسیقی سے برامد ہوتی ہے جس کے پس منظر میں موسیقی بطور گرامر موجود ہوتی ہے لسانیات اس آخری صورت سے اخذ کی جانے والی صورت ہے۔

سوسیور کے اس ماڈل کو سامنے رکھ کر لیوی سٹراس نے انسانی ثقافت کا جائزہ لیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ہر ثقافت زبان کے مشابہ ہے۔ یعنی لسانیات کی ظاہری صورتحال کے پس پشت ایک غائب کا نظام کارفرما ہے۔ جو ظاہری گفتگو ہم کرتے ہیں اُس کے پیچھے اساطیر کا نظام موجود ہے لیوی سٹراس نے ثقافتی تناظر کو محض لسانی عمل تک محدود قرار نہیں دیا بلکہ شادی بیاہ کے قوانین کھانے پینے اور لباس کے آداب منفرد اکائیوں کی بجائے رشتوں اور ثقافتوں کے جال میں دکھائے ہیں۔ گویا معاشرہ اپنے اجزا جس سے وہ ترتیب پاتا ہے۔ ان کے اظہار کے لیے ثقافت کا مرہون منت ہوتا ہے۔ یہ ثقافت ہی ہے جو تقابلی اور منسلک ساختوں کو ترتیب دیتی ہے۔ یہ ساختیات تمام ثقافتوں میں ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ساختیات لاشعوری میلانات کے تابع اور مخفی ہوتے ہیں لہذا ان کی حیثیت کو لیوی سٹراس لانگ سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ لیوی سٹراس کا مقصد لسانیاتی نظام میں انسان کی سوچ کو متاثر کرنے والے اساطیر کو واضح کرنا ہے۔ جو انسانی سوچ کو ایک خاص انداز میں بدلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھر انسان کی حیثیت محض واسطہ تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیوی سٹراس کے مطابق:۔

"How myths think in man unknown to them"

لیوی سٹراس کے ان الفاظ کو سوسیور کے موقف کی روشنی میں جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح افراد گفتگو کرتے ہوئے زبان کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گفتگو کے عمل میں انسان نہیں بلکہ زبان بولتی ہے اس طرح ہائیڈگر کے الفاظ "Language speaks not man" کی تصدیق ہو جاتی ہے۔اور اس طرح "Writing writes not Author" کا موقف بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ہنری ہاکس نے "Language speaks not man" کے الفاظ ہائیڈگر کے بتاتے ہیں۔ ہائیڈگر کا یہ کہنا درحقیقت جوناتھن کلر کی کتاب Structurel Man poetics کے مطالعہ کے سبب ہے۔لیکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہنری ہاکس سے اتفاق نہیں کرتے اور "Language speaks not man" کے الفاظ کو ہائیڈگر سے منسوب نہیں کرتے۔اصل میں ہنری ہاکس نے یہ بات محض جوناتھن کلر کی کتاب کی چند سطریں پڑھنے تک محدود رہ کر نہیں بلکہ اُن وضاحتوں کو مدِ نظر رکھ کر کی ہیں جن کو خود جاناتھن کلر نے لکھا ہے۔ان وضاحتوں کا بغور مطالعہ ہنری ہاکس کا ان الفاظ کو ہائیڈگر سے منسوب کرنا درست معلوم ہوتا ہے۔

جوناتھن کلر کے لیے ''فاعل'' کا وجود اہمیت کا حامل ہے۔(۴۳) جسے نطشے اور ہائیڈگر جیسے ماہرین نے رد کر دیا تھا۔اس طرح جوناتھن کلر نے ''روپ فرائی'' کے اس تصور کو بھی رد کر دیا جس کے مطابق ہر نئی نظم، سابقہ نظموں سے جنم لیتی ہے۔ جوناتھن کلر ایسے نظام پر زور دیتا ہے جس میں فاعل کو نفی نہیں کیا جا سکتا۔کلر کے مطابق فرد معانی کا منبع نہ سہی مگر معانی اُس سے گزرے بغیر وجود میں نہیں آ سکتے۔ گویا اہم بات ساختیاتی عمل ہے جس میں فاعل کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جوناتھن فکر کی بحث اس بات کی عکاس ہے کہ ہنری ہاکس نے جو بات ہائیڈگر سے منسوب کی ہے وہ غلط نہیں ہے۔

ساختیاتی تنقید سے قبل یعنی انیسویں صدی کے اواخر تک مصنف کو تصنیف پر فوقیت حاصل تھی اور ادب کو ''پیغام بغیر اشارات'' کہا گیا جبکہ روسی ہیئت پسندوں نے ''اشارات بغیر پیغام'' کا موقف پیش کیا۔اُن کے

مطابق تخلیق کا وجود لسانی وجود کا آغاز ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ تخلیق کے لسانی وجود کا مطالعہ کیا جائے۔ادیب عام الفاظ کو انوکھا بنانے کا ہنر جانتا ہے۔روسی ہیئت پسندوں نے اس عمل کو Ostranenie کا نام دیا بعد میں پراگ سکول نے اس کے لیے Foregrounding کی اصطلاح استعمال کی ساختیات سے قبل ہیئت پسندی کی تین تحریکیں نمایاں تھیں۔پہلی تحریک روسی ہیئت پسندی کی تحریک ہے جس کو ۱۹۲۹ء میں سیاسی وجود کی بنیاد پر دبا دیا گیا۔دوسری نئ تنقید جو ایلیٹ، رچرڈز اور لیوس کے زیر اثر برطانیہ میں پھلی پھولی۔تیسری جدید تنقید کی وہ صورت تھی جو امریکہ میں شہرت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔اگرچہ یہ تینوں تحریکیں کسی حد تک ایک دوسرے سے مختلف تھی ان کا بنیادی موقف ایک جیسا تھا اور وہ یہ تھا کہ تخلیق کو اُس کے اجزائے ترکیبی کے حوالے سے جانچا جائے۔دوسری ماہرین نے ادبی تخلیق کو لسانی وجود گردانا جس میں تخلیق کار اپنی تخلیق میں زبان کے جوہر اور نشان فہمی کو استعمال کرتا ہے۔جبکہ برطانیہ اور امریکہ میں جدید تنقید کے ماہرین کی توجہ کا مرکز تخلیق کے مضمرات، ابہام اور ایمایت لفظی پر تھا۔ان ماہرین کے مطابق تخلیق کسی نظریے کی تاریخی مواد کی تشہیر نہیں بلکہ یہ ایک نامیاتی کل ہے۔جس میں ہیئت اور متن دو مختلف اشیاء ہیں۔ہیئت پسند ماہرین ان تینوں تحاریک میں تخلیق کو ایک خود مختاری عطا کرنے پر قائم ہیں۔اور تخلیق کو اس کی بنیادی ساخت کے حوالے سے پرکھنے پر مضمر ہیں۔

روسی ماہرین کی توجہ کا مرکز لسانی وجود رہا۔کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ شاعری کا تعلق الفاظ سے ہے نہ کہ موضوعات سے ہے۔(۴۴) جبکہ جدید تنقید سے وابستہ لوگوں کا خیال تھا کہ تخلیق کا خود کفیل لسانی وجود کئی عناصر سے مرتب ہوتا ہے اور یہی عناصر اور اجزاء ہی ہیں جو معانی کو وجود میں لانے کا باعث ہوتے ہیں۔اس طرح دونوں قسم کے ماہرین کی توجہ تخلیق کی ساخت پر ہے۔نئ تنقید کے بعد جب ساختیات کو فروغ حاصل ہوا تو جدیدیت کا تصور پس پشت چلا گیا اور ایک ایسے تصور نے جنم لیا جو تخلیق کو اجزا کا مرکب کہنے کی بجائے اُسے رشتوں کے ایک جال سے تعبیر کرتا ہے۔ساختیات میں توجہ کا مرکز Conventions/Codes کو قرار دیا

گیا جن کا مقصد ساختیاتی وجود کا قیام تھا۔

ساختیات کے ماہرین نے تخلیق کو ایسی ساخت قرار دیا جو اجزا کا مرکب نہیں بلکہ رشتوں کی گرہ تھی اُن کا موقف تھا ساخت کوئی ٹھوس شے نہیں جسے حسیات کی مدد سے گرفت میں لایا جا سکے بلکہ یہ مخفی رشتوں کا نظام ہے۔ اس طرح ساختیات نے روسی ماہرین کی اس بات کی نفی کر دی جس میں وہ ادبی تخلیق کو لسانی وجود گردانتے تھے جس میں پیغام کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔ ساختیات نے پیغام کا دوبارہ سے اقرار کرتے ہوئے اس کی مزید آبیاری کی اب یہ بات پیغام تک محدود نہیں رہی بلکہ حتمی معنی کے برعکس التوا معانی کا نظام وضع کیا گیا۔ رولاں بارتھ نے کہا کہ پیغام کے اندر کوئی شے نہیں ہوتی، پیغام کچھ نہیں، سوائے اپنے پرتوں کے لامتناہی سلسلے کے اس طرح تخلیق بھی اپنی داخلی اور مخفی ساخت کے پرتوں کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ تاہم ساختیاتی ماہرین رشتوں کے نظام کو ساخت کا نام دیتے ہیں جو بذات خود ایک پیغام ہے۔ اور اسے شعریات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شعریات کا تصور محض ساختیات تک محدود نہیں بلکہ مختلف مکاتب فکر کے ماہرین کے ہاں شعریات خاص وضع قطع کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً فیثا غورث کے ہاں اگر توازن کی اہمیت دی گئی تو ڈیموکریٹس کے ہاں شعریات میں شاعرانہ وجدان کو ارسطو نے تزکیہ نفسی کو ابھارا، لان جانس نے حالت جذب کو اہم قرار دیا۔(۴۵) اس طرح سترھویں صدی میں ''سچ'' کو بطور میزان اپنایا گیا۔ بعد ازاں سچ کی بجائے حسن کو میزان کی کسوٹی قرار دیا گیا۔ اس طرح یہ سلسلہ طوالت اختیار کرتا چلا گیا اور آخر کار انیسویں صدی کے اواخر میں ایک متعین معانی کو پیغام کی کامیاب ترسیل کے لیے لازمی ذریعہ قرار دیا گیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں روسی ماہرین نے لسانی ماڈل کو شعریات کا درجہ دے ڈالا جدید تنقید نے تخلیق کو مصنف کی ذات سے الگ قرار دیا۔ جبکہ ساختیات کے ماہرین نے جال نما مخصوص نظام کو شعریات سے تعبیر کیا۔ ساختیات کے ضمن میں سوسیور کے ماڈل کو سامنے رکھتے ہوئے تخلیق کے پس منظر میں موجود ساخت یعنی ''لانگ'' کا اقرار کیا گیا۔ بعد ازاں رولاں بارتھ نے ادب کو بجائے خود ''زبان'' قرار دیا۔

دراصل ماہرین ساختیات کی دل چسپی کا محور نظام تھا۔ وہ نظام کی ظاہری ساخت اور گہری ساخت کو تخلیق کو جوہر قرار دیتے ہیں۔

سوسیور نے زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ (پارول، لانگ اور لسانیات) جن میں سے پارول یعنی گفتار نوام چومسکی کی (Performance) صلاحیت کی طرح زبان کے نظر آنے والے خدوخال اور طریق کار سے مشابہت رکھتی تھی۔ جبکہ لانگ نوام چومسکی (Competence) کی طرح عقب میں موجود تھا اور لسانیات / زبان کو ایسی گہری ساخت کو قرار دیا گیا جس سے گرامر کا پورا نظام وجود میں آتا ہے۔ یہ گہراؤ اور بنیادی ڈھانچہ ذہن کی ساخت کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ اور اس کی بنیاد اختلافات پر ہے۔ رولاں بارتھ جب Writing کی بات کرتا ہے تو اُس کا اشارہ اُس نظام کی طرف ہے جو دکھائی نہیں دیتا۔ بارتھ اس نہ نظر آنے والے نظام کو رشتوں کے جال اور اشارات سے عبارت قرار دیتا ہے۔

بعض ماہرین تخلیق کے عمل کو ماضی کی تخلیق سے مشروط قرار دیتے رہے۔ اُنہوں نے جب بھی کسی تخلیق کا جائزہ لیا تو ماضی کی تخلیقات سے اُس کو اخذ قرار دینے یا مشابہ قرار دینے کی کوشش ہمیشہ موجود رہی۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کی شاعری، ماضی کے تخلیق کاروں کا اکتسابی عمل ہے اور پس منظر سے الگ اس کا اپنا کوئی تشخص نہیں تو اس طور اقبال کی شاعری کا محض سطحی جائزہ تو لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اُس کی گہرائی سے اجتناب برتنے کی کوشش تصور ہوگا۔ اسی طرح بارتھ کا بھی نظریہ ادبی نمونہ سے زیادہ نظام پر زور دیتا ہے جس میں یہ نمونے تخلیق ہوتے ہیں۔ بارتھ پیغام سے زیادہ نظام کی اہمیت کا قائل ہے۔ وہ کسی بھی تخلیق کو منظر سے باہر نہیں دیکھتا۔ اُس کو منظر کی عکاس قرار دیتا ہے۔

بارتھ کے مطابق اادب ایک ساختیہ ہے جس کا مقصد پیغام کی ترسیل نہیں بلکہ وہ خود ایک پیغام ہے۔ (۴۶)۔ بعض لکھنے والے اپنی تحریروں کو ''ذریعہ'' کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان تحریروں کے ذریعے وہ قارئین کو

دوسری اشیاء یا عوامل کے بارے میں جانکاری فراہم کرتے ہیں۔اس طرح کے مصفنین کو بارتھ (Ecrivant) ایکری ونٹ یعنی عام مصنف قرار دیتا ہے جبکہ ایسے مصنف جو اپنی تحاریر کو ذریعہ کی بجائے مرکز نگاہ قرار دیتے ہیں اس قسم کے مصنف کو بارتھ (Ecrivians) کا نام دیتا ہے۔اس طرح باالفاظ دیگر پہلی قسم کے مصنف کو مہرراور دوسری قسم کو منصف سے تعبیر کرتا ہے۔ پہلی قسم کا مصنف محض حوالہ جات تک محدود جبکہ دوسرا اپنے تخلیق پارے کو جمالیاتی پہلو سے منسلک کرتا ہے۔ بارتھ کے موقف کو ٹیرنس ہاکس ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

''مصور رنگوں کو بکھیرتا ہے اُس کا مدعا محض ہم کو رنگ کا استعمال دکھانا نہ ہے۔ بلکہ اُس کا مقصد اپنی تصویر کے عقب میں موجود کسی پوشیدہ امر کو واضح کرنا ہوتا ہے۔اس طرح موسیقار، موسیقی کے ذریعے سے آواز کا اظہار کرتا ہے نہ کہ دلائل پیش کرتا ہے اس طرح مصنف کا کام بھی فن ہے اور وہ تصانیف کے ذریعے سے اُس کے اندر چھپی ہوئی بات کی طرف اشارہ فراہم کرنا ہے''۔

رولاں بارتھ کی تقسیم تحریر کرنے والوں تک محدود نہیں بلکہ وہ لکھائی کو بھی دو اقسام میں دیکھتا ہے۔ایک قسم کو وہ منفعل رویہ کی حامل تحریر قرار دیتا ہے جو قاری کے رویہ کے انفعالی حالت پر مجبور کرتی ہے۔اور دوسری ایسی تحریر جو قاری میں فعالیت پیدا کرتی ہے۔اور قاری فعال کردار ادا کرنے پر خود کو مائل پاتا ہے۔اور تحریر کا حصہ بن جاتا ہے۔ پہلی قسم کی تحریر کو بارتھ (Lisible) اور موخر کو (Scribtible) کا نام دیتا ہے۔موخرالذکر تحاریر پڑھنے والے میں حیرت اور مسرت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ایسی تحاریر پڑھنے والے کو اُس کی ذات اور جسم تک مرکوز رکھتی ہے۔ان کا کام کسی اور منظر کی عکاسی کرنا نہیں ہوتا۔ایسی تحاریر منزل کے تصور سے ہٹ کر محض حال تک محدود ہوتی ہیں۔ یہ کسی نظریے سے یا مقصد سے متاثر نہیں ہوتیں بلکہ محض اپنے انوکھے پن سے قاری پر وجد کا عالم طاری کر دیتی ہیں۔ بارتھ کا (Writerly Text) کا نظریہ اس قسم کے متون کا عکاس ہے جو علت اور معلول کے رشتوں سے ہٹ کر شعریات کے واسطے سے ہم رشتہ ہیں۔

اس میں دورائے نہیں کہ کوئی بھی متن خود بخود تخلیق نہیں ہو جاتا۔ یقیناً وہ ماحول سے جڑا ہوتا ہے۔ زبان ایک ایسا اشتراکی ذریعہ ہے۔ جو متن اور ثقافت میں اشتراک عمل سے وجود میں آتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک متن اور اُس کے اندر موجود کئی متون کا سلسلہ جنم لیتا ہے۔ مگر کسی بھی ادبی تخلیق کو اُس کی مخصوص زبان اور ثقافت کے حوالے سے تجزیہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اُس کا مطالعہ ذہنی، ثقافتی، گرامری حوالہ جات کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنا چاہیے۔ جو متن اور ثقافتوں کے اندر چھپے ہوئے گہری ساختوں کی پرتوں کی تہوں تک رسائی فراہم کرتا ہے۔ ہر متن کی ظاہر ساخت اُس کو زمان و مکان کی قیود میں رکھتے ہیں۔ مگر ہر متن محض ظاہر ساخت پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اُس کی گہری پرتیں بھی ہوئی ہیں۔ جو لسانیات اور ثقافت کی ہمہ گیریت اور عالمگیریت کے مخفی نظام سے آگاہ کرتی ہیں۔ ان کے پس منظر میں انسانی ذہن کی ساخت موجود ہے۔ جو بذات خود ربط باہم ہے۔

گویا بارتھ متن کو مخصوص ثقافتی ماحول تک محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ اسے انسانی تناظر کے طور پر نشان زد کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک گہرے نظام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو مفہوم میں توسیع کا سبب ہے۔ لہذا جب قاری کسی متن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ محض تخلیق کے پرتوں کو نہیں اتارتا بلکہ اپنی ذات کے پرت بھی اتارتا چلا جاتا ہے۔ جس سے معانی آفرینی کا عکس در عکس سلسلہ جنم لیتا ہے۔ (۴۷) بارتھ نے کسی خاص زمانی یا مکانی امکانات سے زیادہ انسانی ذہنی صورتحال سے تخلیق کیے جانے والے متن کو زیادہ اہمیت دی ہے اُن کے مطابق متن کے اندر گہرائی اور مضمرات تک رسائی ہی اُس کے درست مفہوم کی عکاس ہو سکتی ہے۔ اور اس مفہوم کو ہی اہم اور درست گردانے پر زور دیا ہے۔

دریدا، تخلیق کے پس منظر کو درخو اعتنا نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک تخلیق نہ تو ابدیت کے حوالے سے منبع، مصدر یا خالق رکھتی ہے اور نہ ہی ساختیاتی حوالے سے مربوط یا منظّم اکائی پر منتج ہوتی ہے۔ قاری کا کام ہر معانی کو Decontruct کرنا اور زیرِ سطح سے معانی کو دریافت کرنا ہے اور پھر ان حاصل شدہ معانی کو Decontruct

کرنا ہے۔ دریدا کے مطابق متن کے الفاظ مردہ یا بجھے ہوئے نہیں ہوتے۔ ساخت شکنی کا عمل محض قاری تک محدود نہیں رہتا بلکہ متن کے اندر بھی ساخت شکنی اور معانی کے التوا کا عمل موجود ہوتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ متن ملتوی ہوتے ہوئے منظر نامے کا عکاس ہے دوسرے الفاظ میں وہ ساخت نہیں بلکہ ردِ ساخت ہے۔ اس بات کو اگر مان لیا جائے تو دوبارہ تخلیق کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں اور تخلیق کا عمل منسوخ ہوجاتا ہے۔

بعض ماہرین دریدا کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے اسے گورکھ دھندے تک محدود رہنا اور معانی کے مسلسل التوا کے عمل کو واحد حقیقت جاننا کو غیر تخلیقی رویہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق دریدا جب قاعدوں قدروں، منطقی رشتوں کو مسترد کرتا ہے اور ساخت کے مکمل انہدام کی بات کرتا ہے تو ایسی صورت میں اُس کے نزدیک تخلیق کاری کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ جب تک تخلیق کار تخلیق کی روح کو جسم عطا نہیں کرتا اُس کا وجود نہیں ہوتا اور وہ موجود عالم میں منتقل نہیں ہو پاتی۔ مگر اس نظریہ کو بھی مکمل طور پر یہ درست قرار نہیں دیا جا سکتا کہ متن مصنف کے وجود کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوسکتا البتہ وہ ظہور پذیری کے عمل میں مصنف کو ایک حالت نیم بے ہوشی کا شکار بنا کر ایسا کرنے کا مجاز ضرور ہے۔ بعض اوقات تخلیق کار خود کو پُراسراریت کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ اور وہ اُس پُراسراریت تک رسائی اور اُسے سامنے لانے کی خاطر تمام توجہ اُس کی جانب مرتکز کر دیتا ہے۔ اور جب وہ کسی حد تک اس تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو وہ پُراسراریت مصنف میں منقلب ہوجاتی ہے اور ایک تخلیق ساخت میں بدل جاتی ہے۔ اور یہ عمل تخلیق کاری کے ذیل میں آتا ہے یہ بات یاد رہے کہ یہ کام تخلیق کار کی وساطت سے ہی انجام پاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ساخت شکنی کی بجائے ساخت آفرینی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ دریدا کے اس نظریہ و دانتے کے نظریہ ''جہنم'' سے جوڑا جاسکتا ہے۔

حقائق کی پُراسرار دنیا ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے۔ انسان اس دنیا کا جزو ہونے کے باوجود فرد کو اس سے الگ محسوس کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اور اس پراسراریت کو بے نقاب کرنے، معرفت کے حصول

اور اس کے تہہ در تہہ پردوں کو ہٹا کر نئی تخلیقات کے موضوعات دریافت کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ایسا وہ مسرت کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ فلسفی حضرات حقیقت کو اس لیے کھولتے ہیں تا کہ معانی تک رسائی حاصل کر سکیں در حقیقت اُن کی مسرت دریافت کرنے میں مضمر ہے۔ اس طرح صوفی کی مسرت عرفان کے حصول میں ہے جبکہ فلسفی اور صوفی کے برعکس تخلیق کار، تخلیق کے عمل سے مسرت کے حصول کو معانی اور عرفان کی بجائے جمالیات سے منسلک کرتا ہے اور جمالیاتی مسرت کے حصول کو اپنا مدعا اور مقصد گردانتا ہے۔

جمالیات اور لسانیات

جمالیاتی مسرت حسن کو مکمل انسانی حسیات کی مدد سے محسوس کرنے کا نام ہے (کروچے) کے مطابق حسن کا ادراک Intuition یعنی چھٹی حس کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ ''پولے'' حُسن کو چاند کا غائب چہرہ قرار دیتا ہے۔ ''ہرل'' اسے زندہ آواز سے تعبیر کرتا ہے۔ ''شیلے کے مطابق'' حسن بجھتا ہوا کوئلہ ہے۔ دریدا، حسن کو اظہار کی نا قابل ترسیل پاکیزگی کا نام دیتا ہے۔ جبکہ مولانا روم نافہ آہو کا ذکر کرتے ہیں۔ اور وہ حُسن کو محسوس کرنے کے لیے قوت شامہ کے استعمال پر زور دیتے ہیں۔

حُسن یقیناً بعض ایسے اوصاف کا حامل ہے جو مستقل نوعیت کے ہوتے ہیں۔ تبدیلی خواہ جغرافیائی نوعیت کی ہو یا تاریخی نوعیت کی حسن کی بنیاد میں تبدیلی لانے کی غماز نہیں۔ البتہ حُسن کے معیارات قائم کرنے میں اکثر تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ''افلاطون'' نے حسن کو مستقیم خطوط، قوسوں اور اقلیاسی شکلوں تک محدود رکھا، اگر چہ دنیا کے مختلف خطوں میں حسن کے معیارات میں تفریق موجود ہے تاہم حسن کی وہ اساس جس پر تمام خطوں اور زمانوں کے معیارات حُسن استوار ہیں اُس میں بنیادی تبدیلی بہت کم نمودار ہوتی ہے۔ سوسیور نے بیسویں صدی کے آغاز میں دعویٰ کیا کہ لانگ اور پارول کا نظام ایک مطلق نظام ہے جو تمام جملوں کی ساخت میں موجود ہے اور

اس کی نفی سے جملے معانی سے محروم ہو جائیں گے۔ اور محض بے ہنگم شور کی صورت جنم لے گی۔ مگر درحقیقت بعض جملے محض شعریات سے اور بعض منطق سے لبریز ہوتے ہیں۔ بعض کی خوبصورتی اُن کی سادگی میں جب کہ بعض کا حُسن اُن کی آرائش اور پیچیدہ پن، میں ہوتا ہے۔ بعض مختصر ہونے کی خصوصیت کی وجہ سے پر کشش جبکہ بعض اپنی طوالت کی وجہ سے دل کش ہو جاتے ہیں۔ مگر ان تمام جملوں کے عقب میں گرامر کا ایک ہی نظام کارفرما رہتا ہے۔ اور یہی اساس ہے جو جملوں کی خوبصورتی کو طوالت اور اختصار کے باوجود قائم و دائم رکھتی ہے۔ یہی اصول حسن کے معاملے میں بھی کارفرما ہے۔ حُسن خواہ فطرتی ہو یا انسانی جسم کا ہو۔ حُسن کا بنیادی وصف اُس کا توازن ہے۔ اور یہ توازن قوسوں، دائروں، مثلثوں اور زاویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں حُسن کے متنوع معیارات قائم ہونے کے باوجود اُس کے پس منظر میں ''حسن مطلق'' کا نظام ضرور کارفرما نظر آئے گا۔

اسی طرح خوبصورت ادب کی تخلیق کے عقب میں بھی ''شعریات'' اور ''قواعد'' کا نظام ہمیشہ سے موجود اور کارفرما رہا ہے۔ حُسن کو اگر ہم مدارج میں تقسیم کریں تو تین مدارج ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ پہلا درجہ ''توازن'' کا ہے۔ دوسرا درجہ ''اقلیاسی اشکال'' کو حاصل ہے جو توازن کی مظہر ہیں اور تیسرا درجہ ''مادی وجود'' کو حاصل ہے جو توازن اور اقلیاسی اشکال کا حامل ہے۔ اور اسے مختلف صورتوں میں تبدیل کرتا اور ڈھانپتا ہے۔ حسن کی متنوع مادی صورتوں کو وجود میں لانے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے اُس کی نوعیت دریافت اور عرفان سے حاصل ہونے والی خوشیوں سے بہر حال الگ نوعیت کی ہوتی ہے۔ فلسفی خاص سے عام کی طرف عازم سفر ہوتا ہے اور صلے میں ذہنی یا روحانی مسرت کا حصول چاہتا ہے۔ جبکہ تخلیق کار عام کو خاص صورت عطا کرنے کا خواہاں ہوتا ہے اور صلے میں جمالیاتی مسرت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جمالیاتی مسرت کا حصول صرف تخلیق کاری کا لطف ہے اور یہ لطف دریافت یا عرفان سے حاصل نہیں ہوتا۔

تخلیق کار کی اہمیت

غور طلب بات یہ ہے کہ تخلیق کار کسی طرح جمالیاتی مسرت کو حاصل کر سکتا ہے۔تخلیق کار مطلق حسن کا نمونہ تخلیق نہیں کرتا۔اگر ایسے کرے تو اُس کی تخلیق محض شبہیات،اور قوسین تک محدود ہو کر رہ جائے۔جبکہ تخلیق کار کی تخلیق کی گئی صورت ادھوری یا نامکمل نہیں ہوتی وہ مطلق حسن اس وجہ سے بھی نہیں ہوتی کہ اُس میں کوئی نہ کوئی غلطی یا شگاف کی صورت رہ جاتی ہے۔اُس میں سے مطلق حسن کے اثرات تو ضرور نظر آئے ہیں مگر اُسے مطلق حسن کا نمونہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔تخلیق کار کی جمالیاتی مسرت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ تصور کی طرف جست لگائے اور درمیان موجود خلا کو پُر کرے۔فن کا اعلیٰ نمونہ وہی تخلیق قرار پاتی ہے جس میں بوقلمونی اور تجریدیت بیک وقت موجود ہوں مگر اُن کی موجودگی اس طرح ہو کہ ان دونوں کے درمیان ایک شگاف موجود ہے تخلیق کار اپنی قوت متخیلہ سے ملا دے اور وہ ایک ہو جائیں اور ایسا متن وجود میں آجائے جو ہئیت اور مواد کا نمونہ ہو۔تخلیق کا لطف شے کی استراد اور جوہر کی دریافت میں نہیں بلکہ اس لطف کا حصول شے اور جوہر کے درمیان موجود شگاف کو ختم کرنے اور یکتائی کو بحال کرنے میں ہے۔

متن کی اہمیت

تاریخی،سماجی اور سوانحی حوالوں کو جدید تنقید کے ماہرین نے یکسر مسترد کر دیا۔اور تمام تر توجہ کا مرکز متن کو قرار دیا۔اور محض متن کی اُس کارگردگی کو نشان زد کیا تھا۔ جو قول محال تناؤ اور ابہام سے وجود میں آتی ہے۔ ساختیات کے ماہرین نے متن کی کارگردگی کو شعریات کے تابع قرار دیا۔متن کوئی ہوا میں معلق شے نہیں ہے۔ شعریات متن میں اس طرح موجود رہتی ہے جیسے لانگ اور پارول میں موجود ہوتی ہے۔اس طرح ساختیاتی تنقید

کے ماہرین نے تخلیق کو پورے ثقافتی پس منظر کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔مزید اس بات پر زور دیا گیا ہے۔متن کے اندر جو ساخت شعریات کے طور پر موجود ہے اُس کی کارگردگی کو دیکھا جائے کہ وہ کس طرح کے متن کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ساختیات نے مصنف کو منفی کر دیا اور اصل اہمیت کا حامل قاری کو قرار دیا جو متن کو کھولتا ہے۔بیسویں صدی میں ساخت کے جس تصور کو ساختیاتی تنقید نے اپنایا اُسے مرکز گریز ساخت کہا گیا۔انیسویں صدی تک ''مرکز'' کو بنیادی نوعیت کی اہمیت حاصل تھی۔اور انسان خود کو مرکز حیات تصور کرتا اور اشرف المخلوقات کا درجہ دیتا تھا۔اس دور میں مصنف کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا اور حقیقت عظمی کا تصور کائنات کے مرکز کی حیثیت سے مذہبی طور پر گردانا جاتا۔

بیسویں صدی میں ہونے والی علمی پیش رفت نے لسانیات میں ایسی ساخت کو جنم دیا جس میں مرکزیت انسان سے لے کر رشتوں کے ایسے جال کو دے دی گئی جس کا ہر نقطہ ہی مرکز ہ تھا۔اس نظریے کے تحت جز و کو کل سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔اسے وحدت الوجود کے نظریے کے قریب تر قرار دیا جاسکتا ہے۔اسے لانگ اور پارول کا نظریہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔(۴۸) جس میں افراد (پارول) معاشرہ (لانگ) سے ہم رشتہ ہونے کی وجہ سے انسانی شعور کے جملہ مظاہر کی بُنت میں لاشعور کارفرما ہے۔جس کی وجہ سے ادب میں لاتعداد ایسے نمونے وضع ہوتے ہیں جن میں شعریات موجود ہوتی ہے۔

ساختیاتی نقاد کا کام شعریات کی کارگردگی کا تجزیہ کرنا اور متن کو کھول کر دیکھنا ہے اس لیے ساختیاتی ناقدین کی زیادہ تر توجہ ہمیں ادبی تھیوری پر مبذول نظر آتی ہے۔جو متن کو نظری سطح پر موضوع بحث بناتی ہے۔اس طرح ساختیاتی ناقدین دریافت کی حد تک مسرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر وہ اس دریافت سے جمالیاتی پہلو سے لطف اندوز ہونے سے رہ گئے۔ان ناقدین کے درمیان رولاں بارتھ واحد شخص تھا جس کو احساس تھا کہ تنقید جمالیات کے دائرے سے نکل کر فلسفے میں داخل ہو رہی ہے چنانچہ اُس نے تنقید کو دوبارہ جمالیات سے

ہم رشتہ بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ رولاں بارتھ نے متن سے لطف اندوز ہونے کی بات کی۔ اس لطف کی اُنہوں نے دو اقسام متعارف کرائیں۔ ایک کو خاص لطف کا نام عطا کیا جبکہ دوسری قسم کو عام لطف کہا۔

رولاں بارتھ کا خیال تھا کہ جب ایک عام قاری کسی متن کو پڑھتا ہے تو اُس کے لیے متن ایک ایسا احساس ہے جو ثقافتی تناظرات سے تسکین اور آرام فراہم کرنے کا عمل اور موقع فراہم کرتا ہے۔ مگر جب خاص قاری متن کو پڑھتا ہے تو اُس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہ وجد کا احساس قاری کے تاریخی نفسیاتی اندازوں کو توڑ دیتا ہے۔ رولاں بارتھ کے نزدیک ثقافت کا انہدام وجد طاری کرنے کی وجہ نہیں بلکہ موجودہ ثقافتی اور تاریخی پس منظر کے درمیان جو شگاف ہے وہی وجد آفرینی کا باعث ہے۔

ساختیات میں متن کو کھولنے کے عمل کو پیاز کے چھلکے اتارنے سے مشابہ قرار دیا گیا جس کا اصل مقصد متن میں موجود شعریات تک رسائی کا حصول تھا۔ اس رویہ کو فلسفیانہ اور سائنسی طرز تحقیق کہنا بھی درست ہوگا۔ کیونکہ حقیقت تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی متن کی گہرائی تک رسائی کو ممکن بنایا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان پرتوں کو کھولنے سے قاری کو جمالیاتی لطف مل سکے کیونکہ جب تک متن، مطلوبہ فن کی سطح کا حامل نہ ہو اور اُس میں مطلوبہ جمالیاتی لطف فراہم کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔ قاری اپنی قرات کے زور کے باوجود اُسے جمالیاتی لطف حاصل نہیں کر سکتا جمالیاتی لطف صرف وہی متن فراہم کر سکتا ہے جو فنی حوالوں سے مزین ہو۔ ادب کے تحت تحریر کیے گئے متون کو اس حوالے سے معیار گردانا جاتا ہے۔

رولاں بارتھ ادب کے حوالے سے متون کو مزید دو اقسام بتاتے ہیں۔ ادب کے ایسے متن کو جو عمومی نوعیت کا ہو اُسے Readerly اور جو خاص نوعیت کا حامل ہو اُس کو Writerly کا نام دیتے ہیں۔ Readerly متن کو بارتھ ایسا متن قرار دیتے ہیں جو قاری کی توقعات کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے۔ اور وہ اُسے عام سے لطف فراہم کرتا ہے۔ جبکہ Writerly متن کی قرات عام قرات سے مختلف ہے یہ ایسا انداز ہے جس کے ذریعے سے

قاری اُس گہرائی کو تلاش کرتا ہے جو متن کے اندر موجود ہے اور ایسی قرات ہی قاری پر وجد اور انبساط طاری کرنے کا موجب بنتی ہے۔ اس طرح دونوں متون میں مدارج کا واضح فرق موجود ہے۔ ایک متن عام نوعیت کی لذت فراہم کرتا ہے اور قاری بھی متمنی ہوتا ہے کہ متن اُس کی توقعات کے مطابق ہو۔ اور وہ اس پلاٹ میں معمولی سی تبدیلی کے حق میں نہیں ہوتا۔ اکثر مشاعروں میں ایسی صورتحال کا سامنا ہو جاتا ہے جب حاضرین ایک شور کو بار بار سننے کی فرمائش کرتے ہیں۔ یا بچے ایک ہی کہانی کو بار بار سننے کی ضِد کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کے قاری ایسے متن کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں امکانات اور گہرائی کی فراوانی موجود ہو۔ قاری کی ان دو اقسام کو بارتھ Ecrivant اور Ecrivian کا نام دیتے ہیں Ecrivant ہر سطح پر موجود ہوتا ہے جبکہ Ecrivian بننے کی صلاحیت فطرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

ساختی تنقید اور لسانی شعور

ساختیاتی تنقید کے ماہرین کے مطابق ادب کسی ایسے معنی کا ابلاغ نہیں کرتا جسے مصنف تصنیف کرتا ہے۔ بلکہ معانی ہیئت کے تسلسل، ثقافت اور شعریات کے عمل سے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ اس منطقے میں بنیادی اہمیت قاری کو حاصل ہے جو متن کو کھول کر اُسے دوسرے متون سے مختلف پا کر دیکھتا ہے کہ کس طرح ایک نیا متن وجود میں آ رہا ہے۔ تاہم ماہرین ساختیات قاری کو اتنی اہمیت دینے کے بعد اس امر کی بھی وضاحت کر دیتے ہیں کہ قاری کوئی شخص نہیں بلکہ اُس کی اہمیت ذاتی نہیں بلکہ کارگردگی کے حوالے سے ہے۔

ساختی تنقید میں قاری کو صارف کی جگہ خالق قرار دیا گیا کیونکہ ماہرین کے مطابق قاری ہی متن کو سمجھ کر اُس سے معانی کشید کرتا ہے اس لیے حقیقی طور پر متن کا خالق وہی ٹھیرتا ہے۔ ایک طرف تو ساختیاتی ماہرین مصنف کی نفی کرتے ہیں کہ ادب کی تخلیق میں اُس کی کوئی اہمیت اور قدر نہیں اور اُس کی جگہ باعث تخلیق شعریات اور ثقافتی

تناظر کو قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف قاری کو بھی محض کارگردگی کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح اگر کہا جائے کہ ماہرین ساختیات نے ایک ایسے تصور کو اپنایا تھا جس میں مرکز یا مصنف کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسی لیے تخلیق کاری کے عمل میں مصنف کی جگہ قاری کو دے دی گئی۔ جبکہ ساختیات کسی بھی مرکز کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔ اس لیے قاری کو بھی علامات اور استعارات کا ہیولا قرار دیا جو متون میں موجود کوڈز کو دریافت کرتا ہے۔ ساختیاتی نقاد مصنف کو بھی ان علامات کا مظہر قرار دے سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس بات میں شک نہیں کہ متن مصنف کے بغیر تخلیق نہیں ہوسکتا۔ جبکہ ماہرین لسانیات اس بات پر مُصر ہیں کہ متن کے خالق کو نظر انداز کر دیا جائے اور متن کو تخلیقی سطح پر کھولنے کی تمام تر ذمہ داری قاری کے سپرد کر دی جائے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ قاری کی حیثیت محض صارف کی نہیں بلکہ وہ بھی تخلیق کار ہے کیونکہ تصنیف کے عمل میں مصنف اور قاری بنیادی اہمیت کے حامل ہیں قاری کے اندر متن کی قرات کے بعد ایک مصنف جاگ جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کوئی بھی متن صرف مصنف یا صرف قاری کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہوتا بلکہ یہ دونوں کے تعلق کا عکاس ہے۔ اور اس کے وجود کے لیے دونوں کی اہمیت مسلمہ ہے۔

قاری کی حیثیت اور اہمیت میں اضافہ ساختیاتی ماہرین کی عطا ہے۔ اس سے قبل قاری کی حیثیت صارف سے زیادہ نہ تھی۔ جبکہ اہمیت کا حامل صرف مصنف کو جانا جاتا تھا۔ مصنف کو رسد، جبکہ قاری کو طلب کا نمائندہ کہا جاتا تھا۔ قاری کو مطمئن کرنا مصنف کا کام تھا۔ لہٰذا مصنف کو قاری کی طلب کے مطابق رسد فراہم کرنا پڑتی تھی۔ اس طرح سیاسی، سماجی، اخلاقی اور نظریاتی مظاہر تحریر پر اثر انداز ہوتے رہے۔ جس کے باعث تخلیق پر اس کے اثرات دونوں طرح مرتب ہوئے۔ اچھے بھی اور بُرے انداز میں ان عوامل نے تحریر کو متاثر کیا۔ جہاں تخلیق نے طلب کے معیار کو اونچا پایا وہاں عمدہ تخلیق کے امکانات میں اضافہ ہوا۔ ان تمام ادوار میں جو ساختیات سے قبل کے ہیں ان میں قاری منفعل حیثیت کا حامل کردار تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اور اُس کی اہمیت زبان کو استعمال کرنے والے یعنی

صارف کی سی رہی ہے۔

قاری کی اہمیت

ساختیات نے قاری کو تخلیق کار کے مرتبہ پر فائز کیا ہے۔اس طرح قاری کو وہ مقام حاصل ہو گیا جو اس سے قبل مصنف کو حاصل تھا۔مصنف کو مرکز سے دور کر کے قاری کو بنیاد قرار دیا گیا۔تخلیق کے عمل میں تین کردار جن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ مصنف، متن اور قاری قرار پاتے ہیں۔بغور مطالعہ اس بات کو سامنے لاتا ہے کہ سابقہ صدی میں مغربی نقادوں نے ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کو سب سے اہم کردار کا رتبہ عطا کیا ہے۔جس کے نتیجہ کے طور پر ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔انیسویں صدی کے اواخر میں 'مصنف' کو اہمیت دیتے ہوئے فوق البشر کے درجہ پر فائز کیا گیا۔لہٰذا مصنف کی کارگردگی کو جانچنے کے لیے اُس کی سوانح مطالعہ کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔جس کے ذریعے مصنف کے غالب رجحانات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی جبکہ ادبی تاریخ مصنف کے ادبی مقام کو متعین کرنے میں اپنا کردار نبھاتی رہی۔اس کے بعد روسی ہیئت پسندی کی تحریک کے آغاز نے متن کی اہمیت کو اجاگر کیا۔اور ہیئت کے اصولوں کی دریافت اور وضاحت کے لیے لسانیات کو بطور اوزار استعمال کیا۔پھر نئ تنقید نے متن کو خود مختار حیثیت عطا کی۔اور گہرے مطالعہ کو متن میں موجود گہرائی اور دیگر عوامل کی شناخت کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔اس طرح گہرے مطالعہ کے ذریعے ابہام کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔اس کے بعد ساختیات کا دور آیا۔جس میں متن کی شعریات کو اہم قرار دیا گیا۔پس تشریح کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ساختیات نے متن کی شعریات کی جب بات کی تو اُس نے نئ تنقید سے آگے ایک راہ ہموار کر دی۔مگر حقیقت یہ ہے کہ تجزیاتی عمل کا اصل کام ساختیاتی ماہرین نے قاری سے ہی لیا ہے۔مثلاً متن کی قرات کے حوالے سے ''جاس'' کا موقف کچھ یوں تھا۔

''متن کو اُسی کی متحرک حالت میں ہی گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ اُسکی ساکن
حالت میں گرفت میں نہیں لیا جا سکتا۔''(۴۹)

لہٰذا جاس اس بات کا قائل نظر آتا ہے کہ متن کا متحرک حالت میں ہونا ایک لازمی شرط ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ متن کی قرات کرتے ہوئے تاریخی اور ثقافتی کارگردگی کو بھی سامنے رکھا جائے۔ اس نظریے کو (Reception Theory) کا نام دیا گیا۔ اسی نظریہ سے تعلق رکھنے والے ''آئسر'' کے مطابق متن کو محض متعین یا متغیر حالت میں دیکھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوجاتا بلکہ متن قرات سے جنم لیتاے۔ اس طرح آئسر نے نہ صرف مصنف کی نفی کر دی بلکہ اُس نے متن کو بھی درخوا اعتنا نہیں جانا اور ساری توجہ قرات پر مرکوز کر دی۔ سٹینلےفش نے قرات کی تمام ذمہ داری قاری کو تفویض کر دی اور اس طرح متن غائب قرار پایا۔ مگر رفتہ رفتہ قاری بھی اپنی اہمیت کو برقرار نہ رکھ سکا اور رولاں بارتھ نے اُس کو کوڈز کی حد تک محدود کر دیا۔ جو کثرت کے حامل طریق کار کی صورت میں دیکھے گئے۔ ایرن وولف نے قاری کو ادبی تاریخ کا نمائندہ قرار دیا۔ اور اسے ادبی تاریخ کو منکشف کرنے والے کی حیثیت سے دیکھا گیا اور اس کو کسی متعین شخص یا شے کی صورت میں دیکھنے سے گریز کیا گیا۔ جہاں تک مصنف کی اہمیت کا تعلق ہے آج بھی اُس کی بحالی کے لیے آوازیں سنائی دے رہی ہیں جیسے کہ ''ای۔ ڈی۔ ہرش'' نے مصنف کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا:۔

''ساختیاتی ماہرین کو درست معانی کی رسائی کے لیے متن کے مصنف کے
مقاصد تحریر اور رویہ کو بھی ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیے تھا جو متن کے درست معانی
کے قیام کے لیے از حد ضروری ہیں۔''

اس طرح ساخت شکنی کی تحریک میں متن کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں بات کو آگے بڑھایا گیا۔
بقول الزبیتھ فریونڈ:۔

''متن کی پر اسراریت، گہرائی اور شگاف کی موجودگی نے اس کی اہمیت کو سب سے زیادہ قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری کی مطلق العنانیت کو ختم ہو جانا چاہیے۔''

پس قاری کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کی درست معانی تک رسائی نہ ہونے کی بڑی وجہ اُن اسرار تک عدم رسائی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو تخلیق کاری کے درمیان مصنف کی وساطت سے متن کا حصہ بن گئے۔ تاہم تا حال متن کی اہمیت تو بحال ہو گئی ہے مگر مصنف کو ساختیات اور پس ساختیات کے ماہرین اہم کردار دینے سے گریزاں ہیں۔

تشریح کے مباحث

ساختیاتی اور مابعد ساختیاتی ماہرین نے فکری نظاموں کے زیر اثر تشریح کے حوالے سے مباحث پیش کیے ہیں۔ وہ نظریات کا حصہ ہیں ان مباحث سے یکسر روگردانی کرنا ممکن نہیں۔ ان پر بحث قدیم یونان اور ہندوستان کے زمانے سے ہوتی آ رہی ہے اور آج بھی کسی نہ کسی انداز میں تشریح زیر بحث ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہر دور میں علوم میں ہونے والی پیش رفت نے سائنسی اور مذہبی تصورات کو بھی آگے بڑھایا ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ منسلک نظریات بھی کشادہ ہوتے چلے گئے ہیں اس طرح تمام علمی شعبہ جات تمام علمی شعبہ جات نے فعال ہو کر کائنات کے تخلیقی عمل کو جاننے کے خواہشمند نظر آتے ہیں اور اُس تخلیقی عمل کو شناخت کرنے میں لگے ہوئے ہیں جس کے تحت فن وجود میں آتا ہے۔ بیسویں صدی میں مرکز کے تصور کو ترک کر دینے سے اور رشتوں کے جال کو اپنانے سے مصنف کا کردار معدوم ہو گیا جبکہ متن اور قاری کے کردار کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ مگر بیسویں صدی کے نظریات نے تخلیقی عمل کے جو نئے پرت دریافت کیے وہ محض نظریات کی سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ انہیں ادب کی سطح پر بھی آزمایا گیا۔ اس طرح یہ نظریات ہمیں قاری کی تخلیقی کارگردگی کا احساس اجاگر کرتے نظر

آتے ہیں۔ یہ پیش رفت بہت تیزی سے ہوئی جس کی وجہ سے بہت سے معاملات ماضی کی گھپا میں گرِ گئے۔ مثلاً متن کو "Matrix" اور قاری کو Interaction قرار دینے سے مصنف کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جبکہ مصنف متن اور قاری بھی تو ایک Matrix اور Interaction کے عکاس ہیں۔ جن کے ربط سے ہی ادب وجود میں آتا ہے۔

ادب کے تخلیقی عمل سے ساختیاتی ماہرین نے جمالیاتی آسودگی کو مسترد کر دیا اور منطق اور تحلیل کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اس لیے دریافت کے عمل کو ہی زیادہ اہمیت دی گئی اور اُس غایت و انبساط کو تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ جو تخلیق کے عمل سے حاصل ہوئی ہے۔ دراصل تنقیدی نظریات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کو ''نظری تنقید'' کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں مباحث کو موضوع بنایا گیا۔ جبکہ دوسرے حصے کو ''عملی تنقید'' کہا گیا جو قرات کی عملی کارگردگی کا اظہار ہے۔ یہ وہ تنقید کا حصہ ہے جس میں قاری متن کی تشریح کرتے ہوئے اس کی قلب ماہیت کر دیتا ہے۔ اس عمل سے حاصل ہونے والی لذت ہی جمالیات ہے۔ مغرب کی تنقیدی نظریات جمالیات کی اس لذت سے تاحال آشنائی حاصل نہیں کی۔

جمالیاتی خط کو نہ چکھنے کی بڑی وجہ عملی تنقید کے نمونوں کی عدم موجودگی ہے۔ اس حقیقت سے کسی صورت بھی انکار ممکن نہیں کہ بیسویں صدی کے تنقیدی نظریات نے ادب کے میدان میں اور لسانیات کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا۔

لسانیات اور ساخت شکنی کے مباحث

متن اور ساخت شکنی کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا گیا ساخت شکنی کے حوالے سے شمس الرحمان فاروقی کا کہنا ہے کہ ساخت شکنی کے لیے ساخت شکن کا ہونا ضروری ہے کوئی متن تب ہی توڑ پھوڑ کا شکار

ہوگا جب کوئی اس کی تعمیر وتخریب کرنے والا ہوگا۔ فاروقی صاحب کے اس بیانیہ سے مزید الجھنیں پیدا ہونے کا اندیشہ موجود ہے کیونکہ ماہرین ساخت شکنی کوانحراف کے معانی میں استعمال کررہے ہیں۔ مثلاً اگر نقاد اپنے سابقہ شائع شدہ خیالات اور تصورات کوخود ہی مسترد کردے اور اپنی سابقہ رائے کے مدمقابل نئے نظریہ کواپنالے تو اُس نے خود ہی ساخت شکنی کا ارتکاب کر کے فاروقی صاحب کے ارشاد جس میں ساخت شکن کی بات کی گئی اُس کوخود ہیDeconstruct کردیا۔ بعض ماہرین اس لسانی تعمیر وتخریب سے مراد مکمل انہدام کوقرار دیتے ہیں۔ جبکہ دریدابذاتِ خوداسے ایسیDismantling قرار دیتا ہے۔ جس سے جاننے کا عمل مزید تیز ہوجاتا ہے۔

دریدا کے ساخت شکن مباحث اور لسانیات

Dismantlingیا ساخت شکنی کا یہ عمل دوطرح کا ہے۔ پہلا وہ جس کے تحت نقاد مصنف کے نظام کی ساخت شکنی کرتا ہے جس کی بنیاد پر مصنف کی تحریر اپنی بنیاد کواستوار کرتا ہے۔ اس کی مثال دریدا کا مصنف کے حوالے سے لانگ کا نظریہ ہے جس میں وہ مصنف کے پیش کردہ نظریات اور خیالات کوساختیات کی مدد سے دوبارہ ساخت دیتا ہے۔ اس طرح دریدا مغرب میں موجود مابعدطبیعات کوازسرنوتعمیر کرتا ہے۔ دریدا کے مطابق یہ سب کچھ جونظر آرہا ہے کسی نظام یا ڈھانچے کے تابع نہیں ہے۔ یہ ایک گورکھ دھندا ہے۔ جب ہم کائنات کے وجود میں آنے پرغور کرتے ہیں تو کائنات کی موجودہ صورت میں ہمیں فطرتی توڑ پھوڑ اور تخریب وتعمیر ہوتی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ جب کائنات کی تعمیر وتشکیل میں ساخت شکنی کا عمل موجود ہے تو اس کے اندر جنم لینے والے نظام خواہ وہ ثقافتی، سماجی، اخلاقی یا لسانیاتی ہوں وہ کسی طرح ساکن یا منضبط رہ سکتے ہیں۔ اس لیے تنقید کے زاویے بھی ساخت شکنی کے عوامل کا شکار رہتے ہیں۔ ساخت شکنی دریدا کے نزدیک ایک گورکھ دھندا ہے جس کے عقب میں گہرا نظام موجود نہ ہے اور نہ ہی اس کی ساخت منضبط ہے۔ ساخت شکنی کا نظریہ حتمی یا آخری نظریہ نہیں ہے بلکہ اس کو سچ کی شناخت کا درمیانی مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ (ہارٹ مین) جو ساخت شکنی کے نظریہ

کا دعویدار ہے، کہتے ہیں۔

''مجھے ساخت شکنی کے آگے، سچائی کی موجودگی کا ایک اور مرحلہ نظر آرہا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ مرحلہ کیا ہے''۔

مشرق میں ساخت شکنی کے اس نظریہ کو ادراک حقیقت کے راستے میں ماندگی کا وقفہ قرار دیا ہے۔ اور اسے اصل کی موجودگی کے عرفان کا حصول بھی کہا گیا ہے۔ جبکہ ساخت شکنی کو آخری منزل قرار دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر مشرقی نقاد ساخت شکنی کے دوسرے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جس کے تحت تصنیف کے اندر دو سطحیں موجود ہیں۔ ایک بالائی جس میں مصنف کے مقاصد تحریر موجود ہیں۔ اور اس کی جہت نظر آتی ہے۔ جبکہ دوسری سطح گہری ہے جہاں تصنیف خود مختار ہو جاتی ہے۔ ساختیاتی ماہرین کہانی کے گہرے خدوخال کو کہانی کا خارجی روپ عطا کرنے کی وجہ سمجھتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں منٹو کے مطابق کہانی مجھے تحریر کرتی ہے۔ کی عکاسی ہوتی ہے۔ کیونکہ مصنف اُسی نظام کے تابع تحریر کرتا ہے۔ اور نقاد بھی اسی نظام کے تابع رہ کر ہی اپنا کام کرتا ہے لہٰذا نقاد کا کام تصنیف کے اندر موجود ساختیاتی نظام کی کارگردگی کو بیان کرنا ہے۔ جبکہ ساخت شکن ناقدین کو بالائی سطح کے عقب میں موجود گہری ساخت میں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ وہ تصنیف کو خود بخود Dismatle ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں نقاد کا کام تصنیف کے اندر ادھڑنے کے عمل کا انتظار کرنا اور ان عوامل کو نشان زد کرنا ہے۔ اس طرح ساخت شکن کی فعالیت کو نظام اقدار کو مسترد کرنے اور تصنیف کے اندر کی ساخت شکنی کی نشان دہی کرنا قرار پاتا ہے۔

شمس الرحمان فاروقی کی یہ بات کہ ساختیات اور پس ساختیات کے نظریات کی تکمیل اُس وقت ہو گی جب اُن پر مبنی عملی تنقید کے نمونے سامنے آئیں گے۔ (۵۰) حقیقت یہ ہے کہ ساختیات اور پس ساختیات نے انیسویں صدی کے ساخت کے تصور کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ عمل لسانیات کے علم تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے دیگر علوم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انیسویں صدی کی ساخت ''مرکز'' پر استوار تھی۔ جبکہ ساختیاتی تنقید

نے رشتوں کے نظام کے جال کو متعارف کرایا جبکہ ساخت شکنی کے تصورات نے ساخت کے مروجہ تصورات کو سرے سے ہی مسترد کر دیا۔ ساخت شکن تنقید متن کے عقب میں موجود ڈھانچے کو مسترد کرتی ہے اور متن کے اندر ہونے والی تعمیر وتخریب کو بے نقاب کرتی ہے۔

بیسویں صدی میں جتنے بھی نظریات پیش کیے گئے ان میں نئی ساخت کے تصور نے بنیاد فراہم کی ہے۔ مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہر نظریہ سے وابستہ ماہرین اس ایک نقطہ پر متفق ہونے کے بعد تصنیف کے تجزیہ کے لیے الگ الگ آلات کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں ساخت شکن ماہرین بھی ساخت کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور مرکز مائل سے مرکز گریز ساخت کی جانب مائل دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر ایسی ساخت کا تصور پیش کرتے ہیں جس کا بنیادی پہلو اُس کا بے ساخت ہوتا ہے۔ جسے ''گورکھ دھندا'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں ساخت شکنی کے بعد کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ساخت کو منہا کر دیا جائے تو Deconstruction کسی شے کی ہوگی۔

تخلیقی عمل کے دوران جب فعال اور غیر فعال عناصر آپس میں ملتے ہیں۔ تو بے ہئیتی (Choas) کا مرحلہ وجود میں آتا ہے۔ ساختی شکنی تخلیقی عمل کے اس مرحلے کی موجد ہے۔ ساخت سے ساخت شکنی کے اس سارے مرحلے کی بحث کا مقصد یہ تھا کہ واضح ہو سکے کہ مغربی تنقید تیزی کے ساتھ امتزاجی تنقید کی جانب سفر کر رہی ہے جب کہ مشرق کے ناقدین امتزاجی تنقید کے تصور کو قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی مختلف تنقیدی نظریات کی باہمی آویزش کو ناممکن قرار دیتے ہیں جبکہ امتزاجی تنقید میں ایسے آلات کی بات کی گئی ہے۔ جن کو ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً استعمال کیا جا سکتاہ۔ یعنی خواہ وہ آلہ مصنف، تصنیف یا قاری ہو۔ یہ تنقید ان تینوں زاویوں کو اہم تصور کرتے ہوئے بیک وقت اور برابر اہمیت کا حامل قرار دیتی ہے۔ اس طرح تخلیقی عمل میں بھی ان تینوں کی کارگردگی کا جائزہ اور احاطہ امتزاجی تنقید کرتی نظر آتی ہے۔

غور کیا جائے تو تخلیق کو سمجھنے کے ضمن میں بیسویں صدی کے ماہرین تمام نظریات کو ایک دوسرے کو رد کرنے یا دوسرے نظریہ کو تقویت فراہم کرنے کا باعث قرار دیتے ہیں۔ان میں سے ایک لسانیات ''نارتھ روپ فرائی'' جسے اسطوری تنقید کا علم بردار قرار دیا جاتا ہے۔ جب ہم ان کی تنقید کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ایک طرف وہ ہمیں نئ تنقید سے جبکہ دوسری طرف ساختیات اور پس ساختیاتی تنقیدی، نظریات سے منسلک دکھائی دیتا ہے۔ دریدا کے نظریات فرائی کے انداز فکر سے جڑ کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس طرح فرائی کے تصورات نے سٹیونز کے تصورات "Final freedom of being from minal" کو متحرک کیا۔

امتزاجی تنقید کا مقصد ہرگز نہیں کہ تمام تنقیدی نظریات ضم ہو کر محض ایک نظریہ کی شکل اختیار کرلیں۔ بلکہ امتزاجی تنقید تحریر کی ساخت کے اندر کا منظر دکھانے پر زور دیتی ہے۔(۵۱) امتزاجی تنقید ساختی تنقید کے اس تصور کو بھی اپناتی ہے جس کے مطابق رشتوں کا ایک جال ساخت میں کارفرما ہے۔ جب ہم بیسویں صدی کے مرکز مائل اور مرکز گریز تنقیدی نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں ایک دوسرے میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نظریات ایک دوسرے سے جدا دکھائی نہیں دیتے۔ اگر ان کے درمیان تفریق موجود ہے تو ان کے درمیان موجود اتفاق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ آج کی مغربی تنقید رفتہ رفتہ امتزاجی تنقید کی جانب گامزن ہے۔لیکن اس سے مراد یہ لینا درست ہوگا کہ مختلف تنقیدی نظریات ایک دوسرے کو بے دخل کررہے ہیں۔ جیسا کہ شمس الرحمان فاروقی صاحب کا خیال ہے اس ضمن میں ڈاکٹر فہیم اعظمیٰ کا خیال ہے ساختیات سے اسطوری تنقید کا امتزاج ممکن ہے کیونکہ متھ خود لسانی نظام کا حصہ ہے۔

روسی ہیئت پسندوں اور ماہرین ساختیات نے تاریخ کی نفی کی تھی جبکہ پس ساختیات کے ماہرین باختن، التھو سے اور فوکو نے تاریخ کے فعال کردار کو اپنایا۔مگر یہ اپنانا سابقہ تاریخی رجحان سے یکسر مختلف تھا۔سابقہ نظریہ اس بات کا عکاس تھا کہ تاریخ کو سمجھنا ممکن ہے۔اور ادب تاریخ کا انعکاس کرتا ہے۔لہٰذا معروضی رویہ کے تصور کو

ناگزیر خیال کیا جاتا تھا۔ جدید تاریخیت میں اس معروضی رویہ کو مسترد کر دیا گیا اور ایک مرکز کی بجائے متعدد اور متنوع مراکز کے خیال کو اجاگر کیا گیا۔ اس لیے فوکو کا موقف تھا کہ طاقت کو کسی ایک مرکز میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ طاقت ہم رشتگی سے عبارت ایک ساخت ہے۔

مشعل فوکو اور لسانی مباحث

یوں فوکو کے مطابق تخلیق کسی کی تصنیف نہیں اور وہ طاقت کی فراوانی کا احساس دلاتی ہے۔ اس طرح فوکو اور دریدا ہمیں ایک نقطہ پر اپنے نظریات میں متفق نظر آتے ہیں۔ کہ دونوں کسی ایک مرکز کے وجود سے منسوب ہیں۔ نئی تاریخیت کے ماہرین نہ صرف مرکز سے انحراف کرتے ہیں بلکہ وہ تسلسل اور ہم زمانی کو بھی مسترد کر دیتے ہیں۔ تاہم وہ سماجی اور تاریخی تناظر میں ادب کے مطالعہ کو درست قرار دیتے ہیں۔ فوکو نے عدم تسلسل کے تصور کو درست خیال کیا جبکہ قدیم تاریخیت میں عدم تسلسل مٹانے کو کوشش موجود ہے۔ دراصل قدیم تاریخیت میں بکھرے ہوئے سلسلوں کو اور واقعات کو تسلسل کے تابع کرنے کی کوشش کی گئی۔ جبکہ اس کے برعکس جدید تاریخیت ''مسلسل تاریخ'' کے تصور کی نفی کرتی ہے۔ فوکو کے مطابق تاریخ کے بہاؤ میں اچانک ایک جست نمودار ہوتی ہے جو تاریخیت کے نئے تصور کا اظہار اور علامت ہے۔ (۵۲)

اس بات کا اقرار کرنے میں دشواری نہیں کہ مغرب میں لسانی نظریاتی ماڈل جتنے بھی پیش کیے گئے اُن میں ایک خاص بات اُن کا آپس میں ایک دوسرے سے منسلک ہونا ہے۔ اور یہ تمام نظریات ایک ایسے رویہ کی عکاسی کر رہے ہیں جس کو امتزاج کا نام دیا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں مرکزی حیثیت طاقت کو حاصل تھی۔ مادی طور پر اگر اس کی جڑوں کو تلاش کیا جاتے تو اس کا تانا بانا صنعتی انقلاب سے جا ملتا ہے۔ جس کی دو بڑی علامات ''دولت'' اور ''انجن'' تھا۔ روس میں زار اور مغرب میں بسماک اور ملکہ وکٹوریہ کا عہد تھا۔ جو فرد واحد کی

''قوت'' کی دلیل تھے۔ بادشاہت عروج پر تھی ادب میں مصنف کے مرتبے کو بلند حیثیت حاصل تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے آخر تک ''قوت'' ایک قدرِ مشترک کے طور پر معاشرتوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی یہ منظر نامہ بدلنا شروع ہوگیا۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافت نے نیوٹن کے نظریہ زمان ومکاں کی اہمیت کا خاتمہ کر دیا۔ جس سے ہم رشتگی کا نظریہ وجود میں آیا۔ اس طرح مارکس نے ہیگل کے جدلیاتی تصورات کو طبقات پر لاگو کر کے معاشرتی سطح کی جدلیات کا آغاز کر دیا۔ مگر فوری طور پر اس نظریہ پر عمل نہ ہوسکا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کمیونزم کے احیاء سے مارکس کے نظریہ کو نئی زندگی مل گئی اور قوت کی مرکزیت کی بجائے لامرکزیت کا نظام ابھر کر سامنے آ گیا۔ جو معاشی سطح کی مساوات کا پیغام لے کر سامنے آیا۔ یوں قوت کی مرکزیت کے نظریے کو کاری ضرب لگی اور وہ اپنے اختتام کی طرف گامزن ہوگیا۔

برگسان نے زمان مسلسل کا تصور پیش کیا جس میں وقت کے زمانوں ماضی، حال اور مستقبل کی تفریق کو مٹا دیا گیا۔ اس نظریہ کے مطابق وقت کو تسلیم یا بانٹا نہیں جا سکتا۔ یہ نظریہ ماہر لسانیات سوسیور کے نظریات میں دو مختلف سطحوں پر دکھائی دیتا ہے۔ سوسیور نے زبان کے نظام کے حوالے سے جو موقف اختیار کیا اُس میں زبان کے مطالعہ کو دو زمانی تناظر کی بجائے یک زمانی تناظر میں کرنے پر زور دیا ہے۔ اور اس یک زمان کو وہ حاضر وقت زماں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح سوسیور نے زبان کی ساخت میں رشتوں کے اُس جال کو اہمیت دی ہے جو زبان کی کارگردگی کے پیچھے ہر وقت موجود رہتا ہے۔ دوسری سطح پر سوسیور زبان کو لانگ اور پارول میں تقسیم کر کے دونوں کے درمیان موجود ربط کو واضح کیا ہے۔ اس طرح سوسیور نے لانگ اور پیرول میں سے کسی ایک کو مسترد کرنے کی بجائے دونوں میں تعلق کو جوڑتے ہوئے پارول کو گفتگو کا نظر آنے والا حصہ جبکہ لانگ کو گفتگو کا نہ نظر آنے والا حصہ کہا ہے۔ سوسیور نے لانگ اور پارول کی وضاحت کے لیے شطرنج کے کھیل کی مثال دی ہے جس میں تمام چالیں اُس کے نظام کے تابع ہوتی ہیں۔ اس طرح لانگ کو سسٹم اور پارول کو اس کے تحت چلی جانے والی چال سے تعبیر کیا

ہے۔سوسیور کے مطابق اگر لانگ کو منہا کر دیا جائے تو ساری گفتگو بے معانی ہو جاتی ہے۔گویا پارول ہمیشہ لانگ کے مطابق ہوتی ہے۔پارول جو بذاتِ خود ایک ساخت دکھائی دیتی ہے۔مگر اس ساخت کی کارگردگی لانگ کی اُس ساخت کے تابع ہوتی ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔ظاہر اور باطن کی تقسیم محض افہام و تفہیم کے لیے ہے۔ورنہ لانگ اور پارول ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ٹی ایس ایلیٹ کا نظریہ روایت

بیسویں صدی کے نصف اول میں ٹی ایس ایلیٹ نے ''روایت'' کا تصور پیش کیا اس میں روایت سے مراد قدیم سے آج تک کا سارا زمانہ ''حال'' کے لمحے میں موجود ہونا تھا۔روایت سے مراد محض قدیم ماضی سے ہم رشتگی کا تصور نہیں تھا۔ژونگ نے اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کیا جس میں زمانوں پر محیط تصورات کو وہ ایک جال کے ذریعہ سے رشتوں کے اندر سمیٹ کر انسانی تجربات کا نیا نظام متعارف کراتے ہیں۔بیسویں صدی کے لسانی اور تنقیدی نظریات نے پہلی کروٹ اُس وقت بدلی جب روسی فارمل ازم کا نظریہ سامنے آیا۔جس نے متن کی ساخت پر توجہ مرکوز کی۔اس نظریہ کے مطابق تخلیق کار، متن کو انوکھا بنا کر اُس کو پیش کرتا ہے۔اس طرح نئی تنقید کے نظریہ نے بھی متن کو اہمیت دی اور اس کو موضوع بنایا لیکن اس میں متن کی ظاہری ساخت کی بجائے اُس کے اندورنی ڈھانچے کو زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیتے ہوئے معانی کے تہہ در تہہ نظام کو اہمیت دی گئی۔اس کے مطابق تخلیق کا ہر نقطہ داخلی نظام سے منسلک ہوتا ہے اور اُس کے معانی بھی داخلی نظام کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔اس طرح نئی تنقید نے مصنف کو منفی قرار دیتے ہوئے نظر انداز کر دیا جبکہ تخلیق کو خود کفیل اکائی کا درجہ دے دیا گیا۔ساختیات نے نئی تنقید کی اس بات کو قبول نہ کیا کہ متن کے اندر تک محدود رہا جائے۔ساختیات کے مطابق تخلیق کا تناظر خاصا وسیع ہے۔لہٰذا متن پر اثر انداز ہونے والے خارجی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔مزید تخلیق کرنے والے کے زہن

میں شعریات کا جو منطقہ موجود ہے۔ وہ ثقافت سے عبارت ایک نمونہ ہے اور یہی شعریات متن کو تخلیق کرتی ہے نہ کہ مصنف تخلیق کرتا ہے۔ یہ خیال سوسیور کے لانگ اور پارول سے اخذ کیا گیا۔ ساختیات میں شعریات اور متن کے بعد سب سے زیادہ اہمیت قاری کو دی گئی۔ یوں ساختیات میں تمام تر توجہ کا مرکز شعریات، متن اور قاری کو بنایا۔ شعریات کو مصنف کے باطن کی کروٹ جو اُس کے تخلیقی کارگردگی کی وجہ سے متن میں منقلب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ساختیات، اصل ساخت شعریات متن اور قاری کو قرار دیتی ہے۔ ساختیات نے واحد مرکز کو ماننے کی بجائے ان گنت مراکز کے تصور کو اجاگر کیا مگر بغور مطالعہ اس بات کا عکاس ہے کہ ساختیات نے مرکز کی نفی نہیں کی بلکہ ایک مرکز سے دوسرے مرکز کی جانب سفر کو جاری رکھا ہے۔ اور اس طرح ایک برتر مرکز کے تصور کو ابھارا ہے۔ جو بے شمار مراکز کے اتصال سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن وجود میں آ کر اُس کی مستقل حیثیت نہیں رہتی اور وہ نئے مراکز کو تلاش اور قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے۔ یعنی اُس کی حدود میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لسانی اور تنقیدی نظام کا آخری مرحلہ دریدا کی ساخت شکنی کی صورت میں سامنے آیا۔

دریدا کے ساخت شکن نظریات اور لسانی مباحث

دریدا نے ساخت شکنی کے مرکز کی تمام صورتوں کو مسترد کر دیا۔ اور ساخت کے وجود سے بھی انکار کا اعلان کر دیا۔ دریدا کے مطابق:۔

''کوئی بھی شے متعین اور بنیادی نوعیت کی نہیں ہے۔ ہر طرف آزاد کھیل جاری ہے۔ جس میں سمتیں ناپید معانی اور اقدار حالتِ غدر میں ہیں۔ ہست ایک گورکھ دھندا ہے اور گہراؤ بھی جس کی تہہ موجود نہیں معانی ہر وقت التوا کا شکار ہے اور سبب و مسبب کا سلسلہ معطل ہے۔''

دریدا کا یہ نظریہ ایک ایسے بے کنار تناظر کا اعلامیہ ہے جس میں صرف کہرام کی صورت برپا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دریدا نے ہئیت کی پیچیدگی کو ہی سب کچھ جانا مگر اس کے معین پہلوں سے صرف نظر کیا مگر دریدا کے اس نظریہ نے رشتوں کے جال کے عقب میں اُسی بے ہیئتی کا ادراک کیا جس سے تخلیق نے جنم لیا۔ اس طرح بیسویں صدی کا نصف اول جدیدیت اور آخری نصف مابعد جدیدیت کا دور کہلاتا ہے۔ اسی دوران میں ان نظریات نے روسی فارمل ازم سے لے کر ساخت تک کے کئی مراحل طے کیے۔ اس دوران میں کبھی متن کو تو کبھی شعریات کو اہمیت ملی لیکن ساخت کا تصور برقرار رہا۔ مگر ساختی شکنی کے نظریات نے ساخت کے نظریے کو رد کر دیا۔ اور گورکھ دھندے کو پیش کیا گیا۔ یہ گورکھ دھندا محض تلازمہ خیال نہیں بلکہ تخلیقی عمل کا حامل بھی ہے۔ دریدا نے اس تصور کے خارجی تناظر کو دیکھا اور اس کے داخلی تناظر سے واقف نہ ہوسکا۔ مگر وہ اس گورکھ دھندے کی موجودگی سے آگاہ ضرور تھا۔ دریدا نے جس گنجلک کا تذکرہ کیا وہ تخلیق کا ایک مرحلہ ہے۔ یہ گنجلک تخلیقی عمل کے طریق کار میں پوری طرح سے کارفرما ہے۔ اور تمام نظریات کی باہمی آمیزش کا سبب ہے۔ (۵۳)

ان نظریات سے جو تصورات ہمیں ملتے ہیں اُن میں ''روسی فارمل ازم'' سے ''انوکھے پن'' کا تصور جو تخلیق کے عمل میں تقلیب کا ہم معانی ہے۔ نئی تنقید میں تخلیق کے اندرونی خدوخال کا تصور اخذ کر کے معانی کے تعین سے رہائی کی بات کی گئی۔ ''ساختیات'' نے شعریات کے تصور کے ذریعہ سے ''لانگ'' کی کارگردگی کو قبول کیا۔ جبکہ ''ساخت شکنی'' نے ''گنجلک'' کے تصور سے دور گہرائی میں ہونے والی داخلی انتشار کو بنیاد کے طور پر قبول کیا۔ اگر ان تمام تصورات کو مجتمع کر لیا جائے۔ اور یہ اکٹھا کرنے کا عمل مخصوص طریق کار کے زیر اثر کیا جائے۔ تو اس کی مدد سے ہمیں تخلیق کو تہہ در تہہ کھولنے میں نہ صرف کامیابی حاصل ہوگی بلکہ ہم ان تمام نظریات کے مراحل کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس امتزاج کے ذریعہ سے چھو سکیں گے۔

مغربی نظریات پر مشتمل بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ مغرب میں انیسویں صدی کے

اواخر سے بیسویں صد کے کے آخری ربع تک چار نظریات ایسے ہیں جنہوں نے ساختیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

۱۔ روسی فارمل ازم کے مباحث

۲۔ نئ تنقید کے مباحث

۳۔ ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث

۴۔ ساخت شکنی کے مباحث

جیسا کہ یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے۔ کہ انیسویں صدی میں ''مرکز'' کو غالب حیثیت حاصل تھی۔ جبکہ بظاہر بیسویں صدی کی ان مباحث اور نظریات نے مرکز گریز تصورات اور خیالات کو بنیاد بنایا لیکن اندر ہی اندر مرکز کی توسیع کا کام جاری وساری رہا۔ اس لیے امتزاجی مباحث مرکز کی توسیع کا اقرار کرتے ہیں۔

اس طرح امتزاجی مباحث میں تخلیق کے اندرونی خدوخال کے تجزیہ کے ساتھ اس کے بیرونی ڈھانچے پر بھی مباحث اور تجزیات موجود ہیں۔ امتزاجی مباحث کے ذریعہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق کی حیثیت محض غلاف کی سی ہے جس کے اندر پراسرار منطقوں کی جانب رواں دواں راستے موجود ہیں۔ اس لیے امتزاج کو کسی دائرہ تک محدود رکھنا درست نہیں ہے۔ ان مباحث میں دائرے کھلتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ (۵۴)

اُردو زبان اور مغرب کے لسانی مباحث

مغربی مباحث کو اُردو زبان میں زیر بحث لانے کا چال چلن کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں موجود رجعت پسند عناصر نے اس پیش رفت کو روکنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس ردعمل نے ان مباحث کے ہمارے ہاں پھلنے پھولنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رجعت پسند عناصر اس بات پر زور دیتے تھے کہ ساختیاتی تنقید جب مغرب میں

ہی دم توڑ چکی ہے تو اس مردے میں یہاں دوبارہ جان ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ اس حقیقت سے کب انکار ممکن ہے کہ ادبی اصناف یا نظریے تحت در تحت موجود نہیں ہوتے۔ کہ ایک نظریہ کی موت دیگر نظریوں کی پیدائش کی وجہ ہو۔ بلکہ پورا ماضی ہمہ وقت ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس لیے کسی نظریے کو مردہ قرار دینا قطعاً درست بات نہیں ہے۔

اُردو نے محض خود کو ساختیات تک محدود نہیں رکھا۔ اس نے ساختیات سے پہلے کے مباحث تاریخی سوانحی، روسی فارمل ازم اور نئی تنقید کے مباحث کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ کیونکہ ان تمام کے بغیر ممکن نہیں کہ ساختیاتی مباحث پر بات کی جا سکے یا اُن کو سمجھا جا سکے۔ اُردو میں ساختیات کے مباحث کو مارکسی اور نفسیاتی تنقید میں ضم ہوتے بھی دیکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ساخت شکنی کے مباحث، نئی تاریخیت کو بھی اُردو نقادوں نے موضوع بحث بنایا ہے۔ مغرب میں آج بھی شب و روز لسانی مباحث ہو رہے ہیں۔ اور آئے دن نئے مباحث کے نتیجہ میں نئے نظریات کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سابقہ نظریات کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔

مغربی تنقید کے مختلف مباحث اپنی اپنی جگہ پر اس کوشش میں نظر آتے ہیں کہ متن کے درست مفہوم تک رسائی حاصل ہو سکے۔ یہ مباحث ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ آمیزش و آویزش مزید مباحث کو آغاز فراہم کرتی ہے۔ جو مغربی مباحث میں نامیاتی وجود کا احساس دلاتی ہے۔ آج سے سو سال قبل ''تاریخی سوانحی نظریات'' نے بنانے والے کو اہمیت دیتے ہوئے مصنف کو زیر بحث لانے کی کوشش کی۔ گویا ان نظریات میں متن کو تو نظر انداز کر دیا گیا مگر اہمیت لکھنے والی کی اور اُس کے تاریخی تناظر میں مقام پر رہی۔ تاریخی سوانحی نظریات کے بعد روسی فارمل ازم کی تحریک نے مصنف سے سروکار کو قطعی طور پر رد کر دیا۔ اور توجہ کا مرکز محض متن کو قرار دیا گیا۔ فنی تنقید متن کے خالق اور اُس کے تاریخی پس منظر سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور اس نے متن کو خود کار اور خود کفیل اکائی قرار دیا ہے۔ اور اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی

ہے متن کی کارگردگی سے معانی کس طرح پھوٹتے ہیں۔''ساختیاتی'' ماہرین نے متن کی بالائی ساخت پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے اس کی گہری ساخت یعنی شعریات پر غور کیا اور دیکھا کہ کسی طرح نظام کی موجودگی متن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس میں قاری کو زیادہ اہمیت دی گئی۔''ساخت شکن'' تحریک کے مطابق ساختیات نے نئے مٹکوں میں پرانی شراب پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''اور خالق کی جگہ نظام کو دے کر متن کے مصنف کی موجودگی کا اقرار کرلیا ہے۔خود ساخت شکنی متن کے نتیجہ میں ابھرنے والے منظر پر توجہ مبذول کرتی ہے اور متن کی بدولت بدلتے منظر نامے کے اندر سے نئے مناظر کی تشکیل سے آ گاہی فراہم کرتی ہے جو معانی در معانی کی پرتوں کو کھولتی چلی جاتی ہے۔اور ایک گنجلک جنم لینے لگتی ہے۔اور معانی کا التوا جنم لیتا ہے۔ساخت شکن ماہرین بند اور مقرر معانی کی قید سے نکل کر گنجلک منظر نامے کے گہراؤ میں جھانک کر نئے معانی نکال لاتے ہیں اور معانی کے التوا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جنم لیتا ہے۔

سابقہ صدی میں مجموعی طور پر مباحث میں ایک مثلث ''مصنف، متن اور قاری'' پر کام کیا گیا۔آغاز میں اہمیت کی حامل مصنف کی ذات قرار پائی۔پھر متن کو بنیادی اہمیت دی گئی اور آخر میں قاری کو سب سے اہم قرار دیا گیا۔ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق انیسویں صدی امتزاج اور انضمام کی صدی ہوگی جس میں تنقید میں امتزاج کو فروغ حاصل ہوگا۔اور مصنف متن اور قاری کی مثلث ایک کُل کے طور پر نظر آئے گی۔''جان سٹروک'' نے جس تنقید کے بارے میں بات کی ہے اُس کا اطلاق واضح طور پر امتزاجی تنقید کے درج بالا ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال پر ہو سکتا ہے جس کے مطابق امتزاجی تنقید "Free mobality across the intilected land scape" ہے۔یہ احساس امتزاجی تنقید کے لائحہ عمل کے مطابق ہے ایمرسن نے اس بارے میں کہا سامنے کے منظر میں ایک کھیت ''الف'' کا ہے دوسرا ''ب'' کا ہے اور تیسرا ''ج'' کا اور سارا منظر میرا ہے۔

غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کی ناکام جدوجہد امتزاجی اکائی کی طرف ایک اہم قدم تھا۔اگرچہ یہ کوشش

کامیاب نہ ہو سکی مگر اس کے اثرات شعبہ جات میں موجود ہیں۔ سیاسی سطح پر بڑی بڑی بادشاہوں کا مخصوص انداز باقی نہ رہا جس میں مرکز نے تمام طاقت کو خود تک محدود کر رکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں تو نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے ایک نئی وضع کی امتزاجی اکائی پر انحصار کرتے دکھائی دیتے۔ امتزاج کی طرف جھکاؤ کی حالت نے بیسویں صدی کے اواخر میں سٹرنگ تھیوری کو جنم دیا۔ جسے برائن گرین نے اپنی کتاب "The Elegant Universe" (شاندار کائنات) میں بیان کیا۔

سٹرنگ نظریہ نے کائنات کی چاروں قوتوں کو ہم آہنگ اور باہم مربوط دکھا کر اس کے امتزاجی طریق کار کا احساس دلایا ہے۔ نیز اس نظریہ نے رشتوں کے جال کے تصور کے پیش نظر امتزاج کی ہئیت کو بھی بیان کیا ہے۔ اس لیے سٹرنگ کا نظریہ پراسرار توازن کے اصول سے ماخوذ لگتا ہے۔ جس کا مقصد زماں و مکاں کے وجود میں آنے سے پہلے موجود حقیقت کی طرف توجہ مرکوز کرانا تھا۔ بیسویں صدی کے لسانی ساخت میں ڈاکٹر وزیر آغا کو امتزاج کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے اُن کے مطابق سوسیور کا موقف یہ تھا کہ لانگ، جو زبان کا نظام ہے۔ نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ مگر پارول یعنی گفتگو میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ لانگ اور پارول کا یہ انوکھا نظام کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک فطری عمل کا اظہار ہے۔ امتزاج کے حوالے سے سوسیور نے زبان کو دو زمانی کی بجائے یک زمانی قرار دے کر ایک قدم مزید آگے بڑھایا۔ یہ عمل بیسویں صدی کے مزاج کا حصہ تھا جس میں واحد مرکز کی بجائے ان گنت مراکز کی طرف سفر جاری تھا۔

درکھیم نے معاشرے کو اجتماعی معاشرتی نظام کا نام دیا ہے۔ افراد کی سرگرمیاں اسی معاشرتی نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔ معاشرے اور فرد کا یہ تعلق بیسویں صدی کے مزاج کے عین مطابق تھا جس میں نہ تو معاشرہ اور نہ ہی فرد کو مطلق العنان کی حیثیت حاصل ہے۔ جبکہ انیسویں صدی میں معاشرے کی بالا دستی کا تصور موجود تھا۔ بیسویں صدی کے اشتراکی نظام میں بھی معاشرے کی بالا دستی کو تسلیم کیا گیا۔ اس طرح بیسویں صدی کی پوری جہت

کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ربط کی باہمی صورت پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مائل بہ مرکز ساخت کی بالا دستی قائم تھی جس کا منطقی نتیجہ فوق البشر کی صورت میں سامنے آیا۔ متن کے مقابل مصنف کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور متن کو مصنف کے تاریخی تناظر میں جاننے کی کوشش کی گئی۔ بیسویں صدی کے مباحث میں مرکز گریز جہت سامنے آتی ہے روسی فارمل ازم میں متن کی پوری ساخت پر غور کرنے اور اس کے اجزاء کی کارگردگی کو زیر بحث لایا گیا۔ اس بحث نے متن کے مادی وجود کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور یہ موقف سامنے آیا کہ تخلیق کاری کے عمل میں بنیادی بات متن کو لسانی سطح پر نامانوس بنانا ہے۔ اس کے بعد نئی تنقید کے مباحث میں متن کی تفہیم کی طرف پیش قدمی کی گئی اور متن کی اُس پیچیدہ کاری کی طرف توجہ دی گئی جو معنی آفرینی کا محرک تھی۔ اس طرح روسی فارمل ازم نے معنی کے ساتھ سروکار نہ رکھا جبکہ نئی تنقید میں متن کو اس مقصد کے ساتھ کھولا گیا کہ اس کے بطن سے پھوٹنے والے معانی کو بے نقاب کیا جا سکے۔ اس طرح ان نئی تنقید کے مباحث نے متن کے لسانی وجود میں معانی کی اہمیت کا احساس دلا کر اس میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ جس سے معانی آفرینی کا دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا ہے۔

متن کی ساخت کی اہمیت

مغربی لسانیات مباحث میں نئی تنقید کے مباحث کے بعد ساخت کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ ساختیاتی مباحث سوسیور کے نظریات لانگ اور پارول نے مرکز کی نفی کرتے ہوئے شعریات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اب اگر غور کریں تو ان تمام نظریات میں تسلسل نظر آتا ہے۔ روسی فارمل ازم نے متن کے اندر جھانکنے کی ابتداء کی جو متن کے لسانی حوالوں تک محدود تھی۔ نئی تنقید نے مزید اضافہ کرتے ہوئے متن میں معنی آفرینی کے عقب میں ثقافتی ورثے کا احساس دلایا۔ ساختی تنقید نے لسانیات کے تعقلات کو اپنے نظام فکر میں اپنایا اور قرات کو اہمیت دی اور

معانی آفرینی کے عمل کو قاری کی کارگردگی کے ساتھ مشروط قرار دیا۔

ساختیات نے مصنف کی نفی کی اور متن کی قرات کے عمل میں موجود شعریات کے مخفی وجود کو نشان زد کیا جو لانگ سے مماثل تھا۔ دوسری طرف قاری کی اہمیت کا اجاگر کرتے ہوئے اُس متن کی تخلیق مکرر کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

ابرامز نے اپنی کتاب The mirror and lamp میں تنقید کے چار اجزاء کی بات کی ہے۔ ابرامز کے مطابق اعلیٰ تنقید ان چار اجزاء تخلیق، مصنف، تناظر اور قاری کے گرد گھومتی ہے۔ ان چار اجزاء کو ابرامز اعلیٰ تنقید کے حوالے سے اہم قرار دیتا ہے جبکہ عمومی لسانی نظریات ان چاروں اجزاء میں سے کسی ایک جز وکو اہم قرار دیتے ہوئے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان تمام نظریات میں تخلیق کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر حصے کو ایک کل کی حیثیت دے کر اُسے قبول کیا گیا۔ جبکہ ضروری تھا کہ ان نظریات میں تمام اجزا کو یک جا کر کے پھر تخلیق کو کھولا جاتا۔ تو وہ نتائج حاصل ہونے میں کامیابی کے امکانات زائد ہوتے جو اس تخلیق کے مقاصد ہوتے۔

۱۹۵۸ء میں پطرس بخاری نے ثقافتوں کے ادغام کے سلسلے میں دیئے گئے اپنے لیکچر میں ثقافتوں کے ادغام کو ایسے گنبد سے مثال دی جس میں رنگ، رنگ کی کھڑکیاں لگی ہیں۔ جب باہر سے روشنی آتی ہے تو مختلف رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک انوکھا رنگ بن جاتے ہیں۔ پطرس کے مطابق عالمی ثقافت اسی انجذاب کا نمونہ ہے۔(۵۵) پطرس کی اس بات کا اطلاق اگر مباحث لسانیات پر کیا جائے تو یہ کہنا دشوار نہ ہوگا کہ مختلف نظریات آپس میں براہ راست ملائے نہیں جاسکتے۔ بلکہ یہ گنبد میں سے گزر کر آنے والی مختلف رنگوں کی روشنی کی مانند ایک نئے رنگ میں ڈھل جاتے ہیں جس سے ایک انوکھی Epistime (چکا چوند) پیدا ہوتی ہے۔ ''فوکو'' اس چکا چوند کو رشتوں کے خاص وقت میں ملاپ کا نام دیتے ہیں۔ مختلف مشقیں چکا چوند جسم کو ابھارتی ہیں۔ وہ سائنس اور نظام ہیں۔

فوکو نے اس تعریف میں فنون لطیفہ کا ذکر نہیں کیا۔ان مباحث کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے۔کہ کسی زمانے میں Epistime کو ایک نئی بُعد اور چکا چوند اضافہ تصور کیا جا سکتا ہے۔امتزاجی اور مابعد جدیدیت کے تنقیدی نظریات کے حوالے سے ابھرنے والی تنقید میں بھی یہی رشتہ موجود ہے۔اسے آفاقیت اور قیامت کے رشتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔پس ساختیات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:۔

''پس ساختیات کا نظریہ فلسفیانہ قضایہ سے بحث کرتا ہے جبکہ مابعد جدیدیت کا نظریہ (صورت حال) کے حوالے سے بحث کرتا ہے۔اگر غور کیا جائے تو مابعد جدیدیت کا تصور بڑا حصہ پس ساختیات کے فلسفیانہ تصورات کا عکاس ہے۔''

ظاہر یوں ہوا ہے کہ مابعد جدیدیت کو تصورات اپنے Epistime کے تابع ہونے کی وجہ سے صورت حال کہلاتے ہیں۔اور مقامی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔جدیدیت کی عصری صورتحال اور مابعد جدیدیت کی عصری صورت حال ایک دوسرے سے یقیناً الگ تھیں آگے چل کر جب پوسٹ ماڈرن ازم (مابعد جدیدیت) کا دور دورہ ہوا تو صورت حال الگ ہوگئی۔(ناصر عباس نیر) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔کیا مابعد جدیدیت کے بیشتر خیالات وہی نہیں جو امتزاجی تنقید کے ہیں۔ناصر عباص نیر کا یہ سوال اس بات کی طرف توجہ مرکوز کراتا ہے کہ نئی تنقید ساختیات پس ساختیات کے فلسفیانہ تصورات ہی امتزاجی تصورات کے پس پشت کارفرما ہیں۔اور امتزاجی تنقید کو آگے بڑھانے میں ان تمام نظریات کا اور مباحث کا ساتھ ہے جو اس سفر میں مرحلہ بہ مرحلہ اپنا کردار نبھاتے ہیں۔

سولھویں صدی جسے مشابہتوں اور مماثلتوں کی صدی قرار دیا جاتا ہے۔جس کی بنیاد ''میں اور تم'' کا رشتہ

تھا۔ جبکہ سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی، قربتوں (Contiguties) کا دور قرار دیا گیا جس میں رشتہ انجذاب کی بجائے ربط باہم کے تصور کو اہم قرار دیا گیا۔ انیسویں صدی میں متخالف نظریات کو فروغ ملا جس کی وجہ سے صحبت کی بجائے آویزش نے جنم لیا۔ اس طرح بے جان اشیاء کو ایک نئی قوت حاصل ہوگئی اور یوں ''میں اور تم'' اور قربتوں کے رشتوں کی بجائے ''میں اور یہ'' (I and it) نے لے لی۔ انیسویں صدی میں جنم لیتے رومانیت نے ''میں اور یہ'' کے درمیان قربت بڑھانے کی کوشش کی مگر ''یہ'' کی قوت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اور ہمہ وقت یہ قوت ''میں'' سے متصادم رہی۔ بیسویں صدی میں صورتحال تبدیل ہوگئی ہے۔ اور ''میں اور یہ'' کی بجائے ''یہ اور میں کا رشتہ'' ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس طرح ''یہ'' کو برتر حیثیت حاصل ہوگئی۔ مگر ''میں'' اس کے اندر شامل ہوگیا اور ایک داخلی قوت کے طور پر ظاہر ہوا اس لیے بیسویں صدی کے مباحث میں گہرائی اور سطح میں جو رشتہ دریافت ہوا۔ دراصل وہ ''یہ'' کے اندر موجود ''میں'' سے مرتب ہوا تھا۔ ساختیاتی تنقید میں بڑی حد تک گہرائی اور سطح کا تعلق مرکز نگاہ رہا۔

ساخت شکن تنقید نے حقیقت کو ایک گورکھ دھندے کے روپ میں دیکھا جو اپنی آنکھ میں اُتر رہا تھا۔ معانی جب التوا کی زد میں آیا تو وہ بھی ایک گنجلک کا شکار ہوگیا۔ فکری انداز سے یہ ایک بڑی پیش رفت تھی جس میں منطقی انداز کی بجائے غواصی انداز کو اپنایا گیا۔ بیسویں صدی کے ربع آخر تک کائنات کی پُراسراریت کے ادراک کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے گہرائی میں جانے والا ہر زاویہ قابل قبول قرار پایا۔ یوں بھی امتزاجی تنقید اور مابعد جدیدیت ''یہ'' (IT) کی گہرائی میں جانے کی مشترک خصوصیت کی حامل تھیں ہوسکتا ہے کہ تناظر کی تبدیلی کے ساتھ مابعد جدیدیت بھی اُس طرح ماضی کا حصہ بن جائے جس طرح جدیدیت بن گئی۔ اس کے برعکس امتزاجی تنقید میں یہ خوبی موجود ہے کہ وہ نئے آنے والے تناظر سے ہم آہنگ ہوسکے۔ کیونکہ امتزاج کسی زمانے میں رک جانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ دائروی انداز میں زماں و مکاں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور امتزاجی تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق امتزاجی تنقید کھلے رویے کی ضامن ہے اور اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ نقاد اپنے تعصّبات کو جھٹک دے اور امتزاجی جہت کے حوالے سے متن کے خدوخال تک رسائی حاصل کرے جس سے اعلیٰ تنقید کی راہیں ہموار ہوں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ نقاد اور متن دونوں امتزاجی رویے کے حامل ہوں۔ امتزاجی نقاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ امتزاجی نقاد ہر نئی کروٹ سے استفادہ حاصل کرتا ہے مگر امتزاجی تنقید شعریات کے اندر رہتی ہے۔ اس طرح وہ متن کی کلیت کا ادراک کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور متن کی ازسرنو تخلیق کرتا ہے۔(۵۶)

بیسویں صدی میں ساختیات اور پس ساختیات کے ماہرین نے تخلیقی عمل کو اپنے طور پر پیش کیا۔ ان ماہرین نے روسی فارمل ازم اور نئی تنقید والوں سے اس حد تک تو اتفاق کیا کہ تخلیق کا اپنا ایک ڈھانچہ ہوتا ہے مگر تخلیق کو خودمختار اکائی تسلیم نہ کیا۔ ساختیات کے ماہرین اس بات کا قائل تھے کہ تخلیقی ڈھانچہ محض بالائی سطح کے عناصر تک محدود نہ ہے بلکہ وہ گہری ساخت سے عبارت ہے۔ اس طرح ماہرین ساختیات نے شعریات کی جانب نشاندہی کی۔ اس طرح انھوں نے تخلیقی عمل کو شعریات کے منکشف ہونا قرار دیا ہے۔ اور قاری کے ذمہ شعریات پر نظر ڈالنے کا کام سپرد کیا ہے۔

یعنی وہ دیکھے کہ تخلیق کس طرح مرتب اور مدون ہو رہی ہے۔ اگر ہم سوسیور کے اس نظریہ کو جو لانگ اور پارول کا انھوں نے پیش کیا اُس میں سے لانگ کو خارج کر دیں تو پارول کی حیثیت محض شور کی سی ہو کر رہ جائے گی اس طرح کا کام تخلیقی پرتوں کو اتارنا اور شعریات کی کارگردگی پر نظر ڈالنا ہے۔ یہ عمل خود تخلیق کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس عمل سے قاری متن کی دوبارہ تخلیق کرتا ہے۔

ساختیات کے ماہرین میں ایک نام ''گراہم ولیس'' کا ہے۔ گراہم ولیس کے نظریات کو سامنے رکھ کر ''کیتھرین پیٹرک'' نے تخلیقی عمل کی وضاحت پیش کی ہے۔ کیتھرین پیٹرک کے مطابق تخلیقی عمل چار مراحل پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ تیاری، دوسرا پرورش، تیسرا تنویر اور چوتھا مرحلہ تصدیق کا قرار دیا۔ تیاری سے کیتھرین کی مراد وہ معلومات ہے جو بیرونی دنیا سے تخلیق کار کو متاثر کرتی ہیں۔ دوسرے مرحلے میں وہ معلومات اُسے گنجلک کا شکار بنا دیتی ہیں۔ پھر وہ ان پیچیدگیوں کو بھُلا کر زندگی کے دوسرے معاملات پر توجہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ بھولے ہوئے مسئلے کو دوبارہ اپنے سامنے پاتا ہے اور اچانک وہ گنجلک اُسے حل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ حل اچانک اور ایک کوند کی مانند اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور تخلیق کار کے لیے انتہائی مسرت کا باعث بنتا ہے۔ چوتھا مرحلہ کیتھرین پیٹرک کے مطابق وہ ہے جس میں تخلیق کی نوک پلک سنوارتا ہے اور اپنے تنقیدی شعور کی مدد سے اُسے ایک بہترین شکل دیتا ہے۔

بظاہر تخلیق اچانک اور کوندے کی مانند نازل ہوتی ہے مگر بغور مطالعہ اس کے زنجیر نما سلسلے کو واضح کرتا ہے۔ جس میں احساسات، تصورات، خیالات اور الفاظ ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی اہمیت احساس کو حاصل ہے جو پختہ ہوتے ہی اظہار کا متمنی ہو جاتا ہے۔ احساس اور تصور میں فرق محض مدارج کا ہے۔ یعنی احساس جب متشکل ہوتا ہے تو تخیل کا عکاس ہو جاتا ہے احساس تصور اور خیالات کا باہمی ربط اُن الفاظ کو جنم دیتا ہے جو ان احساسات، خیالات اور تصورات کو علامتی صورت عطا کر کے معانی کے نمود کا باعث بنتے ہیں۔

اُردو ادب کو جذباتی جوش و خروش ورثہ میں ملا ہے ہمارے ہاں گفتگو کیا آداب بلند آہنگ ہیں مثلاً خوشی کی حالت میں قہقے اور غم کی حالت میں آہ و بکا، دونوں میں جوش و خروش اور بلند آہنگ کیفیات موجود ہیں۔ افسانہ نگاری ہو یا شاعری دونوں میں یہ جذبات اُردو ادب میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نثر کے مقابل شاعری میں

جذباتیت کا عمل دخل زیادہ رہا ہے جس کی وجہ سے شاعری کو نقصان ہوتا رہا ہے جذبات، تجربات کے خدوخال کو دھندلا دیتے ہیں۔ عام طور پر بھی اس بات کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آ جاتے ہیں تو اُس کے الفاظ لڑکھڑا جاتے ہیں۔ مگر جیسے ہی وہ اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا لیتا ہے احساس کی سطح نمودار ہو جاتی ہے تو جذبات کے زیر اثر کی جانے والی گفتگو کے دوران جو کچھ اُس کی آنکھ سے اوجھل ہو گیا تھا وہ دوبارہ نظر آنے لگتا ہے۔ احساس کی اگرچہ کو واضح شکل نہیں ہوتی مگر تخلیق عمل میں احساس اپنے وجود کے اظہار کے لیے صورت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیوی سٹراس کا کہنا ہے۔ جملہ اساطیر کے عقب میں ایک مِتھ ہوتی ہے جس کی متعین صورت نہیں ہوتی۔

ایلون ٹوفلر اور بیسویں صدی کی تہذیب

بیسویں صدی کی مغربی تہذیب عروج پر پہنچنے کے بعد انجماد کا شکار ہوگئی۔ پھر شکست وریخت کا دور آیا۔ اس دور میں بڑی اور چھوٹی جنگوں کا ہونا معاشرتی اقدار میں انحطاط کی طرف نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ایک بے ہیئتی کا عالم وجود میں آ گیا۔ جسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ نظم وضبط کی تمام صورتیں ختم ہوگئی ہیں۔ تب ایسی صورت حال سے نئی تقلیب کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے جسے ''ٹوفلر'' نے تیسری لہر کا نام دیا۔ بعض ماہرین نے اسی صورت حال کو نیا عالمی نظام (New world order) کا نام دیا۔ جبکہ بعض ماہرین نے اسے نئی ساخت سے بھی تعبیر کیا۔

نئی ساخت کے ماہرین نے مرکز کی نفی کرتے ہوئے لامرکزیت پر ذور دیا۔ بیسویں صدی کے آخر تک یہ نظریہ واضح ہو گیا کہ نئی تقلیب کی صورت حال کے نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال تک بڑی بڑی ریاستوں اور طاقتوں کے وجود نے دنیا کو اپنے قبضے میں جکڑ رکھا تھا۔ مگر بیسویں صدی کے آخری

پچاس سال میں مرکز ہمیں ٹوٹا پھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ ریاستوں اور طاقتوں کے مراکز بکھرنا شروع ہو چکے ہیں۔ اور بقول ٹوفلر کی تیسری لہر کے ''سلطنتیں'' ٹوٹ کر ایک ایسی نئی ساخت میں تبدیل ہو رہی ہیں جو بے مرکز ہوں گی۔ ٹوفلر کی اس بات کی عکاس کارپوریشن کا نظام ہے جس کا مرکز کسی ایک ملک یا ریاست تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ کارپوریشن بغیر کسی جڑ کے پوری دنیا پر قابو پا رہی ہیں۔ آج بڑھتی ہوئی برقی تہذیب نے دنیا کو گاؤں تک محدود کر دیا ہے۔ جدید ذرائع نقل و حمل نے فاصلوں کو مختصر کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ، اور دیگر ذرائع ابلاغ نے دنیا کو ایک کونے کو دوسرے کونے سے جوڑ دیا ہے۔ اب خبریں یا واقعات ہوں، فیشن ہو یا لسانیات انہیں رہن سہن کے آداب ہوں یا ذہنی تصورات تمام صورت حال یکسر بدل چکی ہے۔ اب انفرادی ثقافت کا رجحان آہستہ آہستہ مٹ رہا ہے اور عالمی ثقافت انفرادی ریاستی ثقافتوں پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ کرہ ارض ہی نہیں بلکہ زندگی اور کائنات کی تشکیل وارتقاء کے بارے میں نئے ابھرتے زاویہ نگاہ مرکز کی بجائے لامرکزیت کی طرف سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔

معلومات کا حصول اور لسانیات

کیتھرین پیٹرک موجودہ دور کو ''معلومات کے حصول کا دور'' قرار دیتی ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری ایام تک اس بات پر اتفاق کیا جا رہا ہے کہ بنیادی سطح پر کائنات کے اندر انقطاع کا عمل موجود ہے یعنی کائنات میں توڑ پھوڑ اور شکست وریخت کا عمل موجود ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک گہرائی نمودار ہوتی ہے۔ اور اُس گہرائی تک رسائی حاصل کر کے ہی اُس انقطاع کے اسباب کو جانا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ انقطاع کا تصور نو تاریخیت کے مباحث میں اہمیت کا حامل نظریہ ہے۔ باختن، ماشیرے، ایلتھو اور فوکو تمام ماہرین تسلسل یا تکرار کے عمل کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان ماہرین میں سے فوکو نے خاص طور پر انقطاع کے تصور کو ابھارا ہے۔ جبکہ قدیم تاریخیت انقطاع کو رد کرتے ہوئے تسلسل کو اہم قرار دینے پر مصر ہے۔ قدیم تاریخیت کے ماہرین واقعات کو تسلسل کے تابع کرنے کی بات کرتے

ہیں جبکہ نئی تاریخیت شکستگی کے عمل کی حمایت کرتی ہے اور مسلسل تاریخ کے تصور کو رد کرتی ہے۔ ان ماہرین کے مطابق تاریخ کے بہاؤ کے دوران ایک ''جہت'' نمودار ہوتی ہے جو اہم ہوتی ہے اور تاریخ کے تسلسل کو متاثر کرتی ہے۔ ''فرینک لنسرِ شیا'' نے اس موضوع پر گفتگو میں لکھا ہے:۔

> ''روایتی تاریخ ایک واقعے کو تسلسل کی حالت میں پیش کرتی ہے جبکہ فوکو کی تاریخ عمل انقطاع، جہت اور نمود کے لمحے کو برقرار رکھنے پر زور دیتی ہے۔ ''فوکو'' نے نو تاریخیت ایسے عمل کو قرار دیا ہے جس میں ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ کی جانب جہت لگا کر اُس گہرائی کو عبور کرنا ہے جو دو نقاط کے درمیان موجود ہے۔'' (۵۷)

''فرانسی کرک'' کے مطابق دیکھنے کے عمل کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

> ''دیکھنے کے عمل میں ایک نہ نظر آنے والی جگہ بھی ہوتی ہے اس جگہ کو Blindspot کا نام دیا جاتا ہے۔ انسانی دماغ کی ہ خوبی ہے کہ وہ سابقہ تجربات کی مدد سے ایسی نظر نہ آنے والی جگہ کو اس خوبی کے ساتھ پُر کر دیتا ہے کہ بصارت کے عمل میں کوئی ناہمواری محسوس نہیں ہوتی۔''

تخلیق کائنات کے حوالے سے Big Bang کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اُس میں بھی انقطاع اور جست کا منظر واضح ہے۔ کائنات کی تخلیق کے عمل میں پہلی جہت زیرو ٹائم سے پلانک ٹائم کی طرف لگی تھی۔ اور اس جہت نے دونوں اوقات کے درمیان موجود گہرائی کو عبور کیا تھا۔ ''پلانک'' نے ریاضیاتی طور پر پلانک ٹائم اور پلانک سپیس کی نشاندہی کی ہے۔ زیرو ٹائم اور پلانک ٹائم کے درمیان زماں و مکاں انتہائی مختصر عرصے پر محیط تھے۔ اتنے قلیل وقت کو ''نہ ہونے'' کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ''نہ ہونے'' کا یہ وقت کائنات کی تشکیل کا لمحہ ٹھہرا اور اس لمحے

نے طبیعات کے ماہرین کو حیران کر رکھا ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے جہاں ریاضی کے تمام کلیہ جات معدوم اور ساکت ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان تمام کا نہ ہونا، ہونے سے لبریز تھا۔ اس صورت حال کی تفہیم کے لیے جمالیات طبیعات اور مذاہب بھی باہم آمیز ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے آج فزکس میں مذہبی اور جمالیاتی تجربات کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔

قدیم یونانی دور میں سچ Truth کے مقابلے حسن Beauty کو ثانوی درجہ دیا جاتا تھا۔ جبکہ رومانیت کے دور میں دونوں کو برابر اہمیت دی جانے لگی جبکہ بیسویں صدی کے آخر تک جمالیات، سچ کے برابر متصور کی جانے لگی ہے۔ اس ضمن میں پال ڈائرک کا یہ کہنا قابلِ ذکر ہے۔

> "It is more important to have beauty in ones equation than to have them fit the experiment"

کائنات کے بنیادی اجزاء حروف تہجی کی طرح ہیں۔ جس طرح حروف کے ملنے سے الفاظ بنتے ہیں اس طرح مختلف اجزا مل کر کائنات کی تشکیل کرتے ہیں۔ الفاظ مخصوص لسانی قواعد کے زیر اثر جملوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ جن سے کتابیں اور لائبریریاں وجود میں آتی ہیں۔ یہ کائنات بھی ایک لائبریری کی مانند ہے اور ایٹم کی حیثیت یہاں الفاظ کی سی ہے۔ ماہر لسانیات سوسیور اس صورتحال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ لانگ غیب میں کہیں موجود ہوتا ہے اُس کی موجودگی کا ثبوت اُس کی کارگردگی میں ملتا ہے۔ جس طرح ہر کام اس کائنات میں ایک نظام کے زیر اثر ہو رہا ہے۔ اُس طرح الفاظ کی شکست و ریخت اور جملوں کے بننے کا عمل بھی قواعد کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اگر کوئی جملہ قواعد کے خلاف ہو تو نظام اُس وقت اُس جملے کو رد کر دیتا ہے۔ اسی کائنات میں جملوں کی ہمہ وقت بنتی اور بگڑتی صورتحال کا ٹھکانہ نہیں مگر اس کے عماق میں تخلیقیت لانگ کے طور پر ہمیشہ موجود رہتی ہے وہ نہ صرف

پوشیدہ ہوتی ہے بلکہ اپنی کارگردگی سے اپنے ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتی ہے۔

زبان اور تخیلات

زبان اور ذہن کے مطالعے کی روایت بہت پرانی ہے یونانی دور اور قدیم ہندوستان میں بھی یہ روایت موجود تھی۔(۵۸) آغاز ہی سے اس بات کو طے یا فرض کر لیا گیا تھا کہ زبان اور ذہن کے درمیان تعلق بنیادی نوعیت کا ہے اور یہ دونوں آپس میں منسلک ہیں۔ زبان کو ذہن کی عکاس بھی قرار دیا گیا۔اس طرح زبان کے مطالعہ کو انسانی ذہن تک رسائی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے انقلاب کے عقب میں بھی یہی سوچ کارفرما تھی۔ ادرا کی انقلاب کو انقلاب کی حیثیت دینے کی بجائے اس تناظر کی تبدیلی سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ انسانی رویے اور اُس کے نتائج کو اب نئے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔اور انسانی ذہنی اعمال کے تعلق کو حیاتیاتی فعلیات سے جوڑا جا رہا ہے۔ ادراک کے یہ انقلابات محض بیسویں صدی تک محدود نہیں بلکہ سترہویں صدی کو پہلے ادرا کی انقلاب سے جوڑا جاتا ہے۔اس ادرا کی انقلاب میں ذہن اور زبان کے ''بہم پیوست'' ہونے کا تصور کارفرما تھا۔ اس تصور کی رو سے اگر زبان کی گتھی سلجھ جائے تو سوچ کا معمہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اُس دور میں میسر علمی مواد گمراہ کن حد تک غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بنیادی متن تک دستیاب نہ تھے اور اگر یہ متون دستیاب ہو بھی جاتے تھے تو ان کو درست نہ سمجھا جاتا اور ان کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔ اس میں بھی دو رائے نہیں ہے کہ آج بھی ایسے رجعت پسند عناصر پائے جاتے ہیں۔

ویکارت کے لسانی مباحث

''ویکارت'' کے دور میں سائنس اور فلسفہ کے فرق کو سمجھا نہیں جاتا تھا۔اور انسان کو محض ایک پیچیدہ مشین

سے تعبیر کیا جاتا تھا۔یعنی اُس دور میں سائنس کو فلسفہ پر فوقیت حاصل تھی۔لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ یہ سوال کہ کیا انسان ایک مشین ہے؟ اور انسان کا تعلق محض مادی دنیا کے ساتھ محدود ہے؟ مگر اس سوال کے جواب میں حاصل ہونے والے نتائج نے انسان کے مادی دنیا کے ساتھ اس کا تعلق روح اور مذہب کے ساتھ بھی جوڑ دیا گیا۔ اس کے عقب میں میکانی فلسفہ کی علمداری موجود تھی۔جس کا بنیادی خیال ''دنیا ایک مشین ہے اور یہ کسی ماہر ہنر مند کی تخلیق ہے''۔ یہ خیال دو اشیا کے تعامل کے لیے اُن کے درمیان براہ راست ربط کو ضروری قرار دینے کے تصور سے اخذ کیا گیا۔

مراقبے نامی کتاب میں ویکارت قاری کو آہستہ آہستہ ایک نئی سوچ سے متعارف کراتے ہیں۔حتیٰ کہ قاری غیر محسوس انداز میں ویکارت کی سوچ کو اپنا لیتا ہے اور اُس دور کی اسطوی خیالات کو بیکار سمجھ کر بھلا دیتا ہے۔اور کتاب پڑھنے کے بعد وہ ویکارت کے ''میکانی نظریات کا قائل ہو جاتا ہے۔''مرسین'' کے نام لکھے گئے خط میں ویکارت نے خود اس بات کا اظہار کیا تھا۔(۵۹)

کارتیسی نظریہ لسانیات

''کارتیسی نظریہ'' کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ میکانی نظریہ کا دائرہ کار انسانوں کے علاوہ نامیاتی اور غیر نامیاتی دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔تاہم انسان کو مشین سے برتر حیثیت کا حامل جانتے ہوئے اس کی نفسیات کو بھی نظریے میں شامل رکھا گیا۔انسان اور مشین، میں فرق کو انسانی افعال کا لامحدود حلقہ اثر کا نام قرار دیا گیا۔مشین اپنے محدود دائرہ کار میں رہتے ہوئے افعال سرانجام دیتی ہے جبکہ اس کے برعکس انسانی افعال کے پیچھے ارادہ کا عمل دخل اس کو مشین سے ممتاز کرتا ہے۔انسان اپنے میلان طبع کے باعث مختلف سرگرمیوں میں دل چسپی لیتا ہے۔جس کے پس منظر میں اُس کی اپنی مرضی یا منشا موجود ہوتی ہے۔

کارتیسی تجزیہ میں ''زبان کی خصوصیات'' کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ ویکارت اور اُس کے مقلدین کے خیال میں ''زبان کا استعمال، ذہن کی موجودگی کی دلیل تھا''۔ اس لیے کہا گیا ذہن کے ہونے کی وجہ سے زبان کا وجود ممکن ہے اور اس ذہن کی بدولت زبان کا استعمال کرنے والا انسان مشین پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس مرکزی نقطے کے گرد ایسے تجربات تشکیل دیئے گئے جن میں زبان کے تخلیقی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا جاتا تھا۔ اس تخلیقی پہلو میں مجبوری کی بجائے اختراع کا عمل دخل موجود رہتا تھا۔ کارتیسی فکر کے ماہرین کا خیال تھا کہ جو ''اجسام'' مخصوص آزمائشوں پر پورا اُترتے ہیں صرف وہی اجسام ''ذہن'' رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ''ویکارت'' کا اہم ترین کارنامہ اُس کے ذہن کے بارے میں دیئے گئے تصورات کو قرار دیا جاتا ہے۔ جس نے باطنی اور مخفی تصورات کے خاتمے اور تشریح عالم کے میکانی فلسفہ کے دور کو جنم دیا۔

موجودہ صورتحال میں ہمارے پاس نہ تو جسم کا تصور باقی ہے اور نہ ہی جسم کی طبعی یا مادی خصوصیات کو اہمیت حاصل ہے اب جسم اور ذہن کے تنازعہ کا کوئی وجود نہیں ہے اس طرح میکانی فلسفہ کی بھی اب کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ مگر کارتیسی علم افعال الاعضاء اپنی جگہ برقرار رہا۔ پہلے اور دوسرے اورا کی انقلاب میں جو بات مشترک رہی وہ ''لسانیات'' کا مطالعہ ہے کارتیسی مکتب فکر نے زبان کے مطالعہ کی بھرپور طریقے سے وکالت کی ہے۔

لسانیات کے حوالے سے کارتیسی ماہرین فکر نے جتنا بھی کام کیا وہ بہت مفید تھا اگر اس کام کو فراموش نہ کر دیا جاتا تو شاہد علم لسانیات کی تاریخ کافی پرانی ہوتی۔ اس دور میں لسانیات کے حوالے سے کیے گئے گام کو ناؤم چوسکی دو اجزا میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک جز کو مخصوص صرف ونحو (گرامر) پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ اور دوسرے اجزاء کو استدلالی صرف ونحو کا نام دیتے ہیں۔ استدلالی صرف ونحو میں زبان کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ شامل تھا جبکہ مخصوص صرف ونحو میں مختلف زبانوں کے انفرادی مطالعے کو شامل کیا گیا۔

سترہویں صدی کے وسط میں روزمرہ بول چال کے تجزیاتی مطالعہ کا آغاز ہو چکا تھا فرانسیسی زبان کے

بارے میں دل چسپ انکشافات سامنے آرہے تھے مثلاً (The rule of vaugelas) کئی سال تک موضوع بحث رہا۔۱۶۶۰ء کی دہائی تک رپورٹ رائل کے محققین اس قانون کی تشریح کرتے رہے اور تشریح اس نوعیت کی تھی جو آج کل کے ماہرین لسانیات جدید اصولوں کی مدد سے کرتے ہیں۔

یہ کلاسیکی لسانیاتی روایت کرداریت اور ساختیات کے سیلاب کی نذر ہوگی۔اس کے بارے میں ڈینس ماہر لسانیات ''جسپر ین'' نے کہا''لسانیات کا بنیادی مقصد جملے کی ساخت کا کھوج لگانا ہے۔ جسے متکلم زبان کے استعمال کے دوران داخلی بنالیتا ہے۔اور اس طرح وہ آزادانہ طور پر ایسے جملے تخلیق کرتا چلا جاتا ہے جو ہر طرح سے نئے ہوتے ہیں۔''جسپر ین کو کارتیسی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے آخری ماہر کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ناؤم چوسکی اور لسانیات کے مباحث

ناؤم چوسکی کے مطابق کسی زبان کے متکلم کے لیے ''ساخت کا تصور'' ذہن میں موجود ہونا ضروری ہے اس کو کسی بھی طرح سکھایا نہیں جاسکتا۔ بیرونی ہدایات کے ذریعے سے مخاطب کے ذہن میں ساخت کے تصور کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ والدین بھی زبان سکھاتے وقت بچے کو اُس کے ساختی تصور سے آشنا نہیں کر پاتے حتیٰ کہ ماہرین لسانیات بھی س موضوع پر بہت محدود علم رکھتے ہیں۔ساخت کا تصور ذہن میں خود بخود تخلیق پاتا ہے۔اور اسی تصور کی مدد سے ہم نئے آزادانہ جملوں کو استعمال کرتے ہیں اور زبان کا لامحدود استعمال سیکھ لیتے ہیں۔

زبان کے اس استعمال سے ہمارے سامنے ایک سوال جنم لیتا ہے کہ انسانی ذہن میں زبان کی اساس کیا ہے۔؟ یہ سوال ہمیں آفاقی صرف ونحو کی جانب لے جاتا ہے۔آفاقی صرف کے نظریات کو نحو (Syntex) کے لیے تو بنائے جاسکتے ہیں لیکن ''صرف'' کے لیے ایسے نظریات کو تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔کیونکہ ''نحو'' تو یکساں ہوسکتی ہے مگر ہر زبان کی صرفیات بے ربط اور دوسری زبانوں سے مختلف ہوئی یہ خیالات ''جسپر ین'' کے زمانے میں رائج

کرداری اور ساختی مفروضات سے مختلف ہیں اس دور میں ان خیالات کو سرے سے رد کر دیا گیا حالانکہ جسپر ین کے دور کے بعد ان خیالات کو درست پایا گیا تھا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں وقوع پذیر ہونے والے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بقول ناؤم چوسکی اُن روایتی تصورات کا جنہیں عرصہ دراز سے بھلا دیا گیا تھا کا نئے فہم کے تصورات کو ملاپ کرایا گیا۔(۶۰) جس سے پرانے مسائل اور سوالات کی طرف سنجیدہ پیش قدمی کی گئی۔ لسانیات کے حوالے سے اٹھارویں صدی کے آغاز میں ''ولیم فام ہمبولٹ'' نے نظریہ پیش کیا تھا کہ زبان دراصل محدود ذرائع کے لامحدود استعمال پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ نظریہ عقلی توجیہہ سے عاری ہے۔ کیونکہ دماغ کی محدود سرحدیں اس کے ذرائع کو بھی محدود کر دیتی ہیں لیکن ان ذرائع کا استعمال بے حد وحساب ہوسکتا ہے۔ ''ہیمولٹ'' کے زمانے میں اس کی وضاحت نہ کی جا سکی۔

لسانیات کے نئے فہم کے مطابق زبان کی یہ خوبی ریاضیاتی طریق عمل سے جڑی ہوئی تھی۔ ریاضیاتی طریق عمل کو تخلیقی طریقہ عمل بھی کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے درمیان تک محدود ذرائع کا لامحدود استعمال کے نظریہ کو بخوبی سمجھ لیا گیا تھا۔ یہی اصول حسابیات اور آنے والی جدید دور کی ایجادات میں بھی بہت زیادہ مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ علم ہندسہ اور کلاسیکی منطق میں بھی یہی اصول کارفرما ہیں۔ ان مضمر اصولوں سے آشنائی بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ ان مضمراتی اصولوں کو لسانیاتی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا۔ اگر چہ ان پیچیدگیوں کو پہلے بھی حل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی مگر ان کوششوں کے نتائج خاطر خواہ نہ تھے اور ہمیشہ مبہم ہی رہے۔ ناؤم چومسکی اس نئی سوجھ بوجھ کو پرانے فہم کا نیا اظہار قرار دیتے ہیں۔(۶۱)

اس نئی آشنائی سے ہم آزاد جملوں کے لامحدود تسلسل کو تشکیل دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور ذہن میں ساخت کا تصور دراصل ایک تخلیقی طریق عمل کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ تخلیقی عمل محدود ذرائع کے لامحدود استعمال کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اور ان ذرائع کا استعمال مخصوص صرف ونحو کے زیر اثر نہیں بلکہ

آفاقی صرف ونحو کے استدلال کے تحت ممکن ہوتا ہے۔ اگر چہ جدید مباحث نے پرانے مسائل کے حل کے لیے راہ توہموار کر دی۔ مگر یہ مسائل کا مکمل حل فراہم نہیں کر سکے مسائل کے ایک جزوی حصے کا حل ہی پیش کر سکے مثلاً اگر ہم محدود ذرائع کے لامحدود استعمال کو ہی بغور دیکھ لیں تو لامحدود استعمال کی گنجائش تو ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مگر روایتی مسائل جو زبان کی تخلیق کی متعلق اٹھائے جاتے رہے خاص طور پر کارتیسی فلسفہ کے نقطہ نظر سے اُن کے جواب سامنے نہ آ سکے۔

پہلا ادراکی انقلاب

نوام چوسکی زبان کے استعمال کو دو واضح حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصے کو وہ ذہنی ادراک پر مشتمل حصہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کو ذہن میں معلومات اور اطلاعات کے لامحدود سلسلے تک محدود کرتے ہیں جبکہ دوسرے حصے کو ان معلومات کے لامحدود ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے زندگی کے افعال کی انجام دہی پر مشتمل قرار دیتے ہیں۔ (۶۲) یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ دونوں نظام، ''علم اور عمل'' کے درمیان فرق کی اساس ہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں نظاموں کو اہلیت اور کارگردگی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پہلے نظام یعنی علم یا اہلیت کے لامحدود استعمال کے بارے میں ماہرین نے خاص پیش رفت کی ہے لیکن دوسرے نظام عمل اور کارگردگی کے بارے میں معلومات کے حوالے سے پراسراریت کی کیفیت برقرار ہے۔

زبان کے مطالعہ کی حد تک ہی یہ مسئلہ وجود نہیں ہے بلکہ عمومی سطح پر بھی ہم ایسے مسائل کو دیکھتے ہیں۔ جدید تخلیقی صرف ونحو نئے جملوں کی تشکیل اور اُن کے پس منظر میں موجود معانی کے انکشافات میں مصروف ہے۔ لیکن یہ صرف ونحو یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اُس کو کہنے کا فیصلہ کیسے کرتے ہیں۔ اس حوالے سے افلاطون کا یہ کہنا کہ لوگ جو کچھ جانتے ہیں وہ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نہیں ہوتا بلکہ ہمارے اذہان میں ازلی نقش کی

طرح سے شروع ہی سے موجود ہوتا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں پھر اس نظریہ کا احیاء ہوا ہے۔

''ہیوم'' نے علم فطرت انسانی نامی مقالے میں تسلیم کیا ہے کہ ہم علم کے اُس حصے کو دریافت کر سکے ہیں جو فطرت کی فیاضی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح ''ہیوم'' جو تجربی فلسفہ کا ایک بڑا ماہر ہے۔ نے ''جبلی علم'' کا وجود تسلیم کیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک علم کے حصول کا ذریعہ تجربات یا حادثات نہیں بلکہ یہ ہر شخص کے ذہن میں شروع سے موجود ہوتا ہے۔ افلاطون اس نظریہ کو "Reminiscence Theory" کا نام دیتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق علم گزری ہوئی زندگی کی یاد پر مشتمل ہوتا ہے۔

دوسرا ادراکی انقلاب

دوسرے انقلابی ادراک میں ناؤم چوسکی کے مطابق تناظر کی واضح تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ اس دور کے غالب طرز فکر، کرداریت اور ساختیات تھے۔ زبان کا مطالعہ محض متن یا اس کے اجزا کے مطالعہ تک محدود نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی متن کے مختلف اجزائے ترکیبی کو لسانیات کا مطالعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح زبان کا مطالعہ کرداریت کے زیر اثر طبعی عمل یا اس طرح کے دیگر مظاہر کو بھی قرار دینا درست نہیں ہے ناؤم چوسکی اس خیال کے حامی ہیں کہ:۔

> ''کرداریت اور ساختیات کے بہت سے مفروضات بدقسمتی سے لسانیات کا حصہ بنا دیئے گئے ہیں۔ انسانی ذہن کے بارے میں بے شمار حقائق جمع کیے جا چکے ہیں۔ کردار اور متن ان بے شمار حقائق میں سے ایک چھوٹے سے حصہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔''

کردار اور کلام جیسے موضوعات میں حقیقی دل چسپی کا فقدان واقع ہو چکا ہے شعوری فیصلے جن کو لسانی

وجدان کا نام بھی دیا جاتا ہے محض اعداد وشمار کا گورکھ دھندا ہیں۔ان کو ذخیرہ معلومات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ناؤم چوسکی مطالعہ ذہن کے تجریدی اندازِ نظر کو قطعی طور پر بے معانی اور غیر معقول قرار دیتے ہیں۔اس اندازِ نظر سے متعلق بے چینی کو دور کرنے کے لیے کمپیوٹر کا اور سائنس کے استعاروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔تجریدی احکامات کو سافٹ وئیر کا نام دیا جاتا ہے۔مگر دماغ ایک قدرتی چیز ہے۔ ہارڈ وئیر اور سافٹ وئیر کی تراکیب کے استعمال کو ناؤم چوسکی دشوار قرار دیتے ہیں۔جبکہ اس کے برعکس ذہن کے براہ راست مطالعہ کو آسان قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ کمپیوٹر کا استعمال فقط تمثیلی انداز میں سمجھانے تک محدود رکھا جائے۔ دوسرے ادرا کی انقلاب سے کئی علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ بالخصوص بصارت اور لسانیات کے حوالے سے نئی تخلیقات سامنے آئیں۔

ذہن اور لسان

تجربات اور تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ دماغ کا ایک حصہ ایسا ہے جو صرف زبان اور اُس سے متعلقہ افعال کے لیے مخصوص ہے۔ناؤم چوسکی اس حصہ کو''قدرت زبان''(Language Faculty) کا نام دیتے ہیں۔اس نظام کی ابتدائی حالت کا مطالعہ آفاقی صرف ونحو کی جدید شکل ہے۔زبان کی صلاحیت انسان کو یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔قدرت زبان کی نمو کے بارے میں بعض ماہرین کا استفسار ہے کہ یہ چھ سے آٹھ سال کی عمر میں ایک ہموار سطح پر آجاتی ہے۔ جب یہ توازن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس میں تبدیلیاں کم ہو ہوتی ہیں۔ اس کے بعد نئے اور لامحدود لسانی اظہار وجود میں آتے ہیں۔ ہر لسانی اظہار کے لیے مخصوص آواز، معانی اور ساخت کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر انسانوں کی ذہنی حالت اور لسانی کیفیات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کی بات کو باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔(۶۳)

زبان سے متعلق دماغ میں موجود اجزا میں سے ایک ''صرف ونحو'' کے تجزیے اور تشریح کا کام کرتا ہے۔

اس حصے کو جب کوئی اشارہ موصول ہوتا ہے تو یہ اس اشارے کو علامتی اظہار کے لیے ایک شبیہ میں تبدیل کر دیتا ہے جس سے ابلاغ مکمل ہو پاتا ہے۔لسانیات میں اس طرح کے بہت سے مفروضات کارفرما ہیں۔ پہلا مفروضہ تو یہ ہے کہ ذہن میں کلام کی تشریح کے لیے اجزاء موجود ہیں۔ جو اشارات کے سمجھنے اور اُن کے ترجمہ کا غرض سرانجام دیتے ہیں۔ ناؤم چوسکی اس قسم کے تصورات کو غلط سمجھتے ہیں اور تخلیقی عمل کے وجود کو سائنسی طرز فکر سے دیکھنے پر زور دیتے ہیں۔

زبان کے ادراک کے بارے میں دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ دماغ میں موجود لسانیات سے مخصوص حصہ کی بڑھوتری نہیں ہوتی۔ یہ مفروضہ غلط ہے کیونکہ حصول زبان کے دوران جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ وہ صرف ادراکی کیفیت کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ اور وہ صرف دماغ کی وقوفی حالت Cognative Style پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

تیسرا مفروضہ دماغ میں موجود لسانیات کا حصہ جسے مترجم بھی کہا جاتا ہے اُس کے حوالے سے یہ ہے کہ مترجم بڑی جانفشانی سے کام کرتا ہے۔ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اشارات کے لیے علامتی تشبیہات کا قیام ایک آسان کام ہے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں اشارات کی تشبیہات کے ضمن میں دماغ ناکام ہو جاتا ہے۔ اور زبان اُن کا تعین نہیں کر پاتی۔ جس کے نتیجے میں بامعانی کلام میں بھی مبہم ہو جاتا ہے۔ اور بات سمجھ نہیں آتی۔ یہ الجھن روزمرہ بول چال میں بہت عام ہے۔ اس کی وجہ لسانی اظہار کی وہ اقسام ہیں جن کا ترجمہ ذہن کے لیے نہایت مشکل کام ہو جاتا ہے۔ ترجمہ کی یہ ناکامیاں حالیہ برسوں میں تحقیق کا وسیع موضوع بنتی جا رہی ہیں۔

نوام چوسکی کے مطابق زبان کے بہت سے ایسے حصے ہیں جو ناقابل استعمال ہیں ان سے متعلقہ جملے خواہ کتنے ہی سادہ کیوں نہ ہوں اُن کے معانی تک درست رسائی ذہن کے لیے نہایت دشوار ہوتی ہے۔ جسم کے تمام

نظام اور افعال جسم سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ ڈارون سے منسوب ہے مگر نوام چومسکی اسے مفروضہ تصور کرتے ہیں جس کا مفہوم واضح نہیں اور وہ ڈارون سے اس مفروضہ کو منسوب کیے جانے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کا نہ تو حیاتیاتی اصولوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ارتقاء کا نظریہ اس بات کا دعوی کرتا ہے۔ کہ وہ نظام جو نمو پا چکے ہیں وہ زندگی کے ماحول سے مطابقت پا چکے ہیں۔

زبان کی آموزش سے متعلق نظریات بھی اس طرح کے مفروضوں پر قائم ہیں اکثر لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زبان سیکھی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں ایک تحقیق سامنے آئی ہے۔ جس میں زبان کی آموزش ممکن قرار دی گئی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ تخلیق درست ہو نوام چومسکی کے خیال میں ہمارے ذہن میں ہر طرح کی زبانیں سما سکتی ہیں مگر ضروری نہیں کہ ہمارا ذہن انہیں استعمال بھی کر سکے۔ زبان کا وجود میں آنا تا حال معمہ بنا ہوا ہے۔ زبان کے آغاز کے حوالے سے نظریہ پیش کرنا کوئی عام بات نہیں ہے۔ زبان کی پیدائش سے لاعلمی ہی ذہن کی گتھی کے نہ سلجھنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔

لسانیات اور ذہنی اتصال

نوام چومسکی کے مطابق پہلے ادراکی انقلاب اور آج تک کے دور میں جو اہم ترین مسئلہ ماہرین کے سامنے موجود رہا ہے۔ وہ ذہنی اور لسانی اتصال کا مسئلہ ہے سب سے پہلے جو سوال حل طلب ہے وہ یہ ہے کہ دماغی خلیے اور انکی پیچیدہ نامیاتی نظام میں تبدیلیاں کس طرح ہوتی ہیں۔ یعنی ''سوچ'' دماغی خلیوں میں کس طرح تبدیلی لاتی ہے۔؟ جب کہ دوسرا سوال ادراکی علوم کے حوالے سے ہے کہ کیا ذہن کا کوئی حصہ ایسا ہے جو مسائل کے حل کے نظام پر مشتمل ہو۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے ہمیں ذہن کے نظام کی طبعی اساس دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس

کے لیے دماغ کی تمام سطحوں کا مطالعہ ضروری ہے۔اور حاصل ہونے والے مواد کو مربوط انداز میں یکجا کر کے ایک مکمل تصویر کا حصول ممکن ہے۔

نوام چومسکی ان اتصالی مسائل کے حل کے ضمن میں نیا انداز نظر اپناتے ہیں۔اگر چہ یہ انداز نظر حیاتیاتی پس منظر کو الگ کر کے ادراکی مظاہر کو سمجھنے پر زور دیتا ہے۔کسی شے کے بارے میں یہ جاننے کے لیے کہ اُس میں ذہانت موجود ہے یا نہیں اُس کے بارے میں مختلف آزمائشیں ترتیب دی جاسکتی ہیں۔مثلاً شطرنج کا کھیل یا چینی زبان کی سمجھ بوجھ وغیرہ۔

ادراکی انقلاب کے بعد شدید رجعت کا رجحان سامنے آیا۔ٹیورنگ آزمائش ہم کو کارتیسی انداز فکر کی یاد دلاتی ہیں۔لیکن بغور موازنہ اس بات کو گمراہ کن قرار دیتا ہے کیونکہ کارتیسی تجربات کسی شے کی موجودگی یا غیر موجودگی کے بارے میں ہمیں بتاتی ہیں جبکہ ٹیورنگ کی مصنوعی ذہانت کی جاری آزمائش کا دائرہ کار خاصا وسیع ہے۔مسئلہ اتصال کا دوسرا پہلو اس حوالے سے نوام چومسکی کسی ''حل'' کی توقع نہیں رکھتے۔سکسنر سے پیاجے تک تمام ماہرین نفسیات نے فلسفہ ذہن کے نقطہ کو بار بار دہرایا ہے۔کہ تمام انسانوں کے پاس آموزش کے حل کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ذہن کی میکانیت ہر جگہ ایک سی ہوتی ہے۔مگران کا اطلاق بھی ہر طرح کے حالات میں یکساں طریقے سے کیا جاتا ہے۔مگر ہم جیسے جیسے انسانی ذہانت کے بارے میں اپنے علم کو وسیع کرتے چلے جار ہے ہیں ہمیں یہ سکسنر سے پیاجے تک کے اصول کمزور ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔دماغ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی دیگر نظاموں کی طرح ایک نظام ہے جو کئی ذیلی نظاموں پر مشتمل ہے۔ان ذیلی نظاموں میں مخصوص ارتباط موجود ہے اور یہ ذیلی نظام خاص حدود میں رہتے ہوئے آزادانہ طور پر اپنے افعال کو سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ان ذیلی نظاموں میں موجود خیالاتی ربط اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔

ناؤم چوسکی اور دورِ حاضر کی لسانیات

نوام چوسکی آج کل زبان کے متعلق اٹھائے جانے والے سوالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ بہت سی ایسی اشیا جن کو ہم بات چیت میں استعمال کرر ہے ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ اُن کا حقیقی دنیا میں بھی کوئی وجود ہو۔ ہماری زبان کے الفاظ نہایت گنجلک تناظرات بھی پیش کر سکتے ہیں۔ فطری زبان کی معانیات کا بنیادی مقصد اپنی پیچیدہ لغوی تناظرات کی تہہ میں کارفرما اصولوں کو دریافت کرنا ااور اُن کا مطالعہ کرنا ہے۔ گفتگو کے دوران اشیاء کی طرف اشارہ کرنے والے الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ الفاظ کا استعمال اور اُس کے اصول پیچیدہ ہوتے ہیں۔ الفاظ کے چناؤ میں رجحانات اور حالات کا عمل دخل موجود رہتا ہے۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ لفظ بذات خود کسی شے کا اشارہ نہیں ہوتے۔ ''گاتلب فریگے'' نے لفظ اور چیز نامی جس تعلق کی نشاندہی کی تھی لسانیات کی معانوی دنیا میں اُس کا وجود نظر نہیں آتا۔ اس طرح چارلز ہیئرس نے لفظ، چیز اور فرد کے نام سے ایک مفروضہ پیش کیا تھا اب اُس کا بھی وجود نہیں رہا۔ کیونکہ اس طرح کے تصورات محض اُس نظام کی وضاحت کے لیے تو درست ہو سکتے ہیں۔ جو علامتی سطح کا ہو مگر فطری لسانیات کے نئے نظریات کی فہم کے لیے اس قسم کے تصورات کو غیر مناسب اور ناکافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان تصورات کو استعمال کر کے زبان کی ساخت اور پیدائش کے بارے میں کوئی بامعنی انکشاف نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ کے مخفی نوعیت کے تعلقات لسانیات کی نئی تفہیم پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لغوی معنیات کا مطالعہ محض الفاظ کے استعمال کا نام ہے بلکہ اجزائے زبان کا استعمال ہمیں اُس نظام سے روشناس کراتا ہے جسے ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہم عام اور سادہ الفاظ کے بارے میں جو علم رکھتے ہیں وہ ہم سیکھتے نہیں ہیں۔ اور ہم ان عام اور بظاہر سادہ الفاظ سے مکمل طور پر آشنا نہیں ہوتے کیونکہ یہ مواد ہمارے شعور کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ ہم ان لفظوں کے بارے میں محض ظاہری صورتحال کے

حوالے سے جان سکتے ہیں جس طرح ہم اپنے جسم میں دوڑنے والے خون کے بارے میں سرسری سی معلومات رکھتے ہیں اس طرح ہم ان الفاظ کے بارے میں بھی معلومات سرسری نوعیت کی رکھتے ہیں۔(۶۴)

اب تو یہ حال ہے کہ لفظ کی آواز اور معانی کے بنیادی عناصر کو لغات میں شامل نہیں کیا جاتا۔اس طرح کی عدم شمولیت کو خامی نہیں بلکہ خوبی سے تعبیر کرنا چاہیے۔اگر کوئی لغت الفاظ کے حقیقی معانی پیش کرنا شروع کر دے تو یہ کام مزید الجھاؤ کو جنم دینے کا باعث ہوگا اور مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔

اس لیے کسی بھی زبان کو سیکھنے والے شخص کے لیے جو اُس زبان کو بطور ثانوی زبان سیکھ رہا ہو اُس کے لیے آفاقی گرامر کے حقیقی اصولوں کو پرکھنا بے کار ہوگا۔کیونکہ آفاقی قواعد کے کلیے اُس کے لیے ذہنی تکلیف اور مشکل کا باعث ہوں گے۔اُس کی ضرورت الفاظ کی بنیادی معانوی خصوصیات تک رسائی ہے مختلف زبانیں بغیر کسی تغیر و تبدل کے اشتراک پذیر ہوسکتی ہیں۔دراصل انسانی فطرت میں کچھ ایسی خاصیتیں موجود ہوتی ہیں جن کے ذریعہ دنیا کو خاص طریقے سے دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔یہ طریقے سادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی نوعیت نہایت پُر پیچ اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔پیچیدہ جملوں کے معاملے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مخاطب اور سامع جو کچھ جانتے ہیں۔اُس علم کے اظہار کے درمیان اُن کو رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس رکاوٹ کے سبب زبان کی جبلی صلاحیتیں بھرپور انداز میں استعمال ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر

۱۔ احمد انگور کھا رہا ہے۔

۲۔ احمد کھا رہا ہے۔

دوسرے فقرے میں مفعول موجود نہیں ہے لیکن پہلے فقرے میں کھانے والی شے کا ذکر بھی موجود ہے جس کی بدولت ہم یہ جان لیتے ہیں کہ دوسرے فقرے میں مفعول کی عدم موجودگی کے باوجود احمد کچھ نہ کچھ کھا رہا ہے۔سے اُس کی کیفیت کا اظہار با آسانی ممکن ہے۔اب اس بات کی وضاحت ضروری نہیں کہ احمد کیا کھا رہا ہے کیونکہ

یہ تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کچھ کھا رہا ہے جو کھایا جا سکتا ہے۔ اُس کھانے میں فروٹ روٹی اور دیگر اشیاء خود ہی آسکتی ہیں۔ اس طرح درمیان موجود ذہنی رخنہ خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ اس لیے ذہن جب کسی غائب شے کا رخنہ دور کرتا ہے۔ تو وہ اُس شے کے ''عمومی'' تصور کو فراہم کر کے اپنے کام کو پورا کرتا ہے۔ جملے کی نحوی ترتیب اور تشکیل میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ جملوں کی ساخت کے مضمراتی لسانی پہلوؤں کا جانے بغیر ہم اُن کو آسانی سے استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ شعور کی رسائی ماورا ہے اگر ہم شعوری سطح پر کوشش کریں بھی تو یہ اصول سیکھ نہیں پاتے۔ ناؤم چوسکی کا خیال ہے کہ اساسی اور آفاقی صرف، نحو کا ادراک بے حد مشکل ہے۔ جو لوگ زبان کی تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں یا سکھا رہے ہوتے ہیں ان کو بھی اساسی اور آفاقی صرف و نحو کا ادراک نہیں ہوتا۔ کیونکہ آفاقی نحو پر مشتمل زبان کی قدرتی صلاحیت کے طور پر انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔ جس طرح لغات، الفاظ کے حقیقی معانی فراہم نہیں کر سکتیں اُس طرح روایتی گرامر بھی الفاظ کے پیچیدہ مظاہر اور لسانیاتی گنجلک کے اساسی اصولوں کی طرف وضاحت سے قاصر ہے۔

انسانی علم اور لسانیاتی مباحث

درحقیقت ہم زبان کے اظہار کے حوالے سے جو کچھ علم رکھتے ہیں وہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ دوسرے ادراکی انقلاب میں زبان کے گہرے مطالعہ کی بدولت بہت سے ایسے حقائق تک رسائی حاصل ہوئی ہے جس سے زبان کی قدرتی صلاحیت کے جبلی پہلو روشناس ہوئے ہیں۔ زبان کی گہرائی میں موجود مضمرات کی کھوج کا کام عام نوعیت کا تو نہیں ہے اس کے لیے آزمائشی تشریحات نے نئی دریافت کا آغاز کیا ہے جس کی بدولت زبان سے متعلق معلومات کے حصول کے حوالے سے ماہرین کی سوچ کا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔

زبان کی رکاوٹ اور تشکیل وارتقاء کے حوالے سے جاری دو ہزار سال زائد پرانی تحقیق کی روایات موجود

ہیں۔لیکن اس تمام تاریخ میں جو بات نہیں ملتی وہ ذہن کا مطالعہ ہے۔(٦٥) جو اپنی نوعیت کا انوکھا مطالعہ ہے جو علم
لسانیات کی موجود ترقی میں اہمیت کا حامل ہے۔ناؤم چوسکی کہتے ہیں کہ:۔

"تحصیل زبان کے حالات کے پیش نظر ہم اس بنیادی نقطہ تک پہنچتے ہیں کہ زبان صرف ایک ہے۔"

اس مفروضے کی دو وجوہات پیش کرتے ہیں۔اول یہ کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ پہلے سے موجود تھا۔تاہم لوگ جو کچھ جانتے ہیں اُس کے اظہار سے قاصر ہوتے ہیں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کسی ایک زبان کے لیے وجود میں نہیں آیا۔اگر ہندوستان میں رہنے والے شخص کی اولاد کو جاپان میں پرورش کا موقع میسر آ جائے تو وہ پیدائشی طور پر جاپانیوں جیسی زبان بولنے پر قدرت رکھتے ہوں گے۔انسان کے لیے زبان کا حصول ایک طے شدہ امر ہے۔ یہ کہنا اب درست ہو گا کہ ہئیت کے حوالے سے تمام زبانیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔مختلف زبان کے درمیان ظاہری طور پر موجود فرق دراصل ہماری محدود سمجھ بوجھ کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے۔الفاظ آوازوں کے اختلافات سے قطعی طور پر یہ بات کہنا درست نہیں کہ یہ زبانیں تخلیقی طور پر الگ وجود رکھتی ہیں۔دنیا میں استعمال ہونے والی تمام زبانوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔جو یکساں مستقل ہے اوراس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔اب جا کر ماہرین اس حقیقت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔اوراس دریافت کے بعد کسی بھی زبان کے غیر معین جملوں اورالفاظ کے درست معانی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

ہموار، وضع کا حامل یہ طریق عمل زبان کے اظہار کے لیے مشترک ہے۔لیکن اس کو مستحکم قرار نہیں دیا جا سکتا۔کیونکہ خارجی سطح پر پائے جانے والے تغیرات مختلف زبانوں میں موجود فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔چند ایسے مفروضات موجود ہیں جو زبانوں میں موجود اختلافات کی وضاحت میں سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔زبانوں کے

درمیان موجود تفریقی اختلافات لسانیات کی محدود سطح پر انتہائی محدود حصوں میں واقع ہوتے ہیں۔ان اختلافات میں سے ایک کا تعلق ''تصریفی نظام'' سے ہے۔جسپر ین، نے مارفولوجی اور آفاقی نحو کے امکانات پر بات کرتے ہو اس جانب اشارہ کیا تھا۔کہ اگر ایک شخص کی مادی زبان اگر انگریزی ہے اور وہ جرمن زبان سیکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اُس ضمیری حالتوں کے نظام (The case system) کو نئے سرے سے سیکھنا ہوگا۔کیونکہ انگریزی میں ہر نظام موجود نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق محض سطحی نوعیت کا ہے۔پچھلے چند سالوں کی تحقیق نے اس امکان کی تصدیق کر دی ہے۔کہ تمام زبانوں میں ضمیری حالتوں کا نظام بھی مشترک ہے۔ہوسکتا ہے کہ آفاقی گرامر کی طرح آفاقی لسانیات کا نظام بھی موجود ہو۔فرض کرتے ہیں کہ مختلف زبانوں میں موجود تغیرات کی شناخت کر لی جاتی ہے۔اور ان متغیرات کی قدریں تجربات کی مدد سے معلوم کر لی جاتی ہیں۔تو ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ ان متغیرات کی قدروں کو ادل بدل کر کے زبانوں کو با آسانی تشریح کے لیے کھول سکتے ہیں۔اس طرح تحصیل زبان کا عمل محض ان تغیرات کے مناسب حل تک محدود ہو جائے گا۔اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ ہم تمام زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔کسی بھی معاشرتی زبان کو سیکھنے کے لیے یا اُس سے شناسائی کے حصول کے لیے صرف یہ سیکھنا پڑتا ہے کہ متغیرات کی قدریں معلوم کر لی جائیں۔جب اسی عمل سے ہمیں مضمرات کا جواب حاصل ہو جاتا ہے تو زبان سے شناسائی دشوار نہیں رہتی۔

زبان کے ناقابل استعمال حصے

زبان کے بعض حصے ایسے ہوتے ہیں جو قابل استعمال ہوتے۔عموماً ہم زبان کو قابل استعمال حصوں تک محدود رکھتے ہیں۔اسی وجہ سے روزمرہ کی زندگی میں ناقابل استعمال لسانی حصوں کی بدولت کوئی خاص اثر نہیں

پڑتا۔لیکن جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ نا قابل استعمال ہونے والے لسانی حصے زبان کی ہیئت پر بہت گہرے طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔اس لیے یہ بات درست ہے کہ لسانی اظہار محض تخمینی نظام کا تخلیق کردہ علامتی نمونہ ہی نہیں ہوتا بلکہ عمدہ ترین نمونہ ہوتا ہے۔اگر ہم ''عمدگی'' کا وجود تسلیم کر لیتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ نا قابل استعمال لسانی اظہار کے عقب میں نا قابل عمل کی تخمین کاری کا ہاتھ ہوتا ہے۔تو کیا قابل استعمال لسانی اظہار کے پیچھے بھی کوئی اس قسم کی گنجائش موجود ہوتی ہے؟۔

ناؤم چوسکی اس سوال کے جواب کو دریافت تو کر چکے ہیں مگر وہ اس کو حتمی قرار دینے سے گریزاں ہیں۔ ان کے مطابق زبان نامی صلاحیت، ذہن کی مجموعی تعمیر کا حصہ ہے یہ صلاحیت ذہن کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مربوط انداز میں منسلک اور متعامل ہے۔

ذہنی اور لسانی نظاموں کے اتصال پر ایسے حالات پائے جاتے ہیں۔جن کو عمدہ پن کے قریب ترین قرار دیا جاسکتا ہے۔اس لحاظ سے زبان کو حیرت انگیز طور پر بے عیب قرار دیا جاسکتا ہے۔مطالعہ زبان کے ضمن میں اس طرح کے وجدان معقول حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔اس طرح ناؤم چوسکی اس نتیجہ کو اخذ کرتے ہیں کہ زبان ایک خاص الخاص شے ہے جن کا موازنہ دوسرے نامیاتی نظاموں سے نہیں کر سکتے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ سارا درست نہ ہو اور ہم اشیاء کے درست رخ کو نہ دیکھ پا رہے ہوں لیکن امید افزا بات یہ ہے اس لسانی تحقیق کے نتائج معتبر اور معقول نظر آتے ہیں۔اور اگر یہ نتائج درست ثابت ہوتے ہیں تو اُن سے زبان میں نئے معمے شامل ہو جائیں گے۔

لسانی وجدان نوام چوسکی کی نظر میں

زبان کے سلسلہ میں جو بحث آج کل کی جارہی ہے۔وہ غیر متنازعہ حیثیت کی حامل نہیں ہے۔یہ بھی کہا جا

رہا ہے کہ زبان کی سمجھ بوجھ کے لیے نئے طریقے اور تصورات کی ضرورت ہے۔اس سلسلہ میں ماہرین لسانیات کو حسیاتی ادرا کی قوت فیصلہ تک محدود کر دیتے ہیں اور اس قوت کو''لسانی وجدان'' کا نام دیا جاتا ہے۔ناؤم چومسکی اس دلیل کو ہرگز درست نہیں سمجھتے اور اس کو فکری مغالعہ قرار دیتے ہیں۔اور اس میں موجود عدم سنجیدگی کو غیر معقول کہتے ہیں جو مزید غلط فہمی کا باعث ہے۔(٦٦)

نوام چومسکی کا خیال ہے کہ دنیا کے مظاہر کو سمجھنے کے لیے کچھ قیاس قائم کر لیے جاتے ہیں۔جن سے کچھ سوال جنم لیتے ہیں۔ان سوالات کے جواب تشریحی نظریات کے قیام سے دیئے جاتے ہیں۔پھر ایسے نظریات اور ان کے اندر موجود اصولوں کو آپس میں جوڑنے کی سعی کی جاتی ہے جسے فکری نظام اتصال کا نام دیا جاتا ہے۔اس اتصال کی ایک قسم تحلیلی ہے۔یعنی ایک نظریہ کا مکمل طور پر دوسرے نظریہ میں ضم ہو کر اپنی ذاتی حیثیت کو تحلیل کر دینا ہے۔سائنس اگرچہ اس قسم کے تحلیلی نظریات کی مثالوں سے مبرا ہے۔تاہم تحلیلی اتصال کو ناممکن بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔زبان کے اجزاء دنیا کی اشیاء کے ساتھ کس طرح منسلک ہوتے ہیں۔اس سوال کا جواب میں ایک سادہ، کم متنازعہ مفروضہ ہے کہ:۔

> ''لسانی تراکیب اور اظہار کی معنوی خصوصیات ادرا کی نظاموں کی طرف سے ذہن کو پیش کردہ دنیوی صورتوں کی طرف توجہ مرکوز کر دیتی ہے۔اور ان اصولوں کو دیکھنے کے لیے مختلف تناظر بھی پیش کرتی ہے۔جس کے نتیجہ میں اپنی سوچ کے اظہار کے لیے زبان استعمال کی جاتی ہے۔''

لسانیات کے دنیا کے حوالے سے رابطہ کے متعلق اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد ضروری ہے کہ ان کی معانوی اور تناظراتی خاصیتوں کو سمجھا جائے۔نوام چومسکی سمجھتے ہیں کہ تجریدی کیفیات پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہوتی ہے۔جن میں انسانی دلچسپی اور خدشات موجود ہوتے ہیں۔جن کا بچے کا اکتساب لسانیات کے تجربات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔جو

بچے کو زبان سیکھنے کے عمل میں پیش آتے ہیں۔اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معانوی اور تناظراتی خاصیتیں محدود قسم کی ہوتی ہیں۔اس مفروضہ کو مضبوط کرنے کے لیے مزید مفروضات کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔

اظہاری مفروضہ

یہ مفروضہ زبان کو دنیا کے اظہار کا نام دیتا ہے اور علم المعانی کا کام یہ ہے کہ زبان کی اس کارگردگی کی وضاحت کرے جس کے ذریعہ وہ دنیا کی نمائندگی کرتی ہے۔

بیرونیاتی مفروضہ

ہلیری پیٹم کا نظریہ ہے کہ معانی دماغ میں نہیں ہوتے اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ معانی کا تعین معاشرتی خصوصیات کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔

نوام چوسکی ان دونوں مفروضات کو کٹرین اور وقیانوسی خیالات کی قیاس قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق یہ مفروضات واضح نہیں بلکہ ان کی حالت مشکوک ہے۔جو اشیاء اور زبان کے جس تعلق کی بات کر رہے ہیں چومسکی کے مطابق اُس کا سیاق وسباق کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کے برعکس وہ داخلی معنویات کو چکرا دینے والا اور بھرپور مضمون قرار دیتے ہیں جو ذہنی اور تجریدی صورتوں کا مطالعہ ہے۔اس میں علامتی اظہار کا نظام بھی شامل ہے۔جو زبان کے دوسرے نظاموں کو ہدایات جاری کرتا ہے۔ان ہدایات کے بارے میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ معنویاتی سطح پر کس طرح کام کرتی ہیں۔زبان کی حرکی اور حس پہلو کس طرح صوتی اظہار سے منسلک ہیں اس بات کا ادراک کرنا بھی مشکل کام ہے۔

پچھلی صدی سے اس قسم کے مسائل پر تحقیق کی جا رہی ہے مگر ابھی تک ان سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں آیا۔داخلی اندازِ نظر میں کس حد تک بیرونی تصورات کا ہلکا سا منظر پیش کیا گیا ہے۔ناؤم چوسکی زبان اور فطرت کے دوسرے پہلو یعنی زبان کے استعمال کا مادی دنیا کے ساتھ تعلق کو تین اصولوں پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ یہ اصول

’’گا تلاب فریگے‘‘ نے قائم کیے تھے جو درج ذیل ہیں۔

ا۔خیالات، ذخیرہ کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔

۲۔ان خیالات کا اظہار مشترک زبان کرتی ہے۔

۳۔زبان، مرتب کردہ تراکیب کا مجموعہ ہے۔زبان کی معانویت کا انحصار ان تراکیب اور اشیاء کے درمیان موجود تعلق پر ہوتا ہے۔

فریگے نے اشیاء اور اظہار کے تعلق کی جو تراکیب استعمال کی ہیں۔اُن سے نکلنے والے مطالب ایک سے زائد ہیں۔ان مطالب اور مفاہیم کی موجودگی اس لفظ کو فریگے کے ماڈل کے لیے غیر مناسب بنا دیتی ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ فنی اصطلاحات کا سہارا ہی فلسفیانہ خیالات اور تصورات کی نوعیت کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہیں جو اس رجحان کے عکاس ہیں کہ معلومات کی دریافت کے لیے حس مترکہ (Common juse)اور آسان زبان جیسے وسائل کے استعمال کو ترک کر دیا گیا ہے۔

بیرون پرست نظریات اور لسانی مباحث

بیرون پرست راسخ الاعتقاد نظریہ کے پہلے مفروضہ خیالات ذخیرہ کی شکل میں موجود ہوتے ہیں کی کوئی تجرباتی حیثیت نہیں ہے۔نوام چوسکی اس مفروضہ کو لغو، بے بنیاد اور غیر معقول قرار دیتے ہیں۔جبکہ مفروضہ خیالات کا اظہار مشترک زبان کرتی ہے کے بارے میں نوام چوسکی مشترک زبان کے تصور کو قدرتی مظاہر کے بارے میں جاننے اور واضح اظہار کو قطعی طور پر مددگار خیال نہیں کرتے۔طبعی یا حقیقی جیسے الفاظ غیر مبہم اور واضح ہونے کے مسئلہ سے قطع نظر کسی بھی مظہر کی وضاحت یا نمائندگی نہیں کرتے۔نوام چوسکی کے مطابق مشترک زبان وجود نہیں رکھتی۔ اور طبعی یا حقیقی جیسے الفاظ اگرچہ معانی سے خالی نہیں ہیں مگر ان کا استعمال روزمرہ زندگی تک محدود رکھا جا سکتا ہے مگر

زبان جیسے پیچیدہ مظاہر کی جانکاری کے لیے ان الفاظ کو موزوں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بیرون پرست نظریہ میں یہ بات کہی گئی کہ مشترک زبان اپنے قاعدے اور کلیات کی مدد سے لسانی تراکیب اور خیالات کو دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جبکہ انسانی زبان میں تشکیل کردہ قاعدے اور کلیات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انسانی زبان کی شناخت محض یہ ہے کہ اس میں تخلیقی طریقہ عمل موجود ہو جو معانی کو آوازوں کے ساتھ خاص طریقہ سے جوڑ دے۔ اور یہی سادہ اصول ''توسیع ہم قدری'' اور ''تخلیقی اہلیت'' اور اس طرح کے کئی پیچیدہ مباحث کی حقیقت کھولنے کے لیے کافی ہے۔

الفاظ کے معاملے میں بھی ایسی ہی صورتحال موجود ہے۔ نوام چوسکی کے مطابق ہم لوگ نفسیات اور ذہن کے بارے میں محدود علم رکھتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ تصورات کی گہرائی میں موجود اجزاء کو ثقافتی لبادے سے کیسے الگ کیا جائے۔ کیونکہ ہر تصور کے پیچھے بہت سی نجی اور اجتماعی نوعیت کی دل چسپیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ الفاظ خلقی طور پر صوتی اور معنیاتی خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن الفاظ کی ساخت میں ان معانی کو وسعت عطا کرنے اور ان میں ثانوی رنگ شامل کرنے کی بھرپور گنجائش موجود ہوتی ہے۔

الفاظ کے معانی میں کلیتی صفات موجود ہوتی ہیں۔ اسی لیے الفاظ کے مترادف جوڑے وجود میں آتے ہیں۔ الفاظ کی ان صفات کی بدولت لسانی تراکیب میں عمومی نسبتیں قائم ہوتی ہیں۔ جن میں سے قافیہ کی مثال ایک ہیئتی نسبت کے طور پر کی جاسکتی ہے۔ انسانوں اور زبانوں کے درمیان لسانی اظہار کا ڈھانچہ اندورنی طور پر ایک جیسا رہا ہوگا۔ اگرچہ معانی کی صفات میں اشتراک کے ثبوت نہیں مل سکے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذہن کی ساخت میں تمام انسانوں کی اشتراک موجود ہے۔ اور یہ مشترک حیاتیاتی صلاحیت لسانی اظہار کا مختلف زبانوں کے درمیان اشتراک کو ظاہر کرتا ہے۔ اس بات کو تمام ایسے ماہرین نے تسلیم کیا ہے جن کی سوچ اور فکر آزاد ہے ایسے ماہرین میں افلاطون، ویکارت اور ہیوم جیسے ماہرین شامل ہیں۔

فطرت میں زبان کے مقام کے بارے میں کوئی واضح صورتحال موجود نہیں ہے۔ نوام چومسکی کے مطابق ذہنی پہلو کو بھی دوسرے تمام پہلوؤں کی طرح زیر بحث لانے کی ضرورت ہے جہاں تک زبان کا تعلق ہے یہ ایک حیاتیاتی شے ہے جس کی خصوصیات نہایت پیچیدہ ہیں۔ اور ان کی نوعیت مخصوص ہے۔ لسانی اظہار کے طریق کار اور تراکیب حسی لحاظ سے اور حرکی انداز سے زبان کے استعمال کے لیے الگ انداز میں کام کرتے ہیں۔ زبان اور تخیل کے بارے میں چونکہ حوالہ جاتی معنویاتی ربط موجود نہیں ہوتا اس لیے ان کے درمیان کوئی بیرون پرست نظریہ بھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ جبکہ اس کے برعکس داخلی معنویات حیران کن حد تک صوتیات کے ساتھ برابر سطح پر موجود ہے۔ یہ دونوں نظام (بیرون پرست معنویات اور داخلی معنویات) مل کر کارگردگی کے نظام کو ہدایات جاری کرتے ہیں جس کی بدولت گفتار اور باہمی لسانی تعلقات جیسے پیچیدہ ذہنی اعمال جنم لیتے ہیں۔

کسی بھی وسیع سماجی تناظر میں استعمال ہونے والی زبان کے بارے میں جانکاری کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ معلوم ہو اس زبان کے حیاتیاتی وجود کے حوالے سے اب تک کیا سمجھا جا چکا ہے جب تک زبان کے حیاتی اصول کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنا ممکن نہیں ہوگا اور یہ گورکھ دھندا ہی رہے گا۔ انسانی معاشروں میں موجود اختلافات کی نوعیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ یہ کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلاف معمولی نوعیت کے نہیں بلکہ فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں۔ انسان اور غیر انسانی تاریخ کا مطالعہ میں جو اہم ترین فرق سامنے آتا ہے وہ لسان نامی منفرد صلاحیت ہے جو انسان دیگر اشیاء پر فوقیت عطا کرتی ہے۔ تاہم بہت سے قدیم زمانے سے چلے آ رہے مسائل اور پیچیدگیاں آج بھی باشعور تحقیق کی راہ میں مزاحمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان مسائل کا تعلق ڈیکارت اور اس کی ثنویاتی مابعد الطبیعات سے تھا ہو سکتا ہے کہ ہیوم کا کہنا درست ہو کہ فطرت کے حتمی راز ہمیشہ پردے کے پیچھے چھپے رہیں گے۔ ان رازوں سے متعلق ہیوم کا کہنا کہ ے کہ یہ راز دراصل وہ خفیہ سپرنگ اور اصول ہیں جن کی بدولت انسانی ذہن کام کرنے لگ جاتا ہے۔

لسانیات کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ ہم سب کچھ جان چکے ہیں بلکہ اس کی ابتدا کے بارے میں بھی ہماری معلومات کی نوعیت عمومی ہے۔ مگر اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں جو معلومات ہم حاصل کر سکے ہیں اُن کا بہترین استعمال کرنا ہی بہت بڑی خوبی قرار پائی ہے۔

میخائل باختن (۱۸۹۵۔۱۹۷۵)

میخائل باختن کا شمار روس کے ممتاز مفکرین میں سے ہوتا ہے۔ باختن کی فلسفہ ادب اور لسانیات پر تحقیق نے ان مباحث پر طاری جمود کا خاتمہ کیا۔ ان کے تصورات کو ۱۹۲۰ء کی دہائی میں روسی ادبیات میں بنیادی تبدیلی کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اہل یورپ نے میخائل کی تحقیقات و افکار کا تجزیاتی مطالعہ شروع کیا جس سے باختن کی پذیرائی کے نہ ختم ہونے والے دور کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد یورپ میں میخائل باختن کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ باختن کے ہم عصر مغربی مفکرین کے افکار کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ مغربی مفکرین کے ہاں اضطراری اور ہیجانی پہلو نمایاں ہے۔ یورپ میں بیک وقت کئی فکری رجحانات سر اٹھا رہے تھے۔

۱۹۲۰ میں باختن نے انسانی نفسیات کا ایک ماڈل پیش کیا۔ (Architectonic) ماڈل کا نام دیا یہ ماڈل جدت پسندی اور ندرت تخیل کا نمونہ ہے۔ جس میں ''میں'' کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ کیا ''میں'' اپنے حقیقی پہلو سے واقف ہوں؟ کیا ''میں'' ضمیر کی آواز پر خیالات کی گہرائی میں جا کر عرفان ذات کو حاصل کر سکتا ہوں؟ اس نفسیاتی ماڈل میں فرد ''میں'' کے مدار میں گھومتے ہوئے اپنی روزمرہ معشرتی اور سماجی زندگی کو بسر کرتا نظر آتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں باختن کو کلاسیکی مفکر کا درجہ دیتے ہوئے باختن سنٹر یونیورسٹی آف شیفلڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جہاں اس عظیم ماہر لسانیات کے تحقیقی کاموں پر توجہ دی جا رہی ہے۔

باختن کے خیالات سے یہ تاثر مزید گہرا ہو جاتا ہے کہ ہم جس دنیا کے رہنے والے ہیں یہاں فکر و خیال کی

تعمیر دوسروں کے الفاظ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔فکشن کے حوالے سے باختن کا نظریہ ہے کہ فکشن ادب کی ایسی صنف ہے جس کا متنوع موضوعاتی اور رنگارنگ ڈسکورس انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ باختن کے مطابق ادب کی تخلیق میں مکالمات، گفتار اور تفہیم کے وراثتی تکلم کا ردِعمل کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جو لسانی روابط کی عکاسی کرتا ہے جس کی بدولت لسانیات کا ایک الگ روپ ہمارے سامنے آتا ہے۔ باختن کے نزدیک لفظ کی معنویت کا تعلق ادراک کی سرحد سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔لفظ اپنے سیاق وسباق اور اجنبی لفظ کے پس منظر کے نقطہ اتصال پر معانی کی رنگارنگی کو جنم دیتا ہے جس سے فکر کا نیا منظر نامہ تشکیل پاتا ہے۔ جدید دور میں لسانیات کے علم سے وابستہ تمام مفکرین نے ''عصری آگہی'' کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اپنے ادبی اور لسانی نظریات کی بدولت باختن نے فکری جمود کا خاتمہ کیا اور تقلید کی نئی روش سے متعارف کرایا۔ باختن نے روسی فکر ''ہیئت پسندی'' کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی جس میں وہ اُس کی فکر نے اہم کردار ادا کیا۔

باختن نے روسی فارمل ازم کے خلاف مدلل بحث کا آغاز کیا۔ بچپن سے ہی باختن روسی ہیئت پسندی کے خلاف دبے الفاظ میں تحفظات کا اظہار کرتا رہا۔ کیونکہ سٹالن نے تحریر پر سخت پابندی لگا رکھی تھی لہٰذا باختن کے ابتدائی مضامین جن میں روسی ہیئت پسندی کی مخالفت کی گئی وہ گم نامی کا شکار ہو گئے۔ ۱۹۲۷ء میں فرائیڈ کے تجزیاتی مطالعہ کے حوالے سے باختن کا مضمون شائع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں روسی فارمل ازم پر تنقیدی نوعیت کا مضمون شائع ہوا۔

باختن نے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ محض علامات یا حوالہ جات کی مدد سے صورت حال کی درست عکاسی ممکن نہیں۔ باختن نے روسی ہئیت پسندی اور مارکس ازم کے درمیان رابطہ کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لیے کی گئی کہ سٹالن کے عہد میں روسی ہئیت پسندوں پر کیے جانے والے مظالم میں کمی لا کر اُن کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو سکے۔ باختن اگرچہ خود بھی حکمران طبقہ کا معتوب تھا۔ لہٰذا اس کوشش کی وجہ سے اُس کی شخصیت متنازعہ ہو گئی۔ لیکن باختن نے کسی مصلحت کو راہ میں نہ آنے دیا اور

فسطائیت کے جبر کے خلاف نبرآزما ہوا۔

باختن نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ گزشتہ کئی صدیوں سے ''ابلیسس'' (جس نے نشاۃ الثانیہ کے دور میں انسانیت نوازی پر کام کیا) کی تصانیف کو سمجھنے کی طرف قدم نہیں اٹھایا گیا۔جس کی وجہ سے حقائق غلط فہمیوں کی گرد میں گم ہوتے چلے گئے۔ باختن نے اپنے ساتھ کیے جانے والے مظالم اور سلوک کا کبھی جواب نہ دیا۔ بلکہ خاموشی اختیار کی۔ باختن کے مارکسیت کے حامی ادبیوں کے ساتھ خاصے گہری نوعیت کے تعلقات تھے جو کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ باختن نے ۱۹۲۸ء میں ''میں'' کے بارے میں اپنے مضمون میں روسی ہئیت پسندی کے حوالے سے نظریات پر کئی سوال اٹھائے۔

باختن نے لفظ اور اُس کے صوتی پہلوؤں کے بارے میں اپنے خیالات سے لسانیاتی میدان میں موجود جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ باختن کا خیال تھا کہ تخلیقی فعالیت میں زبان کا مکالماتی صورت میں استعمال اور اُس کے نتیجہ میں جو ردِعمل سامنے آتا ہے۔ وہ حقائق کی رسائی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مکالمات کی ادائیگی کے اور ان کے لہجہ اور زبان کے اتار چڑھاؤ سے جملوں کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ باختن اس بات پر زور دیتا ہے کہ تکلم میں گزشتہ جملوں کی ادائیگی کا گہرا کردار ہوتا ہے۔اور موجودہ تکلم اُن گزشتہ جملوں کے تناظر میں ہی اپنے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ باختن کے مطابق تخلیق کار کا ہر ایک لفظ قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ جو ذہن اور شعوری فہم وادراک کی دولت عطا کرتا ہے۔تخلیقی لمحات میں گفتگو اور پیچیدہ نوعیت کا ڈسکورس اظہار کے پیرائیہ میں جب سامنے آتا ہے۔تو یہ ہمہ گیر اثر رکھتا ہے جس کی بدولت کثیر صوتی نظام کا امتزاج جنم لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے الفاظ موزوں اظہار کی صورت میں فکر و خیال کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ یہ الفاظ کثیر صوتی اشکال میں قاری پر نئی سوچ کے دروازے کھول دیتی ہے۔

باختن کہتے ہیں کہ ہر تفہیم کا انسلاک ردِعمل سے ہوتا ہے۔ ساعتوں سے گزرنے والے پیہم مطالب کے

سلسلے تکلم کی صورت میں ہمارے خیالات میں موجود رہتے ہیں۔اس حالت میں سامع روپ بدل کر متکلم بن جاتا ہے باختن نے ماہرین کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ لسانیات میں تخلیق اور اُس کے لاشعوری محرکات کو مدِ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔تخلیق کے عمل میں باختن الفاظ کے انتخاب اور اُن کے ترک کرنے کے مرحلے کو بہت اہم قرار دیتے ہیں۔(٦٧) اور اس مرحلہ کو احتیاط کا متقاضی کہتے ہیں۔موزوں الفاظ کا انتخاب زبان کی نوعیت، اسلوب اور ساخت کی طرف پہلا قدم ہے۔

باختن کے مطابق لسانی عمل میں بہت سی قوتیں معروف ہیں۔اور اُن کی یہ فعالیت فکر کے نئے میدان کھول دیتی ہے۔غیر محتاط اور وسطی نوعیت کا اندازِ فکر سے لسانیات کی تفہیم میں کوئی مدد نہیں ملتی۔زبان کو اس نوعیت کے غیر حقیقی اندازِ فکر سے نجات دلانا ضروری ہے تاکہ لسانیات کا ارتقاء ہو سکے۔باختن کہتے ہیں کہ زبان کو عام طور پر محض گرامر کے مختلف مدارج کا ملخص تصور کیا جاتا ہے۔جو درست نہیں۔اُن کا استدلال تھا کہ زبان فکری و علمی تصورات فلسفیانہ مباحث، تاریخی حقائق اور نئے تجربات سے سیر شدہ ہوتی ہے۔معاشرتی زندگی میں سماجی، سیاسی اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں کے درمیان زبان رابطہ کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اور ان افکار اور تصورات کو ارتقاء عطا کرتی ہے جو ان افکار کی نمو کرتے ہیں اور نئے جہاں آباد ہوتے ہیں۔

باختن کے مطابق زبان ہمارے بزرگوں اور قدما کے افکار اور خیالات کی امانت دار ہے۔اس کا ہر لفظ معانی کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔اُس نے زبان کے بارے میں قابلِ فہم اور مستند حقیقت کی جانب اشارہ کیا کہ زبان کے ابلاغ سے اظہار کے مشکل مسائل و مراحل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔زبان کا کمال ہے کہ اس کی مدد سے جذبات اور اُتار چڑھاؤ کا سفر تیزی اور آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے۔معاشرتی زندگی میں روابط کو قائم کرنے اور اُن کو فروغ دینے میں زبان کا اہم کردار ہے۔انسان کا زندگی میں کئی تضادات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔اس طرح کے تضادات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اس طرح کے تضادات اور ارتعشات کے خاتمے میں زبان کا کردار

بنیادی نوعیت کا ہے۔

باختن لسانی عمل کو متعدد عوامل اور قوتوں کے باہم ملاپ کا نام دیتے ہیں باختن کے مطابق زبان جن قوتوں کے زیر اثر مطالب کے معانی کی خاطر تکلمی اور نظریاتی اشتراک پیدا کرتی ہے۔ یہ اشتراک اظہار کی مرکزیت کا خواہاں ہے۔ تکلمی اور نظریاتی قوتیں مل کر واحدانی فعالیت کو ممیّز کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اسلوب کی جب درجہ بندی کی جاتی ہے تو اُن پیچیدہ مراحل کی حد بندی کا مرحلہ طے کرنا ہوتا ہے جس کی بدولت قاری منفرد تجربوں کی مدد سے گفتگو کے درست معانی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مفروضے قائم کرتا ہے۔ زبان میں معانی کے حوالے سے ذاتی خیال میں تبدیلی کے حوالے سے اور انفرادی سوچ میں مکمل انہدام کا رویہ ان کے بارے میں باختن کے خیالات اور نظریات بالکل الگ انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جہاں تک متن کے مفاہیم کا سے تعلق ہے۔اس کے تصور تاریخ پر باختن کو شدید قسم کے اعتراضات تھے اسی حوالے سے تحریر کیا گیا باختن کا مضمون (مارکس ازم اور باختن ایسوسی ایٹ، پی این میڈیو، فلسفہ زبان) (Bakhtin and Marksism P.N Medveve بھی ماہرین کے درمیان موضوع بحث رہا۔(۶۸) جس سے ماہرین کو معلوم ہو گیا کہ روسی ہیت پسندی پر اس اہم مضمون کے ذریعہ باختن اپنے خیالات کا کلی یا جزوی اظہار کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ باختن نے پابندی تحریر کے باوجود اپنے نام سے مضامین لکھ کر اپنے خیالات کے برملا اور دبنگ اظہار کے ذریعے سے شہرت دوام حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں اُسکے مضمون Problem of Dostoevisky Art دوستووسکی کے فنی مسائل کے نام سے مضمون لکھا۔اس مضمون میں باختن نے وضاحت کی کہ دوستوسکی کے فن کو محض ''سادہ بیانیہ'' سمجھ لینا درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ مختلف النواع صوتی انفرادی و اجتماعی بیانیوں کا حسین گلدستہ ہے۔اس مضمون میں تخلیق کار کے صوتی لہجے کو اہم قرار دیتا ہے۔ دوستکی کا اسلوب کئی آوازوں کا مخزن ہے۔اسے ایک نقطہ کے تحت پیش کرنا درست نہیں ہے۔ دوستکی کے مطابق اسلوب دینے کے لیے خود راہیں تلاش کر لیتا ہے۔

اور وہ اس کو مصنف کے تابع قرار نہیں دیتا۔ اس طرح وہ متن کو خود مختار قرار دیتا ہے۔ دوستکی کے متعلق باختن کی رائے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ باختن کے تصورات پس ساختیات سے قریب ہیں۔ باختن کے تنقیدی نظریات، تحلیل نفسی اور فکشن کے حوالے سے لکھے گئے مضامین باختن کے اس تصور کی تائید کرتے ہیں جن کی بدولت یہ تاثر سامنے آتا کہ باختن نو مارکسٹوں کا ہمنوا ہے۔ اور وہ خود میں مگن تخلیقی کام میں مصروف رہا۔

میخائل باختن کی وسعت نظری کی بدولت اہل یورپ کی لسانی ادبی اور جمالیاتی سوچ پر اثرات مرتب کیے اور اہل یورپ کی سوچ میں واضح تبدیلی کا باعث ہوئی۔ باختن کو اپنے خیالات کی وجہ سے جلا وطنی کی سزا سہنا پڑی۔(٦٩) اس جلاوطنی کے دوران ۱۹۳۸ء میں ٹانگ میں سوزش اور پیپ کی وجہ سے اُس کو ایک ٹانگ سے محروم ہونا پڑا۔ جلاوطنی، بیماری اور شدید تکلیف نے باختن کی فعالیت اور فکر کو بُری طرح متاثر کیا جس کی وجہ سے اُس کے تنقیدی تصورات میں اعتدال نہ رہا۔ اور اس کے خیالات اور تصورات پر سوال اٹھائے جانے لگے۔

ژاک لاکاں (Jecques Lacon) (۱۹۸۱۔۱۹۰۱)

فرانس میں ۱۳، اپریل ۱۹۰۱ء کو پیدا ہونے والے ژاک لاکاں نے ماہر نفسیات کے طور پر ۱۹۳۱ء میں اپنے پیشہ کا آغاز کیا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے لاکاں کو نفسیات اور فلسفہ میں گہری دل چسپی تھی۔ سگمنڈ فرائڈ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسی وجہ سے ۱۹۳۶ء میں فرائڈین تحلیل نفسی کی تحریک کا حصہ بن گئے ژاک لاکاں نے تحلیل نفسی کے حوالے سے چند مضامین بھی تحریر کیے جو کافی مقبول ہوئے اور پسند کیے گئے۔ اگرچہ وہ تحریک کا ایک فعال اور سرگرم رکن تھا مگر اُس کی سچ گوئی سے پریشان لوگ اُسے اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے رہتے۔ آخر کار ۱۹۶۴ء میں ژاک لاکاں نے پیرس میں ایک تنظیم قائم کی۔ اور اپنی زندگی کا مقصد فرائڈ کے نظریہ کی تحقیق اور توضیح کو بنالیا۔ ان کی کتاب (Ecole Freudienhe) میں شائع ہونے والے مضمون سے ژاک لاکاں کو بہت شہرت ملی۔

ان کے مضامین کا مجموعہ (Ecrits) کی بدولت ژاک لاکاں نہ صرف فرانس بلکہ پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہو گئے۔Ecrits کے انگریزی ترجمہ سے نئے مباحث کا آغاز ہوا۔

لسانیات کے شعبہ میں پس ساختیاتی فکر کے حوالے سے لاکاں کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ژاک لاکاں نے فرائڈ کے تصورات کی مدد سے لسانیات پر حیاتیات کو استوار کرنے کی کوشش کی۔پس ساختیات کے متعلق لاکاں نے بیگانگیت،موضوعیت اور جنسی اختلافات،محرکات قانون اور تفریح جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لا کر بیسویں صدی میں خیال افروز مباحث کا آغاز فراہم کیا۔ژاک لاکاں کے متعلق:۔

''متن فنا نہیں ہوتا ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔''

الفاظ اور ان سے وابستہ مطالب کو ژاک لاکاں نے وسعت دی۔ان کا خیال تھا کہ شعور کی تشکیل اور زبان کی بناوٹ ایک جیسے حالات میں ہوتی ہے۔زبان اشارات کا نظام ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ سچ اپنی اثر آفرینی کو خود ثابت کرتا ہے۔لاکاں اس کائنات میں سچائی اور صداقت کی فتح کی بات کرتے ہیں۔ژاک لاکاں نے سوسیور کے خیالات پر سخت انداز میں گرفت کی اور ان پر نظرِ ثانی کی اور کہا،نشان مستحکم نہیں ہوتا بلکہ مسلسل تغیر کا شکار رہتا ہے۔الفاظ اور اُن کے مطالب بھی اس طرح کی نوعیت رکھتے ہیں۔اور مطالب بھی مسلسل تغیر کا شکار رہتے ہیں۔لاکاں نے الفاظ پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھا اُس مظہر کو جس کے لیے لفظ کو استعمال کیا جا رہا ہے لاکاں اس کو ثانوی حیثیت میں رکھتے ہیں۔ژاک لاکاں زبان کو اپنی شناخت کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔انہوں نے زور دیا کہ علم، لسانیات اور ادب جیسے دیگر موضوعات پر گفتگو تاریخی حوالے سے کی جائے لاکاں نے آئینہ گفتار کی ذریعہ قاری کو مستقبل کی دھندلی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی۔(۷۰) ان کی تحاریر کا ایک ایک لفظ معانی کا طلسم ہے جس میں مرحلہ شوق طے نہیں ہوتا۔ژاک لاکاں نے افکار کی عمارات کو پس ساختیات سے گرا کر ایک عظیم کارنامہ سر انجام دیا۔ژاک لاکاں نے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی۔انہوں نے ایک ایسے موزوں لسانیاتی ماڈل کو پیش کیا

جس کی مدد سے سماجی زندگی کا احاطہ بھی ممکن ہے۔ اگر چہ ژاک لاکاں فرائڈ کا بہت بڑا معتقد تھا مگر اُس نے اُن مسائل کو سلجھانے کی سعی کی جن کو فرائڈ نہ سلجھا سکا یا ان سے پہلو تہی کی۔ ژاک لاکاں نے ان تصورات پر پھر سے غور شروع کیا اور نئے مطالعہ پر توجہ دی۔ جس سے نئے مباحث کا آغاز ہوا۔ مروج نظریات پر ژاک لاکاں نے ہمیشہ اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تصورات اور نظریات کی بنیاد رومانویت اور رجعت پسندی ہے۔ جدید خیالات کی بدولت ژاک لاکاں نے لاشعور اور زبان کے امتزاج سے مخاطب کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا وہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ژاک لاکاں نے فرائڈ کے نظریات کے از سر نو وضاحت کی اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی یہ کوشش ژاک لاکاں کا منفرد سوچ کی عکاس ہے۔ (۷۱)

ژاک لاکاں نے فرائڈ کے نظریہ کی توضیح کرتے ہوئے اس جانب غور کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ فرائڈ کے تصورات انتہائی پیچیدہ نوعیت کے ہیں جنہیں اُن کے زمانے کے ناقدین درست انداز میں سمجھنے میں نا کام رہے ہیں۔ بقول لاکاں، فرائڈ کے نظریات کے ذریعہ سے لاشعور کی جو ساخت سامنے آتی ہے عام پڑھنے والے کے بس سے ان گرہوں کو کھولنا باہر ہے۔ لاشعور کی جو ساخت پر نہیں پہنچ پاتا اور اُسے معلوم نہیں ہو پاتا تا کہ اس نظریہ کے ذریعہ فرائڈ کس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح فرائڈ قاری کو سر گرداں پھرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لاشعور کے بارے میں فرائڈ کے خیالات اُس کے فکری رجحانات کے عکاس تھے۔

ژاک لاکاں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سگمنڈ فرائیڈ کے لاشعور کے حوالے سے نظریات کی وضاحت اس انداز میں کی ہے کہ پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے انہیں انتہائی آسان اور شستہ بنا دیا۔ (۷۲) لاشعور کی وضاحت کرتے ہوئے لاکاں نے ہمیشہ جمالیات اور اخلاقی اقدار کو مدِ نظر رکھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اخلاقی اقدار میں تہذیبی اور ثقافت کو پروان چڑھاتی ہیں۔ ژاک لاکاں نے کوشش کی کہ وہ اپنی تحاریر میں قاری کے لیے مسرت کا سامان مہیا کرتا رہے۔ اسی لیے لاکاں نے فرائڈ کے ۱۹۲۰ء میں پیش کردہ تحلیل نفسی کی وضاحت کے مرحلے کو با

آسانی طے کر لیا۔

لاکاں کے مطابق انسان کی زندگی میں تبدیلی اور تغیر کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جو اُس کے تضاد تخیلات اور ارتعاشات کا مظہر ہے۔ اس لیے انسان کو اپنی حقیقت اور اصلیت کا علم ہونا چاہیے۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے انسانی لسانی عمل کا آغاز کرتا ہے۔ اور یہ طویل لسانی اور پیچیدہ عملکا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ بے تکلفی اور بے ساختگی لاکاں کے اسلوب کا حصہ ہے۔ پس ساختیات اور لاشعور کے موضوع پر اس کے افکار انتہائی اہم ہیں۔ ژاک لاکاں نے اس بات پر زور دیا کہ لاشعور کی ساخت اور تشکیل بھی زبان کی مانند ہوتی ہے۔ لاشعور اور زبان کے مابین گہری مماثلت کی طرف لاکاں نے قاری کی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی، جس کی بدولت معلوم ہوا ادب کا مطالعہ بھی لاشعور کے مطالعہ کے لیے اپنائے جانے والے اصولوں کے تحت کیا جا سکتا ہے۔ نفسیات اور لسانیات کے حوالے سے ژاک لاکاں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ژاک دریدا (Jacques Derrida) (۲۰۰۴-۱۹۳۰)

الجبریا میں جنم لینے والے ژاک دریدا نے تنقید، لسانیات اور ادب میں اپنے افکار کی بدولت نہ صرف شہرت کی بلندیوں کو چھوا بلکہ اس نے اپنے افکار سے لوگوں کو مغلوب کر کے لسانیات کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا۔ دریدا نے اپنے تصورات سے فکر ونظر کی کایا پلٹ دی۔ (۷۳) عالمی سطح پر دریدا کے تصورات کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دریدا کے افکار کی تفہیم کے لیے صرف یورپ میں چودہ ہزار مقالات تحریر ہوئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لسانیات، ادب اور فنون لطیفہ کے تمام شعبہ جات میں دریدا کے انقلابی افکار کے اثرات نمایاں ہیں۔ دریدا کی تصانیف جن سے اُن کی شہرت کو دوام حاصل ہوا درج ذیل ہیں۔

۱۹۶۲ Husserls Geometry

۱۹۷۳ Speech and phenomina

۱۹۷۶ Of grammatology

۱۹۷۸ Writing and difference

متن کی خودمختاری کے حوالے سے دریدا نے بہت کام کیا۔ اور واضح کیا کہ متن سے الگ کوئی بھی مفہوم درست نہیں۔ نکولس رائل نے دریدا کے متن کے حوالے سے نظریات پر گہری تحقیق کی اور اپنے تجزیہ میں لکھا کہ دریدا متن سے کیا مراد لیتے ہیں۔ دریدا نے لسانیات کے حوالے سے ایک منفرد نقطہ نظر پیش کیا اور اس جانب توجہ دلائی کہ الفاظ تو معانی کا ایک طلسم ہیں۔ دریدا نے سوسیور کے نظریات اور خیالات سے اختلاف کیا۔ اور انہیں دلائل کے ساتھ نا قابل عمل قرار دیا۔ دریدا نے اس نقطہ پر زور دیا کہ زبان اپنے داخلی نظام کے ذریعے اپنے مطالب اور لسانی تقاضوں سے نمٹنے کی صلاحیت کی حامل ہے۔ قاری کے لیے دریدا ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ زبان کے پس پردہ نظام کے عوامل کے بارے میں علم حاصل کرے اور معانی کی رسائی کے لیے کوشش کرے لسانیات میں آزادروی کا موجد دریدا ہے۔ لسانی نظام اور معانی آفرینی کے حوالے سے دریدا کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

متن اور اُس کے معانی کے حوالے سے ژاک دریدا کے خیالات نے لسانیات کے حلقوں میں ہلچل برپا کردی۔ سوسیور کے ساختیاتی مباحث کے بارے میں دریدا کے جارحانہ موقف کی بدولت اُسے بت شکن خیال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک متن کا تعلق ہے دریدا کا خیال ہے کہ قاری فوراً ہی متن کے سامنے آتے اُس کے بارے میں اپنی رائے قائم کر لیتا ہے۔ فرد کے تجربات چونکہ اُس کے فکر کو سیراب کرتے ہیں۔ اس لیے وہ متن کے ان حصوں کو اور علامات کو جو اُس کی زندگی کی روزمرہ کا حصہ ہوتے ہیں۔ شناخت کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا۔ (۷۴)

ردتشکیل کے حوالے سے دریدا کے تصورات کی بازگشت دنیا بھر میں سنائی دے رہی ہے۔ دریدا نے عام

تخلیق کو بھی منطق کے اصولوں کے تحت جانچنے کی ابتدا کی۔سوسیور کے نظریے کے مطابق ''زبان ایسے نظام کا نام ہے۔ جو اشارات، علامات اور نشانات کی مدد سے وجود میں آیا۔اُس کا خیال تھا کہ یہ نشانات اور علامت اظہار اور ابلاغ کی بدولت قابل غور ہیں۔ اوراس تمام عمل میں سوسیور اختر افات کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ژاک دریدا نے ان معاملات پر اپنی رائے بے لاگ انداز میں دی۔ دریدا نے فلسفہ کی مطلق العنانی پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا دریدا کا خیال تھا کہ یہ تمام تصورات مابعد طبعیاتی سوچ کی بدولت ہیں۔

دریدا نے ردِ تشکیل کی راہ دکھا کر قاری کو متن اور اس کے معانی کے بحر بے کراں کی غواصی پر آمادہ کیا۔ دریدا نے اس بات پر زور دیا کہ لسانیات کے پس منظر، متن اور مطالب کا تعلق براہ راست نظام افتراقی سے ہوتا ہے۔اور یہ نظام کسی مرکز کے تابع نہیں ہوتا لہٰذا اس نظام کے حوالے سے حتمی رائے دینا بعید از قیاس ہے۔

افلاطون کے زمانے میں لفظ کی مرکزیت کے تصور کو دریدا مسترد کر دیتے ہیں۔ دریدا کا کہنا ہے کہ تحریر خواہ کتنی موثر اور دل کش ہو وہ تقریر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ دریدا کے نزدیک تقریر کو تحریر پر فوقیت حاصل ہے۔(۷۵) دریدا نے الفاظ کے مدار میں گردش کرنے والی تحریروں پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔اور متن میں موجود معانی کی وحدت کے تصور کو سرے سے رد کر دیا۔ژاک دریدا نے لسانیات کو ایک نئے انداز سے سمجھنے کی بات کی۔تحریر کو ثانوی درجہ دینے کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ایک مقرر ایک ہی وقت میں کثیر التعداد مجموعہ گرفت بنا سکتا ہے۔اس لیے تقریر کا اولیت دی گئی۔

دریدا کے مطابق تحریر اپنی ردِ تشکیل کی صورت خود پیدا کرتی ہیں۔ جب قاری تحریر میں موجود نئے مفہوم کی موجودگی کے بارے میں جان لیتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ پس منظر کی کیا حقیقت ہے۔ دریدا کے مطابق بادی النظر میں لفظ کے حقیقی معانی تک رسائی ممکن نہیں۔ بلکہ یہ مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے۔

ژاک دریدا اور ردتشکیل کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے۔اس کی وجہ دریدا کا ردتشکیل کے حوالے سے سرانجام

دی گئیں تحقیقات ہیں جن کے ذریعہ سے ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے۔ دریدا نے ردِتشکیل کے ذریعے ان تمام عوامل کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے گردِنواح میں ہو رہے ہیں۔ دریدا کے نزدیک محض لسانیات اور متن کا مطالعہ ہی کافی نہیں بلکہ اس کے افکار کا دائرہ کار بہت وسیع قرار دیتے ہیں۔ دریدا کے مطابق مصوری، سنگ تراشی، آرٹ اور یہاں تک کہ انسانی خدوخال بھی ردِتشکیل کی زد میں آسکتے ہیں۔ مظاہر قدرت کو بھی دیکھنے والا ردِتشکیل کے ذریعہ نئی تفہیم اور معانی فراہم کرسکتا ہے۔ اس طرح دریدا کے نزدیک کوئی بھی شے اس کائنات کے ردِتشکیل کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہے۔

دریدا نے متن اور ردِتشکیل کے حوالے سے تخلیق کار کی شناخت اور انفرادیت کے حوالے سے مباحث کا آغاز کیا جس کی بدولت فکری جمود کا خاتمہ ہوا۔ دریدا نے اقوام عالم کی اس طرف توجہ مبذول کرائی کہ اخلاقی اور روحانی اقدار کی بقا ضروری ہے۔ تاریخی شعور کی مدد سے دریدا ہر قسم کی عصبیت کو ختم کرنے کی بات کی اور مروجہ متن اور اس کے ساتھ وابستہ روایتی تصورات کو غیر مستحکم کر کے معنی خیزی کی نئی راہیں تلاش کرنے پر زور دیتے ہوئے واضح بات چیت کے لئے استعمال ہونے والی زبان کو تحریری زبان سے مقدم سمجھا۔ اس طرح دریدا نے گفتگو کی بالاتری کی بات کی ہے کیونکہ وہ گفتگو کو انسان کی شناخت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دریدا الفاظ میں موجود افتراقات کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ''فرق'' داخلی کیفیت کا نام ہے۔ دریدا، کلیت پسندی کو فرسودہ عمل قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ہر لفظ کی الگ تہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے کلیت کو زیرِ غور لانا قطعی ناممکن ہے۔ ان افتراقات کی بدولت دنیا میں ہر زبان کا وجود ممکن ہوا۔ ان زبانوں کے اپنے جدا جدا وجود کو قائم رکھنے کے لیے ان افتراقات کو برقرار رکھنا ہوگا۔ ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے فرق ہی اُس کے وجود کا ضامن ہوتا ہے۔ دریدا کے مطابق کسی بھی متن کے حتمی معانی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا خیال ہے کہ متن اپنے وجود کو خود ہی ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے معانی کی تخریب اور تشکیل کا عمل بدلتے ہوئے حالات کے مطابق وقوع پذیر ہوسکتا ہے۔ اس طرح ردِتشکیل اور

تعمیر وتخریب کے امکانات ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ دریدا کے مطابق لفظ کی تعمیر میں ہی تخریب کی صورت موجود ہوتی ہے۔ ردتشکیل کا نظریہ ساختیات کے ردعمل میں سامنے آتا ہے۔ دریدا لفظ کی مرکزیت اور اُس کے معانی کی مرکزیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور متن کے گہرے مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ تاکہ حقیقت تک رسائی حاصل ہو سکے۔ متن میں مختلف معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ معانی نہ صرف موافق ہو سکتے ہیں بلکہ بعض حالات میں معانی متضاد حالت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ معانی کو منطقی اکائی تصور کرنے کو دریدا غلطی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ردتشکیل سے دریدا کا مطلب معانی کے نظام کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ردتشکیل کا مقصد حقیقت کے اوپر پڑے پردے کو ہٹانا اور سچ کو سامنے لانا ہے۔ ان انقلابی تصورات کی وجہ سے دریدا کا کردار علمی ادبی حلقوں میں متنازعہ رہا ہے۔ دریدا کے اسلوب کا سب سے اہم پہلو اُس کا کائنات کے حوالے سے پیش کیا جانے والا نقطہ نظر ہے۔ دریدا کی نظر دنیا بھر کے مسائل پر تھی۔ اور ان مسائل کے حل میں وہ سرگرداں رہا۔(۷۶)

الفاظ کو لپیٹ کر پیش کرنا دریدا کے نزدیک منافقت کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ الفاظ کو حقیقت کے معانی کے حوالے سے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ژاک دریدا معدے کے کینسر میں مبتلا ہو کر ۱۸، اکتوبر ۲۰۰۴ء کو وفات پا گئے۔

مشل فوکو فرانس کے عالمی شہرت یافتہ مفکرین میں شمار ہوتا ہے فوکو کی شہرت کا سبب اپنے پیش رو مفکرین سے الگ اپنے تصورات اور افکار کو پیش کرنے کی سعی ہے۔ فوکو زبان اور لسانیات کو طریق کار کے آلہ کے طور پر پیش کرتے رہے جو اُن کے منفرد انداز اور سوچ کا عکاس ہے۔ فوکو کو تقلید برائے تقلید سے نفرت تھی۔ اس لیے اُس نے پہلے کے مفکرین کے راستے سے الگ راہ اختیار کی اور نئی سوچ کو اپنایا۔ فوکو کے افکار کے تانے بانے معاشرتی اور سیاسی ماخذات سے جنم لیتے ہیں۔ فوکو کے اسلوب کی رنگا رنگی، قاری کو سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ فوکو نے ساختیات، لسانیات اور ادب کے میدان میں اپنی کاوشوں کی مدد سے نئے افکار کے لیے راہ ہموار کی۔

فوکو نے اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرائی کہ محض متن پر انحصار کرنا درست نہیں۔اس کا خیال تھا کہ فکر وخیال میں متن کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔فوکو نے ساختیاتی کی بجائے پس ساختیاتی فکر کو اپنایا۔اور زندگی بھر اس فکر پر قائم رہا۔اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی فوکو نے پس ساختیات کے مباحث کے سلسلہ کو جاری رکھا۔اگرچہ لوگوں نے اُسے ساختیات کا نمائندہ گردانا۔جسکا فوکو کوافسوس بھی رہا مگر اُس نے اپنی زندگی کا مقصد پس ساختیات کے فلسفہ کی اشاعت کو بنایا۔جبکہ ساختیات کو اُس نے عقل عام پر مبنی فہم قرار دے کر مسترد کر دیا۔فوکو کے مطابق ساختیات میں اتنی قوت نہیں کہ وہ ثقافتی اور تہذیبی عوامل کے حقیقی فکر کے انداز کو اپنا سکے۔(۷۷)

ساختیات کی اس حالت سے بے زار فوکو نے اس سے آگے جانے کی ٹھان لی۔ماہرین لسانیات کا اس پر اتفاق ہے کہ فوکو کا کڑا رویہ اُس کی انفرادیت کی دلیل ہے۔اُس نے جانچ اور پرکھ کے طریق کار کو اپنایا۔فوکو تاریخ کے مسلسل عمل کو پیش نظر رکھنے پر زور دیتا ہے۔کیونکہ ماضی کے متعدد واقعات اور حالات وقت گزرنے کے ساتھ معدوم ہو جاتے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ تمام صورت حال کو سائنسی انداز فکر اپناتے ہوئے تاریخی تناظر میں دیکھا جائے۔تاریخی شعور کے حوالے سے ان کے افکار نہایت پر امید رہے۔فوکو کا کہنا تھا کہ اقوام عالم کی شاندار تاریخ،اقدار اور روایات کی تفہیم سے اقوام کے بارے میں جاننے میں مدد ملتی ہے۔مسلسل تاریخی ارتقاء سے اس امر کی عکاسی ہوتی ہے کہ اقوام کسی طرح عروج اور زوال کے زمانے میں حالات سے نبرد آزما رہیں اور کون سے ایسے اہم واقعات ہیں جنھوں نے اقوام کی سوچ اور افکار میں تبدیلی پیدا کی۔فوکو کے نزدیک تاریخ کا تسلسل افراد کی صلاحیتوں میں پیہم بہتری لانے کا سبب ہے۔

فوکو کی ابتدائی تحریروں پر نطشے کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔فوکو نے مارکس اور ہیگل کے تصورات کے اثرات کو بھی قبول کیا۔فوکو کی تصانیف کا اگر مسلسل مطالعہ کیا جائے تو اُس کے اسلوب کا طلسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا

ہے۔فوکو کی تحریریں اس بات کی عکاس ہیں کہ فوکوسترہویں صدی کے حالات اورفرانس سے باہر کی دنیا میں فکری ارتقاء سے واقفیت نہ رکھتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ماہرین فوکو کی آراء پرانحصار کرنے سے گریزاں ہیں۔ یہ حقیقت ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ تخلیق کار الفاظ کونکھارتا اور اُسے نئے انداز عطا کرتا ہے۔ یہ مناسبت اس کی انفرادیت کی دلیل ہوتی ہے۔ وہ روایات کی بنیاد پر افکار کا نیا ڈھانچہ تعمیر کرتا ہے۔تاریخ کا معروضی مطالعہ بعید از قیاس ہے۔

تاریخ تحریر کرتے وقت سائنسی انداز نہیں اپناتا۔ وہ اپنے اسلوب کو دل کش بنانے کے لیے استعارات تشبیہات کو اپناتا ہے۔اس طرح ہیگل بھی ان خیالات سے متفق لگتا ہے کہ انسانی ذہن کیونکہ شعوری ارتقا کو قبول کرتا ہے اس لیے شعور ذہن کونئی روشوں سے آشنا کرسکتا ہے۔فوکو کا خیال تھا کہ انسانی عقل اورفہم کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ اس کی تکمیل فرد کی زندگی میں ممکن نہیں۔ کیونکہ انسانی فہم کی نشوونما تاریخ کے تناظر میں تکمیل کے مراحل طے کرتی ہے۔فوکو کا استدلال ہے کہ قوت کا حصول ڈسکورس کا مرہون منت ہے۔تخلیق کار کے حوالے سے فوکو اُسے متوازن، متعدل ااور مصنف بننے کا مشورہ دیتے ہیں۔فوکو کے مطابق تہذیب کی تمام اقسام گفتگو کی تمام اشکال پر اثر انداز ہوتی ہیں۔فوکو نے مابعدطبیعات کے بارے میں بھی اپنے تحفظات کا برملا اظہار کیا۔

فوکومتن پرانحصار کومحض بھٹکنے سے تعبیر کرتے ہیں۔فہم اورادراک کوفوکوانسانی جوہرقرار دیتے ہیں۔اوراس کی نشوونما کومسلسل جاری عمل قرار دیتے ہیں۔سماجی اور معاشرتی زندگی کا دارومدار انسانی فہم پر ہوتا ہے۔فوکو دیوانہ پن کوفطری کیفیت قرار دیتا ہے۔انتہائی نامساعد حالات انسان کوکرب کی طرف دھکیلتے ہیں تو جنوں کی کیفیت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔فوکو کے بارے میں ناقدین نے لکھا ہے کہ بعض اوقات فوکو کی خودآرائی کی بدولت مضحکہ خیز صورت حال جنم لیتی ہے۔فوکو نے ہر موضوع پر اپنے تصورات اور خیالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں

تک کہ جنس اور جذبات کو بھی فوکو نے نفسیات اور تاریخ کی کسوٹی پر جانچنے کی سعی کی ہے۔مگر وقت کے ساتھ جنس کے حوالے سے فوکو کی آزاد خیالی نے نئی بحث کو جنم دیا۔فوکو نے اپنے دوستوں کو مرنے سے قبل وصیت کی کہ غیر مطبوعہ تحریروں کو مرنے کے بعد شائع نہ ہونے دیں۔لہٰذا جو تحریریں فوکو کی زندگی میں شائع ہوئیں وہی اُن کا ادبی اثاثہ تصور کی جاتی ہیں۔تاریخ کے مسلسل عمل کو زندہ رکھنے والا فوکو اب خود تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔

لسانیات اور تنقید کے تعلق کی وضاحت دراصل زبان و ادب کے تعلق کے ساتھ منسلک ہے۔اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ زبان اور ادب کے درمیان کوئی فرق موجود نہیں اور ادب کو آرٹ کی ایک قسم قرار دیا جائے تو زبان کا ذریعہ اظہار ہونا لسانیات اور تنقید کو ایک موضوع کے دائرہ کار میں لے آتا ہے۔اور دونوں کے درمیان کوئی فصیل نظر نہیں آتی۔مگر یہ دلیل درخو اعتنا نہیں ہے۔کیونکہ یہ دلیل نہ صرف لسانیات اور تنقید کے اُن اختلافات سے لاعلم ہے۔جو دونوں کے درمیان صدیوں کے ارتقاء میں وقوع پذیر رہے۔بلکہ یہ دلیل زبان و ادب کے درمیان موجود فرق کو بھی واضح کرنے سے قاصر ہے۔یہ درست ہے کہ اظہار کا ذریعہ زبان ہی ہے مگر ادب کا امتیازی وصف زبان ہی ہے۔

زبان ادب سے باہر آزادانہ معانی رکھتی ہے۔اور اپنے معانی کے اظہار کے لیے مکمل نظام اور ثقافتی ہم آہنگی کا اظہار کرتی ہے۔اس سے یہ بات واضح ہے کہ زبان اور ادب میں واضح فرق موجود ہے۔ادب زبان کی قلبی ماہیت کرتا ہے۔اسکا کام لسانیات کو نشانیات کی سطح پر اجاگر کرتا ہے۔زبان کا خاص نظام کسی سماجی گروہ کی روزمرہ ضرورتوں کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتا ہے جبکہ تنقید کی دل چسپی محض زبان اور اُس کے استعمال سے ہے جو ادب کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ لسانیات کا دائرہ کار ادب تک محدود نہیں ہے۔بلوم فیلڈ ادب کی زبان کو لسانی تحقیق کا قابلِ قدر حصہ تصور نہیں کرتے۔بلوم فیلڈ اس طرح زبان کے ادب کی طرف عمومی رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔چنانچہ یہ درست ہے کہ اسلوبیات صرف ایک تنقیدی دبستان ہے۔ادب کی زبان جو اس حوالے سے مخصوص

رویے کا مطالعہ کرتی ہے۔ درحقیقت اسلوبیات بذاتِ خود تنقیدی دبستان نہیں ہے۔ بلکہ اس کو لسانیاتی دبستان کہنا درست ہوگا۔ جس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ہر فن اور علم کی شعبہ کی مخصوص زبان ہے۔ جسے اسلوب کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اسی اسلوب کا لسانیاتی مطالعہ اسلوبیات کہلاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ لسانیات اور اسلوبیات دونوں فقرہ کے اشتراکی اور تقلیدی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں اور جملہ میں موجود متعدد اظہاری امکانات میں سے چند امکانات کو منتخب کرتے ہیں۔ اور باقی نکات کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ مخصوص حالات میں مخصوص اسلوب ہی موزوں ہوتا ہے۔

لسانیات اور تنقید ادبی زبان کے مطالعہ کے ضمن میں متفق ہیں کہ ادب میں زبان کے مطالعہ کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ لسانیات زبان کا سائنسی مطالعہ کرتی ہے۔ جو تفہیم وضاحت اور تجزیہ پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ لسانیات میں ایک قسم کے اظہار کو دوسری قسم سے تقابل کرنے کی طرف کوئی کوشش موجود نہیں ہے۔ یعنی ایک طرز اظہار کو دوسرے سے خوبصورت یا بُرا قرار دینے کی سعی لسانیات میں نہیں ملتی۔ لہٰذا لسانیات ایک ادیب اور ایک عام آدمی کی زبان میں فرق کی وضاحت نہیں کرتی۔ خالص لسانیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دونوں خواہ وہ خاص زبان استعمال کرنے والا شخص ہو یا عام زبان کا استعمال کرنے والا شخص دونوں کے درمیان لسانیات کو اختلاف نہیں کرتی جبکہ تنقید کی بنیاد ہی اقدار پر ہے۔ بہتر اور کم تر، حسین اور بدصورتی کا معیار قائم کرنا ہی تنقید کا آغاز ہے۔ تنقید ادیبوں کی عظمت اور ان کے افکار کی طرف توجہ دیتی اور اُن کے معیارات مقرر کرتی ہے۔ تنقید عام آدمی کو اُن امکانات سے دور قرار دیتی ہے۔ جن امکانات تک رسائی ایک عظیم ادیب ہی کر سکتا ہے۔ تنقید کا کام ادب کی تفہیم اور تعبیر کرتا ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک زبان ادب کی ایک جہت ہے۔ اس لیے تنقید زبان کو کلیدی حیثیت عطا نہیں کرتی۔

لسانیات، سماجی علم ہے۔ جس کی تشکیل اُس میں مضمر قوانین کی بدولت ہے۔ لسانیات کا معروض زبان

ثقافت عمرانیات اور ذہنی تصورات سے مختلف اوران سب پر حاوی ہے۔اس لیے لسانیات کا علم دیگر تمام علوم سے مختلف اور حاوی نظر آتا ہے۔لہٰذا یہ درست ہے کہ دیگر علوم کے مقابلے میں تنقید کو سب سے زیادہ مدد لسانیات سے حاصل ہوتی ہے۔لسانیات کو اصولی طور پر دو اقسام عمومی لسانیات اور توضیحی لسانیات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ولیم جونز کا کہنا ہے کہ جدید لسانیات کا تعلق سنسکرت، یونانی، لاطینی اور جرمن زبانوں سے ہے۔مگر درحقیقت یہ تقابلی لسانیات کا آغاز یا مارفولوجی کی ابتدا تھی جس کی جانب ولیم جونز نے نشاندہی کی ہے۔ انیسویں صدی تاریخی لسانیات کا مطالعہ کی صدی کہلاتی ہے۔تاریخی لسانیات کا مفروضہ ہے کہ زبان جامد نہیں ہے وہ ایک متحرک اور ارتقا پذیر شے ہے۔زبان کے اس تحرک کو لفظی، معانوی اور جملے ہر سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔تاریخی لسانیات اس تحرک کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیتی ہے۔

سوسیور نے تاریخی لسانیات کے محدود دائرہ کار کی طرف نشاندہی کی اور تین نقاط پیش کیے۔

۱۔ تاریخی لسانیات، زبان کے ابلاغ کی وضاحت نہیں کرتی۔

۲۔ ابلاغی عمل کے دوران تاریخی لسانیات موجود نہیں ہوتی۔

۳۔ ماورائے لسانی انکشافات تاریخی لسانیات کی رسائی میں نہیں۔

اس طرح تاریخی لسانیات اگر غیر ضروری نہیں تو اس کو غیر سائنسی ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ سوسیور نے زبان کے ایک زمانی تصورات کی بنیاد رکھی۔ان نظریات کی بدولت زبان کے اُن قوانین کو دریافت کیا گیا جو زبان کے پس منظر اور گفتگو کی گہرائی میں موجود ہیں۔اور یہی عوامل زبان کی کارگردگی کو ممکن بنائے ہین۔ادبی متن کو سمجھنے میں زبان کا تاریخی علم معاون ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ مزید پیچیدگیوں کو جنم دیتا ہے۔ادبی تنقید میں تاریخی لسانیات کے بعض عناصر کو استعمال کرنا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔کیونکہ بعض ادبی متون کے تناظر کو مدِ نظر رکھ کر ہی اُن کی تفہیم کی جاسکتی ہے۔شمس الرحمان فاروقی نے میر کے اشعار کی تشریح میں تاریخی لسانیات کا کثرت کے ساتھ

استعمال کیا ہے۔اس کی مدد سے وہ شعر کے داخلی تناظر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساختیاتی لسانیات اپنے طریق کار، اورموضوع کے اعتبار سے تاریخی لسانیات سے مختلف ہے جس کی وجہ سے نتائج اور اثرات بھی دونوں کے مختلف ہیں۔تاریخی لسانیات ماورائے لسانی انکشافات تک رسائی نہیں رکھتی اس کا دائرہ کار محض زبان کی تاریخ تک محدود ہوتا ہے۔مگر ساختیاتی لسانیات کا دائرہ کار اس کے برعکس خاصا وسیع ہوتا ہے۔لسانیات زبان کا سائنسی ماڈل پیش کرتی ہے۔اور زبان کو دیگر سماجی علوم سے وابستہ کرتی ہے۔لہٰذا یہ تاریخی لسانیات کی طرح خود تک محدود نہیں رہتی۔ساختیات لسانیات کے اثرات دیگر علوم پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔مثلاً نفسیات، فلسفہ، ثقافت اور ادب جیسے دیگر علوم پر ساختیاتی لسانیات کے اثرات واضح ہیں۔اس طرح ساختیاتی فکر کی بدولت زبان سماجی علوم کے درمیان جگہ بنانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔

لیوی سٹراس کا کہنا ہے کہ زبان کا ساختیاتی ماڈل انسانی ذہن کی ساخت کو ظاہر کرتا ہے۔''ژاک لاکاں'' اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں۔اور ساختیاتی لسانیات کو انسانی شعور کے پس پردہ کارفرما دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ژاک لاکاں کی رائے مبالغاتی پہلو لیے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساختیاتی لسانی ماڈل سے مبالغہ آمیز توقعات کا شائبہ ہوتا ہے۔لیکن یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ساختیاتی ماڈل کی بدولت تحلیل نفسی کے حوالے سے مطالعہ کو فروغ حاصل ہوا اور نئی راہیں اور امکانات کھلنے لگے۔ساختیاتی لسانیات نے زبان کی اُس گہرائی تک جانے کی بات کی جس کی وجہ سے انسانی لسانی گفتگو ممکن ہوسکتی ہے۔سوسیور نے اسے ''لانگ'' کا نام دیا ہے۔''لانگ'' کی وجہ سے ہزاروں فقرات اور جملے بنائے اور اُن سے مزید جملے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔جو اس بات کا اظہار ہے کہ لسانیات کی تہہ میں موجود ساختیات ہی کسی مظہر کے اظہار کو یقینی بنانے میں رہنا کردار ادا کرتی ہے۔

افلاطون سے بیسویں صدی کے آغاز تک لسانیات کے شفاف ذریعہ ہونے کا تصور غالب رہا۔افلاطون نے زبان کو شے کا علم دینے والے کے طور پر جانا ہے۔گویا زبان کی حیثیت کے۔۔۔مظہر یا حقیقت کا متبادل

قرار دیا گیا ہے۔ قدیم مذاہب اس نظریہ کو مبالغہ کی حد تک اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ جس کے نتیجے میں لفظ کو وہ قوت متصور کیا جاتا تھا جس سے شے منسوب ہے۔ زبان سے متعلق مذہبی تصورات اس نظریے سے ماخوذ ہیں۔ جبکہ ساختیات اس نظریہ کو رد کر دیتی ہے۔ اور زبان کے بارے میں اس تصور کی نفی کرتے ہوئے ہوا سے شے کا متبادل نہیں بلکہ زبان کو شے یا حقیقت یا مظہر کی طرف اشارہ کر دینے والے عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ اشارہ فطری یا منطقی نوعیت کا نہیں بلکہ ثقافتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ساختیات کے مطابق زبان نشانات کا نظام ہے۔ جس میں ہر نشان دوسرے نشان سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی اختلاف لسانی کارگردگی کو ممکن بناتا ہے۔

ساختیات نے لسانی علم میں زبان کے متحرک کردار پر زور دیا ہے۔ ساختیات نے انسانی موضوع کو بے مرکز قرار دیا ہے۔ یہی اصول ساختیاتی مطالعہ میں رہنمائی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ جس کی بدولت نئے نظریات نے جنم لیا۔ ''شعریات'' کی بدولت نئے تنقیدی نظریات نے دو رُخ اختیار کیے۔ ایک تو شعریات کو ادب میں ڈھونڈا گیا اور دوسرا اس کو زبان میں تلاش کرنے کی سعی کی گئی۔ یہ دو رُخ ہی ساختیات میں پیشِ نظر رہے ہیں۔ لسانیات میں لانگ ہی ادب میں شعریات کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے جس طرح ساختیات لسانیات کے تجریدی نظام لانگ تک رسائی کرتی ہے اُس طرح تنقید ادب کی شعریات تک پہنچتی ہے۔

شعریات کی دریافت سے تنقیدی تصورات نے دو پہلو اختیار کیے۔ ایک تو شعریات کو خود ادب میں دریافت کیا گیا اور دوسرا زبان کی تہہ میں موجود لسانی نظام کو زبان کی کارگردگی کا ضامن تصور کیا گیا۔ ان دونوں تصورات کو ادب اور لسان کو ایسے متون قرار دیا جن کی کارگردگی ایک جیسی ہے۔ یہاں زبان اور ادب کے امتیازات کو پس منظر میں رکھ دیا گیا ہے۔ مگر ساختیات ادب کے سائنسی مطالعہ کا اُس طریقہ کار کو بھی اہمیت دیتی ہے جو ادب کی تہہ میں موجود نظام کو مرتب کرتا ہے۔ شعریات کا یہ تصور لسانیات کے ساختیاتی مطالعہ سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔

رومن جیک سن شعریات کو لسانیات میں جبکہ بارتھ شعریات کو ادب میں تلاش کرتے ہیں۔ رومن جیک سن کے ترسیلی ماڈل کے ذریعہ پیغام کی ترسیل میں چھ عناصر اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

۱۔ مقرر (گفتگو کرنے والا)

۲۔ پیغام (گفتگو کا مقصد)

۳۔ سامع (گفتگو سننے والا یا پیغام وصول کرنے والا)

۴۔ تناظر (سیاق وسباق، ثقافتی پہلو وغیرہ)

۵۔ ضابطہ (علامات، نشانات وغیرہ)

۶۔ وسیلہ (ذریعہ، راستہ)

مقرر سامع کو کوڈ میں مضمر پیغام بھیجتا ہے۔ جو مخصوص تناظر میں بامعانی ہوتا ہے۔ پیغام کی ترسیل کسی وسیلہ (آواز، کاغذ) سے ہوتی ہے زبان کے پیغام کی ترسیل میں یہ چھ عناصر بیک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔ جب ان عناصر میں درجہ بندی قائم ہو جاتی ہے تو بامعانی گفتگو وجود میں آجاتی ہے۔ رولاں بارتھ شعریات کا تصور تو ساختیات سے لیتے ہیں۔ مگر وہ اسے ادب میں سے تلاش کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ساختیات زبان کے نظاموں کو ضابطوں، اور رسمیات مشتمل عمارت قرار دیتی ہے۔ جس کی تشکیل ثقافت کرتی ہے۔ ساختیاتی لسانیات زبان کے نظام میں موجود فرق کو اہمیت دیتی ہے۔ اور ہر نشان کو بامعانی قرار دیتی ہے۔ کیونکہ وہ صوتی اور معانوی سطح پر دوسرے نشان سے مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح ساختیاتی لسانیات متن کی ساخت کو سمجھنے کا طریق کار اور ماڈل فریم کرتی ہے۔ مگر یہ متن کی تعبیر فراہم کرنے سے قاصر ہے۔

ساختیات کی کلیت پسندی پر پہلی ضرب ''دریدا'' کی ساخت شکنی کی شکل میں لگائی گئی۔ دریدا زبان کی خود مختاری کو تسلیم کرتا ہے مگر وہ اس بات کو ماننے پر تیار نہیں کہ معانی مستقل ہوتے ہیں وہ معانی کے مسلسل التوا کی بات

کرتا ہے۔ دریدا کے مطابق متن سے باہر کچھ نہیں ہے کوئی تحریر خود سے باہر تناظر نہیں رکھتی۔ مگر چونکہ دریدا کے ہاں لسانی تناظر کی بات کی گئی ہے۔ جبکہ متن کا یہ لسانی تناظر اُس کے سماجی تناظر سے بھی منسلک ہوتا ہے اس لیے اس کی تعبیر من مانی نہیں کی جاسکتی۔

لسانیات اور دیگر علوم کے درمیان موجود تعلق متن کی تعبیر اور تشریح کے نئے انداز فراہم کرتا ہے۔ اس لیے جیک سن کے ماڈل میں ایک نئے عضو کو شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی متکلم کے علاوہ اپنے باطنی تصورات کو اہمیت دینے والا تخیلاتی کردار اس ماڈل کا حصہ ہو۔ ہر کردار تخلیقی عمل کے دوران خدوخال حاصل کرتا ہے۔ تخلیقی لسانیات اس ساخت کی بھی تحقیق کرے جو فرد کی سماجی حالت، اور نفسیاتی کیفیت کو یکساں طور پر متاثر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔

لسانیات میں نقطہ نظر اور رویوں کی کی مستقل تنسیخ اور تبدیلیوں کا عمل جاری رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے جدید فکری زاویے منظر عام پر آتے رہتے ہیں کسی بھی وقت کوئی نیا تجربہ نیا رُخ پیدا کرسکتا ہے اور سابقہ نظریے کی نفی ہو سکتی ہے۔ اس لیے جدید لسانیات کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اردو لسانیات کا المیہ ہے کہ یہ محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکی۔ اردو میں لسانیات کے جدید مباحث کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لسانیات سے متعلق موجود مواد ذہنی گمراہی کا باعث بن رہا ہے۔ جدید لسانیات کے حوالے سے ضروری ہے کہ اردو میں ان جدید لسانیاتی مباحث کو جگہ دی جائے جو مغرب میں مستعمل ہیں تاکہ اردو میں موجود لسانی مسائل کو کم کیا جاسکے۔ اس طرح اردو کے لسانیاتی نقطہ نظر کو فروغ دینے کی بدولت ہم لسانیاتی گمراہی کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرسکیں گے۔

حواشی اور حوالہ جات

۱۔ محی الدین قادری، زور، ''ہندوستانی لسانیات''، عزیز پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۲۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۶ء۔

۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو کی کہانی''، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ''عام لسانیات''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔

۵۔ آل احمد سرور، ''جدیدیت اور ادب''، ۱۹۶۷ء۔

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''تنقیدی تھیوری کے سو سال''، حفیظ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۷۔ شمیم حنفی، ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس''،

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

۱۰۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت اطلاقی جہات، مغربی پاکستان اکیڈمی، کراچی۔

۱۱۔ شمس الرحمان فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ، آج، کراچی، ۱۹۹۹ء۔

۱۲۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

۱۳۔ محی الدین زور، ہندوستانی لسانیات، عزیز پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

14. Jonathan Culler,Roland Barath, Oxford press london.2001.

۱۵۔ نصیر احمد خان، اردو لسانیات، اردو محل پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء۔

16. Jacques derrida,Speech and Phenomena, North Western Press Evenston 1973

17. Edward Saeed, The Orientalism,1977

18. Ruqaiya Hassan, Ways Of Saying,Ways of Meanings.1998]

19. Raymond Champion, Language and Literature,London; Edward Arnold (publisher)Ltd.1984.

۲۰۔ حامد حسین، ڈاکٹر، لفظوں کی انجمن میں، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔

21. Frank Lentricchia; After the new Criticism, London, Methuem, p 160-73.

22. The pleasure of the text trans; Richard Haward

۲۳۔ حامد حسین، ڈاکٹر، لفظوں کی انجمن میں، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔

24. Bloom Field,language,Published by Geoge Allen London,1958.

۲۵۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

۲۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

۲۷۔ تھامس کوہن نے ۱۹۶۲ء میں پیراڈایم کی تھیوری پیش کی انہوں نے اپنی کتاب ''سائنسی انقلابات کی ساخت'' میں سائنسی نظریات کی داخلی تاریخ لکھی ہے۔

28. Hassan,R.The place of context in a systamic functional model, Webster,London,2009.

۲۹۔ سجاد باقر رضوی، پروفیسر، مغرب کے تنقیدی اصول، مطبع عالیہ ۱۹۶۶ء۔

30. Roland Barathes, Image,Music, Text.Fontanna. Press1977.۔31. Roland Barathes, Criticsmand truth, Athlone press 1978.

32. Nicholos Royle, Jacques derrida,Routledge,London,2013.

۳۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

۳۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری کے سو سال، حفیظ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۹۷۔

35. Roland Barathes, Image,Music, Text.Fontanna Press1977.

36. Roland Barathes, Criticsmand truth, Athlone press 1978

37. Jonathan Culler, Roland Barath, Oxford university press London,2001,(P12.)۔38. A Barathes Reader(1982), Hill and wang, New York.

39. Literary Theory: A very short introduction, Oxford university press 1997.

40. Structurel Poetics: Routledge and Kegan Paul, ithca cornell, universaty

press,1975.

41. Elements of Semiolaogy(1968), Hill and wang, New york.۔42. Doja Albert(2008), Claude Levi Strauss at his centimental, toward future anthrapology.

43. Culler,J.(1976). Sassurer. Glasgow Fontana/ Collins.

44. Mythologies(1972), Hill and wang, New York.

۴۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

46. Roland Barathes: Death of the Auther,1968.

47. The place of Text(1975), Hill and wang, New Yo

48. Roultedge and kagan paul,Structurel Poetics, 1975.

49. Linguistics Boundaries, National acadmey,sci,USA,1987.

۵۰۔ شمس الرحمان فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ، آج، کراچی، ۱۹۹۹ء۔

۵۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری کے سو سال، حفیظ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

52. Miller James, The Passion of michel Foucalt,smart, Barry,2002.

53. Jacques Derrida, Speech and phenomina, North western university press, Evnston,1973.

۵۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری کے سو سال، حفیظ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

۵۵۔ عبدالحمید اعظمی، پطرس بخاری۔ شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۰۶ء۔

۵۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز۔ نئی دہلی، ۲۰۰۰ء۔

۵۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۵۸۔ بنجمن شلزے، ہندوستانی گرامر (مرتبہ و مترجمہ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء

۵۹۔ کرسٹل ڈیوڈ، لسانیات کیا ہے، نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۷ء۔

۶۰۔ ناؤم چوامسکی، ورلڈ آرڈر کی حقیقت، مترجم احسن مخدوم، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

61. Naom chomsky, In Human Nature,souvenir press,London. 1974. p,172.

۶۲۔ ناؤم چوامسکی، ورلڈ آرڈر کی حقیقت، مترجم احسن مخدوم، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

63. Naom chomsky, In Human Nature,souvenir press,London. 1974. p,172.

۶۴۔ ناؤم چوامسکی، ورلڈ آرڈر کی حقیقت، مترجم احسن مخدوم، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۶۵۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

66. Naom Chomsky, Critical Assessment,vol.2

67. Bear, Rohatid, Bakhtin and Genre,Atlanta,society of biblical literature,2002,

68. P.N,Medveded,Bakhtin and marksiasm.

69. Makhail Bakhtin, Forms of time and Chronotopo,1938.

70. Michael,P.Clark,Jaquas Lacan, vol.1.

71. Lacan,J, Founding Act, A Challange to psychoanalytic establishment,p,97-106.

72. Singmund Freud, On meta Psychology, (Penguin 1984).P 207.

73. Geoferry Bennington, Jaquess derrida, university of chicago press 1991.

74. Derrida: After ward, Toward an ethics of discussion,Publish in the English translation,1988.

75. Jacques Derrida, Speech and phenomina, North western university press, Evnston,1973.

76. Lional Abel, Important Nonsence, Basc Books New York, 1972.

77. Michel Foucault, The Subject and the Power, Chicago university press.

محاکمہ

اس مقالہ کوتحریر کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اردو ادب میں جدید لسانیات کے مباحث کے اطلاق کی ضرورت موجود ہے۔ اردو ماہرین لسانیات کے لیے ضروری ہے کہ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنائیں اور قدیم روایتی تصورات کو ترک کر کے نئی اور جدید تحقیقات کی روشنی میں اردو زبان کو بین الاقوامی ابلاغ کی زبان بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اب جبکہ عدالت عالیہ نے اردو کو دفتری زبان قرار دیتے ہوئے ہر قسم کی خط و کتابت کو اردو زبان میں کرنے کے احکامات صادر کر دیئے ہیں اس لیے اب یہ بات زیادہ ضروری ہو گئی ہے کہ اردو رسم الخط اور اس کی ٹائپ پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اردو زبان کے استعمال کے بڑھتے ہوئے رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اردو لسانیات کے میدان میں مغرب کے ہم پلہ ہو کر ان کی زبانوں میں ہونے والے لسانی مباحث پر گہری نگاہ رکھیں اور ہر جدید تحقیق سے اردو لسانیات کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔ تا کہ اردو زبان کو مزید فروغ حاصل ہو سکے۔

بولنے والے کی تہذیب زبان کی معنیات کی عکاس ہے۔ معنیات متکلم کے تہذیبی رویوں کا عکس پیش کرتی ہے۔ ابلاغ کی درست فراہمی کے لیے صورتحال اور موقع محل اہمیت رکھتے ہیں۔ وہی کلام با مقصد اور متحرک ہوتا ہے جو سماجی سیاق میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ کہ علم بشریات میں بھی معنیات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ بشریاتی نقطہ نظر سے رشتوں اور فطرتی مظاہر اور عقائد کی گروہ بندی بھی زبان کے معنیاتی امتیازات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح زبان کے استعمال کرنے والوں کے تصورات، مشاہدات، مطالعات اور ذہنی رجحانات بھی معنیات کو متاثر کرنے والے عوامل ہیں۔ نظام لسان کے ہر ماڈل یا جملے میں صوت اور معنی کی بھرپور نمائندگی ہونی چاہئے۔ یعنی

ماڈل ایسا ہو جس میں صوتی، قواعدی اور معنیاتی اصول ایک مربوط اکائی کی صورت موجود ہوں۔ آج کل تخلیقی گرائمر میں ان اصولوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

تمام انسانی گروہ سماجی نظام کو اور اس سے وابستہ ادارے زبان اور اس کے معنیات کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ زبان کے ساختیاتی سانچے انہی لسانی گروہوں کے مزاج اور فکر کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں۔ ہر لسانی گروہ کی تخیلاتی اور ذہنی صلاحیت دنیا کے بارے میں ان کے موجود ادراک اور شعور پر مشتمل ہوتی ہے۔ محض زبان ہی انسانی شعور اور ادراک کی ترجمانی کی وسیلہ نہیں بنتی بلکہ انسانی تصورات اور ماحول کی بناوٹ وغیرہ بھی اظہار کا بالواسطہ ذریعہ ہیں۔ زبان کی جڑیں لسانی گروہ کے ماضی میں ہوتی ہیں۔

اردو زبان کے حوالے سے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ حروف تہجی، اور رموز واوقاف کی زیادتی کی وجہ سے طباعت اور اشاعت میں کچھ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ملک کے مختلف حصوں کے سماجی اور تہذیبی عوامل کے زیر اثر بول چال میں موجود انحرافات ہیں۔ املا کی ہم آہنگی اور یکسانیت، طباعت اور اشاعت کے لیے ایک معیار کا کام کرتی ہے۔ یہ کام عمومی طور پر ابتدائی تعلیم کے مراحل میں طے پا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ بچہ تدریس کے ذریعہ اردو سیکھتا ہے اور پھر عام بول چال سے اس کو مزید مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ علمی فروغ کے لیے اردو زبان کی کسی نہ کسی طرح معیار بندی کی جائے۔

لسانیات سائنس ہے اور اس کا کام حقائق سے بحث کرنا ہے۔ لیکن لسانیات طبیعاتی سائنس نہیں ہے کیونکہ اس میں جس مواد سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کا تعلق مستقل اور غیر متغیر حقائق سے نہیں ہوتا۔ لسانیات جس مواد سے بحث کرتی ہے وہ منطقی ہوتے ہیں۔ اور ان میں افقی اور عمودی ہر سطح پر تبدیلیوں کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

میری رائے ہے کہ لسانیات میں اضافہ اور ترمیم کا زیادہ تر کام غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے

مناہج مطالعہ اور طریق بحث کی تعریف اور توضیح ممکن ہوتی ہے۔ چونکہ لسانیات ایک عمرانی علم ہے اس لیے اس کا تعلق لوگوں کے سماجی اور معاشرتی رویوں اور عوامل سے ہے۔اس لیے لسانیات کو محض جدید لسانیاتی توضیح ،فونیمیات، ساختیات اور تبادلی گرائمر تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اور عمرانیاتی لسانیات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے لسانی نظام کو تجرید کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس مقالہ میں سیاق وسباق اور زبان کے تعلق پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زبان اور سماجی معیارات، زبان اور علم کے درمیان تعلق پر بحث اس مقالہ میں شامل ہے۔ زبان کے کردار اور اس میں ہونے والی معنویاتی تبدیلیوں پر ماہرین کی رائے اور ان کی تحقیقات کو مقالہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ فن لفاظی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ لفظ اور بولنے والے کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ جمالیاتی عمل ،لسانیاتی خصوصیات سے مستفید ہونے کا طریقہ ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ کن حالات میں زبان کے خاکے قابلِ اہمیت ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عبارت کے گہرے معنوں کو ذمہ داری سے سمجھا جائے۔ معانی ایسی قوت ہے جو علامت اور بیان کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے۔ یہ معانی مکمل طور پر ثقافت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ ثقافتی ہم آہنگی اور تضادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ثقافتی حدود کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ لیکن یہ انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ ثقافتی حدود میں تغیر موجود رہتا ہے۔ یہ ثقافتی تضاد دو ثقافتوں کے درمیان مکمل انحراف نہیں ہے بلکہ یہ لسانی تضاد ہے جو دو ثقافتوں کے درمیان مشابہہ طور پر ظاہر ہوتا ہے اور دو ثقافتی رویوں میں تعلق پیدا کرتا ہے۔

میری رائے میں واضح اور مضمراتی اسلوب میں فرق ضرور رکھنا چاہئے۔ واضح اسلوب کے لیے ایک ایسے سامع کی ضرورت ہے جو متعلقہ زبان کے بارے میں عمومی معلومات رکھتا ہو۔ جبکہ مضمراتی اسلوب کے لیے ایسے سامع کی ضرورت ہے جو ان حالات کے بارے میں بھی جانتا ہو جن حالات میں یہ پیغام جاری ہوا غالباً تمام انسانی زبانوں میں صریحی اور مضمراتی فاصلے موجود ہیں۔ کسی بھی متن کی تکمیل میں یہ فاصلے پہلو بہ پہلو موجود رہتے

ہیں۔مضمراتی اسلوب کی ترجمانی ہمیشہ موجود ذرائع سے ممکن نہیں ہوتی بلکہ اکثر مواقع پر اس کی وضاحت کے لیے سیاق وسباق کی ضرورت ہوتی ہے۔ سامع تک بات کے درست مفہوم کی رسائی کے لیے ضروری ہے کہ واضح اسلوب کو اپنایا جائے۔تکہ سامع بات کو اس کے درست تناظر میں سمجھ سکے۔

میری رائے میں سیاق وسباق کو لسانیاتی مطالعہ کے تمام پہلوؤں میں اہم قرار دیا جانا چاہئے۔ چونکہ گفتگو انسانوں کی فطرت پر منحصر ہوتی ہے۔اس لیے معنی کا تبادلہ لازمی طور پر عام بولنے والے کے سماجی اور ثقافتی پس منظر پر انحصار کرتا ہے۔زبان اور سیاق وسباق میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔اس لیے کسی بھی زبان کے معانی تک رسائی کے لیے سیاق وسباق میں گہرے تعلق کے بارے میں معلومات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔یعنی وہ تمام تناظراتی عوامل جن میں چہرے کے اتار چڑھاؤ، ماحول، ثقافتی اثرات اور لہجے پر خصوصی توجہ ہی سیاق وسباق کو واضح کرتے ہیں۔اس لیے جس قدر سیاق وسباق واضح ہوگا اسی قدر زبان اپنے مفہوم کو واضح کر سکے گی۔

اس مقالے میں لسانیات عمومی مغربی رجحانات، مغرب کے جدید لسانی مباحث پر سیر حاصل تحقیق موجود ہے۔لسانیات اور اس کی افادیت کے حوالے سے مغرب میں ہونے والے مباحث کو اس مقالے کا حصہ بنایا گیا ہے تاکہ اردو ادب میں ہونے والی لسانی تحقیقات کے لیے ایک نئے نقطہ نظر کو سامنے لایا جا سکے۔لسانیات کی حدود جس میں اردو لسانیات کو پرکھا جا رہا ہے اس میں اضافہ کیا جا سکے۔ اردو ماہرین لسانیات جس دلجمعی اور جانفشانی سے لسانیات کے میدان میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔امید ہے یہ مقالہ ان کی تحقیقات میں ممدو معاون اور مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

اردو میں لسانیاتی مطالعہ کو جامع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اردو میں لسانیاتی نظریات کسی نہ کسی مخصوص نقطہ کو پیش نظر رکھ کر چند مخصوص پہلوؤں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔بعض ماہرین لسانیات نے کوشش کی ہے کہ لسانیات کی جامع انداز میں توضیح اردو میں پیش کی جائے۔ اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ اب ایک علم کی

مرکزیت یا اجارہ داری نہیں رہی۔ اس لیے جدید لسانیات کے مباحث کو یورپ سے باہر دیگر خطوں میں کسی اجنبیت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس لیے ضروری خیال کرتا ہوں کہ اردو ادب کو ان مباحث سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء۔

۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۰ء۔

۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد، لاہور، مرکزی بورڈ، ۱۹۷۱ء۔

۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جدید اردو ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۵۔ احتشام حسین، اردو لسانیات کا مختصر خاکہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور۔

۶۔ احسان الحق، ڈاکٹر، اردو عربی کے لسانی رشتے، قرطاس، کراچی۔

۷۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات، زبان اور رسم الخط، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء۔

۸۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، صوتیات اور فونیمیات، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۴ء۔

۹۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء

۱۰۔ الٰہی بخش اعوان، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات لسانیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ انشاءاللہ خاں انشاء، دریائے لطافت، (مرتبہ مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو اشاعت دوم، کراچی۔

۱۲۔ انیس ناگی، شعری لسانیات، کتابیات، لاہور۔

۱۳۔ بنجمن شلزے، ہندوستانی گرامر (مرتبہ ومترجمہ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۱۴۔ پریشان خٹک، پروفیسر، لسانی رابطہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

۱۶۔ حیدر سندھی، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، پاکستان کا لسانی جغرافیہ، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء۔

۱۷۔ خلیل صدیق، آواز شناسی، بیکن بکس اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۱۸۔ خلیل صدیقی، زبان کا مطالعہ، مستونگ قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۶۴ء۔

۱۹۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، بیکن بکس اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۲۰۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء۔

۲۱۔ خورشید الحسن رضوی، ڈاکٹر، مقالہ الخط العربی القدیم وارتقا، غیر مرتبہ۔

۲۲۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

۲۳۔ روح الامین، سید، اردو کے لسانی مسائل،

۲۴۔ روح الامین، سید، ''اردو لسانیات کے زاویے''، عزت اکادمی، گجرات، ۲۰۰۷ء۔

۲۵۔ سدھیش ورما، آریائی زبانیں، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۶۰ء۔

۲۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۲۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

۲۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۲۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، معنویات، آزاد بک ڈپو، سرگودھا، ۱۹۸۶ء۔

۳۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، نظامیات اردو، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۳۱۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل ولطائف، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء۔

۳۲۔ شرف الدین صلاحی، اردو سندھی کے لسانی روابط، مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔

۳۳۔ شمس الرحمان فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ، آج، کراچی، ۱۹۹۹ء۔

۳۴۔ شمس الرحمان فاروقی، ''لغات روزمرہ''، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء۔

۳۵۔ شمس الرحمان فاروقی، ''لفظ و معنی''، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء۔

۳۶۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو زبان کا ارتقاء، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی۔

۳۷۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ''اردو قواعد''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۲ء۔

۳۸۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، کُل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۰ء۔

۳۹۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، داستان زبان اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

۴۰۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، لسانی مسائل، مکتبہ اسلوب۔ کراچی، ۱۹۶۲ء۔
۴۱۔ شیما مجید، اردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔
۴۲۔ عبدالحیٔ عابد، علم الخط، میانوالی، ۲۰۰۹ء۔
۴۳۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، عمومی لسانیات، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۹۳ء۔
۴۴۔ عبدالحق، ڈاکٹر، قواعد اردو، الناظر پریس، لکھنو، ۱۹۱۴ء۔
۴۵۔ عبدالحق، ڈاکٹر، خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۳۵ء
۴۶۔ عبدالحق، ڈاکٹر، صرف ونحو، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء۔
۴۷۔ عطش درانی، ڈاکٹر، پاکستانی اردو کے خدوخال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء۔
۴۸۔ علم الدین غازی، لسانی مطالعے، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء۔
۴۹۔ عین الحق فریدکوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، اورینٹ ریسرچ سنٹر، لاہور، ۱۹۷۹ء۔
۵۰۔ غلام علی آلانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پریس، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
۵۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو املاء وقواعد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء۔
۵۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، تدریس اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔
۵۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو ہندی تنازعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۷ء۔
۵۴۔ قدرت نقوی، سید، لسانی مقالات (حصہ اول) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء۔
۵۵۔ قمر عباس، اردو لسانیات میں مولوی عبدالحق کا مقام، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پریس، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔
۵۶۔ گارساں دتاسی، مقالات، انجمن ترقی پسند اردو، کراچی، ۱۹۶۴ء۔
۵۷۔ گلیسن، ایچ اے، توضیحی لسانیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء۔
۵۸۔ گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔
۵۹۔ گوپی چند نارنگ، اردو کی تعلیم کے ساختیاتی پہلو، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۴ء۔
۶۰۔ گوپی چند نارنگ، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۱ء۔

۶۱۔ گوپی چند نارنگ، املاء نامہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء۔
۶۲۔ گوپی چند نارنگ، لغت نویسی کے مسائل، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء۔
۶۳۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ایک بھاشا دو لکھاوٹ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵۔
۶۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، لسانی مطالعے، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء۔
۶۵۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، عام لسانیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔
۶۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کے بدلتے نظریات، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
۶۷۔ مصطفیٰ علی بریلوی سید، انگریزوں کی لسانی پالیسی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔
۶۸۔ مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر، اردو کی لسانی تشکیل،
۶۹۔ محمد معین الدین، لسانی مطالعے، مجلس دانشوراں، لاہور، ۱۹۷۰ء۔
۷۰۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، عزیز پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء۔
۷۲۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، تاریخ زبان اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء۔
۷۳۔ موسیٰ سلمان کرماڈی، اردو کا آسان قاعدہ، اسلامک ایجوکیشنل ٹرسٹ، یوکے۔
۷۴۔ میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر، لسانیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔
۷۵۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔
۷۶۔ ناصر عباس نیر، مابعد جدیدیت اطلاقی جہات، مغربی پاکستانی اردو اکیڈمی، کراچی۔
۷۷۔ ناؤم چوامسکی، ورلڈ آرڈر کی حقیقت، مترجم احسن مخدوم، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔
۷۸۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر، اردو لسانیات، اردو محل پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء۔
۷۹۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر، اردو ساخت کے بنیادی عناصر، مکتبہ جدید، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء۔

80. Aarts, Bas, and Charles F. Meyer (editors). 1995.The verb in contemporary English. Cambridge: Cambridge University Press.
81. Albert(2008), Claude Levi Strauss at his centimental, toward future anthrapology.
82. Bakhtin,M.(1938), Forms of time and Chronotopo.

83. Bakhtin,M.(1986), The problems of Speech Genre, University of Texas Press.

84. Baart, Joan. 1999.Acoustic phonetics. CD-ROM. Preliminary edition, chapters 2–5. In LinguaLinks 4.0 LT. Dallas

85. Baltin, Mark R., and Anthony S. Kroch (editors). 1989.Alternative conceptions of phrase structure. Chicago: University of Chicago Press.

86. Bear, Rohatid, Bakhtin and Genre,Atlanta,society of biblical literature,2002

87 Benjiman lee whorf,The relation of habitual thought and behaviour to language, carrol,1939.

88. Bernstein,B.(1990), Class, Codes and Control,volume 4.

89. Brenstein,B.(1996). Symbolic control and identity, Theory research critique,London.

90. Brown,R.(1968),The Pronouns of power and solidarity.

91. Buhher,K.(1934), Sparch Theoric,Trans.

92. Bloom Field,language,Published by Geoge Allen London,1958

93. Butt,D.(1987). Randomness,Order Latent patterning of Text.

94. Butt,D.(2001). Development of systamic Functional theory,Vol;2, Berlin.

95. Cameron, Deborah. 1992.Feminism and linguistic theory. Basingstoke. London: Macmillan.

96. Campbell, Lyle. 1999. "Historical linguistics: An introduction." Cambridge, MA: MIT Press.

97. Chomsky,Naom, Critical Assessment,vol.2

98. Chomsky, Noam, and Morris Halle. 1968.The sound pattern of English. New York.

99. Chomsky,Noam In Human Nature,souvenir press,London 1974.

100. Colran,C.(1964), Rhetorical units and decontextualization.

101. Colran,C.(1999), Contexts for Learning,London.

102. Culler,J.(1976). Sassurer. Glasgow Fontana/ Collins.

102. Eggins,S.(1997), Analyzing Casual conversation, London Cassell. 103. Engerstorm,Y.(1999), Perspective on active Theory, Cambridge University press.

104. Fair Clough,N.(1992) Discourse and Social Change, Cambridge,Polite Press.

105. Firth,J,R.(1957), Papers in Linguistics,oxford university press london.

106. Fleming, Ilah. 1988.Communication analysis: A stratificational approach. semantic, and morphemic analysis. Volume 2. Dallas, TX: Summer Institute of Linguistics.

107. Franklin, Karl. 1994. "Review: Lexical matters." NOLx 1977–2002.

108. Geoferry Bennington, Jaquess derrida, university of chicago press 1991.

109. Goldsmith, John A.(1975)."Tone melodies and the autosegment." Columbus,Ohio State University Chicago.

110. Gregory,M.(1967), Aspects of Varieties differentiation, Journel of Linguistics.

111. Gregory,M.(1988), Generic Situation and Discourse, Amsterdam.

112. Greogry M, Relations and functions in and around language,London,2002.

113. G.leach, Semantics, London,1974.

114. Halliday M.A.K,(1964), The linguistic science and language teaching, London

115. Halliday M.A.K,(1974), Language and social man, vol.3, Longman,

London

116. Halliday, M.A.K.and Hassan, R.(1976) Coheision in English, long man, London.

117. Halliday,M.A.K(2009), Place of context in symentic model,New York.

118. Halliday, M.A.K.and Hassan,R.(1985), Context and Text,Language,and social semiotic perspective.Deakin University Press,Geelong/oxford.

119. Hassan,R.(1973),Code Register and social dialect, Vol,1. London, equinox.

120. Hassan,R.(1985), Linguistics, language and verbal art, geelong Deaken University Press London.

121. Hassan,R.(1988), Process of socialization in language,london.

122. Hassan,R.(1996), Ways of Saying,Ways of Meanings,Edited by camel Cloran, London.

123. Hassan,R.(2004), Analyzing Discursive variation, London.

124. Hassan,R.(2009), Sementic Variation, Meaning in society vol.2 Jonathan webster,Equinox.

125. Hassan,R.(2009), The place of context in a systamic functional model, Webster,London.

126. Hill and wang,(1968), Elements of Semiolaogy,New york.

127. Hill and wang,(1972), Mythologies,New York.

128. Hill and wang,(1975)The place of Text,New York.

129. Hill and wang,(1982), A Barathes Reader,New York.

130. Hymes,D.(1986), Models of interaction of language and social life,Oxford.

131. Jacques Derrida,(1973). Speech and phenomina, North western university press, Evnston.

132 Jacques Derrida:(1988), After ward, Toward an ethics of discussion,Publish in the English translation.

133. Koul,Omkar Nath, Linguistics, theoretical and applied, Indian institute of language studies.

134. Labov,W.(1972), Socio linguistic Patterns,Oxford,Basil Black Well.

135. Lacan,J, Founding Act, A Challange to psychoanalytic establishment.

136. Lemke,J.(1995), Textual Politics Discourse and Social dynamics, London.

137. Lemke,J.(2011), Review of semantc variation, London,eqinox.

138. Lional Abel, Important Nonsence, Basc Books New York, 1972.

139. Lukin,A.(2002), Examining Poetry, Macquarie University.

140. Mallinowski,b.(1935), An Ethnographic theory of Language, Vol.2,part,4,London.

141. Martin.j.R.(1985), Process and Text, Noorword,NJ, Ables.

142. Martin.j.R.(1992), English text,System and Structure.

143. Mathiessen.C.M.(1993), Register in the Round, in register analysis.

144. Mead.G.H.(1934), Mind, Self and Society, Chicago University Press.

145 Michel Foucault,(1982), The Subject and the Power, Chicago university press.

146. Michael.P.Clark, Jaquas Lacan,vol.1.

147. Miller James,(2002), The Passion of michel Foucalt,smart, Barry.

148. Mukarovsley J.(1977), The world and verbal art, New Haven Yale University Press.

149. Roland Barathes,(1968), Death of the Auther.

150. Routledge and Kegan Paul,(1975), Structurel Poetics, ithca cornell, university press.

151. See Weiner,and Labor.W,(1983), Constrains on Agent leaa
152. Passive,Australian Journel of languistics.
153. Singmund Freud,(Penguin 1984), On meta Psychology.
154. Terry Egilton,(1997), Literary Theory: A very short introduction, Oxford university press.
155. Tucker.G.H,(1996), Language form and Linguistic theory, Amsterdam.
156. Uzgalis william, Stanford encyclopedia of philosphy,john locks.
157. Volosinov,V.N.(1973). Maxism and philosphy of Language, Cambridge, Harverd university Press.
158. Williams,G.(1995). Joint book reading and literary pedagogy, NewYork,Peter Lang.
159. Williams,G.(2001). literary pedagogy Prior to Schooling,NewYork,Peter Lang.